

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

نورانی 2017

شعاع

پاک سوسائٹی

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

سُحُوح

باقی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر — رضیہ جمیل

مدیر منظم — افریقا ریاض

مدیر اعزازی — امت الصبور

فنانہ ٹیلی گون — شاہین رشید

اشہارت — کجالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ سُحُوح

37 - اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نوز بہیڑ سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نوز بہیڑ ایلیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE



ناولٹ

78	نایاب جمیلائی	شہرِ خطا
190	ام ایمن قاضی	زندگی کے رنگ
172	شبانہ شوکت	ہوائے کشتِ وفا

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	الطاف حسین حالی	حمد
11	سلیم کوثر	نعت
12	ادارہ	نتیجہ کی باتیں

افسانے

62	سمیرا حمید	عہدِ سکوت
110	قانتہ رابعہ	پاکِ دل
70	ام اقصیٰ	پسِ ایلینہ
73	عندیب زہرا	انے کے کاویا
114	نور دیا نور	برگِ بے سول

انٹرویو

20	شاہین رشید	دستک
47	جنید جمیل	یا دینِ باتیں
280	ڈاکٹر صمیم	جب تجھ سے ناخوڑا ہے
277	ادارہ	شعاع کے ساتھ

ناول

216	صائمہ اکرم	شہزاد
36	عفت سحر پار	خوب شیشے کا
266	احمد ندیم قاسمی	نظمِ اسم
266	محسن نقوی	غزل
267	احمد مشتاق	غزل
122	فرزانہ کھرل	پیار کا دوہرا شہر

کسل ناول

انتیباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی اعداد سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



قرآن سالانہ بیک لیسنس ریجنسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے



284	امت الصور	تاریخ کے جھوکے	24	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موتھم کے یگانہ	268	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	275	واصفہ سہیل	ایٹنیہ خالے میں
			270	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			273	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ

فروری 2017

جلد 31 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلورین حسن پر نشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقالہ ای پی پی اے سی ایچ ایس ایس جی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

دکھیں جگمگ



شعاع کا فروری کا شمار لیے حاضر ہیں۔
 سرد مزاج موسم کا ہو یا انسانوں کا، طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرد موسم خوش گواری
 اور سرخوشی کی کیفیت طاری کرتا ہے اور سرد مزاج لوگوں کا ساتھ بے زار کر دیتا ہے۔
 اللہ کا شکر ہے کہ کراچی کے لوگوں کی دُعا میں قبول، خوشی، خاموشی سے برستے روٹی کے گالوں نے فلک
 یوں پہاڑوں کو سفید لباس پہنایا اور وہ بادل جو جھلک دکھا کر قابض ہو جاتے تھے، بہت سالوں بعد برے
 تو سردی نے اپنا رنگ جمایا اور کراچی والوں نے بہت سالوں بعد سرد موسم کا لطف اٹھایا۔
 سب سے بہت ہوؤں میں سرما کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر کینو کھانا اور طویل راتوں میں کافی، مونگ پھلی اور
 چلغوزوں کا لطف اٹھانا کہ یہ موسم سرما کی سوفا میں ہیں مگر یہ اور بات ہے کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے انہیں ہماری
 پہنچ سے دور کر دیا ہے۔
 جب راتیں طویل ہوں اور چاروں طرف خاموشی ہو تو مطالعے کا لطف بھی دو بالا ہو جاتا ہے۔ موسم سرما
 میں لحاف میں دبک کر شعاع کا لطف اٹھائیں۔ یہ آپ کی دسترس میں ہے۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ فرزانہ کھل کا مکمل ناول۔ پیار کا دوسرا شہر،
 - ۲۔ نایاب جمیلانی، ام ایمان قاضی، فرح بخاری اور شبانہ شوکت کے ناولٹ،
 - ۳۔ سمیرا حمید، قانتہ رابعہ، ام اقصیٰ، خدیبہ زہرا اور نور دیا نور کے افسانے،
 - ۴۔ صائمہ اکرم چودھری اور عنفت محرطہ ہر کے ناول،
 - ۵۔ مقبول ترین شخصیت جنید جمشید کی یادیں باتیں،
 - ۶۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
 - ۷۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
 - ۸۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
 - ۹۔ شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
 - ۱۰۔ خط آپ کے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع کا ہر شمارہ ہمارے لیے خاص شمارہ ہوتا ہے، جسے ہم پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اپنی
 محنت میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ یہ ہمیں ضرور بتائیے گا۔

رَسُولِ مَقْبُولٍ
عِشْقِ

بَارِي تَعَالَى
کَلِمَاتِ

قبضہ ہو دیوں پر کیا اور اس سے ہوا تیرا
اک بندہ نافرماں ہے حمد سرا تیرا
جو دل میں نصب ہے، حمد و ثنا کا آئینہ
اسی کا عکس ہے ارض و سما کا آئینہ
گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہو گا حق کیونکر ادا تیرا
خدا کا ذکر ہے عشق محمدی کی دلیل
اور ان کا عشق ہے قرب خدا کا آئینہ
پچھا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی
کلی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا
زمانہ آپ کے اشارے مثال کا عکس
صحابہؓ آپ کے مہر و وفا کا آئینہ
تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلہ تیرا
مہک رہی ہیں جہاں آیتوں کی تفسیریں
وہ جبل نور ہے غارِ حرا کا آئینہ
آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا
سلیم اشکِ ندامت سے دھلتا جاتا ہے
ہے سامنے مرے، دستِ دعا کا آئینہ
مولانا الطاف حسین حالی

سائنس کی روشنی میں

بیماریوں کی اقسام ان کے علاج کا بیان

لقوی تعریف : لغت میں طب کے معنی جسمانی و ذہنی علاج اور دوا دارو کے ہیں۔ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا نہ فرمایا ہو۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی شفا (اور علاج دوا) نازل فرمائی ہے۔“ (صحیح بخاری۔ 5678)

لہذا جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو علاج کروانا سنت ہے۔ یہ توکل کے خلاف نہیں بلکہ اسباب اختیار کرنا توکل کے عین مطابق ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”اللہ کے بندو! دوا دارو کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موت اور بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی شفا پیدا کی ہے۔“ (مسند احمد 4/278)

بیماری کی اقسام اور ان کا علاج : بیماری کی دو قسمیں ہیں۔

دل کی بیماریاں، جیسے شک و شبہ، شہوت اور کفر و عناد کی بیماریاں۔
بدنی بیماریاں۔

دل کی بیماریوں کا علاج صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات سے ہو سکتا ہے کیونکہ ان بیماریوں کے اسباب و علاج کی معرفت صرف رسولوں کے ذریعے ہی سے ممکن ہے۔ قرآن مجید نے ان بیماریوں کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے، جیسے ”ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید کر دیا۔“ (البقرہ 2-10)

”یعنی ان کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہے جو اصلاح نہ کرنے پر بڑھتی ہی گئی۔“

بدنی بیماریوں کا علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ اولاً ”بذریعہ غذا“ جبکہ دوسری قسم کے علاج کے لیے بیماری کے اسباب اور ان کو دور کرنے کے لیے مناسب دوا کے لیے غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔

طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر دو قسم کی بیماریوں کا شافی علاج موجود ہے، البتہ اسباب کے موافق علاج کے لیے حاذق اور تجربہ کار طبیب کی خدمات حاصل کرنا مستحسن امر ہے۔

حاذق طبیب کی پہچان : علاج کے لیے موثر دوا کا انتخاب بے حد ضروری ہے کیونکہ ہر بیماری اپنی مناسب دوا ہی سے باذن اللہ دور ہوتی ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”ہر بیماری کی دوا ہے جب بیماری کے موافق دوا مریض کو مل جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔“ (صحیح مسلم۔ 2204) بیماری کی نوعیت کے مطابق مناسب دوا صرف تجربہ کار، عقل مند اور صحیح طبیب ہی دے سکتا ہے۔

صحیح حکیم کی پہچان کے لیے حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ نے متعدد امور ذکر کیے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

اچھا حکیم وہ ہے جو بیماری کی نوعیت کو سمجھ سکے۔
بیماری کے سبب کو معلوم کر سکے۔
مریض کی بدنی قوت کا اندازہ لگا سکے کیونکہ اگر مریض کی قوت مرض پر غالب آسکتی ہو تو پھر دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مریض کی طبعی حالت کو جان سکے کہ وہ گرم مزاج ہے یا خشک و تر وغیرہ؟

طب سے متعلق احکام و مسائل

اللہ نے ہر بیماری کی شفا (حاصل کرنے کے لیے) (دوا) نازل کی ہے۔ حضرت اسامہ بن شریک (ثعلبی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

”میں (مجلس میں) موجود تھا جب اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کر رہے تھے: کیا فلاں کام کرنے میں ہم پر گناہ ہے؟ کیا فلاں کام کرنے میں ہم پر گناہ ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اللہ کے بندو! اللہ نے حرج (تنگی) کو دور کر دیا ہے مگر جس نے اپنے بھائی کی عزت میں سے ایک حصہ کٹ لیا، یہی ہے جس نے گناہ کیا۔“

انہوں نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمیں اس بات سے گناہ ہو گا کہ ہم (بیماری سے شفا کے لیے) دوا (استعمال) نہ کریں؟“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کے بندو! (شفا کے لیے) دوا (استعمال) کیا کرو، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو بیماری بتائی ہے، اس کی شفا (کے لیے) دوا بھی بتائی ہے، سوائے شدید برہا پے کے۔“

انہوں نے کہا ”اللہ کے رسول! بندے کو سب سے بہتر چیز کیا عطا ہوئی ہے؟“

”فرمایا قر اچھا اخلاق۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1- یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا مظہر ہے کہ آپ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کے نامناسب رویے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

2- اسلام کے احکام انسانی فطرت کے مطابق ہیں، اس لیے ان میں ایک طرح کی سہولت موجود ہے۔

3- عزت میں سے حصہ کاٹنے کا مطلب ہے کہ اس کی آبروریزی کی یا ایسا کام کیا یا ایسی بات کہی جس سے اس کی عزت میں فرق آئے۔

4- بیماری کا علاج کرنا بھی جائز اسباب میں سے ہے

سال بھر کے موسم کے مطابق دوا اختیار کر کے کیونکہ بعض موسم خاص امراض کے علاج کے لیے مفید نہیں ہوتے، مثلاً ”آپریشن کے لیے سخت گرمی کا موسم۔“

مریض کے علاج کی آہ ہو اور کا خیال رکھے۔
دوا کی قوت کی پہچان رکھتا ہو۔

سائیڈ ایفیکٹ (دوا کے مضر اثرات) سے واقف ہوتا۔

صرف بیماری کا علاج ہی مقصود نہ ہو بلکہ دوسرے کسی بھی مرض سے بچاؤ بھی کرے۔
صرف حلال دوا سے علاج کرے۔
طبی اور روحانی علاج کرے۔
مریض کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش

آئے۔

موجودہ صحت کی حفاظت، ضائع ہونے والی قوت کے حصول، بیماری کو حسب طاقت کم کرنے اور ادنیٰ مصلحت کی خاطر اعلیٰ مصلحت کو نہ چھوڑنے والا طبیب۔

طب نبوی کے چند ہر بل ٹانگ: طب نبوی میں چند ادویات ایسی ہیں جو بہت سی بیماریوں کا شافی علاج ہیں، البتہ ان کے استعمال کے لیے مریض کی طبیعت، حالت، بیماری کے اسباب و علل اور دیگر اسباب کو مد نظر رکھنے کے لیے حافظ طبیب کی خدمات حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

شہد: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”ان کے پیٹوں سے مختلف رنگ کا مشروب (شہد) نکلتا ہے، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔“ (النحل 16-69)

”زم زم: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے م کو جس (نیک) مقصد اور نیت سے پیا جائے یہ اسی کے لیے موثر ہو جاتا ہے۔“ (ابن ماجہ 3062)

کلونجی: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ”سیاہ دانے (کلونجی) میں موت کے سوا ہر بیماری کی شفا ہے۔“ (صحیح بخاری 5688)

ہو اور اس چیز سے پرہیز کرے جو اس بیماری میں نقصان دہ ہے۔

2- بیماری کے بعد زود ہضم اور غذائیت والی خوراک استعمال کرنی چاہیے۔

حضرت صہیب (بن سنان رومی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رومی اور کھجوریں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آئیے! تناول کیجئے“

میں نے کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم کھجوریں کھا رہے ہو، حالانکہ تمہاری آنکھ دکھتی ہے“

میں نے کہا ”میں دوسری طرف سے چہا رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے۔

فوائد و مسائل:

1- مہمان کو کھانے کی پیش کش کی جائے تو اسے چاہیے کہ تکلف نہ کرے، قبول کر لے ہاں! اگر اس کی ضرورت نہیں ہے تو اور بات ہے۔

2- بیمار کو کھانے پینے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

3- بزرگ شخصیت سے بھی مزاح کی بات کی جاسکتی ہے بشرطیکہ ادب و احترام کی حدود سے تجاوز نہ ہو۔

بیمار کو کھانے پر مجبور نہ کریں

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اپنے مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کیا کرو، انہیں اللہ تعالیٰ کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ (بہیقی)

فوائد و مسائل:

1- مریض کے لیے صحت مند انسان والی غذا مفید نہیں ہوتی اس لیے انہیں بھاری غذا نہ دی جائے۔

جنہیں اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

5- ہر بیماری کا علاج موزوں ہے، یہ انسان کی محنت، سمجھ اور توجہ پر مبنی ہے کہ مریض کی بیماری کو سمجھے اور مناسب دوا کا انتخاب کرے۔

6- بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بوڑھاپا اللہ کا بنایا ہوا مستقل نظام ہے، اس لیے یہ اپنے وقت پر آتا ہی ہے۔ انسان کو جوانی کی قوتوں سے محروم ہونے سے پہلے نیکیاں کر لینی چاہئیں تاکہ بوڑھاپے میں حسرت و ندامت نہ ہو۔

7- خوش اخلاقی انسان کی ایسی خوبی ہے جس سے دنیا میں بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس لیے یہ اللہ کا عظیم احسان ہے۔

پرہیز کا بیان

حضرت ام منذر سلمی بنت قیس انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں نیم پختہ کھجوروں کے خوشے (رسی سے) لٹک رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے لے لے کر (کھجوریں) کھا رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کھانے کے لیے کچھ کھجوریں لے لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”علی! رک جاؤ۔ تم ابھی (بیماری سے اٹھے ہو اس لیے) کم زور ہو۔“

ام منذر رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چقدر اور جو پکائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”علی! اس میں سے کھاؤ یہ تمہارے لیے زیادہ مفید ہے۔“ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1- بیمار کو خوراک میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بیمار کو چاہیے کہ وہ چیز کھائے جو اس کے لیے مفید

2- نواب وحید الزماں خاں نے اس کا ترجمہ ”حریرہ“ کیا ہے۔ انہوں نے اس کی وضاحت یوں کی ہے ”حساء وہ کھانا ہے جو آٹے، پانی اور روغن سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں کبھی شیرینی بھی ڈالتے ہیں اور کبھی شہد، کبھی آٹے کے بدلے آٹے کا چھان ڈالتے ہیں اس کو قلبینہ کہتے ہیں اور ہندی میں حریرہ مشہور ہے۔“

(ترجمہ سنن ابن ماجہ حاشیہ حدیث ہذا)
فیروز اللغات اردو میں ”حریرہ“ کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں ”میٹھی اور گاڑھی چیز جو میدے کو کھانڈ میں گھول کر پکائی جاتی ہے۔“

3- قلبینہ کی ترغیب دیگر صحیح احادیث میں بھی موجود ہے۔

کلا دانہ (کلونجی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”کالے دانے میں سام کے سوا ہر مرض کی شفا ہے۔“

سام کا مطلب موت ہے اور کلا دانہ کلونجی ہے۔
کلونجی کے استعمال کا طریقہ

حضرت خالد بن سعد رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔

ہم لوگ سفر میں تھے۔ ہمارے ساتھ حضرت غائب بن ابجر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ راستے میں بیمار ہو گئے۔ ہم لوگ مدینہ پہنچے تو وہ (اس وقت بھی) بیمار تھے۔ حضرت ابن ابی عقیق رحمۃ اللہ (عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمن بن ابی بکر) ان کی بیماری پر سی کے لیے آئے تو ہم سے فرمایا۔

”تم یہ کلا دانہ (کلونجی) استعمال کرو۔ اس کے پانچ سات دانے لے کر پیس لو پھر زیتون کے تیل میں ملا کر ان کی ناک میں چند قطرے اس طرف اور چند قطرے اس طرف (نتھنوں میں) ڈالو کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ

2- اگر مریض کی طبیعت کھلنے پینے پر آمادہ نہ ہو تو سختی نہ کی جائے کیونکہ زبردستی کھلائی ہوئی غذا فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتی ہے۔

3- مناسب ترغیب کے ذریعے سے ہلکی پھلکی زود ہضم غذا دی جاسکتی ہے تاکہ قوت قائم رہے۔

4- ”اللہ تعالیٰ مریض کو کھلاتا پلاتا ہے۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں تندرست آدمی کی طرح کھانے پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قلبینہ کا بیان

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جب کسی کو بخار ہوتا تو آپ قلبینہ تیار کرنے کا حکم دیتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔“ اس سے

غم زدہ انسان کے دل کو سہارا ملتا ہے۔ اور بیمار کے دل سے رنج کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح کوئی عورت پانی کے ذریعے سے اپنے چہرے سے میل کچیل دور کرتی ہے۔“ (ترمذی)

مفید چیز

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نا پسندیدہ مفید چیز قلبینہ (حریرہ) کو اپناؤ۔“
ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جب کوئی بیمار ہو جاتا تو (حریرہ کی) ہنڈیا آگ پر چڑھی رہتی حتیٰ کہ (اس کا معاملہ) کسی ایک طرف لگ جاتا یعنی وہ فوت ہو جاتا یا شفا یاب۔

فوائد و مسائل :

1- قلبینہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔ ”وہ ایک رقیق کھانا ہے جو آٹے یا چھان (آٹے کی بھوسی) سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں بعض اوقات شہد بھی ڈالا جاتا ہے۔“ (السنن، ص ۱۸۷)

اثر (یا جنون) سے شفا دیتی ہے۔“ (مسند احمد)
فوائد و مسائل :

1- من اس قیدرتی خوراک کا نام ہے جو بنی اسرائیل پر نازل کی گئی تھی۔ وہ بیٹھے دانوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ وہ لوگ حسب ضرورت لے کر استعمال کر لیتے تھے۔

2- کھمبہ کو من اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ بھی بلا مشقت حاصل ہو جاتی ہے۔ کھمبہ کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے بعض قابل استعمال ہیں اور بعض نقصان دہ۔ ”کماہ“ مفید قسموں میں سے ایک ہے۔ آج کل مفید اقسام کی کھمبہ خود اگائی جاتی ہے جو غذا میں استعمال ہوتی ہے۔

3- کھمبہ کا پانی آنکھ کے امراض کے لیے استعمال کرنے کے بارے میں بعض علماء نے کہا ہے کہ اسے دوسری دوا میں ملا کر استعمال کرنا چاہیے، مثلاً ”اٹھ سرے میں کھمبہ کا پانی ملا کر گوندھ لیا جائے“ پھر اسے آنکھ میں لگایا جائے۔ بعض علماء کی رائے میں اس کا پانی نکال کر صرف وہی استعمال کیا جائے۔ (زاوالمعاد) صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اطباء کے مشورے سے آنکھ کی مختلف بیماریوں میں الگ الگ مناسب طریقے سے استعمال کیا جائے۔

4- عجمہ کے بارے میں اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح بخاری میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”جو شخص صبح کے وقت سات عجمہ مجھوریں کھائے اس دن اسے زہریا جادو سے کوئی (تکلیف یا) نقصان نہیں ہوگا۔“ (صحیح ال بخاری۔ 5768)



صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”یہ کالا دانہ ہر بیماری کی شفا ہے، سوائے اس کے کہ سام (ہی مقدر) ہو۔“
 میں نے کہا ”سام کیا ہے؟“
 انہوں نے فرمایا ”موت۔“

فوائد و مسائل :

1- بیمار کی بیمار پرسی کرتے وقت اگر بیماری کا کوئی مجرب علاج معلوم ہو تو مریض کے لواحقین کو بتا دینا درست ہے، تاہم غیر مجرب دوا کا مشورہ نہیں دینا چاہیے۔

2- علاج کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ ناک میں دوائی ڈالنا بھی ہے۔

3- کلو نجی کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ نے ”زاوالمعاد“ میں اختصار کے ساتھ کافی فوائد ذکر کیے ہیں۔ ڈاکٹر خالد بن زوی نے طب نبوی کے موضوع پر اپنی تصنیفات میں اس پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہے۔

شفا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ”دو شفا دہانی چیزیں اختیار کرو۔ شہد اور قرآن۔“
فوائد و مسائل :

قرآن سے جسمانی بیماریاں بھی دور ہوتی ہیں، جیسے سانس کے ڈھے ہوئے مریض کو سورۃ فاتحہ کا دم کرنے سے شفا ہو گئی تھی۔

کھمبہ اور عجمہ کھجور

حضرت ابوسعید خدری اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کھمبہ من کی قسم سے ہے۔ اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔ عجمہ کھجور جنت سے ہے اور یہ جن کے

جنید جمشید

شاہین رشید

”اس لیے کہ ہمارا مذہب یہ نہیں کہتا کہ آپ گوشہ نشینی اختیار کر لیں۔ ہمارا مذہب اسلام، اسلام کے دائرے میں رہ کر سب کچھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ دنیا کو تسخیر کرنے کا حکم جو رب دیتا ہے وہ اپنی مخلوق کو گوشہ نشینی کے لیے کیسے کہہ سکتا ہے؟“

”تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو ہی اسلام کی طرف راغب کرنا مشکل کام ہے؟“

”بہت مشکل کام ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کو کیا مسلمان کرنا۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہم مسلمان اسلام کی بہت سی باتوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں ان باتوں سے واقف کرانا ہے اور اس کام میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو ہم تو ان کے اولیٰ خادم ہیں۔“

”آپ نے ”جیو“ ٹی وی سے دینی معلومات پر مبنی پروگرام شروع کیا تھا۔ اس کا کیا ریسپانس ملا؟“

”بہت اچھا ریسپانس ملا تھا، کیونکہ ہمارے یہاں چاہے معلومات عامہ ہو یا دینی معلومات ہوں! ایسے پروگرام ٹی وی پہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ ہیں نہیں تو غلط نہ ہوگا، تو اس لحاظ سے ہمیں اس پروگرام کا بہت اچھا ریسپانس ملا تھا۔“

”اس پروگرام کو ہم بھی دیکھتے تھے اور اس بات کا مجھے شدت سے اندازہ ہوا کہ لوگوں میں دینی معلومات کی بہت کمی ہے۔ ایسا آپ نے بھی محسوس کیا تھا؟“

”بالکل کیا تھا۔ مطالعے کی کمی تھی، دینی معلومات کی کمی نظر آتی تھی۔ لیکن اگر ایسے پروگرام پیش کیے جاتے رہے تو لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔“

”آپ نے کہا کہ علم کی کمی ہے۔ کیا اسی وجہ سے ہم بے راہ روی کا شکار ہیں؟“

”بالکل۔ مذہب سے دوری، معلومات کا نہ ہونا۔“

صحافت کی فیلڈ سے وابستہ ہونے کے بعد بہت سی نامور شخصیات سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان سے انٹرویو کرنے کا بھی۔ ان ہی میں معروف شخصیت جنید جمشید بھی تھے۔ ان سے ملاقات تو نہ ہوئی، البتہ فون پر بات چیت بھی ہوتی تھی اور انٹرویو بھی کیا۔

برسوں پہلے ان کی بیگم عائشہ اور جنید جمشید کا انٹرویو کیا تھا، ہمارا ایک مشہور سلسلہ تھا۔ ”مشہور تو ہم بھی ہیں۔“ اس میں ہم نامور شخصیات کی بیگمات سے انٹرویو کرتے تھے اور اس مشہور سلسلے میں ہم نے ”عائشہ جنید“ کا انٹرویو کیا تھا اور جنید جمشید صاحب سے بھی گاہے بہ گاہے بات ہوتی تھی۔ ”کچھ یادیں“ کچھ باتیں“ ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔ اللہ تعالیٰ جنید جمشید کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

”گلوکاری سے نام کمایا۔ پیسہ بھی۔ پھر دین کی طرف آگئے، اچانک یہ تبدیلی کیسے آئی؟“

”دیکھیں جی۔ جب اللہ کی ہدایت کسی بندے کے لیے آجائے، وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اچانک تبدیلی نہیں آتی۔ انسان آہستہ آہستہ ہی راغب ہوتا ہے۔ پہلے رائے و تدبیر نہیں جانتا تھا۔ پھر رائے و تدبیر لگا۔ اچھا لگا، وہاں ایک بات سے بہت متاثر ہوا۔ نماز کی ادائیگی نے بہت متاثر کیا کہ نماز کی ادائیگی کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ پھر دین کی باتوں نے دل پہ اثر کیا اور سچ پوچھیں تو مولانا طارق جمیل کی رہنمائی میرے بہت کام آئی۔“

”لوگ دین کی طرف راغب ہوتے ہیں تو دنیا کی نعمتوں سے اور آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا؟“

عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی وردی اور ان کی عزت دیکھ کر میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں ایئر فورس میں جاؤں اور والد جیسی عزت پاؤں۔

”چھاتو پائلٹ بننا چاہتے تھے؟“

”جی۔ پائلٹ اور وہ بھی ”ایف 16“ طیارے ”کاپا ٹکٹ“ بس جنون کی حد تک شوق تھا۔ مگر میری بد قسمتی کہ میں پائلٹ نہ بن سکا۔ کیونکہ میری بینائی دور کی کمزور ہو چکی تھی اور اس کا پتا مجھے جب چلا جب میں نے کلائئر ہونے کے لیے ٹیسٹ دیے تھے۔“

”فہم تو بہت ہو اہو گا؟“

”ایسا ویسا۔ کتنے دن کسی کلام میں دل نہیں لگتا تھا۔ پھر والد صاحب کے کہنے پر ہی لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور میکنیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور پاک فضائیہ میں بطور کنٹرولر (سولین) کے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ یوں پاک فضائیہ میں جانے کی خواہش کسی حد تک پوری ہو گئی۔ لیکن جب میوزک کی طرف آ گیا تو پھر جا ب کو بھی خیر یاد کہہ دیا۔ فوراً ”نہیں جب اللہ نے عروج دنا شروع کیا۔“ ”گلوکار تو پیدا انٹی ہوتا ہے۔ آپ پر کب انکشاف ہوا کہ آپ میں یا آپ کے گلے میں سر ہے؟“

”یہ خود انکشاف نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کے ارد گرد کے لوگ احساس دلاتے ہیں کہ آپ کے گلے میں سر ہے۔ سر والا ہمیشہ کچھ نہ کچھ گنگنا مارتا ہے۔ تو مجھے بھی دوستوں نے احساس دلایا کہ میں گا سکتا ہوں اور لوگ مجھے ”راک اشار“ کہتے تھے۔ کالج یونیورسٹی کی مختلف تقریبات میں جب حصہ لینا شروع کیا تو لوگ مجھے بہت شوق سے سننے لگے تھے۔“

”میوزک گروپ بنانے کا خیال کیسے آیا؟“

”ان دنوں میوزک گروپ بنانے کا جیسے لوگوں کو کر رہا تھا۔ تو ہم دوستوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی ایک میوزک گروپ بنالیں۔ تب واسٹل سائن کے روحیل حیات اور شہزاد احسن نے مجھے لیڈ سنگر کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کر لیا اور یوں ہمارا گروپ ملک کے اندر اور ملک سے باہر اپنی پرفارمنس

ان باتوں کا نتیجہ ہی ہے راہ روی ہے۔ جب تک ہم اپنے مذہب کو نہیں سمجھیں گے، اچھے انسان کیسے بنیں گے۔“

”اس میں قصور کس کا ہے، اساتذہ کا؟ والدین کا یا اسکول میں پڑھائے جانے والے نصاب کا؟“

”میں تو سمجھتا ہوں کہ اساتذہ، والدین اور نصاب تینوں کا قصور ہے۔ نصاب تو ہم اور آپ ہی بناتے ہیں۔ ہم اور آپ اگر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر ہم تو صرف ڈیوٹی دیتے ہیں یا پھر صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ اجتماعی سوچ کا فقدان ہے۔ اگر ہم سب یہ ارادہ کر لیں کہ اللہ کے دین کو سیکھنے کے لیے جس قربانی کی ضرورت ہوگی ہم دیں گے تو اللہ تعالیٰ خود آپ کی مدد فرمائے گا۔“

”آپ تبلیغ پہ جاتے ہیں۔ زیادہ اثر کون لیتا ہے، بچے یا بڑے؟“

”دونوں ہی لیتے ہیں، لیکن بچے اثر بھی لیتے ہیں اور سیکھتے بھی ہیں اور جلدی سیکھتے ہیں اور بڑے بھی جنہیں مذہب کے بارے میں معلومات نہیں ہوتیں، ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔“

”دین کی طرف تو آپ کچھ عرصہ قبل ہی راغب ہوئے۔ گلوکاری نے آپ کو شہرت دی۔ ویسے بچپن کا کیا خواب تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟“

”جی۔ بچپن میں تو بچے بہت کچھ سوچتے ہیں کہ یہ بنیں گے، وہ بنیں گے۔ جوں جوں انسان یا بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی سوچ میں فرق آتا جاتا ہے، تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔“

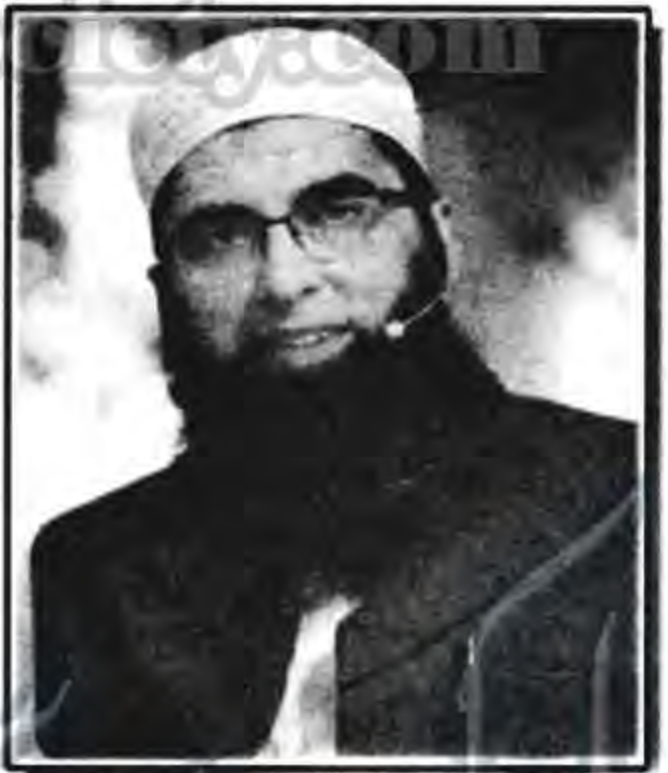
”مگر عموماً“ بچے اپنے بڑوں کو فالو کرتے ہیں۔ جیسے گھر میں کوئی ڈاکٹریا انجینئر ہے یا بینکر ہے یا فورس میں ہے تو بچے بھی اسی طرف راغب ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ ایسا تھا؟“

”یہ بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔ واقعی بچے اپنے بڑوں کو فالو کرتے ہیں۔ میرے والد جمشید اکبر خان پاکستان ایئر فورس میں گروپ کیپٹن تھے اور اس

”بالکل اتفاق کروں گا کہ اللہ کا کرم مجھ پر ہمیشہ رہا۔
ہاں میں پائلٹ نہیں بن سکا اور اس وقت کامیرون اور
افسوس کرنا شاید اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اس کے بعد میں
نے جو کام کیا مجھے ترقی و کامیابی ہی ملی۔ مثلاً میں نے
بڑی کامیابی کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ پھر جب
میوزک میں آیات اللہ نے بہت کامیابی دی اور جب
اللہ کی راہ پر نکلا تو بھی اللہ نے بہت نوازا۔ تو میں تو جتنا
بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

”جنید جمشید جب میوزک کی دنیا میں تھے جب
اللہ نے انہیں عروج دیا تھا تب بھی ان کا لہجہ نرم اور
گنگو شائستہ ہوتی تھی اور جب دین کے راستے پر نکلے
تب بھی ان کا یہی انداز تھا۔ جنید جمشید تین ستمبر
1964ء میں پیدا ہوئے اور 7 دسمبر
2016ء میں وفات پائی۔ حکومت پاکستان نے
انہیں ان کی زندگی میں ہی تمغہ امتیاز اور تمغہ حسن
کارکردگی سے نوازا اور انہیں لکس اسٹائل ایوارڈ بھی
ملا۔“

اللہ جنید جمشید کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت
میں اعلا مقام دے۔ (آمین)



کی وجہ سے مشہور ہوتا چلا گیا۔“

”آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ جب اللہ نے کسی
انسان کو شہرت، عزت اور دولت عطا فرمائی ہے تو وہ اس
سے ایسا کام ضرور کرواتا ہے تاکہ اسے یہ سب کچھ مل
جائے۔“

”جی۔ بالکل مانتا ہوں۔ کیونکہ سب کچھ اوپر والا
ہی کرتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو انسان ایک قدم
آگے نہیں بڑھا سکتا۔ قسمت مجھ پر مہربان ہوئی اور
میرا ”دل دل پاکستان“ اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ پھر یہی
قومی نغمہ میری پہچان بن گیا۔ یہ ہماری ایک اہم کا گانا
تھا۔“

”اس وقت کیا تاثرات تھے؟“

”جو تاثرات تھے انہیں لفظوں میں تو بیان کیا جا ہی
نہیں سکتا۔ اس گلے نے یا قومی نغمے نے مجھے راتوں
رات شہرت کی بلندیوں پہنچا دیا اور آپ دیکھیے گا کہ
میری یہی پہچان ہمیشہ رہے گی۔“

”آپ شاید ان چند خوش قسمت ترین لوگوں میں
سے ہیں کہ جنہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں
فائدہ ہی ہوا۔ ترقی ہی ملی۔ آپ اتفاق کریں گے اس
بات سے۔“



”وہ ماشاء اللہ سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔“
 ”دونے اور اتنی فٹ۔ ایک سرساز کرتی ہیں کیا؟“
 ”دیکھیں۔ ہماری فیلڈ ایسی ہے کہ ہمیں فٹ رہنا
 پڑتا ہے۔ لیکن یہ اسمارٹنس مجھے ورثے میں ملی ہے۔
 ہماری فیملی میں سارے ہی بہت دبیلے پتلے ہیں۔ اس
 لیے پیٹ بھر کر مزے سے کھاتی ہوں کہ مجھے پتا ہے
 میں نے موٹا نہیں ہونا۔ مگر مزے کی بات بتاؤں جب
 میری بیٹی پیدا ہوئی تو میرا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر
 تھوڑی سی ڈائٹ کرنے سے واپس اپنی جگہ آگئی۔
 اور ایک سرساز تو میں اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے
 کبھی کبھار کرتی ہوں۔“



”کھانا مزے سے کھاتی ہوں“ آپ نے کہا۔ تو کیا
 کیا پسند ہے۔ اپنے انگریزی کھانے یا پاکستانی دسی
 کھانے۔“

”اپنے انگریزی سے کیا مراد ہے۔ اپنے دسی
 کھانے کہیں۔ مجھے نہاری بہت پسند ہے۔ پلاؤ میری
 کمزوری ہے۔ اور چاولوں سے بنی ہوئی تمام ڈشز
 مجھے بہت پسند ہیں اور آپ نے پوچھا تھا کہ فٹ کیسے
 رہتی ہوں تو یہ بھی بتاؤں کہ مجھے گھریلو ٹولوں پہ بہت

شہناز رشید

بھروسا ہے اس لیے ان ہی پہ بھروسا کرتی ہوں۔“
 ”اب جبکہ آپ باقاعدہ آگئی ہیں انڈسٹری میں تو کیا

فلم میں بھی کام کریں گی؟“
 ”جی۔ بالکل کروں گی۔ لیکن اس کے لیے میری
 بھی کچھ شرائط ہوں گی۔ کہ میں بولڈ کروں اور آسٹم
 سوئگ نہیں کروں گی۔ میں آرٹ موویز کی طرح کی
 کوئی مووی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہیرو۔ کون ہونا چاہیے؟“
 ہنستے ہنستے۔ ”حسن“ (میاں صاحب) میں اپنے
 شوہر حسن کے ساتھ دو سیریلز بھی کر چکی ہوں۔ فلم بھی
 ان ہی کے ساتھ کرنا چاہوں گی۔

”عموماً ہمارے یہاں فنکارا میں اتفاقاً آتی ہیں۔“

دستک
دستک
دستک

منیتا مارشل

”ہیلو۔ کیسی ہیں؟“ منیتا مارشل سے کبھی کبھی
 ہیلو ہائے ہو جاتی ہے
 ”جی۔ ٹھیک۔“

”کیا مصروفیات ہیں۔ اور کتنے عرصے کے بعد
 ڈراموں میں واپسی ہوئی ہے؟“

”مصروفیات تو ماشاء اللہ کافی ہیں اور ویسے تو شادی
 کے بعد میں نے کافی کام کیا ہے۔ البتہ بچوں کی وجہ سے
 تھوڑا گپ آیا۔ تقریباً سات سال کے بعد اب میں
 باقاعدہ اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ اب گپ نہیں دوں
 گی۔“

”گڈ۔ ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM



آئیں۔

یا سرعباس

(آر جے ایف ایم 101) فزیو تھراپسٹ

”کیا حال ہے جی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”ایف ایم اور آپ کی فزیو کیسی چل رہی ہے۔“

”بہتر ہے۔ آپ سب کی دعاؤں سے۔“

”ماشاء اللہ آپ ایک کامیاب فزیو تھراپسٹ ہیں۔“

ہر طرح کے مریضوں سے پالا پڑتا ہو گا۔ کوئی ایسا مریض

بھی ملا جو بہت غریب تھا؟“

”جی۔ بالکل ملا۔ مگر میں بتانا نہیں چاہوں گا۔“

اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ایسے مریضوں کی بہت

دعا میں لگتی ہیں۔ بہت سے سفید پوش اور غریب

لوگ ہوتے ہیں جو انورڈ نہیں کر سکتے مگر میں پھر بھی

”فزیو تھراپی بہت ایمان داری اور جانفشانی کے ساتھ

کرتا ہوں۔“

”گڈ۔“

”جی میں ”تو پرافٹ نولاس“ کی بنیاد پر کام کرتا

ہوں۔ پتا نہیں۔ اللہ کس کے حوالے سے اور کس کی

دعاؤں سے رزق دے رہا ہے۔“

آپ بھی اتفاقاً ”آئیں؟“

”جی۔ بالکل اچانک اور اتفاقاً“ آئی۔ میری بڑی

بہن ماڈل تھیں، ایک دن ان کا برائیڈل سیشن شیڈول

تھا، مگر طبیعت کی خرابی کے باعث وہ نہیں جاسکیں، تو

وہاں کے منتظمین نے مجھے کہا کہ آپ ان کی جگہ شوٹ

کروالیں۔ یہ میرا پہلا فوٹو سیشن تھا۔ اور چونکہ اللہ

نے مجھے اس فیلڈ میں لانا تھا، تو شوٹ اچھا ہو گیا۔ بس

پھر تو آفرز کی جیسے لائن لگ گئی۔“

”معاوضہ بھی بہت اعلیٰ ملا ہو گا؟“

”ارے نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ چونکہ

اسٹوڈنٹ تھی تو اس وقت کے لحاظ سے پندرہ سو بھی

میرے لیے ایک بڑا معاوضہ تھا۔ تو بس پندرہ سو کو

انجوائے کیا۔ اور پھر جوں جوں کام کرتی گئی معاوضہ

پرکشش ہوتا گیا۔“

”شہرت کا مزہ ہے؟“

”شہرت کا تو بہت مزہ ہے۔ جب لوگ آپ کو پہچان

کر عزت دیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ اتنے

لاکھوں کروڑوں میں لوگ ہمیں ہمارے کام سے

پہچان رہے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی لت ہے کہ ہم

چاہیں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتے اور شوہر کو

چھوڑ ہی نہیں سکتے۔“

”آپ نے ایک مسلمان سے شادی کی، کبھی

پچھتاوا ہوا؟“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو

پسند کرتے تھے اور تب ہی شادی کی۔ بہت ہی اچھی اور

ابھی ازدواجی لائف گزار رہی ہوں۔ میرے بچے اور

میرا شوہر میری زندگی ہیں۔“

”شوہر کی وجہ سے کبھی کبھی غلط نیوز بھی آجاتی

ہیں۔ ایسا ہی ہے؟“

”جی۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لوگ

کسی کی بی لائف سے خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے

غلط باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔“

”چلیں جی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے“

بیارے بچوں کے لئے

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے

ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”بھئی ایسا ہوا کہ لوگوں نے کام کروالیا۔ کہا بعد
میں لے جائے گا اور پھر میسج دیے ہی نہیں؟“
ہنتے ہوئے ”بہت جگہ ایسا ہوتا ہے۔ ہنگے، ٹنگے
نہیں ملے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اور اللہ
تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے میری کسر پوری کر ہی دیتا
ہے۔“

”ککش کیا ہے اس فیلڈ میں اور ریڈیو کی فیلڈ
میں؟“
”دیکھیں انسان اسی شعبے میں آتا ہے جو اسے کام
کے لحاظ سے اور مال کے لحاظ سے پرکشش لگتا ہے۔
فیزو تھراپی میرا پروفیشن ہے۔ خدمت خلق ہے اور
ریڈیو میرا شوق، میرا جنون ہے اور حکومت وہ ہی اچھی
ہوتی ہے جو دلوں پہ راج کرے۔ لہذا۔۔۔ میں چاہتا
ہوں کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں تو لوگوں کی
اکثریت یہ کہے کہ ”یاسر عباس“ ہمارے دلوں پہ
حکومت کرتا تھا۔ اور ریڈیو میں ککش یہ ہے کہ لوگ
بنا دیکھے آپ سے محبت کرتے ہیں اور یہ تعلق بڑا
خوب صورت تعلق ہے۔“
”کیا ریڈیو اسی ذوق و شوق کے ساتھ بنا جاتا ہے،
جس طرح کسی زمانے میں بنا جاتا تھا؟“

”جی میں آپ کو بتاؤں کہ چیزیں اسی وقت اپنی
اہمیت کھوتی ہیں جب ان پر توجہ نہ دی جائے۔ ریڈیو
اگر چند کاموں کے لیے محدود رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہی
ہے کہ اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اب اس کا استعمال
اب صرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ ”خبریں سن لیں لائٹ
نہیں ہے تو کنٹری سن لیں اور دوران ڈرائیونگ گانے
سن لیں۔“

”کانفی ایف ایم چینل کھل گئے ہیں۔ کہیں اور
جانے کا خیال آپ کو آیا؟“
”دیکھیں جی۔ بہتر تو یہی لگتا ہے کہ دوسرے آپ
کو خود بلا میں، اب خود جا کر کہنا اچھا نہیں لگتا اور میں
ایف ایم 101 میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔
اس لیے کہیں اور جانے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM



”ٹی وی سے کیا ناراضی ہے؟“
 ہنستے ہوئے۔ ”کوئی ناراضی نہیں ہے اور ایسا نہیں
 ہے نہ میں ٹی وی پہ نہیں گیا۔ سماعی وی کے پروگرام
 ”بنو سماعی وی کی آواز“ میں بہ حیثیت جج کے فرائض
 انجام دیے ہیں اور یہ اس دور کی بات ہے جب ”مایا

خان“ میزبان ہوا کرتی تھیں اور تقریباً ”تین سال میں
 نے جج کے فرائض انجام دیے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ
 کیمروں سے میری دوستی نہیں ہے۔“

”کسی اور پروگرام یا ڈراموں کا دل نہیں چاہا؟“
 ”دل تو بہت چاہا۔ مگر جج پوچھیں تو ہمارے یہاں
 ”گلابی سسٹم“ بہت زیادہ ہے اور اسی وجہ سے بروقت
 چانس نہیں ملتا۔ یا ملتا ہے وہ چاہے کوئی اینکوری ہو۔ بیوز
 کاسٹر ہو یا ڈراما آرٹسٹ اور ویسے بھی یہ فل ٹائم جاب
 ہے اور میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ میں انتظار
 کر سکوں۔ مگر اگر اچھی آفر ہوئی تو انکار نہیں کروں
 گا۔“

”ہے جو ہمارے ملک کو میلی نظر سے دیکھتے ہیں۔“
 ”یقیناً“۔ گانا تھوڑا آپ کے پہلے گانے سے
 مختلف ہو گا؟“

”مختلف۔؟ بلکہ بہت مختلف ہو گا۔ میرے پہلے
 والے گانوں سے بہت مختلف اور آپ دیکھیے گالو گوں
 کو ہمارا گانا بہت پسند آئے گا۔“

”ٹیم ورک ہو گا یا اکیلے؟“
 ”ٹیم ورک ہے۔ ایک بینڈ کے ساتھ مل کر کام
 کر رہا ہوں اس گانے پر۔“
 ”چلیں ہیٹ آف لک۔“

”یا سر۔ کوئی ایسی شخصیت آپ کی زندگی میں ہے
 جس کے آپ بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ انہوں نے
 آپ کا بہت ساتھ دیا۔“

”جی بالکل ہیں۔ ڈاکٹر فیصل یاسین صاحب جو
 میرے استاد بھی ہیں انہوں نے فزبو تھراپی میں میری
 بہت اچھی تربیت اور ٹریننگ کی۔ جن کی وجہ سے میں
 آج ایک کامیاب فزبو تھراپسٹ ہوں۔“

علی گل پیر
 (سائیں تو سائیں فیم)



سرووق کی شہسپت

ماڈل ----- ماہ نور

میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ----- موسیٰ رضا

”کیسے مزاج ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کیا نیلا رہے ہیں؟“

”ممووی تیری“ کے ساتھ کچھ نیلا رہا ہوں۔ ان
 شاء اللہ اس فیلڈ میں جلد واپسی ہوگی۔

”کیا ہو گا اس گانے اور ویڈیو میں؟“

”اس میں مجھے کئی سینئر گلوکاروں اور سینئرز کی
 سپورٹ حاصل ہے۔ اس گانے میں سب کی کا اس لی

خوب ایمل رضا خدا کرے آپ کا قلم یونہی سرسبز و شاداب رہے اور جبران میاں کو بتائیے گا کہ وہ جو غریب راپینزل جیسے بالوں والی ہوگی وہ بس ان ہی ”جوگی“ ہوگی۔ ہانڈی روٹی کا وقت بال سلجھانے میں ہی لگ جانا ہے اور سارے روماس کا بیڑا غرق۔

”شہزاد“ خوب صورت اضافہ آغاز سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ منزل آسمان سے آگے ہے یقیناً ”مزید ارسا ناول پڑھنے کو ملنے والا ہے۔“

”کیپٹن صاحب“ گھر آکر بھی کیپٹن ہی رہے۔ ان کی اصل میں تربیت ہی ایسی ہو چکی ہے کہ ”جس پر بھی ڈالی بری نظر ڈالی۔“ (آپ ذرا بری کاٹ کر ”شک بھری“ نظر لگا لیں ہم نے اس لیے نہیں لگائی کہ شاعر کا دل دکھے گا ایک دھاگا باندھنا تھا۔ چاریوں نے سارے گھر کو دخت میں تھوڑی ڈالنا تھا۔

”یادگار سین“ میں سیر صاحب کا بھیجا گیا اغوا کار نمبروں بزدل تھا ایسے ہوتے ہیں اغوا خدے بھٹی ”شہر نطا“ کے لیے آئیں، ذرا سی خطا یہ ہوئی کہ اکتوبر کا شمارہ لینے وقت پر نہ پہنچ سکے بعد میں ملا ہی نہیں۔

دین میں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں

ج پیاری ثوبیہ! آپ پہلے تو یہ بتائیں کہ انسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیے۔ آپ مزاح پر توجہ دیں۔ آپ میں صلاحیت ہے جبران میاں راپینزل جیسے بالوں والی گواتی تلاش کے بعد ڈھونڈ کر لائیں گے تو اس سے ہنڈیا روٹی تو نہیں کرائیں گے نا۔ خود چوٹھا جھونکلیں گے یا پھر ملازم رکھیں گے۔

وہ دین میں بیٹھ کر آپ کے خیالات کی روانی کا یہ عالم ہے تو اگر آپ ٹرین میں بیٹھ کر لکھتیں تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ خط کیسا ہوگا۔

کنیز فاطمہ نے جڑا نوالہ سے لکھا ہے

تین چار ماہ پہلے میں نے دو افسانے بھیجے تھے۔ عشق آتش اور انکم سپورٹ کے نام سے۔ پلیزان کے بارے میں بتادیں۔

ج پیاری کنیز! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ کوشش جاری رکھیں۔ انکم سپورٹ کے لیے معذرت۔ عشق آتش ابھی پڑھی نہیں



خط بھجوانے کے لیے چاہا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو ہمارے پیارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط کشن گڑھ سے ثوبیہ نور کا ہے، لکھتی ہیں

ہمارے ہاں شادیوں پر اکثر ایک گانا گایا جاتا ہے ”خط لکھنا تے لکھ کے میں پاڑ دینی ہاں“ تو میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ خط لکھنا کوئی بازیچہ اطفال تو ہے نہیں کہ بندہ کھیل کھیل میں لکھ دے پھر پھاڑ دے۔ مگر اب تجربے کے بعد احساس ہوا ہے کہ ان کا پوسٹ آفس بھی ہماری طرح دسترس سے دور ہو گا تو بے چاری خط جب پوسٹ نہیں کر سکتی تو غصے میں آکر پھاڑ دیتی ہوگی تو بس غصے میں آئے بنا ہم نے بھی ایسے ہی بہت سے خط پھاڑ ڈالے۔

میں ”تم اور محبت“ پڑھ کر سب سے زیادہ لطف اندوز ہوئے۔ بہت عرصہ بعد کھل کر ہنس لیا پھر رو بھی لیا۔ بہت

پڑھ کر بہت دل دکھا۔ کوثر خالد جڑانوالہ اور ”ثمینہ اکرام“ کراچی کے خط کی منتظر رہتی ہوں اللہ ثمینہ جی کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔ کوثر جی کے خیالات بہت اچھے لگتے ہیں۔

بچ پیاری راحیلہ! اتنا تفصیلی اور باریک بینی سے کیا گیا تبصرہ اچھا لگا۔ ہم اپنی کسی قارئین کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے۔ چاہنے والوں کی باتوں کا کیا برا ماننا۔ اور سرورق کے لیے صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی تبدیلی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی آپ کی خواہش بھی پوری کر سکیں۔

رہنما چوہدری نے مدد کے سے شرکت کی ہے

2 جنوری کو بھانجے ولیم سے واپسی پر بیٹے سے کہا کہ رحمان بک ڈپو صبزیاں پر گاڑی کو ذرا بریک لگانا۔ کہا تو انسپکٹر صاحب (بسبند جی) سے ڈرتے ڈرتے ہی تھا لیکن گاڑی بھی رک گئی اور بیٹا ایک منٹ میں ہی ڈائجسٹ کے ساتھ واپس آیا تو کتنی خوشی ہوئی، ہتا نہیں سکتی۔ ٹائٹل یہ نظر دوڑائی۔ بہت خوب صورت سرورق اور فیورٹ ماڈل جو ایک ماہ شعاع پہ تو دوسرے مہینے خواتین پہ نظر آتی ہیں۔

ہمارا نام سروے میں شامل نہیں۔

ہمیں خبر ہے سب تعبیریں ہاتھ نہ آتی بریاں ہیں پھر بھی جاگتی آنکھوں دیکھے سننے اچھے لگتے ہیں

بہر حال سروے بہت پسند آیا اور سروے کے شروع میں دیا گیا شعر تو بہت ہی اچھا لگا۔ پہلے خط میں ہی اپنا نام دیکھتے ہوئے ناقابل بیان خوشی محسوس ہوئی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری اور ایمان افروز ہندھن میں نازیہ علی اور عدنان علی کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ صائمہ جی اور شہزاد شہزاد نے قدموں کو اس طرح زنجیر کیا کہ اسے پڑھے بنا آگے بڑھایا نہیں گیا۔

شازیہ الطاف ہاشمی کا افسانہ یہ رشتے یہ ناٹے ایک جیتی جاگتی حقیقت جس سے آشنائی رشتوں کی تبدیلی کے بعد ہی ہوتی ہے۔ عذہ خالد کے یادگار سین نے ذہن کو ہلکا پھلکا کر دیا۔ بہت خوب صورت تحریر نے بہت محفوظ کیا۔ ٹویہ جنیں گل کا افسانہ بہترین لفظ بہترین پرکاری کے ساتھ گویا موتیوں سے تصویر بنائی گئی ہو بہت متاثر کن تھا۔ شہ

راحیلہ عالم نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں ٹائٹل اچھا تھا۔ یسے آپس کی بات ہے کہ اگر شعاع اور خواتین پر صرف نام لکھا ہو اور سرورق پر کچھ نہ ہو تو بھی اس کے لاکھوں کروڑوں پر ستار پھر بھی خریدیں گے۔ آزما کر دیکھ لیجئے۔ ہمیں اس تصویر کی وجہ سے ہی بڑی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں نبی وی دیکھتی نہیں۔ تصویر سے میوزک سے پجرتی ہیں مگر کیا کریں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ دل سے بہت مجبور ہیں بہت محبت کرتے ہیں۔ چھوڑ نہیں سکتے کبھی الٹا کرتے ہیں کبھی کور چڑھاتے ہیں۔ فہرست یہی پہلی شعاع حمد و نعت دل میں اتر گئیں۔

”پارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں“ تو جواب ہی ہمیں۔ نازیہ علی اور عدنان علی کا بندھن اچھا لگا جب تجھ سے تا نا جوڑا میں س۔ ج۔ پ کا پڑھ کر یہ افسوس ہوا کہ لڑکی کی ماں نے ہی جھگڑے شروع کیے حالانکہ ماؤں کو بہت سمجھ داری سے کام لینا چاہیے۔ تاکہ ان کی بچیاں سکون سے رہ سکیں۔

اب لڑکیوں کو میڈیا نے اتنا تیز کر دیا ہے کہ اب تو ساس سر مظلوم اور دیور مند خاموشی کی تصویر نظر آتے ہیں۔ پتا نہیں ایسی ساس اتنی عجیب مندیں کہاں پائی جاتی ہیں اور ایسی معصوم بہویں بھی نظر نہیں آتی ہیں۔

”یادگار سین“ عذہ خالد کا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ پال ساز میں بیچاری نگار کو چھڑ مارنے پر اتنی بری طرح تھکتے ہوئے بتایا گیا لڑکیوں کو اس سے یہ سبق ملا ہو گا کہ اپنے کام سے کام ہی رکھنا چاہیے ایسے ویسوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے اور اس میں ہیروئن صاحبہ جو توں اور چپلوں سے پیٹ رہی ہیں۔

ٹویہ حبیب گل کا ”سوچنے کی بات“ اچھا لگا۔ حقیقت سے قریب تھا۔ نایاب جیلانی کا ”شہر خطا“ بہت اچھا ناول ہے۔ انادیا کی حرکتیں پڑھ کر روح تک کانپ جاتی ہے۔ ماورا خان کا ”کمال ضبط“ اچھا تھا صبر اور شکر کا سبق۔ عفت سحر طاہر کا ”خواب شیشے کا“ بہت پیارا ناول ہے۔ فوزیہ اشرف کا ”فیصلہ“ اچھا لگا واقعی بزرگ بہت سمجھ داری سے فیصلہ کرتے ہیں۔

”نکی جٹی ہاں“ مصباح علی سید کا کھل ناول بہت اچھا تھا۔ ایمل رضا کا میں محبت اور تم بہت بہترین۔ ایمل رضا بہت اچھی رائٹر ہیں ربیعہ طارق کا افسانہ ”صدقہ“

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

ہے۔ نوال گھمن کا عمر سعید کے بارے میں لکھا بڑھ کر
آنکھیں اشک بار ہوئیں۔ بہت اچھے طریقے سے انہوں
نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

خط آپ کے کوثر صاحبہ میں کہاں چھاپے مار سکتی
ہوں۔ یہ بہت کبھی آپ ہی کر لینا۔ میں تو زنجیروں میں
جکڑی ہوں اور زنجیریں آسانی سے کہاں ٹوٹتی ہیں۔
تاریخ کے جھوکوں سے بھی اچھا تھا۔

جب تجھ سے ناٹاں۔ ج۔ پ تمہاری عظمت کو سات
سلام۔ جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حقیقتاً "اس ماہ
مزہ آیا ہے" واہ کیا جی دار خاتون ہیں آپ تھپڑ کا جواب کے
سے دیا نل خوش کہتا اے جناب یہ مزاح کا ترکا آپ نے
نود لگایا تھا یا ادارے کا کمال ہے۔ میں نے تو تین چار بار
اس کو بڑھا ہے اور داودی سے محترمہ کو شازی کہتی ہے
میری طرف سے بھی سلام کہنا کہ ہم تو دن رات گھر کے
لئے محنت کرتے ہیں۔

پھر بھی سر کے تاج جو نا اٹھانے میں تاخیر نہیں کرتے
(مخاوراً "ما کہا ہے جو تے کا) سچ سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔
ج پیاری فوزیہ! آپ کی والدہ کی صحت کے لیے دعا گو
ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ ان کا سایہ آپ کے سر پر
سلامت رکھے۔ اور یہ باپ کی باتیں نہ سوچا کریں۔ اللہ
تعالیٰ آپ کو دو جہانوں کی خوشیاں اور آسانیاں عطا فرمائے
آپ ہنسی مسکراتی ہی اچھی لگتی ہیں۔

بصرہ ہمیشہ کی طرح بے ساختہ اور جامع ہے اور نا آجوزا
ہے میں مزاح کا ترکا ہم کیوں لگاتے۔ ہماری قارئین کسی
سے کم ہیں کیا؟

سیدہ گلشوم نے لکی مروت کے پی کے سے لکھا ہے

ہماری ایجوکیشن ایم اے عربی ہے اور ساتھ عالمہ کا درجہ
بھی حاصل ہے۔ لکھنا پڑھنا چونکہ بچپن سے ہمیں گھنٹی
میں پلایا گیا تھا اس لیے جیسے ہی اردو کو سیکھا۔ کتابیں پکڑیں
اور خون بن گیا۔ شعاع نے سخت ٹھیس پہنچائی دل کو
کیونکہ ہم نے سب سے پہلے شعاع میں اپنا اظہار خیال
بیجا ایک بار نہیں 100 بار لیکن ہر بار ہمیں ناامید کیا گیا۔
شعور کی منزل سے بہت پہلے جب ہم (اردو سے
ناواقف تھے) یعنی کہ ہماری مادری زبان تو پشتو ہے ہم
کتابیں دیکھتے اور خوش ہوتے۔ بچپن سے اس بات کے
دلدادہ تھے کہ ادب کی مجلسوں میں حاضر ہوں

خطا بہت اچھا شیچو بہترین ہے۔ اور اٹاں کی کمال ضبط
واہ اسم ربانی۔ خواب شیشے کا رکافات عمل شروع ہو گیا۔
رقص نکل میں شکر ہے کہ کہانی کچھ آگے بڑھی۔ ایمل
رضا کا "محبت میں اور تو" ناول پڑھا اور بس ڈائجسٹ رکھ دیا
اب کچھ پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔ کئی دفعہ روئی کئی دفعہ
ہنسی۔ فوزیہ اشرف کا افسانہ بہت خوب صورت فیملی
نزاکتوں کو بیان کرتی ہوئی حقیقت کی عکاسی تھا۔

ج پیاری رہ جانے! آپ یقین جانیں کہ ہم آپ لوگوں کی
بیمتی رائے بہت محبت اور توجہ سے بڑھتے ہیں۔ خطا شائع نہ
ہو تو ملال نہ کیا کریں۔ ہماری مجبوریوں کو مد نظر رکھا کریں۔
ری بات اشعار کی تو وہ شعبہ انجارج کی صوابدید پر ہے۔
ویسے ہمیں غم دوراں سے زیادہ غم جاناں والی شاعری اچھی
لگتی ہے۔ دعاؤں کے لیے ممنون ہیں۔

فوزیہ شمرٹ ہانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے
شریک محفل ہیں لکھا ہے

سرورق پازیب ہنسی ماڈل اچھی لگی دسمبر ہمیشہ سے جانی
دشمن کی طرح لگا جو کہ خاموشی سے وار کر جائے۔ آپ بھی
دعا کیجئے گا میری امی صحت مند زندگی گزاریں۔ اور مجھے میرا
خواب شیشے کا نمیر آفتدی تو بڑا بزدل نکلا۔ بدلے کے
لیے ایک لڑکی کو استعمال کیا۔ مجھے تو لگتا ہے موجد ہی
نجات دہندہ ہو گا مہراہ کے لیے۔

شعاع کا دوسرا ناول یادگار سبق۔ مزاح سے بھرپور
تحریر مگر مختصر کیوں افسانہ سمجھ کے بڑھ لیا حقیقت میں ایسی
دیدہ دلیری لڑکیوں کو سوٹ نہیں کرتی۔ جس بابا ناٹپ ہیرو کی
درگت بنائی تھی وجہ سے نے کہیں وہ ہاپوں سعید یا پھر فیصل
قریشی تو نہیں تھا پس وہ دونوں اسکرین کی جان نہیں چھوڑ
رہے۔ مکمل ناول ایمل رضا نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس
تحریر نے بے تحاشا ہنسیا ہے۔ قسم سے ایسی مزاجیہ تحریر ہر
ماہ شامل کریں۔ ایمل رضا کی کیستہرین پاکستان کے کسی
امرے کی بی جملو ہی لگی۔ اس تحریر کا مہیج اچھا تھا۔ کام
کوئی بھی ہے اسے حقیر نہ سمجھا جائے اور کام کرنے والوں
کو۔ جملوں میں نوک جھونک اور ٹاک ٹاک کے ٹوکے
(طنزیہ) باتیں تھیں۔ ہنس ہنس کر رہا تھا۔

بندھن میں نازیہ علی سے ملاقات اچھی لگی۔
"کہہ جاناں میں کون" ہائے سب نے کتنے اچھے
جوابات دیے۔ کوثر خالد ماحول ہی انسان کہ اچھا رہا بنانا

ٹائی پڑ گئی۔ ایمل اپنی مخصوص تشبیہات اور الفاظ سے دل میں ساکنیں تو مصباح۔ اللہ جانے یہ کیا چیز ہے انتہائی موڈی۔ جیسا موڈ ویسا ہی قلم جمایا۔ ویل ڈن ایمل، شاہاش، مصباح خوش رہو۔

اس ماہ ناولٹ ”شہر خطا“ کچھ سو سو لگا، پچھلی قسط جیسا نہیں تھا، البتہ دو سرائی ناولٹ عزہ خالدہ کا یادگار سبق بہت زبردست، صدقہ بہت بہترین اور سب افسانوں پر نمبر لے گیا۔ اس بار قارئین سے سروے بہت زبردست تھا۔

مناز یوسف اور کوثر خالدہ کے جوابات بہترین لگے تھے۔ ج پیاری ظاہرہ! ہم ہر ممکن احتیاط کرتے ہیں اور ہمارا سفر اس سلسلے میں بہت سخت ہے لیکن کبھی بشر ہونے کے ناطے نظر چوک جاتی ہے اور اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پرچا آنے کے بعد جب ہم نے دیکھا تو ہمیں بھی سخت کوفت ہوئی تھی۔ بہر حال آئندہ مزید احتیاط رکھیں گے۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ امتل آپ کی پھپھو کو سلام کہہ رہی ہیں۔

چوک سرور شہید سے بنت حوا لکھتی ہیں

آج کل کہانیوں میں ہر چیز دکھائی جاتی ہے معمولات وغیرہ۔ مگر افسوس کہ نماز مقصود ہے۔ کیا ہو گیا ہے ہماری مصنفین کو۔ قارئین کہانیوں کو بہت فالو کرتی ہیں۔ جب ”جنت کے پتے“ کی پردے والی لائین پڑھتی ہوں تو پتے اختیار ہاتھ اپنے چہرے پہ جاتا ہے، پردے کی تجدید ہوتی ہے۔ یاد دہانی ہوتی ہے کہ میں بھی کرتی ہوں مجھے بھی کرنا چاہیے۔ ایک دن ”نمل“ پڑھنے لگی۔ وہاں نماز کا ذکر آیا تو مجھے خیال آیا ابھی میں نے بھی نماز پڑھی ہے۔ تو چاہیے کہ کہانیوں میں ہیروئین کے معمولات میں کم از کم نماز کو نو دکھانا چاہیے پلیز اداؤں کے بجائے دعاؤں کی اہمیت پر زور دیں۔ قسمت تو دعاؤں سے بدلتی ہے۔

بنت حوا! کسی بھی بات کی حکمران اور بے محل نصیحت و تبلیغ اثر کھودیتی ہے۔ ہم کہانیوں میں اخلاقیات کا خیال رکھتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی پیغام یا سبق ہو لیکن ڈائریکٹ تقریر نہیں بلکہ قارئین خود اس کہانی کو پڑھ کر اخذ کریں، ویسے آپ کا خط پڑھ کر ہمیں سچ سچ حیرت ہوئی ہے کیا پرچے میں مزید تبلیغ و نصیحت کی نجاش ہے؟

شعاع اجنبیوں کے لیے چراغ

اور ادبوں کے لیے سرتاج

شعاع نے اپنی لازوال تحریروں اور اپنے الفاظ کے موتیوں سے ہمیں مالامال کر دیا۔ شعاع کی خاطر ہم نے کتنی تکالیف جھیلیں وہ الگ داستان ہے، بہت مار کھائی ایک دو 10 نمبر کے چپل وہ بھی چپتی دھوپ سخت گرمی میں بڑے مزے سے کھاتے (واہ مزا آگیا) ہی ہی ہی۔

ج پیاری بیدہ! سچ ہمیں یہ آپ کا سہلا خط ملا ہے۔ اور آپ کی یہ نادر و نایاب تشبیہات پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ غالباً یہ سب پشتو زبان کی ہیں۔ افسوس کہ ہم اتنی مینٹی زبان سے نابلد ہیں۔ دعاؤں کے لیے بہت ممنون ہیں۔ جگہ پانے کے لیے شکایت کا دفتر نہیں، تبصرہ ضروری ہے۔ اور ہاں آپ کا سروے اس وقت موصول ہوا جب پرچے کو مارکیٹ میں آئے ہوئے بھی چار دن گزر چکے ہیں۔

امید ہے آئندہ کسی شمارے پر ایسا ہی معصومانہ اور

بے ساختہ تبصرہ پڑھنے کو ملے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

اور یہ 100 بار اظہار خیال کس پتے پر بھیجا تھا۔ ہمیں تو ایک بار بھی آپ کا اظہار خیال موصول نہیں ہوا۔

ظاہرہ عثمانیت نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

اس بار میں حال چال پوچھنے کے بجائے ڈائریکٹ اپنا بتاؤں گی۔ کہ اس بار شعاع کی وجہ سے جو تک میری ہوئی ہے۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ میری پھپھو اتنے سال بعد امریکہ سے آئی ہیں۔ ایسے ہی باتیں کرتے کرتے شعاع اٹھا لیا۔ اور پہلا صفحہ ہی ”رخصت“ کا نکلا۔ میری عزت کا فالو وہ بنوانے کے لیے!

پھپھو نے پڑھتے ہوئے مجھے دوبارہ دیکھا۔ اور پھر سرورق پر۔ شاید رسالے کا نام پڑھنے کے لیے۔ رسالہ بند کر کے، تکیہ کے نیچے اور ڈائٹا میں بے حد شرمندہ ہوئی۔ جلدی سے خفت مٹانے کو ”میری محبت اور تم“ ”نکی جی ہاں“ دونوں ہی آگے پیچھے لگے ہوئے ہیں نکال کر ان کے سامنے کیے۔ پھر کہیں جا کے میری عزت کا ہستا فالو وہ جی ہوئی سخت آئس کہیم میں بدلا۔ پھپھو بھی خوش ہوئیں۔ اس بار ایمل رضا کا ”میں محبت اور تم“ مصباح علی کا ”نکی جی ہاں“ دونوں ناولٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ جیت جانے کے لیے اور میں فیصلہ نہیں کر پائی کہ کون سا جیتا۔

تمام رائٹرز بہت اچھی لگتی ہیں سب ہی اپنی جگہ بہت اچھا لکھتی ہیں نئی پرانی تمام رائٹرز۔ آئی! نمل وہ واحد کہانی ہے جو کہ میں ہر ماہ پڑھتی ہوں اس کے علاوہ نبیلہ عزیز کی ”رقص بگل“ بھی۔ نبیلہ! اللہ آپ کی پریشانیوں ختم کرے۔ آپ آئیہ رزاقی ہمارے شہر میں کہاں رہتی ہیں اگر اجازت دیں تو ایڈریس بھیجیں اتنی اچھی رائٹر ہمارے قریب ہیں اور ان سے ملاقات نہ ہونا ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ آئی سائہ رضا، نمرہ اور سمیرا یہ وہ بہرے ہیں جو ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے، پلیزان سے کہیں کہ وہ ہمیں نہ چھوڑیں۔ نعیمہ ناز، راشدہ رفعت، اور شینہ عظمت سے ناول اور کھل ناول لکھو امیں اور زہرہ ممتاز سے میرا خیال ہے کہ یہ اچھا لکھ سکتی ہیں۔

ج پیاری مریم! خواہمیں اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ پر چاہا ہر ماہ نہیں پڑھتیں البتہ ہر ماہ خریدنی ضرور ہیں۔ اور وجہ اس کی آپ کی بڑی بہو ہونے کے ناتے مصروفیت ہے۔ ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ پرچا آپ بے شک پورا نہ پڑھیں لیکن سلسلہ وار ناولوں کی اقساط ہر ماہ ضرور پڑھ لیا کریں تاکہ ہم آپ کی رائے جان سکیں۔ آئیہ رزاقی کے لیے آپ اپنا فون نمبر بھجوا دیں۔ ہم آئیہ صاحبہ کو دے دیں گے۔ وہ خود آپ کو اپنا ایڈریس دے دیں گی۔

بشری گوندل لکھتی ہیں

کیا حال ہے ہم اسٹوڈنٹس تو سردی سے جسے بڑے ہیں بلکہ یوں کہیں کہ یونیورسٹی کھلنے کے خوف سے بالکل مجھد ہو گئے۔ میں قائد اعظم یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں اور اسلام آباد کی سردی۔۔۔ اف۔۔۔ ہڈیاں بھی لگتا ہے قراقرم بن چکی ہیں۔ اس بار خط لکھنے کی اصل وجہ مصباح علی ہیں۔ میں نے اوپر تلے کئی رسالوں میں ان کے ناول پڑھے۔ میں ان کی فین بن گئی اور وہ میری فیورٹ بن گئی ہیں۔ انہوں نے اپنے فلم سے یہ ثابت کیا کہ وہ بڑی رائٹر ہیں مدیرہ کی رشتہ دار نہیں۔ خوب صورت انداز تحریر سنجیدہ مزاح برکتہ بے ساختہ۔ سلسلے وار ناول صائمہ آئی کا شہزاد۔ ایک سحر کی طرح لگا۔ اف ٹرین کا منظر اور ہوا سے لڑکھڑا کے گرنا۔ اف جھرجھری آگتی۔ کافی گہری کہانی لگ رہی ہے۔ ”خواب شیشے کا“ عفت سحر کا سلسلے وار ناول بنا تجس کے بھی توجہ پا گیا۔ کرداروں کے نام البتہ خاصے مشکل ہیں۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں جنوری کا شعاع پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام افسانے ناول ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ خاص کر صائمہ اکرم کا شہزاد۔ واللہ کیا دلربا خوب صورت ترین دلنشین انداز میں لکھا ہے۔

اور عذہ خالد کا یادگار سین بہت خوب ”خواب شیشے کا“ عفت سحر ظاہر کے ناول نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے اچھا لگا۔ مصباح علی سید کے ناول ”کئی جنی ہاں“ نے تو بہت مزا دیا اتنا پر ہمار بلکہ ذائقہ دار ناول نے دل خوش کر دیا۔ ”میں محبت اور تم“ ایمل رضا کے ناول نے نہایت معذرت کے ساتھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ویسے ایمل بہترین رائٹر ہیں۔ سحر خطا اچھا لیکن مشکل ترین ناول ہے۔ نہایت دھیان اور سوچ کر پڑھنا پڑتا ہے عتایہ۔ یہ دیا ناموں کا بہر پھیر اللہ توبہ دماغ کھپانے والا ناول سرد رو کرتا ہے۔ باقی افسانوں میں شازیہ الطاف کا ”یہ رشتے ناتے بالکل حقیقت سے قریب تھا بہت اچھا لگا۔ فوزیہ اشرف کا فیصلہ بھی بے حد شاندار افسانہ تھا۔

باتوں سے خوشبو آئے اور پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ ج پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے ممنون ہیں آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

مریم فاطمہ ایبٹ آباد سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں آئی آج تقریباً ”نو سال بعد دوبارہ قلم اٹھایا ہے۔ خط بڑی مشکل سے پوسٹ کروا رہی ہوں۔ کیونکہ جس کسی کو خط پوسٹ کرنے کا کہا تو وہ اتنی حیرانگی سے دیکھے گا جیسے ہم انسان نہیں (ایلیٹین) ہوں۔ آنکھوں سے یہ الفاظ ادا ہو رہے ہوتے ہیں کہ بی بی یا گل ہو، آج کل کون خط لکھتا ہے۔ اب ان کو کون بتائے کہ ہم غالب کے متاثرین میں سے ہیں۔ آئی میری الماری (کپڑوں کی) اور گھر میں ہے جو نہیں دو سری کوئی۔ ساری ان ڈائجسٹ سے بھری پڑی ہے۔ وجہ آدھا درجن تندیں اور ان کے بچے ہیں۔ مائیں بغیر پوچھے ڈائجسٹ لے جاتی ہیں واپس نہیں دیتیں اور اگر واپس آجائے تو بچوں نے اس کا کیا حشر کیا ہوتا ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میاں صاحب سے اکثر اس بات پر لڑائی ہوتی ہے کہ ان کو الماری میں کیوں رکھا ہے۔ مجھے آپ کی

”کہ جاناں میں کون“ میں نوال افضل گھمن کا تبصرہ جامع مختصر اور بہترین تھا۔ رشک حبیب کو شادی مبارک اور رقص بیکل کے لیے اللہ کا واسطہ۔

ج پیاری بشری! یہ آپ لوگوں نے کیوں کر فرض کر لیا ہے کہ خط طویل سے تو پڑھا نہیں جائے گا۔ ہماری ہمت کو داؤس کہ بارہ قل اسکیب صفحات کا خط بھی بخوشی پڑھ لیتے ہیں مگر شائع ہونے کی جو شرائط ہیں ان پر ہم سختی سے عمل کرتے ہیں۔

بشری آپ ہمیں آئندہ خط لکھیں تو اپنے شہر کا نام ضرور لکھیں۔

عمل نے ٹنڈو آدم سے لکھا ہے

جنوری کے شعاع کا ٹائٹل بہتر تھا مجھے پائل بہت پیاری لگی۔ پہلی شعاع اور حمد و نعت پڑھی۔ پیاری باتیں تو ہوتی ہی بہت پیاری ہیں۔ سروے کے سوالوں کے جوابات اچھے لگے۔ انٹرویو میں بندھن میں نازیہ علی اور عدنان علی ہیں کافی انڈر اسٹینڈنگ تھی اچھا لگا۔ ”تجھ سے نا آجوزا“ بھی ٹھیک تھا۔ ”خواب شیشے کا“ لو بھی میرے تو سب کے چھکے چھڑا دیے۔ انٹرنٹنگ ہے اسٹوری۔

شہزاد ”اف۔ اف۔ اف میں تو ویسے ہی سروی کے موسم میں مری میں ہی ہوتی ہوں (بھئی خیالوں میں) مجھے بر فیلا سال بہت پسند ہے اور اوپر سے میری پسندیدہ جگہ پر آپ نے اسٹوری لکھ دی۔ صائمہ! آپ بہت زبردست ناول لکھ رہی ہیں۔ ناولٹ میں ”شہر خطا“ کاشف بے چارہ مار دیا ”دیا“ نے۔ کہانی زبردست جاری ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ”یادگار سبق“ وجیہ کی بہادری پسند آئی۔ مجھے بھی یہ پیچھورے لڑکے بہت برے لگتے ہیں۔ میں نے تو باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا ہے کاش میں بھی وجیہ جتنی بہادر ہوتی مگر میں بہت بزدل ہوں۔ مکمل ناول میں ”نگی جی ہاں“ بڑا ہی عجیب نام ہے اسٹوری ٹھیک تھی۔ افسانے اس بار سارے ہی بس ٹھیک تھے البتہ دل کو ایک بھی ناں لگا۔ ”میں محبت اور تم“ ہائے۔ بس مجھے یہ بتاؤں کہ ایمل رضا اور سمیرا حمید کہاں ملیں گی؟ مجھے نہیں لگتا وہ اس دیس میں اس دنیا میں رہتی ہیں کہیں پریوں کے دیس سے تو نہیں لے آئے آپ میری فیورٹ رائیٹر ہیں یہ اتنی اچھی کہانیاں میں واقعی ہی ان سے ملنا چاہتی ہوں پلیز انٹرویو لے لیں ناں ان کا تصویر سمیت پلیز پلیز اتنے

اچھے الفاظ کہاں سے لاتی ہیں آپ جگنو، بورشے، برف، سنڈریلا، سنو واٹس، کارل اور اب یہ بھالو اف بہت ناکس زبردست۔

ج پیاری عمل! دنیا اتنی بھی بری نہیں ہے، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں جہاں کچھ برے لوگ پائے جاتے ہیں وہاں بہت سارے اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور ان ہی کے دم سے دنیا قائم ہے اور ڈرنا تو ویسے بھی اچھی بات نہیں۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ خود کو مضبوط کریں کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ایمل رضا اور سمیرا حمید کی تحریریں پڑھ کر تو ہمیں بھی حیرانی ہوتی ہے یہ ان کی خدا داد صلاحیت ہے اتنی کم عمری میں ایسا مشاہدہ الفاظ کا اتنا عمدہ انتخاب اور موضوعات کا ایسا تنوع بہت کم تخلیق کاروں کو نصیب ہوتا ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ خواتین ڈائجسٹ کو ہمیشہ بہترین رائٹرز کا ساتھ حاصل رہا ہے۔

نگی جی ہاں کا مطلب ہے ”چھوٹی سی ہاں“

او کاٹھ سے ڈاکٹر طاہرہ جیلانی شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شہر خطا اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ ایسے شاہکار ناول ہی شعاع کے ساتھ وابستگی کا ذریعہ ہیں۔ تنقید یہ ہے کہ ”رقص بیکل“ بہت بے قاعدگی سے لکھا جا رہا ہے۔ اگر رائٹر صاحبہ اپنے ذاتی مسائل کی وجہ سے نہیں لکھ پا رہیں تو ایک دو قسطوں میں ختم کر دیں اس کو۔ میں نے اپنے نئے نئے ناولیے مجازی خدا کے نام خود ایک غزل لکھی ہے آپ سے درخواست ہے کہ شاعری سیکشن میں ضرور شائع کیجئے گا۔ کیونکہ میں نے ان کو چیلنج دیا ہے۔

ج محترمہ ڈاکٹر صاحبہ! آپ کی تعریف و تنقید کی تو خیر ہے۔ مگر یہ چیلنج والی بات۔ کیا ہی اچھا ہونا کہ آپ یہ نظم ہمیں بھیجنے کے بجائے بالمشافہ ہی انہیں سنا دیتیں۔ دیکھیں! آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اپنی مزہم پٹی خود کر لیں گی۔ تم بیچارے عریب کہاں جائیں گے۔ ویسے بھی آپ کی شادی کو ابھی سال بھی نہیں گزرا۔ کم از کم ایک عشرہ تو گزرنے دیں پھر لکھئے گا۔

شازیہ الطاف ہاشمی نے شجاع آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شجاع اور خواتین ہر دفعہ ہی بہار کا پیغام لیے آتے

ہیں۔ ہمارے لفظوں کو آپ نے معتبر جانا۔ پتا نہیں کتنے لوگ ہیں سب ہمارے دل میں بستے ہیں اور ان سب کو میں چائے پلانا چاہتی ہوں۔ بچوں کے اسکول کھل گئے ہیں۔ فاطمہ آمنہ اسکول گئی ہیں۔ الطاف ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے ہی نکل جاتے ہیں اور پیچھے میں اکیلی بیٹھ کے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ خیر آپ نے کون سا جواب دینا ہے مجھے نہ دیں کسی اور کو دے دیں کیونکہ اگر میرا خط چھپا تو پھر افسانہ غائب ہو جائے گا اس لیے میں جواب کے بغیر ہی بھلی۔

ج شازیہ الطاف ہاشمی! ہم نے آپ کا پورا نام لکھا ہے۔ تاکہ آپ کی شکایت دور ہو جائے۔ آپ کی محبت کے لیے ممنون ہیں اور ہمارے دل میں بھی آپ کے لیے اتنی ہی محبت ہے جہاں تک چائے کی بات ہے تو کبھی موقع ملا تو آپ کے پاس آئیں گے اور چائے بھی ضرور پیئیں گے۔ دیکھیں، آپ کو یقین تھا کہ ہم آپ کو جواب نہیں دیں گے اور آپ کو جواب چاہیے بھی نہیں پھر بھی ہم نے آپ کا خط شائع کیا اور جواب بھی دے رہے ہیں۔

ناظمہ زیدی چونکہ اعظم سے لکھتی ہیں

پیاری باتیں ماشاء اللہ آپ نے ایک بار بیمار یوں اور علاج کے متعلق کچھ احادیث شائع کی تھیں پلیز اگر اس سلسلے میں کچھ اور بھی دیں تو مہربانی۔ ”کیہہ جاناں میں کون“ میں سب کے جواب اچھے لگے۔ سنا ز یوسف جی آپ کو بہنوں کی محفل میں مس کرتے ہیں۔ نادیہ علی کے جوابات اچھے لگے۔ صائمہ جی! آپ کا ناول اچھا ہو گا ہمیشہ کی طرح ہمیں یقین ہے۔ سیدھی سادی کہانیاں زیادہ اپیل کرتی ہیں بجائے فلسفے کے گوگل سے لی گئی معلومات ہمیں بھی پسند نہیں عذرا خالد اچھی کہانی تھی مزاجیہ سی۔ فریش کر دیا آپ نے تو ”سوچنے کی بات“ رائٹر کی سوچ بالکل درست تھی نہ جانے کیوں اپنوں کی جڑیں اپنے ہی کاٹتے ہیں۔ انجام تو سوچ لیا کریں کبھی۔ ”کمال ضبط“ کمال کا ضبط تھا بھئی ”خواب شیشے کا“ آگے بڑھ رہا ہے آہستہ آہستہ بہت اچھا لگ رہا ہے یہ ناول مجھے تو دلچسپ ”فیصلہ“ اچھا افسانہ تھا اچھا سبق گڈ۔ ایمل رضا آپ کو کیا کہوں ”نام ہی کافی ہے“ زبردست ناول۔ بہنوں سے شکوہ ہے کسی نے بھی مجھے یاد نہ کیا؟ خاص طور پر کوثر خالد آپ نے آپ سے تو کوئی دل کا رشتہ محسوس ہوتا ہے۔ ثناء مسکان

میں متفق ہوں آپ کی بات سے سو فیصد۔ پیاری ناظمہ! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ خواتین اور شعاع کے معیار کا اندازہ تو آپ ہر مہینے سے بڑھ کر لگاتی لیتی ہوں گی۔ ہم تو بس اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اتنی اچھی لکھاری اور قاری بہنوں سے نوازا ہے۔ آپ کے دونوں افسانے قابل اشاعت ہیں۔ ان شاء اللہ باری آنے پر لگ جائیں گے۔ مگر یہ بات آپ اپنے شوہر دوستوں اور رشتہ داروں کو ہرگز مت بتائیے گا۔

کہانی کس موضوع پر لکھی جا رہی ہے یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر کہانی میں کچھ ایسے مسائل کو اٹھایا گیا ہے جن کی گہرائی میں جانا ضروری ہے تو بہتر ہے کہ اس موضوع کے متعلق معلومات بھی مہیا ہوں۔ اس کے لیے مطالعہ اور گوگل کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایبٹ آباد سے سحرش نور شریک محفل ہیں

سب سے پہلے شعاع آیا وہی پڑھا۔ بے حد دلچسپ لگا۔ سب سے پہلے نگی جی ہاں رہی دوڑ لگائی۔ میری فرمائش نوٹ کر لیں پلیز مصباح سے کہیں نگی جی ہاں کی سیریز بنادیں جیسے سائرہ کی اور تمہو بخاری کی ہے۔

نایاب آپی کا ”شہر خطا“ پسند آ رہا ہے۔ عنایہ کا رویہ بہت ہی عجیب ہے۔ کہانی جیسے جیسے بڑھ رہی ہے۔ ماضی کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ ویسے نایاب آپی کے ناولز میں پیروں، تعویذ دھاگے کا خاصا ذکر ہوتا ہے اور یہ ہیں بھی جیلانی، کسی پیر خاندان کی تو نہیں۔ افسانے اس بار کہانیوں کے اعتبار سے اچھے تھے۔ مگر ان میں افسانوی رنگ نہیں تھا۔

ویسے ایک بات اب شدت سے افسانوں میں دکھائی دے رہی ہے۔ یا تو بے تحاشہ منظر کشی ہوگی بلاوجہ کے لفظ کہانی سے عاری یا پھر سیدھی سپاٹ فار مولاسی کہانی۔ منظر اور کہانی ملا کر جو افسانہ تیار ہو اس کی بات ہی الگ ہے۔ ارے ہاں آئی سلسلہ جب تجھ سے نا تا جوڑا۔ ہا ہا ہا شدت سے ہنسی آئی۔ پلیز صحیح کر دیں یہ لطیفہ تھا کہانی تھی یا حقیقت اف۔ جو بھی تھیں البتہ بڑی ہی صاف گو خاتون تھیں۔ جیتی رہو یونہی۔ نادیہ علی کا بندھن اچھا لگا باقی تمام سلسلے جاندار تھے۔

ج پیاری سحرش! آپ کی فرمائش مصباح علی تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے ہم آپ سے متفق ہیں۔ مصباح میں

نے کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا، آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

فائزہ بھٹی نے چوکی سے لکھا ہے

آج کل شادیوں کا سینر ہے نا تو ماڈل گرل مایوں ہندی کے۔۔۔ سن میں جانے کی تیاری کیے اچھی لگ رہی تھی۔
”کیہا جاناں میں کون“ سب کے سوال دل چسپ تھے۔ شہزادہ احمد بٹ چوکی سے آپ نے لکھا 2012ء سے پڑھ رہے ہیں۔ جبکہ میں پچھلے دنوں ایک پرانا رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ 2008ء یا 2007ء کا تھا اس میں بھی آپ کا ذکر تھا۔ (جواب کی خاطر) عائشہ انصاری اور حرا قریشی نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ”جب تجھ سے نا تا“ اس بار تو بہن صاحبہ نے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا رکھی تھیں اور خوب لکری تھیں سسرال والوں کی ان کی تو ساس کا بھی سلسلہ شامل ہونا چاہیے۔ ”خواب شیشے کا واہ نمبر آفتدی کیا خوب بھگو کماری ہے۔“

ج پیاری فائزہ! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم آپ کا پورا خط شائع کرتے آپ کے سوال نمبر 1 اور 2 کا جواب ہے ”ہاں“ اور تیسرے کا جواب ہے ”نہیں۔“

کوثر خالد نے جزائروالہ سے لکھا ہے

بھٹی ہم نے نماز پنجگانہ کی کوشش کامیاب کرنا ہے۔ لہذا تبصرے مختصر کرنا پڑیں گے۔ پہلی شعاع اید تک سلامت حمد و نعت کیا قافیے زبردست۔ نبی کی باتیں۔ روشن روشن۔ تجھ سے نا تا اس قسم کے برا حال۔ بیٹی بولی اسکول میں پڑھواؤں گی ٹیچرز کو۔ پیچھے پکار تو ہم بھی گرتے ہیں مگر اس طرح کی ہیں۔ ج نے خود لکھا ہے تو بھٹی کمال ہے کمال شہزادہ ہماری پسندیدہ رائیٹر۔ فسوں خیزی تو بہت ہے۔ شہر خطا دردناک ہے۔ یادگار سبق عزہ خالد۔ واہ نہایت دلچسپ قلم زور قلم اور۔ غزلیات دو شعر تو مجھ پر تھے۔

خیرات کیا وہ بھی جو موجود نہیں تھا تو نے تمہی دستوں کی سخاوت نہیں دیکھی ج۔ بھٹی کوثر یہ کیا بات ہوئی۔ اگر ہر نماز کے لیے 30 منٹ مختص کر کے جائیں تو ڈھائی گھنٹوں میں پانچوں نمازیں ادا ہو جائیں گی باقی کے 21 گھنٹوں میں آپ کے پاس 15 منٹ کا تبصرہ لکھنے کا وقت نہیں۔

مزاح لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ضروری نہیں کہ رائٹر کسی موضوع پر لکھے تو اس میں اس کا ذاتی تجربہ شامل ہو۔ ایک حساس انسان جو کچھ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے، اسے اپنی کہانیوں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ نایاب جیلانی نے صرف تعویذ گندوں پر نہیں اور موضوعات پر بھی لکھا ہے ”نا تا جوڑا ہے“ کی خاتون واقعی بہت دلچسپ اور صاف گو ہیں ہمیں بھی ان کی سچائی نے متاثر کیا۔

صبا گل حفصہ، رانی، عذرا، ثناء، آنسہ لکھتی ہیں

ہوش سنبھالا تو بڑی بہنوں کے ہاتھ میں شعاع اور خواتین دیکھا اور پڑھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک رابطہ برقرار ہے۔ یعنی 12 سال ہو گئے۔ اب ہم کہانی ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں کیونکہ یہاں پر چالٹا نہیں پھر ہم ایک دو سرے سے شیئر کرتے ہیں کیونکہ میں ہمیں شادی شدہ ہیں اور پھر فون پر وہ بحث کہ امی بھی سر پکڑ لیتی ہیں۔ مگر ہمارا تبصرہ ختم نہیں ہوتا اور اب تو دو تین کزن بھی شامل ہیں جنہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جب صبا نے عمر جمائیکری ڈیوٹے کے بارے میں پڑھا تو رونے لگی۔ جبکہ میری کزن تو باقاعدہ بے ہوش ہو گئی تھی اور وہ ایسے کہ جب اسے ہم کہانی سناتے۔ تو وہ رونے کی وجہ سے منہ کے ایسی زاویے بناتی کہ ہم اس پر بہت ہنستے اور مذاق اڑاتے پھر جب بجو اسے کہانی سناری تھیں اور عمر جمائیکری کے موت کے بارے میں بتایا اس وقت دونوں کچن میں جا رہی تھیں۔ جب بجو نے اس کی ہوں ہاں نہ پا کر پیچھے دیکھا تو آنسہ اوندھے منہ زمین پر۔

ڈاکٹر نے کہا ٹینشن ٹی ہے۔ ہا ہا ہا اور باقی کہانیاں اور سلسلے تو اس پر تو میرا دل چاہتا ہے خوب تبصرہ کروں۔ لیکن پھر وہی بات آپ کے صفحات۔

ج پیاری سی صبا، حفصہ، رانی، عذرا، ثناء، آنسہ! خط اس وقت شائع ہوتا ہے۔ جب شمارے پر جامع تبصرہ ہو۔ اور وہ بروقت ہمیں مل جائے۔ ہمارے صفحات محدود ضرور ہیں مگر ہم آپ لوگوں کے خطوط پڑھتے ضرور ہیں خواہ وہ کتنی ہی تاخیر سے ملیں کیوں کہ آپ لوگوں کی آرا اور فرمائشوں کو مد نظر رکھ کر ہی پرچا ترتیب دیا جاتا ہے۔

آپ کی اردو تو کافی بہتر ہے۔ آپ کہانیاں بھیج دیں۔ پڑھ کر ہی پتا چلے گا کہ زبان کا مسئلہ ہے یا۔۔۔ خط میں آپ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الہی ماجرا کیا ہے
”خوش کوثر“ گل تھمئی ہے۔ دوبارہ سے شکر یہ۔

عالیہ راؤ نے ملتان سے لکھا ہے

ایک درخواست پیارے نبی کی پیاری باتیں میں زنا کے بارے میں احادیث و قرآنی آیات شائع کریں اور میرا خیال ہے ہمارے عہد حاضر کے شعراء کرام بھی اچھی حمد و نعت کہتے ہیں ان کو بھی موقع دیں مطلب نئے شعراء کا کلام شائع کریں۔ حصہ نظموں غزلوں میں فرزانہ نیناں اور دیگر شاعرات کا کلام بھی شامل کیا کریں۔ دو مرتبہ رس گلے نرائی کیے بھائی نے ”موسم کے پکوان“ میں۔ بس وہ سب ہی کچھ بنے مگر ”رس گلے“ نہیں بنے۔

خواب شیشے کا بہت خوب صورت ناول ہے۔ بھئی مجھے تو ویسے بھی رومانٹک ناول پسند ہیں۔ کوثر خالد جی میرے اگلے ناول کے ہیرو کا نام رینج مبر ہے۔ تمام سلسلے اچھے ہیں۔ نعمان اعجاز اور صبا قمر کا انٹرویو کریں۔ ہو سکے تو علی وارث کو بھی لائیں۔

ایک وہی سابقہ فرمائش فرحت اشتیاق اور مریم عزیز سے کوئی بہت ہی رومانٹک ناول لکھوائیں۔ بے حد رومانٹک بارش میں بھیلتا ہوا۔ کوئل سی کوک سا، کسی گوری کی ہوک سا، گلاب سا چاندنی رات سا پلیز مریم جی اور فرحت جی اور ساتھ ساتھ رضائیں کو انتظار ہوں ابھی سے۔ میرے شہر کی میمونہ خورشید کہاں غائب ہیں پلیزان سے کچھ لکھوائیں اور نبیلہ رمضان! ایک لڑکی ملتان میں رہتی ہے عالیہ راؤ 25 دفعہ تمہاری کہانی ام ہانی والی پڑھ چکی ہے نام میرے خیال میں مرگ و فاقا مریم ساجد قسم سے آئی مس یونیورسٹی گوندل کوئی ناراضی ہے؟ آجائیں (نئے لوگوں کو موقع بھی دیں) سدرہ سحر عمران کدھر ہو بھئی۔ نبیلہ ابر راجہ ”ہائے“ تمہارے ہیرو کا مجھے بے حد انتظار ہے بس سمجھو دھند میں کئے رستے پہ کھڑی ہوں۔ آج ساگ ہی پکایا ہے قسم سے اگر وہ آگیا تو ساگ پراٹھے کے ساتھ کھلاؤں گی۔ یار مکھن والی روٹی کے علاوہ پراٹھے کے ساتھ بھی بہت لطف دیتا ہے ساگ۔ آزمائش شرط ہے۔

ج پیاری عالیہ! آپ کی کہانی ہم نے ایک دفعہ نہیں دو دفعہ پڑھی ہے اور ہم اپنی رائے پر قائم ہیں۔ حقیقت نگاری اور رومانس اپنی جگہ لیکن ہمیں برجا ترتیب دیتے

ہوئے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ منٹو اور عصمت چغتائی اردو ادب کے بڑے نام ہیں لیکن ان کی بہت سی کہانیاں ہمارے پرچوں میں شائع نہیں ہو سکتیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پرچے بڑی عمر کی خواتین کے ساتھ ساتھ کم عمر لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں لہذا ہمیں کہانیاں شائع کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوتا ہے۔ آپ جنوری کے شعاع میں ایمل رضا کی اور جنوری کے خواتین میں سمیرا حمید کی کہانی دیکھیں دونوں کا موضوع محبت ہے لیکن محبت میں بھی ایک وقار اور رکھ رکھاؤ ہونا چاہیے۔

آپ اطمینان سے امتحان دیں، پھر کہانیاں لکھیں آپ یقیناً ”بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔“
آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

ثینہ اکرم یلاری کراچی سے لکھتی ہیں

نئے سال کا سروے پڑھ کر ذرا مزہ نہ آیا کیونکہ سروے کو مختصر کر دیا گیا تھا جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ اتنا اچھا سوال تھا کہ ”گزرے سال کی کوئی میٹھی سی یاد“ مگر یہ سوال تو سرے سے سروے میں موجود ہی نہ تھا۔ سروے کا سارا حسن برباد ہو گیا اس سوال کو حذف کرنے سے۔ اس کی وجہ تو آپ ہی بتا سکیں گی ہمیں آگے بڑھے تو صائمہ اکرم چودھری کا ناول ”شہزاد“ پڑھ کر ساری کوفت اور بے زاری رونو چکر ہو گئی۔ نئے سال کا خوب تحفہ دیا آپ نے۔ ”شہزاد“ پہلی قسط سے ہی آؤٹ کلاس اسٹوری رہی۔ ابھی تو کرداروں کا تعارف ہی ہوا ہے۔ آگے چل کر بہت سپر ہٹ ناول رہے گا۔ مکمل ناول میں مصباح علی سید کا ناول ”نکی جی ہاں“ اچھا لگا جبکہ ایمل رضا کا ناول ”میں محبت اور تو“ بھی بس ٹھیک ہی رہا۔ ”خواب شیشے کا“ نمبر آفندی نے آغا جان کا بدلہ مہواہ سے لیا۔ یہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ کوثر خالد جی سلام عرض ہے۔ آپ نے اپنے سارے شعاع کے شمارے قربان کر دیے پیچوں کی مدد کے لیے۔ اگر آپ کو شعاع ڈائجسٹ چاہیں تو میں آپ کو اپنے سارے شعاع ڈائجسٹ تحفتاً دے کر خوش محسوس کروں گی، آپ کے جواب کا انتظار رہے گا اور ہاں ڈاک خرچ بھی میرے ذمے ہو گا۔ میرے پاس تو ان کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

ج پیاری ثینہ! نئے سال کے سروے میں پیاری بیٹی

مٹ ان دیکھے پابندیوں میں جکڑے۔ رات کا وقت ہے۔
سب سو رہے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں کہ لکھنا جنون ہے۔
ہمارے تحریری سفر میں کیا ساتھ دیں گی آپ؟ کیا ہم
بھی عزت سے سانس لینے کے حق دار ہیں؟ التجا۔

التجا۔ اور پھر۔ التجا۔
ج تو خیر! آپ کا تو نام ہی زندگی ہے اور زندگی تو اسی کا نام
ہے۔ کچھ خوشیاں کچھ غم، کہیں پابندیاں کہیں آزادی اور
صرف پشیمان ہی نہیں خواتین تو ہر جگہ بندشوں میں جکڑی
ہوتی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہیں زیادہ ہی پابندیاں ہیں
اور سچ پوچھیں تو پابندی نہ بھی ہو تو انسان اپنی تقدیر سے تو
فرار نہیں حاصل کر سکتا۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کو
آج بھی آواز اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وہ بے چاریاں تو
روشن شاکر کی طرح ”سوچ کے پروں“ کے کتنے کا گلہ بھی
نہیں کر سکتیں۔

تمہیں ہاتھ ندیم اور عمیرہ بننے کی ضرورت بھی نہیں
تمہیں اللہ نے الگ مزاج، سوچ اور شخصیت دی ہے۔
جو ذرہ جس جگہ ہے آفتاب ہے۔ آپ کی یہ بات اچھی لگی
کہ ظلم خاموش نہیں رہنے دیتا۔ ظلم کسی بھی نوعیت اور
کسی بھی روپ میں ہو اسے بحیثیت انسان قبول کرنا ہی
نہیں چاہیے۔ یہ انسان کے حوصلے اس کی ہمت اور اس
کے افضل ہونے کی توہین ہے۔ افسانہ کسی ہلکے پھلکے
موضوع پر لکھیں۔

ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ آپ افسانہ لکھ کر
بھجوائیں لیکن ایک شرط ہے کہ ناقابل اشاعت ہونے کی
صورت میں دل برداشتہ نہ ہوں۔

بشری ایمان بھکر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے
خط تو میں کافی دفعہ لکھ چکی مگر آپ لوگوں نے ان کو ردی
کی نوکری کی نذر کر دیا آج جس اسٹوری نے مجھے خط لکھنے پر
مجبور کر دیا وہ ہے ”شر خطا“ کا کردار انادیا ہے حالانکہ آج
کل میں اپنے ایم فل میں بہت مصروف ہوں ساتھ چاب
بھی تو نا تم صرف سلسلے وار ناول کا ہی نکال پاتی ہوں آج
جب ”انادیا“ کے بارے میں پڑھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ قلم
اٹھانے پر مجبور ہو گئی مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ
جب کسی انسان پر ظلم ہوتا ہے تو اس کے اندر زہر بھر جاتا
ہے مگر یہاں کا دستور ہے کہ ظلم کرنے والے کو تو کھلی
چھوٹ دی جائے ہاں سننے والا صبر کرے۔ یہی کچھ انادیا

غزوی شامل نہ ہو سکیں اس کا ہمیں بھی بے حد افسوس
ہے۔ سروے کا ایک سوال ”میٹھی سی یاد“ ہم نے حذف
کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس سوال کا جواب
بیشتر بہنوں نے تقریباً یکساں دیا تھا اور آپ جانتی ہیں کہ کسی
بھی بات کی تکرار بیزاری اور اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔
دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم چاہتے تھے کہ ہماری قارئین نے
اتنی محنت سے سروے کے جوابات لکھے ہیں اور پھر ہمیں
بھجوانے کی تکلیف کی ہے تو محدود صفحات میں زیادہ سے
زیادہ نام شامل ہو جائیں۔

کوثر خالد تک آپ کی فراخ دلانہ پیشکش پہنچا رہے
ہیں۔ ویسے آپ بھی کوثر خالد سے کم بڑے دل کی نہیں
ہیں۔ اپنا اتنا قیمتی ذخیرہ دینے کو تیار ہیں اور ڈاک خرچ بھی
اپنے ذمے لے رہی ہیں۔ واہ بھئی ہماری قارئین کا جواب
نہیں ہے ہم ایسے ہی تو اپنی قارئین پر فخر نہیں کرتے۔

زندگی تو خیر خلیل نے گاؤں پنوار بالا پشاور سے شرکت
کی ہے، لکھتی ہیں

خط کیا، گلہ نامہ سمجھے، آٹھویں میں آپ کو پہلا افسانہ
بھیجا تھا، ناقص سا اور ناقابل اشاعت تھی پھر بھیجا
”عشق موت کی سانس ہے“ مگر وہ نویں کلاس میں نہیں
بھیجا تھا، بلکہ تعلیم چھوڑنے کے بعد۔ آٹھویں کے بعد
قلم پابندی لگی، کسی بد کرداری کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ
بس لگ گئی۔ انسان اپنے خواہشات سے کیسے مجبوراً
دستبردار ہوتا ہے، اب یقین ہو چلا ہے۔ تعلیم کسی کی جاگیر
نہیں۔ ہم نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا مگر کسی اسکول سے
نہیں، بلکہ شعاع کرن وغیرہ سے۔ ہم کو احساس ہونے لگا
ہے کہ ہم میں تخلیقی صلاحیت ہے۔ مگر یہاں سے جواب تو
ملے۔

اپنے درد، خواہشات کے لیے صرف رسائل نظر آئے
کیونکہ آپ جانتی ہیں نا۔ کہ ہم پشیمان اپنے فیصلوں میں
کتنے کھردرے ہوتے ہیں۔

تحریری سفر تو شروع کیا ہے مگر پشیمان کو تو اور بھی حوصلہ
افزائی کی ضرورت ہے نا۔ کیونکہ یہاں لکھنا تو کیا بولنا تک
محال ہے۔ ”عشق موت کی سانس“ اس لیے لکھی کہ
میں بنت سحر نہیں ہوں، عمیرہ اور نمرہ، ہاتھ ندیم یا ایمل
نہیں ہوں۔

پشاور کے گاؤں پنوار بالا کی پشیمان ہوں۔ پشیمان۔ ان

نے بھیج دیا۔

ج پاری بشری! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے لیکن یہ محض آپ کی غلطی تھی کہ آپ کا کوئی خط شائع ہی نہیں ہو گا اور اسی وجہ سے آپ نے لکھنا بند کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے خط ہمیں ملے ہی نہ ہوں یا تاخیر سے ملے ہوں۔ اس لیے شامل نہ ہو سکے ہوں۔ بہر حال۔ عنادیہ کے معاملے پر ہم آپ سے متفق ہیں۔ عنادیہ اتنی قصور وار نہیں تھی جتنی اس کو سزا ملی۔ بیڑھیوں پر دال کے کنکر پھینکنا اتنی بڑی غلطی نہیں تھی کہ اس کو اتنی بری طرح پینا جاتا۔ نایاب اس کردار کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں۔

”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ ہماری قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہے آپ کا نقطہ نظر بھی درست ہے کہیں بہوئیں کرنے والی لڑکی کی بھی غلطی ہو سکتی ہے لیکن دیکھا ہی گیا ہے کہ زیادہ تر بہوئیں کے خلاف ساس مندیں جھٹائیاں مل کر محاذ بناتی ہیں۔ جس طرح چانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح سب عورتیں مکار نہیں ہوتیں آپ بھی ایک عورت ہیں۔ آپ تو مکار نہیں ہیں۔ ہم جلد ساس مندوں کے لیے بھی سلسلہ شروع کریں گے آپ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے گا۔

📖

کے ساتھ ہوا بچپن سے اس کے اندر اتنا زہر بھرا گیا پھر سونے پہ سہاگہ اس کی چچی نے کسر پوری کی۔ اس کی عزت نفس کو روند کر جوتے مارے جب ”انادیہ“ نے بدلہ لینے کی ٹھانی تو محترمہ رائٹر بھی اور ان کے ساتھ ساتھ ساری قارئین بھی دشمن بن گئیں۔ میری رائٹر سے درخواست ہے کہ انادیہ کے ساتھ کچھ برائے نہ کریں کیونکہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ہمیں اس کو اس پر حق بجانب سمجھتی ہوں پہلی غلطی اس کی ماں کی ہے کیونکہ جب کسی جانور کے بچے کو بھی زود کو ب کیا جائے تو وہ حملے کے لیے آجاتا ہے۔ کیسی ماں تھی جو بیٹی کے ساتھ ظلم دیکھتی رہی اور آگے نہیں بڑھی ”انادیہ“ کا غصہ نفرت سب حق پر ہے۔ میں کہتی ہوں کسی کو بھی ”انادیہ“ کے اس رویے پر اعتراض ہے تو خود کو اس کی جگہ پر رکھ کر دیکھے اگر وہ جادو ٹونے کی طرف لٹی تو وہ قصور وار نہیں کیونکہ وہ اتنی ہرٹ ہو چکی تھی۔ غصہ نفرت اتنا اس کے اندر بھر چکا تھا۔ کوئی سمجھانے والا بھی نہیں تھا اور انسان اپنی تذلیل بھول نہیں سکتا نہ معاف کر سکتا ہے تو اس وقت اس کی دوست نے اس کو جو کہا وہ بیچاری اس راستے پر چل پڑی ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ انتہائی فضول جیسے دنیا کی ساری بہوئیں مظلوم سسرال والے ظالم میں نے تو اپنے ارد گرد آج تک اتنی مظلوم بہوئیں نہیں دیکھی یہاں پر بات ہوتی ہے کہ ساس مندیں جلاتی ہیں۔ میں نے بہوئوں کو ساس کو جلاتے دیکھا میری اپنی بھابھیاں جیسی ہیں خدا کی پناہ۔ آج کل کی عورتوں کی سائیکس ہے میاں مٹھی میں ساس مندیں جا میں بھاڑ میں۔ نند تو ایک بھی برداشت نہیں آج کل کی بہوئیں شارپس والی ہیں۔ نرا ڈرامہ جو اپنی کہانیاں لکھ کر بھیجتی ہیں خود نیک بی بیوں بن جاتی ہیں میاں جی بھی اچھے۔ بری تو صرف ساس اور نند ہے اس نام تو ساس اور نند بہت اچھی لگتی ہیں جب رشتے کے لیے جاتی ہیں۔ آگے پیچھے پھرتی نہیں تھکتیں جب کام نکل گیا تو کون میں کون خدا کے لیے بند کریں فضول سلسلے کو۔ ساری مکاری عورتوں کی مکاریاں ایک سے بڑھ کر ایک مکار عورت کی کہانی۔ اتنا تو مجھے پتا ہے خط رومی کی نوکری میں جائے گا مگر پھر بھی میں

سستی بلاتسنگ



شہ مجاری

قیمت - 300 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شاعر اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل یا ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیکر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM 34 2017 فروری شاعر

خواب سحر کا

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے سننے یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سمیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔
وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہراہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہراہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں 'تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ان کی بیوی سمراہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

گیارہویں قسط

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



Downloaded From Paksociety.com



کمرے میں اعصاب شکن خاموشی پھیلی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تباہ کن خبر پر فوری رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے تائی جان نے سینے پر دو ہتھ مارے ہوئے آواز نکالی۔
 ”ہائے۔۔۔ قیامت آگنی ہمارے گھر پر۔۔۔ وہ کیمنس۔ بے غیرت کہاں نکل گیا تمہیں۔“
 تائی جان کی بہا ہا کار آغا جان اور مبین صاحب کو حواس میں لے آئی۔
 ”کچھ فائدہ نہیں بے کار ہے سب۔ اور بکواس بھی۔“ چھڑی پر ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔
 ”ارے میں کہتی ہوں رپورٹ کراؤ اس بے غیرت بے حمیت کے خلاف زندہ درگور کر دو اسے۔“ تائی جان کے کونے اور مبین جاری تھے۔

مبین صاحب اور آغا جان کے سامنے بھی حقیقت واضح تھی۔ مہواہ کا ہاسپٹل سلاٹرز ہونا فراڈ تھا۔ یعنی کہ یہ کھیل واقعی نمبر آئندی کا تھا۔
 ”ڈاکٹر اور عملے کو رشوت دی گئی تھی۔ تب ہی تو یہ ڈراما کھیلا انہوں نے۔“ مہواہ سسکی سلاحدہ گویا سکتے کے عالم میں ساری کتھان رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بہن کی بربادی پر کیا رد عمل ظاہر کرے۔
 ”بھول جاؤ۔ بھول جاؤ اس سارے قصے کو مہواہ اور آگے دیکھو شادی طے ہے تمہاری اسی ہفتے میں۔“
 آغا جان نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو مہواہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
 ہمارے بڑے بزرگ جب کسی کے ساتھ برا کرتے ہیں تو درحقیقت وہ اپنی اگلی نسل کے لیے گڑھے کھود رہے ہوتے ہیں۔

مال اور اولاد کو انسان کی آزمائش کہا گیا ہے۔ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی اولاد سزا کا تھی ہے تو دل ان ہی بیوں کا کٹتا ہے۔
 ”اس نے واقعی نکاح کیا ہے آغا جان۔؟“ مہواہ نے سس خ ہوتی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
 ”کوئی حیثیت نہیں ہے اس نکاح کی مہواہ! تم بس خاموش رہو۔ چند دنوں بعد تمہاری شادی ہے۔“ تائی جان متوحش زدہ سی بولیں۔ بس نہ چلتا تھا کہ مہواہ کے ذہن سے یہ واقعہ ہی کھرچ ڈالتیں۔
 ”بھول جاؤ اس منحوس واقعہ کو مہواہ! سمجھو ایک ڈراما خواب دیکھا تھا۔“
 آغا جان نے دنگ لہجے میں کہا تو وہ بے یقینی سے باری باری ماں اور دادا کو دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”آپ لوگ مذاق سمجھ رہے ہیں اس بات کو؟“

”مذاق ہی تو ہے یہ سب۔ نہ ولی نہ گواہان۔ نہ تمہاری مرضی شامل تھی اس نکاح میں۔ باطل ہے نکاح۔“ آغا جان نے درشتی سے کہا۔
 مہواہ کی آنکھیں ابل پڑیں وہ روتے ہوئے بولی۔
 ”جو بھی ہے آغا جان۔ مگر جب تک اس مسئلے کا حل نہیں نکلتا میں شادی نہیں کروں گی۔ نکاح پر نکاح۔“
 مبین صاحب کرسی پر ساکت و جاہد بیٹھے تھے۔

بازی ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ پیادے نے خاموش کونے سے اٹھ کر جانے کیسے شہ مات دے دی تھی۔ وہ پیادہ اس ساط پر جو بالکل بے وقعت اور حقیر تھا جس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا۔ جسے بنا چال چلے سب پٹا ہوا سمجھ کر مطمئن تھے۔

”اسے سمجھاؤ صدیقہ! مزید داغ خراب مت کرے ہمارا۔ بہت کچھ سہا لیا آئندی باؤس نے۔ تمہانے کامنہ بھی دیکھ لیا۔ اب برادری میں جو عزت بچی ہے وہ بچی رہنے دو۔“ آغا جان بڑے ضبط سے بولے اور مہواہ پر ایک

www.paksociety.com

نظر ڈال کر کمرے سے چلے گئے۔
”مہواہاں سے لپٹ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ ”آپ لوگ تو میری بات کو سمجھیں امی۔“
”میں کسی مفتی عالم سے پوچھتا ہوں۔ بنا مرضی کے زبردستی نکاح کی واقعی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بیٹا۔“
”مبین صاحب بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر روئیں۔
مہواہ کے آنسو ٹھم سے گئے۔ باپ سے تو نظر ملانا بھی مشکل تھا۔

”امی۔“ اس نے ملتجیانہ انداز میں کہتے ماں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔
”آپ لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اب یہ شادی نہیں کر سکتی۔ آپ ان لوگوں کو ابھی انکار
کریں امی۔“

کہتے کہتے دل بری طرح کانپا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دن گن گن کر اس دن کا انتظار کیا تھا۔ مگر کیا۔
”اس دن کا“ انتظار کیا تھا اس نے؟ اس کی تقدیر پلٹنے والا دن؟ طلال کے نام کو اس کی تقدیر کے کاغذ سے مٹا دینے
والا دن؟

”دفع دور۔“ تائی جان نے اپنے ہاتھوں سے مہواہ کے ہاتھ یوں جھٹکے جیسے کوئی بچھو تھام لیا ہو غلطی سے۔ پھر
درشت لہجے میں بولیں۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو مہواہ۔ پہلے کیا کمزورتی دیکھی ہے ہم لوگوں نے جو اب تم بھی ہماری
جگہ ہنسائی کا انتظام کرنے لگی ہو۔“

اور مبین صاحب تو سر تھامے بیٹھے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی اچانک کس موڑ پر لے آئی ہے۔
ملاحہ نے باپ کی بے بسی کو شدت سے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔
”چھوڑ دو آپنی۔ ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ نکاح نامہ تک تو نہیں ہے تمہارے پاس۔ کون سا
نکاح، کیسا نکاح۔“ وہ ملتجیانہ انداز میں مہواہ کو سمجھانے لگی۔
”مگر میں۔۔۔ میرا اللہ تو جانتا ہے تاکہ وہ نکاح ہوا تھا۔“ وہ اذیت میں تھی۔

ہر ہر لفظ پر دل کھٹتا تھا۔ وہ کیوں مانی؟ مرکیوں نہیں گئی ہاں کہتے اور نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے؟ مگر وہ
نہیں جانتی تھی۔ انسان تب نہیں مرتا جب وہ مرنا چاہتا ہے۔ وہ تب مرتا ہے جب اس کے دل میں کبھی نہ مرنے کی
چاہ پیدا ہو جاتی ہے۔

”زبردستی کے نکاح کو باطل کہا گیا ہے مہواہ! میں فتویٰ بھی لے لیتا ہوں آج۔“
مبین صاحب اس سے زیادہ خود کو حوصلہ دے رہے تھے شاید۔ مہواہ کے لب کچھ کہنے کو پھر پھڑپھڑائے۔
تائی جان اس کی بدلتی رنگت اور تاثرات دیکھ رہی تھیں۔ جی میں آتا تھا کہ مہواہ کے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھ
دیں۔ تاکہ وہ کوئی اور صورت نہ پھونک پائے۔
مگر اس نے بڑے زخمی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ سر جھکائے۔ باپ سے نظریں ملائے۔ ان کی طرف
دیکھے بنا۔

”لیکن اگر میں نے ولی رضامندی سے ہاں کی ہو تب اس نکاح کی کیا اہمیت ہوگی؟ ابو! یہ بھی بتا کیجئے گا۔“
کمرے میں ایک دھماکا سا ہوا تھا۔ مبین صاحب پچھی نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگے۔ تائی جان تو گویا غش ہی کھا
گئیں۔ ملاحہ نے لپک کر ان کو سنبھالا تھا۔ مہواہ پھر سے رونے لگی۔



آغا جان کو ایک پل چین نہ پڑتا تھا۔ ان میں پہلے کا سادہ قم چاہے نہ رہا ہو، مگر ان کا غصہ، تنفر اور زرنکار سے

ابھی ابھی انہوں نے موحد کو اسٹڈی میں بلوایا تھا۔

”دیکھا تم نے موحد آفندی۔ خون کیسے اپنی اصلیت دکھاتا ہے۔ غلط کارماں کا بیٹا بھی غلط کارہی نکلا۔“ ان کا داغ ایل رہا تھا۔

موحد سینے پر ہاتھ لیٹے کھڑا خاموشی اور بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں سن رہا تھا۔ وہ تھمے تو اس نے لب کھولے۔

”خون تو وہ آپ کے بیٹے کا ہے آغا جان۔ اور رہی اس کی ماں۔ تو وہ بھی شادی کے بعد آفندی میں شامل ہو چکی تھی۔“ برسکون انداز میں کہتے ہوئے اس نے لاہروائی سے شانے اچکائے تو آغا جان کا داغ گھوم گیا۔

گھور گرا اپنے منظور نظر پوتے کو ناگواری سے دیکھا۔ ”کوئی بھی کوڑے کے ڈھیر سے کسی کو اٹھالائے اور آفندی ہاؤس والوں سے رشتہ داری گناہنے کی کوشش کرے تو ہم اسے اپنا خون مان لیں؟“

”خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”اس بات کی سچائی کے گواہ تو مانا اور پایا بھی ہیں۔ وہ جب اپنے بھائی کی ڈتہ کا سن کر گئے تو وہاں ان کا بیٹا بھی موجود تھا۔“ وہ آزاد ماحول کا رو رہا تھا۔ ڈرے بچھکے بنا بات کرتا تھا۔

”مگر اس کی ہمت کیسے ہوئی اس قدر بے غیرتی دکھانے کی۔ ہمارے گھر کی عزت سے کھیلا ہے وہ۔ میں اسے زندہ گاڑوں گا۔“ ان کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ غصہ، عیش، رگوں میں خون کی جگہ گویا لاوا دوڑتا تھا۔

”اب یہ سوچو کہ اس معاملے سے پنہا کیسے ہے۔ شادی طے ہے مہر کی اور وہ کسی صورت شادی پر راضی نہیں ہو رہی۔“ وہ بے بسی سے بولے۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے نمبر آفندی ان کے سامنے آجائے اور وہ اسے گولیوں سے بھون ڈالیں۔

”ایک بندہ جسے ہم میں سے نہ کوئی جانتا ہے، نہ اسے کبھی دیکھا ہے، اسے ہم کیسے ڈھونڈ سکتے ہیں۔“ اس نے شانے اچکا کر بے چارگی ظاہر کی تھی۔

”مہو سے پوچھو۔ اس نے تو دیکھا ہو گا نا۔ مجھے تو شرم آتی ہے اس بچی کا سامنا کرتے ہوئے۔ اس بے شرم نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہمیں۔ پہلے اس کی ماں ہماری رسوائی کا سامان بنی اب اس بے حمیت نے شب خون مارا ہے۔“

”جب تک اس کا پتا نہیں چل جاتا تب تک تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ شادی تو روکنی ہی پڑے گی۔ یہ بھی شکر ہے کہ نمبر آفندی نے اتنی عزت رکھ لی لڑکے والوں کے سامنے کہ مہواہ کو ایک سیٹلٹ کے بہانے سے واپس بھیجا۔ ورنہ وہ اتنی خوش دلی سے اسے قبول نہ کرتے۔“

آغا جان نے سخت نظروں سے پوتے کو دیکھا تو ان نظروں میں ہلکی سی ناپسندیدگی بھی تھی۔

”یعنی تمہیں اس قدر بے ہودگی میں بھی اس ناہنجار کی ”کچھ“ اچھائی نظر آرہی ہے؟“

”جو دکھائی دے رہا ہے، اسی پر تبصرہ کر رہا ہوں میں۔ تین دنوں بعد تو اپنے گھر والے بھی لڑکی کو قبول نہیں کرتے، کجا سسرال والے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”وہ کمی نہ جانتا تھا کہ آپوں اس شادی کی راہ میں روڑے اٹک جائیں گے۔ کبیر کو ساتھ لو اور پتلا گاؤ اس شخص کا موحد۔ مجھے وہ کسی بھی حال میں چاہیے۔“

وہ سرد لہجے میں بولے تو موحد کو ان کے ارادوں کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔ اس نے مہری سانس بھری۔

”اوکے۔ میں مہر سے بھی انفارمیشن لیتا ہوں۔ کبیر کو تو تب ہی انوالو کروں گا جب مجھے خود سارے معاملے کا پتا ہوگا۔“

وہ سنجیدگی سے بولا تو آغا جی گہری سانس لے کر رہ گئے۔ چوٹ اس بار سیدھی ان کے کلیجے پر لگی تھی جو بنا اجازت کسی کو اپنا ہاتھ بھی چھونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔



مہواہ خوب روئی، چیختی چلائی۔ مگر یہاں کون سا مہواہ آفندی کے پیارے بیٹھے تھے جو اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے اور اب وہ کتے کی کیفیت میں تھی۔
تو کیا اس کی اپنی ”مرضی“ ختم کر دی گئی تھی؟ یعنی اپنی ہی زندگی کے کسی فیصلے کو کرنے کا اختیار کھو بیٹھی تھی وہ؟ ایسے میں اغوا کار عورت نے اسے سمجھایا۔

”کچھ عقل سے کام لے۔ کیوں مرد سے مقابلے پر اترتی ہوئی ہے؟“ مہواہ نے نفرت سے اسے دیکھا اور کڑوے لہجے میں بولی۔ ”ایک کمزور لڑکی سے مقابلے پر تو وہ نامرد اترتا ہوا ہے۔ اتنا ہی بدلہ لینے کا شوق تھا تو آفندی ہاؤس کے کسی مرد کو چیتا۔ پھر پتا چلتا ہے۔“

وہ جانتی تھی کہ کہیں نہ کہیں نمبر آفندی بیٹھا اس کی تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس لیے جب تک ہمت رہی وہ یوں ہی للکار کر بولتی رہی۔ مگر اب۔ الٹی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ اسے نکاح کا الٹی میٹم مل گیا تھا تو ذہن سنستا اٹھا۔ ساری بہادری ختم ہو گئی۔

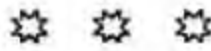
تب موقع دیکھ کر اس عورت نے اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔
”اللہ کا شکر ادا کرو کہ صاحب تم سے نکاح کر رہا ہے۔ بدلے کے لیے سہمی۔ یہ سوچو کہ وہ بنا نکاح کیے تمہارے پاس چلا آتا تو تم کیا کر سکتی تھیں؟“ وہ دم مگر پریقین انداز میں بول رہی تھی۔
”اب زبردستی کے نکاح کی واقعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اور اس ناجائز نکاح کے بعد اگر وہ شوہر کی حیثیت سے تمہارے پاس آ گیا تو؟“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ذہنی انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ مہواہ متوحش سی ہو گئی۔
اس نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے مہواہ کی آنکھوں میں دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولی۔
”تم اچھی لڑکی ہو۔ میرا دل کر رہا ہے کہ تمہیں کچھ عقل کی بات سمجھاؤں، اس نکاح کو تم ہی حلال شکل دے سکتی ہو۔ دلی رضامندی سے یہ نکاح کر کے۔“ مہواہ کا دماغ سن کیفیت میں تھا۔

”اللہ جانے تمہیں یہاں کب تک رہنا پڑے۔ واپس جانا نصیب ہو بھی یا نہیں۔ کہاں ناجائز رشتے کا بار اٹھاتی پھوگی۔“ ذہنی و جذباتی شکست و ریخت کے بعد مہواہ کو اس عورت کی کئی گئی باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر جو اس نے نہیں کہا وہ زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آیا۔

”یا اللہ! تو گواہ رہنا۔ میں زبردستی کے اس ناجائز رشتے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے اللہ میں اس نکاح پر دل سے راضی ہوں۔ میں اپنی دلی رضا سے اس شخص کو قبول کرتی ہوں جس کا نام نمبر و قار آفندی ہے۔“
اس نے اپنی مرضی و رضا سے ایجاب و قبول کیا۔ اسے کرنا ہی تھا کہ صیاد نے آزادی کے سارے روزن بند کر دیے تھے۔ پچھلی ہتھیار نہ ڈالتا تو اور کیا کرتا؟

مہواہ بے دم ہو گئی۔
تانی جان کے بین اور کوٹنے اونچے ہو گئے تو سہیل آفندی کی فیملی بھی افتاں و خیزاں مہواہ آفندی کے کمرے میں آگئی۔ سب کو اس گھر پر ٹوٹنے والی قیامت کا پتا چل گیا تھا۔ ترمین نے بے ساختہ حیرت و بے یقینی سے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا۔



طلال سکتے میں تھا۔

بے یقینی سے ماں کو دکھا۔ وہ خود بھی پریشان اور ابھری ہوئی تھیں۔

”آندھی ہاؤس“ سے فون آیا تھا۔ مہر کی چچی کا۔ وہ شادی سے معذرت کر رہی تھیں۔ مہراہ نے انکار کر دیا ہے شادی سے۔ ”ماما نے اسے بتایا مگر ایسے انداز میں جیسے خود اپنے منہ سے نکلنے والے لفظوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

”آئی کانٹ بلیو یا۔“ (میں یقین نہیں کر سکتا)

طلال نے بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے گویا خود کلامی کی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ بھی یقین نہ کرتا۔

اب جبکہ وہ واپس آچکی تھی اور طلال کو ہی کیا دونوں گھرانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اور شادی میں شخص تین روز باقی تھے۔

وہ جب سے آئی تھی طلال اور اس کی فیملی سے نہ جاگتے ہوئے ملی اور نہ کوئی بات کی تھی۔ پھر بھی طلال نے سب کو سمجھا لیا کہ وہ صدمے کی کیفیت میں ہے شادی تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مگر یہاں تو سارا معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔

”تم یقین مت کرو۔ کبھی مت کرنا۔ یہاں تمہارے باپ کی پگڑی اچھل رہی ہے اور تم اپنے یقین کو لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔“

ماما ذہنی خلفشار لیے اس پر برس پڑیں۔

وہ اب موبائل ہاتھ میں لیے تیزی سے مہراہ کو کال ملا رہا تھا۔

”میں نے کہا بھی تھا تم سے اپنی بھابھی کی بات مان لو۔ اس کی بہن اچھی خاصی تھی۔ مگر تم۔ اف۔ میرے اللہ سارے خاندان کو کارڈز بانٹ دیے۔ دوڑ کے مہمان کل سے آنا شروع ہو جائیں گے۔“ وہ شدید پریشانی کے عالم میں بیچانی انداز میں مسلسل کبھی ایک تو کبھی دوسری فکر میں مبتلا ہو رہی تھیں۔

”شش۔“ طلال شدید طیش کے عالم میں موبائل دیوار پر مارتے مارتے رہ گیا۔ دو بار کال کالی گئی اور اس کے بعد موبائل آف آنے لگا تھا۔

”کس کو فون کر رہے ہو؟“ ماما نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

”مہراہ کو۔“

”یو ایڈیٹ۔ اپنے باپ کو فون کرو۔ اور انہیں بتاؤ کہ کیسے پورے خاندان میں ہماری انسلٹ ہونے والی ہے۔“ وہ عرصے سے چلا میں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”ماما پلیز مجھے کنفرم تو کرنے دیں۔ تین دن رہ گئے ہیں شادی میں ایسے میں ایک فون کال آتی ہے معذرت کی تو کیا ہم شادی ملتوی کر دیں گے؟“

وہ ابھی تک بے یقین تھا۔ اسے یقین آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مگر وہ یونہی سر تھامے صوفے پر گر سی گئیں۔

ساتھ چچی نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں ان تک معذرت اور مہراہ کا شادی سے انکار پہنچایا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ ان تین دنوں میں طلال کے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر لیں۔

”میں خود جا کر پتا کرتا ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا تھا۔

ماما ہمت کر کے انھیں یہ سب طلال کے پایا کو سب سے پہلے بتانا ضروری تھا۔

”یا اللہ رحمہ۔ کس کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کی خوشیوں کو۔“ وہ شوہر کو فون کرتے ہوئے صدمے کی کیفیت میں تھیں۔
 چکن میں کھڑی کان ادھر ہی لگائے سب سنتی بھابھی کا دل بلیوں اچھلا۔ اپنی بہن کا روشن مستقبل بالکل سامنے دکھائی دیا تھا۔ وہ موبائل پر ان کو کال ملا کر خوش خبری سنانے لگیں۔



وہ آفندی ہاؤس پہنچا تو کھلبلی سی مچ گئی۔ مہراہ نے ملاحظہ سے خبر ملتے ہی کمرہ مقفل کر لیا۔
 ”اے کو منہ چھپا کر مت بیٹھے۔ خود بتائے طلال کو انکار کی وجہ۔“ تائی جان کا توتول خراب ہو رہا تھا۔ رو رو کر سرور سے پھساجا رہا تھا۔

انہیں پتا تھا خاندان بھر میں جو بے عزتی ہونے والی تھی۔ جو قہقہے ابھی لگے ہی نہیں تھے وہ ان کی آواز بھی اپنی سماعت میں محسوس کر رہی تھیں۔ جس نکاح کو سب کھیل کہہ رہے تھے باطل کہہ رہے تھے۔ مہراہ آفندی اے حلال نکاح کا نام دے رہی تھی۔

”میرا دل مطمئن نہیں امی۔ میں خود کو گناہ گار محسوس کروں گی طلال سے نکاح کر کے۔“
 آغا جان کا داغ خود اس ساری صورت حال پر شل ہو گیا تھا۔ وہ سب جو مطمئن تھے کہ بس فتویٰ لے کر اس نکاح کو باطل قرار دے کر تین روز بعد طلال کے ساتھ مہراہ کو رخصت کر دیں گے۔ اب پھر سے پہلی سیڑھی پر اکھڑے ہوئے۔

”اے چائے پلا کر ڈرائنگ روم سے ہی رخصت کر دو کبیر۔“
 آغا جان نے اسٹڈی روم سے حکم جاری کیا تھا۔ کبیر مونہ بانہ سر جھکا تا ڈرائنگ روم میں آیا تو پردے پر نظریں جمائے بیٹھا طلال بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر مہراہ کے بجائے کبیر کو دیکھ کر امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ کبیر نے اس کا تاریک پڑنا چہرہ واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ مصافحہ کر کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھتے دونوں ہی بے چینی کی کیفیت میں تھے۔

”میں مہراہ سے ملنے آیا تھا۔ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔“ طلال نے سیدھے سجاؤ کبیر ہی سے مدعا بیان کر دیا۔ جو عام حالات میں تو ہرگز نہ کرتا۔ مگر آفندی ہاؤس والوں نے تو حد ہی کر دی تھی۔ کوئی بھی طلال سے ملنے نہیں آیا تھا۔ الٹا کبیر کو ”سفیر“ بنا کر بھیج دیا۔ (تو ٹھیک ہے پھر سفیر ہی سہی)
 ”مجھے دیکھ کر بھی آپ کو حالات کی سمجھ نہیں آئی طلال صاحب۔؟“ کبیر نے سادگی سے کہا تو طلال بھڑک گیا۔

”میں وجہ ہی تو جاننے آیا ہوں ان حالات کی جو ”ایک دم“ سے بدلے ہیں۔“
 ”آپ کے گھر فون کر دیا گیا تھا۔ آپ کو علم تو ہی گیا ہو گا سر“ وہ مؤدب ہو کر بولا۔ پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ”ابھی چائے آرہی ہے۔ اس کے بعد ہی آپ جا سکتے ہیں۔“ صاف لفظوں میں ”گیٹ آؤٹ کال“ کبیر کے انداز کو سمجھتے ہوئے طلال کے اندر طیش کروٹیں لینے لگا۔

”اوہ۔ آئی سی۔“ وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”یعنی ان لوگوں میں سے کوئی بھی مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔“
 ”یہ لیں۔ چائے بھی آگئی۔“

ملازمہ چائے کی ٹرالی اندر لائی تو کبیر نے طلال کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ طلال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات میں سرد مہری تھی۔

”چائے تو اس گھر میں عیس کسی ”حیثیت“ ہی سے پیوں گا۔ تباہ تان سب کو۔“
وہ سرد لہجے میں کہتا ڈرانگ روم سے نکل گیا تھا اور اس کے دکھ کو شدت سے محسوس کرتا، کبیر کئی ٹانیوں تک
ہلتے ہوئے پردے کو دکھتا رہا۔

وہ آغا جان کو ”رپورٹ“ دینے جا رہا تھا کہ راستے میں مہراہ کے کمرے کا دروازہ ایک دم سے کھلا۔ وہ عاداتاً
سیدھا چلا گیا۔

”کبیر۔“ آنسوؤں میں ڈوبی نمکین سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ رک گیا۔ پاؤں جیسے زمین نے جکڑ
لیے۔

اسے لگا وہ اس چہرے کو اس قدر دکھی کیفیت میں کبھی دکھنا نہیں چاہے گا۔
”کیا کہا اس نے؟“ جانے ضبط و برداشت کی کن بلندیوں پر کھڑی وہ پوچھ رہی تھی۔
”آپ سے بات کرنے آئے تھے لی بی۔ آغا جان نے کہا چائے پلا کر رخصت کرو۔“
وہ یونہی رخ موڑے آہستہ آواز میں بولا۔

کبیر کا تو احساس جرم ہی نہ جاتا تھا۔ نہ وہ وہاں سے فیکٹری جاتا اور نہ مہراہ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا۔ وہ تو اس
سے آنکھ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

”ہم۔ اچھا کیا۔“ آنسوؤں میں ڈوبے لہجے میں کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ لب بھینچے سر جھکائے آگے
بڑھتے کبیر نے گھٹی گھٹی سی رونے کی آواز واضح سنی تو دل نئے سرے سے تاسف کا شکار ہونے لگا۔



”شکر کرو طلال، ان لوگوں میں تھوڑی سی انسانیت باقی تھی جو انہوں نے تین روز پہلے تہا دیا۔ اگر شادی کے
روز انکار کرتے تو سوچو ہم کہاں کھڑے ہوتے۔“ گھر میں کچھری بجی تھی۔ پیپا اسے سنبھار رہے تھے اور وہ کسی
صورت سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ ان لوگوں سے وجہ تو پوچھیں۔“ وہ پاگل نظر آ رہا تھا۔ دیوانہ۔ جیسے زندگی ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہو۔
”دماغ صحیح ہے تمہارا۔؟ وہ لوگ صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ لڑکی ہی اس شادی پر راضی نہیں ہے تو
اور کیا وجہ جانتا باقی رہ جاتی ہے۔“ پیپا نے غصے سے کہا۔

”کرچکا ہوں اس کے باپ کو فون۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ اس حادثے نے لڑکی کے ذہن پر برا اثر ڈالا ہے
اور وہ کسی طور بھی شادی کے لیے راضی نہیں ہو رہی۔“

”تو ہم شادی کی تاریخ آگے کر دیتے ہیں پیپا۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟“ اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔
”سب حل پیش کرچکا ہوں میں۔ مگر انہوں نے معذرت کر لی ہے کہ وہ یہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتے۔ نہ اب نہ
آئندہ کبھی۔“ وہ سخی سے بولے۔

لاڈلے بیٹے کا خود سے بے گمانہ انداز دیکھتے تھے تو دل نہیں کرتا تھا کہ اس کا دل توڑنے والی بات کریں۔ مگر
نی وقت تو اس کی ہر آس اور امید کو توڑنے میں ہی اس کی بہتری تھی۔

”آپ میری کنڈیشن نہیں سمجھ رہے پیپا۔ وہ لڑکی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں اس طرح
اپنے خوابوں کو اجڑتے نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ اسے بال نوچنے کو تھا۔

گوئی ایسے شخص سے پوچھے جسے بینائی دے کر واپس لے لی گئی ہو۔ طلال اس وقت ایسا ہی شخص تھا۔
”میں جانتا ہوں طلال اور اسی لیے تمہاری زندگی کے اس اہم فیصلے پر ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی اعتراض

نہیں اٹھایا۔ مگر اب بات عزت پر مبنی آئی ہے مائی سن۔ تم وہاں گئے اور ان لوگوں کا رویہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہو۔ اب اور کیا پوچھنا باقی رہ گیا ہے؟“

پاپا نے رمان سے سمجھایا تو وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔
 ”یہاں بیٹھو۔ اطمینان سے سوچو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں اور ہمارے ساتھ مل کر فیصلہ کرو۔ مہراہ کے علاوہ کسی بھی لڑکی کا نام لو۔ ہم اس بار بھی تمہاری پسند کو خوش دلی سے قبول کریں گے۔“
 وہ بہت آرام سے کہتے طلال کو دنیا کے ظالم ترین انسان لگے۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا کر وہ یقیناً اس کی برین واشنگ شروع کرنے والے تھے۔ مگر جو بھی اسے مہراہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کو کہتا وہ ظالم ہی تو تھا۔
 طلال اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے سوچنے دیں پاپا۔ اپنی اس غیر یقینی بربادی کے بارے میں۔ اس ذلت کے بارے میں جو بیٹا کسی قصور کے میرے ماتھے پر مل دی گئی ہے اور اس انسلٹ کے بارے میں جو آئندہ ہاؤس والوں نے کی۔ مجھے وقت دیں سوچنے کا۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ بے بسی سے ہارے ہوئے انداز میں بولا تو انہوں نے اٹھ کر اسے شانوں سے تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اور درشتی سے بولے۔
 ”بی اے مین (مردہنو) شان دار ماضی پر رونے کے بجائے مستقبل کو شان دار بنانے کا سوچو۔ تم اب مہراہ آئندہ سے آگے کا سوچو گے۔ اینڈ اس مائی آرڈر۔“ (اور یہ میرا حکم ہے)
 طلال نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔ تو وہ دھیسے پڑ گئے۔

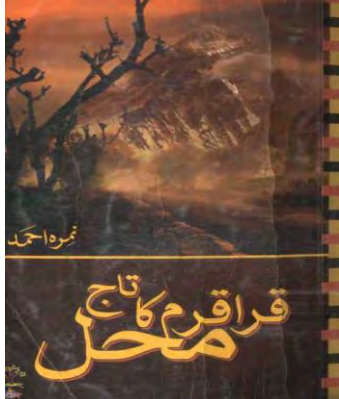
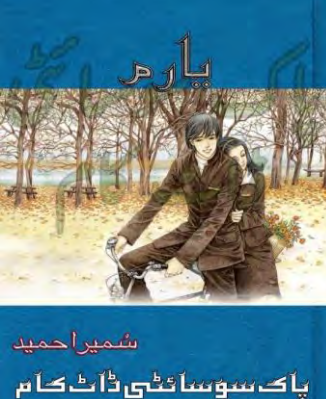
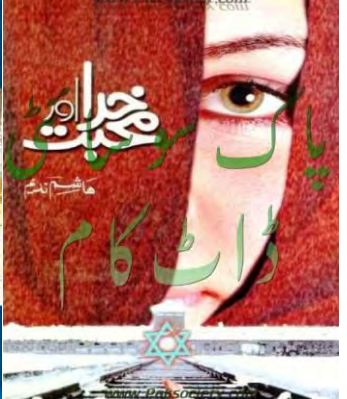
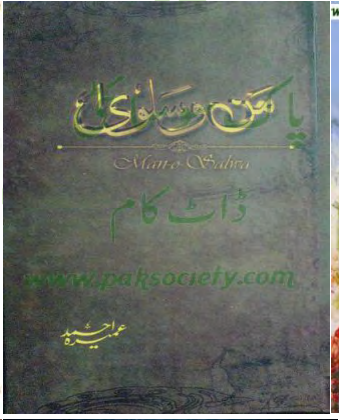
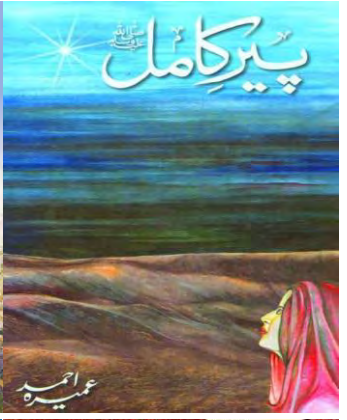
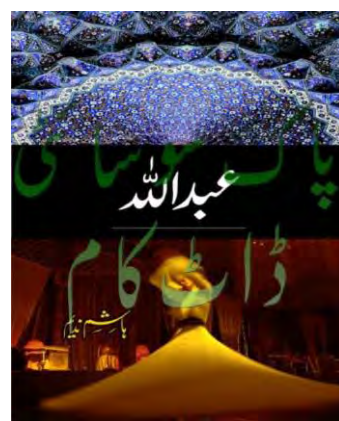
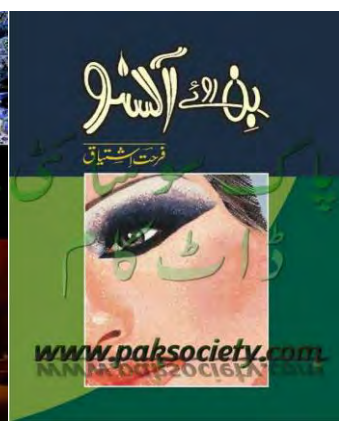
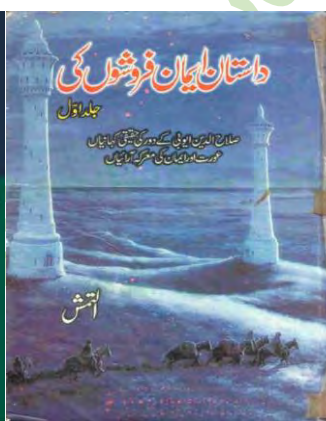
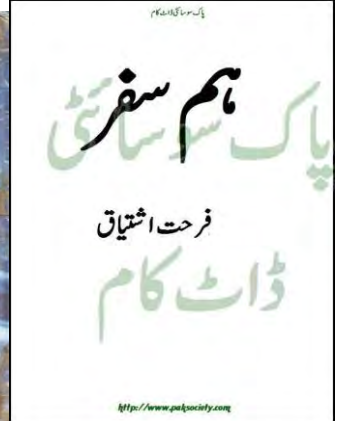
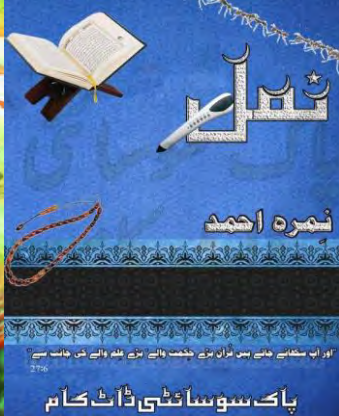
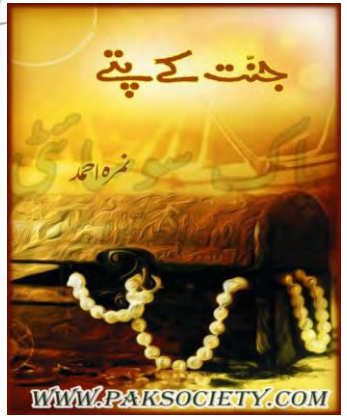
”انہوں نے ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا طلال۔ اب اپنے باپ کی برسوں کی بنائی عزت تم ہی بچا سکتے ہو۔“ اب کی بار اس کے کندھوں پر ان کی گرفت دوستانہ تھی۔ مگر ان کے لب و لہجے اور الفاظ سے جھٹکتی قطعیت طلال اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان کا ہاتھ ہٹاتا وہاں سے تیز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو بھی اپنے شانوں پر اپنے گھرانے کی عزت کا بار محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کا حتمی فیصلہ کر کے اپنے والدین کو بتانا تھا۔ بھابھی کی بہن۔؟
 طلال نے اس وقت مہراہ سے سخت نفرت محسوس کی۔ اس کی زندگی کو اس دورا ہے پر لا کر چھوڑ دینے والی وہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ نجانے کتنے گھنٹے گزر گئے وہ شل ہوتے داغ کے ساتھ اپنی اگلی زندگی کے بارے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 کل تک اپنی زندگی میں وہ ہر بات مہراہ کے ساتھ اس کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ آج اس خانے میں کسی خیالی پیکر کو رکھ کر سوچنا اسے موت لگ رہا تھا۔

(تو میں وہ فیصلہ کیوں نہ کروں جس سے چوٹ مہراہ آئندہ کے دل کو بھی لگے) اس کا ذہن ہی نہیں چوٹ کھائی اتنا بھی انگڑائی لے کر بے وار ہوئی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا۔
 اس کی آنکھوں میں چھائی صدمے اور بے یقینی کی کیفیت کی جگہ اب وحشت نے لے لی تھی۔
 وحشت جو سکون قلب حاصل کرنے کے لیے آدمی سے کچھ بھی کر دیتی ہے۔ طلال بھی اب اس مقام پر تھا کہ ”کچھ بھی“ کرنے کو تیار تھا۔

اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہاتھ مار کر تکیے کے پاس رکھا موبائل اٹھا کر کسی کو کال ملائی۔
 آنکھوں میں پھیلی سرخی اس کی بدترین ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال اینڈ کر لی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



گئی۔
”طلال بول رہا ہوں۔ سارا معاملہ تم تک بھی پہنچ چکا ہوگا۔ مہراہ سے میری شادی نہیں ہو رہی۔ کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لمبے میں پوچھ رہا تھا۔
(اور طوفان ٹھہرے ہوئے سمندروں کی تہ میں ہی ہوا کرتے ہیں)
دوسری طرف وہ اس قدر غیر متوقع پروپوزل پر دنگ رہ گئی۔



دروازے پر ہلکی سی دستک نے مہراہ کو بے زار کیا تھا۔ وہ الماری کا پتہ بند کرتی پلٹی۔
”آجاؤ۔“ وہ اسی بے زاری سے بولی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر موحد اندر داخل ہوا تھا۔
مہراہ نے لب بچھے اور سینے پر بازو پٹیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بزبان خاموشی پوچھ رہی ہو۔ جی فرمائیے؟

مگر آنے والا تو گویا فرصت میں تھا۔
ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پنچوں کے بل خفیف سا اچکتا، وہ ناقدانہ نظروں سے اس کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ہم۔ ٹائٹس روہ۔“
مہراہ نے کوفت محسوس کی۔ ”میرے کمرے کی انٹیریر (آرائش) پر تو سیر حاصل گفتگو کرنے نہیں آئے ہو گے تم۔“ مہراہ نے تلخی سے کہا تھا۔

موحد نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ ”آیا نہیں۔ بھیجا گیا ہوں محترمہ۔“ جتا کر بولا۔
”آغا جان سے کہہ دو کہ یہ چند دن گزر جانے دیں۔ پھر جو طوفان اٹھانا ہے اٹھالیں۔“ وہ غصے سے بولی مگر براہو اس آواز کا جواب جو ضبط کے عین موقع پر بھرا گئی۔

”نیمیر تک پہنچنے کے لیے یہ انوسٹیشن گیشن بہت ضروری ہے مہر۔“ موحد سنجیدہ ہوا۔
مہراہ تھک کر بستر کے کنارے پر ٹنگ گئی تو وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔
”اب کیا فائدہ اس ساری بھاگ دوڑ کا موحد۔ جب میں زندگی کے کھیل سے ہی باہر کر دی گئی ہوں۔“
وہ ٹوٹے ہوئے لمبے میں بولی تو ایک آنسو پلک سے ٹوٹ کر رخسار پر ستارے کی مانند آن اٹکا۔
موحد نے نگاہ چرائی۔

”مجھے شروع سے بتاؤ مہراہ! تم ان میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟ نیمیر کو دیکھا تو ہو گا تم نے؟“ کیا کہتا ہے وہ۔ محض نکاح کر کے تمہیں واپس چھوڑ جانا!! کچھ تو ڈییمانڈ ہوں گی اس کی؟“ وہ تابدوڑ سوال کر رہا تھا۔ مہراہ شکتہ دلی سے بولی۔

”وہ اب کہاں ملے گا موحد۔؟ بلکہ وہ اب کبھی نہیں ملے گا۔“ پھر اس نے خوف زدہ ہو کر جھرجھری سی ملی۔
”اور اگر وہ نہ ملا تو۔؟“ اس نے نم آنکھوں سے موحد کو دیکھا۔ ”کیا میں ساری عمر اس قید میں جکڑی رہوں گی موحد؟“

وہ امید بھری نظروں سے پوچھ رہی تھی۔ موحد نے گہری سانس بھری۔
”وہ۔ ایک جانا پہچانا شخص تھا موحد جیسے اسے کہیں دیکھا ہو میں نے۔“ نیمیر آئندی کی شکل ذہن میں لاتے

ہوئے مہراہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ تو موحد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب۔ یعنی ملنے جلنے والوں میں سے کوئی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس یونہی۔ کچھ دیکھا ہوا چہرہ۔“

وہ مزید الجھی۔ پھر یک لخت ہی جیسے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کوئی دھند تھی جو ایک دم سے چھٹی تھی۔

”ہاں۔ میرے خیال میں مجھے یاد آگیا کہ وہ کون تھا۔“ وہ بے اختیار سنسنی خیز انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

موحد نے ایک ٹھہری ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

وہ بغور اسی کو دیکھ رہی تھی۔ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور میرے خیال میں تو تم بھی اس شخص کو جانتے

ہو موحد آندی۔“

چند لمحوں تک اسے دیکھنے کے بعد وہ ہلکا سا کھنکارتے ہوئے اٹھ کر مہراہ کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں دو

نفوس کے ہوتے ہوئے بھی بے حد خاموشی تھی۔ بامعنی خاموشی۔



طلال فریش ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو رات بھر کی بے خوابی اس کی سرخ آنکھوں اور مضحل انداز سے ظاہر

تھی۔

”میں تمہاری پسند کا ناشتہ تیار کرنے ہی لگی تھی تلال۔“ بھالی آج ضرورت سے زیادہ ہی خوش تھیں۔

ابھی چند لمحوں بعد ہی ان کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اتنی افراتفری میں تو ان ہی کی بہن ملتی تلال

کو شادی کے لیے۔

”ابھی بھوک نہیں ہے بھابھی۔ رہنے دیں۔“ اس نے انہیں وہیں روک دیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ کرسی پر بیٹھ

گئیں۔

ماما کا دل مضطرب ہوا۔ کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جمائے کھڑا وہ کچھ کہنے یا نہ کہنے کی کھٹکھٹ میں گھرا تھا۔

”تھوڑا سا ہی کچھ کھا لو تلال۔ رات کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تم نے۔“ ماما نے تشویش سے کہا۔ مگر وہ

باپ کی طرف متوجہ تھا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے پاپا۔“ وہ بہت ہارے ہوئے انداز میں بولا تو اس کی دلی تکلیف کا احساس کر کے ماما کی

آنکھیں نم ہونے لگیں۔

بھالی سراونچا کر کے نفا خزانہ بیٹھ گئیں۔ ان کی بہن کو ٹھکرانے والے کو سزا تو اچھی ملی تھی۔ مگر چلو۔ اب بچھتا

کر لوٹا ہے تو اور بھی اچھی بات ہے۔ خوب قدر کرے گا میری بہن کی۔ وہ اندر ہی اندر محفوظ ہو رہی تھیں۔

وہ تینوں خطر نظروں سے تلال کو دیکھنے لگے۔

”میں تزیین آندی سے شادی کروں گا پاپا۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہتے ہوئے گویا ہم ہی پھوڑ دیا تھا۔ وہ

تینوں نفوس ہی بد کے

پاپا کے تاثرات فوراً ہی بدلے۔ درشت لہجے میں کہا۔

”دامغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟“

ماما نے بے اختیار ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ ہو گئے۔

بھالی نے بے یقینی کے سمندر سے بمشکل نکلتے ہوئے تلخی بھرا طنز کیا۔

”تم نے تو شاید منت ہی مان لی ہے کہ اسی گھر کے داماد بنو گے۔“ تلال نے سلگتی نظروں سے انہیں دیکھا اور چیخ

کر بولا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ آپ کے گھر کی نہیں مانی تھی منت۔“

بھالی نے غصے سے سر جھٹکنا تھا۔

ماما نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”ہوش کے ناخن لو طلال۔ وہ لوگ ایک بیٹی کے رشتے سے انکاری ہیں۔ دوسری کے لیے کیسے مائیں گے۔“

”آپ نے ایک نام پوچھا تھا۔ وہ میں نے بتا دیا ہے ماما! آپ ان سے بات کریں۔ وہاں سے انکار نہیں ہوگا۔“ وہ ضبط سے کہہ کر پلٹ گیا۔

”طلال۔ بات سنو میری۔“ پاپا نے غصے سے آواز دی تھی۔ وہ ٹھہرا ضرور مگر پلٹا نہیں، محض چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا۔

”اگر آپ کو اعتراض ہے تو پھر یہ شادی نہیں ہوگی پاپا۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر قطعیت سے بولا۔

”کبھی بھی نہیں۔“

وہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ پاپا کو مزید غصہ آیا۔

”اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ماما سے بولے۔

”پتا کر لیں پاپا۔ ہو سکتا ہے طلال کی تزئین کے ساتھ بھی سیٹنگ ہو۔ یونہی تو اتنے کانفیڈنس سے نہیں کہہ رہا تھا۔“

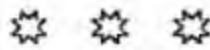
بھالی کی مسکراہٹ طنزیہ اور لہجہ آگ لگانے والا تھا۔ طلال نے تو ان کا دماغ ہی گھما دیا تھا۔ بھالی کو افسوس ہوا۔ ایسے ہی ماں بہن کو پھر سے آس دلا دی۔

ماما پاپا کو سو کا انداز برداشت کرنا پڑا۔ طلال نے انہیں کوئی جواب دینے لائق چھوڑا ہی کب تھا۔

”میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا کرنا چاہتا ہے یہ لڑکا۔“ ماما نے شدید پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”میں بات کرتا ہوں آغا جان سے۔ مہواہ تو ذہنی ڈسٹرنس کی وجہ سے شادی سے انکار کر رہی ہے۔ ویسے تو انہیں طلال پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

پاپا اب ٹھنڈے دل و دماغ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ آقندی ہاؤس والوں کے رویے نے انہیں بد دل کر دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر ایک بار پھر ان کے دروازے پر جانے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔



تزئین پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ جب سے طلال کی کال آئی تھی۔ وہ بے یقینی کا شکار تھی۔

اف۔ جس چاند کو چھونے کی اس کے دل میں محض حسرت تھی۔ وہ اس کے آنگن میں جگمگانے کو تھا۔

واہ اللہ۔ تو بھی بڑا بے نیاز سے قدرت والا ہے۔ جب چاہے جو چاہے سو کرے۔

اس نے فوری طور پر ماں کو جا کر اپنے تئیں خوش خبری سنائی۔ انہوں نے پھیٹی نگاہوں سے بیٹی کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

”یا گل تو نہیں ہو گئی ہو تم۔ کل میں نے خود فون کر کے اس کی ماں تک مہواہ کے رشتے سے انکار پہنچایا ہے۔“

”تو کیا ہوا امی۔ وہ مہواہ کا مسئلہ تھا۔ اسے نہیں کرنی شادی تو نہ کرے۔ ہم نے تھوڑی کہا ہے اسے انکار کرنے

کو۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔ پھر دے دے ہوش سے بولی۔

”طلال نے خود کہا ہے کہ اس کی ماما اب میرے لیے بات کرنے والی ہیں اور وہ اسی دن نکاح چاہتے ہیں جس روز
طلال اور مہواہ کا طے تھا۔“ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔
سارہ چچی جو بیٹی کو صلواتیں سنانے لگی تھیں اس کے چہرے سے چھلکتے رنگوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔
”آپ کو بڑا شوق تھا کہ میں بھی کوئی لڑکا پسند کر لوں۔ دیکھ لیں خود اللہ نے بھیج دیا میرے لیے۔ بس آپ ابو
سے کہہ دیں کہ طلال کی ماما کو انکار نہیں کرتا۔“

وہ زیرو زبر ہوتی سانسوں کے ساتھ شرمگین انداز میں کہہ رہی تھی۔ سارہ چچی چپ تھیں۔
انہیں فی الفور اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ طلال کو تزئین بھی ویسے ہی پسند کرتی تھی جیسے کہ مہواہ۔ مہواہ
کی شادی کے لیے بدولی اور بدواغی کا مظاہرہ کرنے والی تزئین اب پورے دل سے خوش دکھائی دے رہی تھی۔
وہاں سے پلٹ گئی۔

”آپ لوگ آغا جان کو بھی منالینے کا امی۔ پلیز۔ بس طلال۔“ وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔
جانے قدرت کیا رنگ دکھانے والی تھی۔



وہ اولین جھٹکے سے جلد ہی سنبھل گیا تھا۔

”میں۔ میں جانتا ہوں اسے؟ کون ہے وہ؟“ وہ بے حد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔
”وہ شخص۔ جو اس روز ہماری گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا اور گاڑی سے اپنی گاڑی بھی ٹکرائی اس نے۔ تم نے اسے
بھاڑا بھی تھا۔“

وہ تیز تیز ہتا رہی تھی۔ تنفس بے ترتیب اور نرمی سے گلابی ہوتی آنکھیں۔
”ہاں۔ یاد ہے وہ واقعہ مگر وہ بند ہے۔“ وہ الجھا۔ ”گاڑی تو کسی کی بھی ٹکرا سکتی ہے کسی کی گاڑی سے۔“
”نہیں وہ وہی تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ وہ کسی سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ جانے
کب سے وہ ہماری مصروفیات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ موقع کی تلاش میں تھا۔“
وہ ہیرانی انداز میں کہتی ہوئی آخر میں چیخ کر بولی اور خود پر سے قابو کھو کر رو پڑی۔
موحد کی آنکھوں میں تاسف ابھرا۔

اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر قسمت جس نے آزمائش کے لیے مہواہ آفندی کو چننا اب کیا ہو
سکتا تھا۔

”ریلیکس مہر۔ ایزی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے نرمی سے اسے تسلی دی۔
”اب کچھ بھی، کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا موحد! میرے لیے تو کبھی بھی نہیں۔“ وہ خود ترسی کے سے انداز
میں بولی تھی۔ پھر دوپٹے سے رگڑ کر آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔
”جو یاد تھا وہ بتا دیا تمہیں۔ آغا جان کو بتاؤ تا اب اگر کچھ ہو گا تو بس یہی کہ وہ نمبر آفندی کو ڈھونڈ نکالیں۔ اور
گوئی مارویں اسے میرے سامنے لا کر۔“

وہ بے حد تنگی سے بولی تو موحد نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر تاسف سے کہا۔
”یہی نسل در نسل دشمنی لے ڈوبی ہے تم لوگوں کو۔ نمبر آفندی بھی تو پھر تم لوگوں کا خون ہے نا۔ اس کے عمل پر
پھر اعتراض کیا؟“

”تمہارا خیال ہے کہ اس نے صحیح کیا جو بھی کیا؟“ مہواہ نے صدمے سے پوچھا۔

”میں صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔“ وہ مختصراً بولا۔
 ”وہ صرف ہم لوگوں کو اذیت دینا چاہتا ہے اور بس۔“
 مہواہ تھک کر بولی۔ موجد چند ثانیوں تک اسے دیکھنے کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا۔
 ”آہ۔۔۔ طلال۔۔۔ کیسے لمحوں میں میری زندگی، میرے ہاتھ کی لیکروں سے نکلے ہو تم۔“
 وہ پھر سے رونے لگی تھی۔



طلال کے گھر سے آنے والا فون آغا جان کے موبائل پر آیا تھا۔ طلال کے والد کا مدعا جان کر آغا جان کو خفیف سا جھٹکا لگا۔

”مہواہ کا مسئلہ ہم سمجھتے ہیں آغا جان۔ وہ بچی واقعی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے۔ مگر ہمیں تو آپ کی سب ہی بچیاں ایک سی بیماری ہیں۔ تقدیر میں نہیں لکھا تھا کہ مہواہ ہماری ہوئے۔ لیکن آپ کے گھرانے سے رشتہ جوڑنا ہمارے لیے باعث عزت ہے۔ سو آپ مہروانی کریں تو ہم اسی تاریخ کو طلال اور تزین بیٹی کا نکاح کیے لیتے ہیں۔ خاندان میں آپ کی عزت بھی رہ جائے گی اور ہمارا پرہ بھی۔“
 انہوں نے بہترین طریقے سے طلال کا مقدمہ آغا جان کے سامنے پیش کیا تھا۔
 آغا جان نے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کھنکار کر گفتگو کا آغاز کیا تو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔



”ملائکہ تو تڑپ رہی ہے وہاں پاکستان آنے کے لیے۔ میں نے ہی منع کیا۔ جب شادی ہی نہیں ہو رہی تو کیا فائدہ آنے کا۔ خواہ مخواہ اس کی سسرال تک باتیں جائیں گی۔ ابھی تو کہہ دیا کہ فی الحال شادی کینسل ہو گئی۔“
 تائی جان افسردگی سے مہواہ کو بتا رہی تھیں جو منہ مٹھل سی تکیے سے ٹیک لگائے سو گوار بیٹھی تھی۔ اس کا ماتم تو ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ آنکھ خشک بھی ہوتی تو دل روتا رہتا۔
 اسی وقت ملاحہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر آئی تو ماں کی آخری بات سن لی۔ اس کی رنگت فق تھی۔ وہ آ کر مہواہ کے پاس ڈھمے سی گئی۔
 تائی جان متوحش سی ہو گئیں۔ ”تمہیں کیا ہوا۔۔۔ سب خیر تو ہے نا؟“
 اب تو ہر آہٹ پر دل ڈر سا جاتا تھا۔ ملاحہ نے حسرت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مہواہ کو دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
 ”کیا ہوا ملاحہ۔۔۔ بتا دو پلیز۔“

مہواہ کا دل جیسے مٹھی میں آگیا تھا۔ سراسیمہ ہو کر بولی۔
 ”ملائکہ آپلی کو آنے دس امی۔ آغا جان نے نہ تو شادی کینسل کی ہے اور نہ ہی طلال بھائی کو جواب دیا ہے۔“
 وہ بھیکے لہجے میں بولی تو نظریں مہواہ کی اڑی رنگت پر تھیں۔
 ”مگر میں اعتراض کا حق رکھتی ہوں۔ میں نے انکار کر دیا ہے اس شادی سے۔“
 مہواہ کی گردن میں کوئی پھندا سا ساخت ہونے لگا۔ وہی جانتی تھی کہ کس دل سے وہ یہ الفاظ کہتی تھی۔
 ”ہاں آپلی۔۔۔ تمہیں اعتراض تھا۔ مگر تزین آپلی کو تو کوئی اعتراض نہیں نا طلال بھائی سے شادی پر۔۔۔“ ملاحہ ضبط کھو کر بچوں کی طرح رو دی تھی۔
 اور مہواہ۔۔۔ اسے لگا اس کے بدن سے روح پرواز کرنے لگی ہو۔

”اللہ کی ماران آستین کے سانپوں پر۔“
تائی جان کے دل پہ ہاتھ پڑا۔ تو وہ تڑپن اور ساتھ چچی کو کونسنے لگیں۔ ملاحظہ ابھی بھی مہو کا ہاتھ تھا مے روری
تھی۔ اور مہواہ سپید پڑنی رنگت کے ساتھ ساکت و جاہد تھی۔ جیسے کوئی بے روح جسم۔



”آغا جان! کیا واقعی آپ نے طلال کا پروپوزل تڑپن کے لیے قبول کر لیا ہے؟“
مبین آفندی کو شدید دھچکا لگا تھا۔ جبکہ سہیل آفندی بیوی کی سکھائی پٹی کے نتیجے میں چپکے ہو رہے۔
”بھئی آغا جان کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ کس کی مجال۔“ انہوں نے بھائی کے سامنے سارا الملبہ آغا جان
پر ڈال دیا۔

”تو۔ کیا مسئلہ ہے اس میں؟“ آغا جان نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے انہیں سخت نظروں سے دیکھا۔
”مہواہ اس سے شادی سے انکار کر چکی ہے! ایسے میں پھر سے اس کا اسی گھر کا داماد بننا۔“
بات کرتے کرتے ان کی پیشانی چمک اٹھی تھی۔ آغا جان تند و تیز لہجے میں ان کی بات ہی کاٹ گئے۔
”انکار مہواہ نے کیا تھا۔ ہم نے نہیں مبین میاں! اور انکار کی وجہ مہواہ تھی طلال تو بے قصور تھا۔ پھر ہم کیوں
اعتراض کریں اس سے رشتہ داری جوڑنے پر۔“

انہوں نے اپنے روایتی رنگ لہجے میں کہا۔ تو مبین آفندی بہت کچھ زبان پر لاتے لاتے رہ گئے۔ کہ وہ ایک بیٹی
کے باپ تھے۔ کیسے کہتے کہ مہواہ کی پسند تھا طلال۔ اس نے کون سا اپنی مرضی سے طلال کو چھوڑا تھا۔ اب مہنوئی
کی صورت اسے قبول کرنا اور اسی گھر میں ہوتے طلال سے سامنا کرنا مہواہ کے لیے ایک قیامت ہو گا۔ آغا جان
اس جذباتیت سے کوسوں دور تھے۔

”بس اب مزید کوئی فضول اور تکملاً اعتراض اٹھا کر دنیا میں مزید تماشا مت بنانا۔ خاندان والوں کو یہی پتا ہے کہ
مہواہ کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں۔ ایسے میں تڑپن سے طلال کی شادی ہو جانا کوئی ایسی عجیب بات نہیں سب کے
لیے۔“ ہاتھ اٹھا کر تھکمانہ انداز میں بولے۔

”مہواہ کا بھی تو اس سارے قصے میں کوئی قصور نہیں آغا جان! وہ تو نا کر وہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے۔“ مبین بے
چارگی سے بولے تھے۔

”نا فرمان اولاد ہے تمہاری مبین آفندی۔ میں نے کہا تھا اسے اپنی زبان بند رکھے اور چپ کر کے طلال کے
ساتھ شادی کرا کے رخصت ہو جائے۔ مگر سارا اسلام تو جیسے ان لوگوں نے ہی پڑھا ہوا ہے۔ ہم تو گویا مسلمان ہیں
ہی نہیں۔“ آغا جان گرجے۔

”نکاح پر نکاح کیسے کرتی آغا جان۔ ایجاب و قبول کر لیا تو نکاح ہو گیا۔ چاہے کنڈیشن کیسی بھی تھی۔“
وہ دم مہم پڑ گئے۔ بیٹی کے ساتھ ہونے والے سانحے نے تو ان کی کمر ہی توڑ ڈالی تھی۔

”تو ٹھیک ہے پھر۔ جس کے نصیب میں جو تھا وہ اسے مل گیا۔ اب میں زبان دے چکا ہوں طلال کے باپ کو۔
جس کو اعتراض ہے وہ بے شک اس نکاح میں نہ بیٹھے۔“

وہ بڑی رکھائی اور کرختی سے کہہ رہے تھے۔ مبین آفندی دل موس کراٹھ گئے۔



”دیکھ لیا آپ نے ساری عمر میرا بھائی، میری بھتیجیاں کرتے رہے آپ! آستین کے سانپ نکلے سب۔“ تائی
جان کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔

مہواہ کو تو چپ سی لگ گئی تھی یہ خبر سن کر نہ بولی نہ آنسو بہائے۔ بس ساکت بیٹھی رہ گئی تھی وہ۔ تائی جان کی آنکھوں کے سامنے سے بیٹی کی شکل او جھل نہ ہوتی تھی۔ انہیں تو قدرت سے بھی شکوہ تھا۔
 (ہم نے ایسے کون سے گناہ کیے تھے بھلا جن کی ایسی سزا مل رہی ہے؟) انہیں یاد نہیں پڑتا تھا۔
 جن کے دلوں پر مہر لگ جائے انہیں یاد کرنے پر بھی اپنے گناہ یاد نہیں آتے۔
 ”ان کا کیا قصور ہے بھلا آغا جان کا فیصلہ ہے یہ۔“ وہ خود بہت مضطرب تھے۔ آغا جان کے اس فیصلے نے انہیں ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا۔

”تو وہ گون سا سنبھی کا کیا ہے۔ اگر تزیین کو اعتراض ہوتا تو وہ صاف کہتی۔ میں نہیں جانتی۔ کتنی منہ پھٹ ہے وہ۔ اور اس پھا بیٹا کتنی سا نہ کو دیکھو۔ ذرا جو دیدِ لحاظ رکھا ہو۔ وہ نہیں جانتی کہ مہواہ اور طلال۔“
 غصے سے تیز لہجے میں کہتے آخر میں ان کی آواز بھر آگئی تھی۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہیں۔ پھر خود پر قابو پا کر تلخی سے بولیں۔
 ”ذرا سی شرم کر لیتے سا نہ اور سہیل۔ میری بچی کے جذبات کا خیال نہیں ہے انہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے اس طرح کی رشتہ داری گانتھنا انہیں زیب دیتا تھا بھلا۔“

”اب کیا کیا جاسکتا ہے۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولے۔
 ”میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ سو کو کچھ دنوں کے لیے ننھیال بھیج دیں۔“
 صدیقہ بیگم کا دل چاہا اونچی آواز میں بین ڈالنا شروع کر دیں۔ کتنا ظلم ہو رہا تھا مہواہ کے ساتھ۔ مگر یہی بات جب مہواہ کے سامنے دہرائی گئی تو اس کی چپ کی مہر ٹوٹ گئی۔

”نہیں امی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے اونچی آواز میں قطعیت سے کہا تھا۔
 ”یہاں رہ کے دل جلاؤ کی اپنا۔ کیسے دیکھو گی سارا تماشا۔ اس طلال کی اصلیت بھی دیکھ لی تم نے اسے شرم نہ آئی یہ فیصلہ کرتے ہوئے۔“ تائی جان نے واویلا کیا تھا۔

”جس نے جو بھی کیا امی! جب میری قسمت ہی ایسی لکھی تھی تو میں کسی کو کیا الزام ہوں۔ وہ میرے لیے جوگ تو نہیں لے سکتا تھا نا۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”اسی لیے تو کہتی ہوں۔ یہاں رہ کر سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گی تو تکلیف ہوگی۔ جوگ نہ لیتا مگر کچھ شرم کر لیتا۔ اسی گھر میں داماد بن کر آنا ضروری تھا کیا۔ وہ نہیں جانتا تمہیں کتنی تکلیف ہوگی۔“
 تائی جان اس وقت صرف ماں بن کر سوچتی تھیں جب اپنے بچوں پر تکلیف آئی تھی۔

”اسے بھی تو میرے انکار سے تکلیف ہوئی ہے نا امی۔ وہ کون سا میرے انکار کے پیچھے کی وجہ جانتا ہے جو احساس کر کے کوئی فیصلہ کرتا۔ اسے تو کسی نے اصلیت بتائی ہی نہیں۔“
 مہواہ آنکھیں پونچھتے ہوئے پھیکے انداز میں مسکرائی تھی۔ تائی جان گہری آہ بھر کے رہ گئیں۔



ملائکہ کو سارے حالات کی خبر تھی۔ مگر اب اس نئی ”خوش خبری“ نے تو اسے صدمے میں دھکیل دیا۔
 ”حد ہوتی ہے بے حسی کی امی۔ طلال کو تو چلو مہواہ کے ساتھ ہوئے واقعہ کا علم نہیں۔ مگر ہمارے گھر میں تو سب جانتے ہیں کہ طلال اور مہواہ کی پسند سے یہ شادی ہو رہی تھی۔“ وہ رودی۔

”یہاں کوئی کسی کا دل دکھنے کی پرواہ نہیں کرتا میری بچی۔ پتھر لوگ ہیں یہاں۔“ انہوں نے آہ بھری۔
 جب انسان پر خود پرین آئے تو وہ فوراً ”لفح و نقصان چیک کرنے لگتا ہے۔ یہی بندہ خدا لوگوں کے ساتھ ہر حد

تک ظلم روا رکھتا ہے تب اسے اپنی پتھریلی کا احساس نہیں ہوتا۔
 ”میں نہیں آرہی امی۔ دفع کریں ان لوگوں کو۔ آغا جان کے فیصلوں نے کبھی بھی ہمارے خاندان کو خوش
 نہیں رہنے دیا۔۔۔ ان ہی کا کیا مہواہ بھگت رہی ہے۔ انہی کا پوتا ہم سے بدلہ لے رہا ہے ان کی کرنی کا۔“ وہ صاف
 گوئی سے کہہ رہی تھی۔

تائی جان کا فون تھا ماہاتھ لرزا۔
 ایک دم سے زرنگار کی بھولی بسری خوب صورت شکل ان کی آنکھوں کے آگے آئی تھی۔
 اور وہ آخری ملاقات۔۔۔ بارش کی وہ رات۔ بات مکمل کر کے فون رکھنے تک وہ اسی عجیب سی کیفیت کے حصار
 میں تھیں۔

انہیں وہ ڈرا سہا اور ماں کے پیچھے چھپا لڑکا یاد آیا۔ مگر یاد کرنے پر بھی وہ اس کے نقوش یاد نہیں کرا پائی تھیں۔
 اس روز اس گھر کے کینوں نے میرو قار آقندی پر ترس یا رحم کی نگاہ ڈالی ہی کب تھی۔ جو اسے کوئی یاد رکھتا۔
 اور اب تو اس نے اپنا ایسا تعارف کرایا تھا کہ تا عمر وہ آقندی ہاؤس والوں کو بھولنے والا نہیں تھا۔



”مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا پطلال۔۔۔ تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سوچ۔“
 کل نکاح تھا۔ اور رات گہری تھی جب غیر متوقع طور پر پطلال نے تزئین کو کال کی۔ وہ تو ساتویں آسمان پر جا
 بیٹھی۔ اس کی آواز میں خمار سا اترنے لگا۔

”مہو نے انکار کیوں کیا تھا شادی سے تزئین؟“ تزئین کے رومانوی خیالات میں ڈوبے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔
 پطلال نے بڑے سرد لہجے میں پوچھا تھا۔

”یہ تو تم اس سے پوچھتے جس نے انکار کیا ہے۔“ سنبھلتے ہوئے تزئین نے تھیکے انداز میں ناگواری سے کہا۔
 ”تم کیا چاہتی ہو اب میں اسے کال کر کے اس سے پوچھوں؟“ قدرے توقف کے بعد اس نے بڑے سکون
 سے پوچھا تو تزئین گڑبڑائی۔ تمام ناگواری ایک سیکنڈ میں ہرن ہو گئی۔
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ فی الفور بولی۔

”تو پھر بتاؤ۔ مہو نے انکار کیوں کیا۔ کیا وجہ ہے اس انکار کے پیچھے۔ اس کی ذہنی کنڈیشن؟“ تزئین کی توجہ پر
 بن آئی۔

اب اگر وہ مہواہ کو پطلال کی نظروں میں یونہی مظلوم بنی رہنے دیتی تو امید واثق تھی کہ وہ آئندہ بھی اسے بے
 چاری ہی سمجھنے والا تھا۔ اس نے تیزی سے داغ دوڑایا۔ اسے یہ لمحے قسمت سے تھفتا ملے تھے۔ تزئین کو
 اچانک احساس ہوا۔

یہی وہ لمحے تھے جب مہواہ کو پطلال کے داغ سے بھی نکال سکتی تھی۔ (زندگی سے تو وہ خود بخود ہی نکل گئی۔)
 ”جو لڑکی شادی سے محض تین دن پہلے انکار کرے اس کا محض داغ تو خراب نہیں ہو سکتا پطلال۔“
 وہ محتاط انداز میں بولی تو اگلے چند لمحوں تک دوسری طرف سے محض سانسوں کی آواز آتی رہی۔ اتنی دیر تزئین
 کا دل دھک دھک کرتا رہا۔

”مجھے نہیں پتا پطلال۔ مگر جب مہواہ لاپتا تھی تب موحد بھی یہاں نہیں تھا۔“
 خوف سے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے تزئین نے جو منہ میں آیا وہ روانی سے کہہ ہی دیا۔ پطلال سے بولنا
 مشکل ہونے لگا۔

”وہ محبت کرتی تھی مجھ سے۔“ چند ثانیوں کے بعد وہ یقین سے بولا۔ جیسے اسے تزمین کی بات کا یقین نہ آیا

”کرتی ہوگی۔ مگر تب موحد نہیں آیا تھا تم دونوں کے درمیان طلال۔“ تزمین نے ڈھٹائی سے اپنی بتائی کہانی کو آگے بڑھایا تھا۔

”آئی ڈونٹ بلیم۔ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔“ وہ دکھ کے حصار میں تھا۔ بلکہ شاید بے یقینی زیادہ تھی۔

”اس نے کر دیا ہے ایسا طلال۔“ وہ زور دے کر بولی۔ پھر ذرا سی خفگی دکھائی۔

”نکل ہمارا اسپیشل ڈے ہے طلال اور تم مجھ سے ہم دونوں کی باتیں کرنے کے بجائے کسی تیسرے فرد کو ڈسکمیس کر رہے ہو۔“

”میرا حق بننا ہے یہ جاننا کہ کس وجہ سے مہواہ آندری نے مجھے رہ چھوڑا کیا ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

وہ ایک لخت مہو سے مہواہ آندری بن گئی تو تزمین کا دل پُر سکون ہونے لگا۔

”اس نے تمہیں نہیں اپنی قسمت کو رہ چھوڑا کیا ہے طلال۔ مجھ سے پوچھو کہ تم کیا ہو میرے لیے۔ کتنی اہمیت ہے تمہاری۔ کتنی اسپیشل فیئلنگز ہیں تمہارے لیے میری۔“ وہ مخمور انداز میں کہہ رہی تھی۔ اسے یقین دلا رہی تھی۔

مگر طلال کا دل تو تب خوش ہوتا جب اس نے تزمین سے رومانس جھاڑنے کی خاطر کال کی ہوتی۔ اب تو جو حقیقت اسے پتا چلی تھی اس نے ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا تھا۔

”اوکے۔ پھر بات کروں گا۔“ اسی ذہنی انتشار کے باعث اس نے مزید کچھ کہہ کر بنا کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

اب وہ تو جس بھی ذہنی کیفیت کا شکار تھا۔ مگر تزمین سر تباہ جل کر رہ گئی۔ مہواہ آندری سے منہ کی کھانے کے بعد بھی وہ اسی کے سوگ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا ”ابھی طلال کو میرا آندری کے مہواہ سے زبردستی نکاح والے قصے کا علم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ تو وہ اسے مظلوم جان کر میرے طلاق لینے تک مہواہ کے انتظار میں ہی بیٹھا رہتا۔ وہ جلتی کر دھتی سیدھی ماں کے کمرے میں آئی۔“

”طلال کا فون تھا۔“ بگڑے موڈ میں انہیں اطلاع دی۔ تو وہ فکر مند ہوئیں۔

”خیریت تو تھی؟“

”نہیں۔“ وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

”تو بتا دیتیں نا۔۔۔ نکاح پر نکاح تو نہیں ہو سکتا نا۔“ ساہرہ چچی نے اطمینان سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ بتا دیتی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”ناکہ وہ ساری ہمدردیاں مہواہ کے نام لگاوتی اور نکل پڑتا نمیر آندری کو ڈھونڈنے۔“

”اب وہ اس گھر کا داماد بننے والا ہے۔ کب تک اس سے یہ بات چھپائیں گے ہم۔“ انہوں نے تفکر سے کہا۔ تو وہ جھلا کر بولی۔

”اب گھر کی ہر بات داماد کو پتا ہو یہ ضروری تو نہیں۔“ پھر انہیں تاکید کی۔

”آپ سب سے کہہ دیں۔ کوئی بھی طلال کو یہ حقیقت نہیں بتائے گا کہ اغوا کے بعد نمیر نے زبردستی مہواہ سے نکاح کر لیا تھا۔“

”وہ تو اب ظاہر ہے کہنا ہی پڑے گا۔ پہلے تو اپنی عزت رکھنے کے لیے چھپایا تھا۔ اب اس رشتے کے لیے چھپانا پڑا ہے۔“

وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

طلال کی فیملی مختصر سے لوگوں کے ساتھ نکاح کے لیے آئندی ہاؤس ہی آئی تھی۔ اس طرف سے بھی خاندان کے محض خاص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔
 ”میرے کپڑے بھی نکال دینا ملاحظہ۔“ مہراہ نے ناشتا کرتے ہوئے کہا تو ملاحظہ چائے میں چینی ملانا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

تائی جان نے تڑپ کر اس کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھا۔

”کیوں خود کو امتحان میں ڈالتی ہو مہرو۔“

”اچھا ہے نا۔ عادت ہو جائے گی۔ ابھی دنیا سے چھپنے کی کوشش کروں گی تو پھر کبھی سامنا نہیں کرپاؤں گی۔“

”لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے مہرو۔“

”کر لینے دس امی! اندر کی بات تو کوئی بھی نہیں جانتا سب کو پتا ہے میرا کیسی ڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی۔“ وہ اندر سے چاہے مطمئن تھی یا نہیں۔ مگر ظاہر ہی کر رہی تھی کہ وہ پرسکون ہے۔
 یہ تو مہراہ آئندی کا دل ہی جانتا تھا۔ قیامت تو طلال کے ساتھ شادی سے انکار کرتے ہی آئی تھی مگر اب طلال کا ترمین کے ساتھ شادی کرنا۔ پوری رات نہ اس کی آنکھ لگتی اور نہ خشک ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب ایک ڈراؤنا خواب لگتا۔ اس نے اپنے مستقبل کو ہمیشہ طلال کے ساتھ سوچا تھا۔ اب تو آئندہ آنے والی زندگی ہی ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

اور اب وہ نکاح سے کچھ دیر پہلے ہی تیار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ اللہ جانتا تھا ہر لمحے اس نے کیسے آنسو بہائے تھے

”میرے اللہ۔ مجھے ہمت عطا کر۔ میرے دل سے طلال کا خیال نکال دے۔ یا اللہ۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



ہنزلیہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر سوتی آنکھوں کو تو لیے سے تھپتھا کر خشک کرنے تک وہ دل ہی دل میں محو
مناجات رہی تھی۔ اسے کوریڈور میں ہی چچی نے روک لیا۔
اسے سر سے پاؤں تک ناقدانہ نظروں سے دیکھا تو وہ گھبرا سی گئی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ انہوں نے کچھ ایسے انداز سے پوچھا کہ مہوشانے میں آگئی۔
”براہمت ماننا مہو۔ مگر ہا ہرز زمین کے سارے سسرال والے بیٹھے ہیں۔ وہی جن سے تم نے ملنا اور بات کرنا
بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ابھی تم جاؤ گی تو نکاح کے موقع پر پرانے کھاتے کھل جائیں گے اور میرا خیال ہے کہ تم اس
موقع کو خیریت سے گزر جانے دو۔“

وہ صاف لفظوں میں جو بات نہیں کہہ سکتی تھیں وہی گھما پھرا کر کہہ دی۔ یعنی وہ مہرانی فرما کر اپنے کمرے میں
ہی رہے۔

”چچی جان۔ میں اسی لیے وہاں جا رہی ہوں، تاکہ کسی کو باتوں کا موقع نہ ملے۔“ وہ سخت کے مارے رو نے والی
ہو گئی۔ بھلا شوق سے تھوڑی وہاں جا رہی تھی۔

”اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے کمرے میں ہی ہو۔ اللہ ہی جانے بیٹا۔ تمہیں پتا تو ہے ہمارے گھر کو کسی کی نظر
لگ چکی ہے پہلے ہی۔ اب بس خیریت سے میری بیٹی کا نکاح چٹ جائے۔“
پہلے اسے رکھائی سے کہہ کر پھر انہوں نے یوں دلگرفتی کا مظاہرہ کیا کہ مہواہ کو پہلی بار چپ رہنے کم بولنے اور
بظاہر بے وقوف دکھائی دینے والی ساہ چچی کے اندر کی خود غرض عورت دکھائی دی۔

تیزی سے کوریڈور میں داخل ہوتے موحد نے چچی جان کی آخری — بات سنی تھی اور سخت کے مارے (یا
شاید تکلیف کے؟) مہواہ کا سپید بڑا چہرہ بھی دیکھا۔
”مہواہ اندر نہیں بیٹھے گی۔ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے اس نے۔“ وہ تیز لہجے میں بولتا آگے آیا تو چچی جان سٹپٹا
گئیں۔

”میں تو بس اسی کی فکر میں کہہ رہی تھی۔ بے عزتی ہو گی سب میں۔“
”ہا۔ فارگیت اٹ چچی جان۔ کس میں اتنی اہمیت ہے کہ ہمارے گھر میں ہماری ہی انسلٹ کرے۔ تم چلو
مہو۔ اور جیسے چاہو فنکشن اینڈ کرو۔“

وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
”چچی جان شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری زندگی تو برباد ہو ہی گئی۔ کہیں میری نحوست تزئین پر بھی نہ پڑ
جائے۔“

وہ بڑے ضبط سے بولی تو آنکھیں شدت ضبط سے گلابی ہونے لگیں۔
”کم آن مہر۔“ وہ جھنجھلا یا۔
”ہنس۔“ چچی جان سر جھٹکتی چلی گئیں۔ انہیں موحد کی بے جا مداخلت بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ مگر اس
کے سامنے چلتی کس کی تھی بھلا۔

”میں تو صرف یہ سوچ کر نکاح میں شریک ہو رہی تھی کہ مجھ میں سب کا سامنا کرنے کا اعتماد پیدا ہو۔ میں کب
تک چھپ چھپ کر لوگوں سے کٹ کر رہوں گی۔ طلال آخری بار نہیں پہلی بار داماد کی حیثیت سے یہاں آیا ہے
اور آئندہ بھی آتا رہے گا۔ تو کیا میں تمام عمر اس سے چھپتی رہوں؟“
اس نے انگلی سے آنکھ کے آنسو کو جھٹکا تھا۔ موحد کو اس پر ترس آیا۔

”چلو آؤ تمہ“ اس نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے مہواہ کا ہاتھ تھاما اور باہر نکلا تھا۔

”موحد“ وہ اس کی اچانک حرکت پر اٹھاؤ نہ سکی۔

”جیب رہو۔ یوں ڈرو کی تو ساری دنیا ڈرائے گی تمہیں۔“ وہ تقریباً ”اسے کھینچتے ہوئے ہال میں ملایا جہاں نکاح کی سنت ادا کی جا رہی تھی۔

دل پہ جبر کی ذہنی انتشار پر بمشکل قابو پائے طلال نے پاپا کے ہاتھ کے دباؤ کو اپنے شانے پر محسوس کرتے ہوئے نکاح خانے پر جھک کر دستخط کرنے چاہے۔ ایک نظر۔ بس ایک نظری بلا ارادہ سامنے اٹھی تھی اور طلال کے دل کی دنیا زبر و زبر ہو گئی۔

وہ کچھ گھبرائی اور ہر اس کی موحد کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے لگا اور گرو بالکل سناٹا چھا گیا ہو۔ وہ اپنا اختیار کو شش کے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ تھے (تو ترمین نے سچ کہا۔)

”جی۔ یہاں سائن کریں۔“ رجسٹرار نے ایک بار پھر اس کی توجہ نکاح خانے کی طرف مبذول کرائی تو ایک چھناکے سے جیسے وہ ساکت منظر ٹوٹا۔

وہ ہارے ہوئے انداز میں نکاح خانے پر جھکا اور لگا تار جتنے سائن کے گئے وہ کر دیے۔ اور حقیقت اس کی دعاغی نہیں تن گئی تھی۔ خوشی تو اس شادی کی پہلے بھی نہ تھی مگر مہواہ کو موحد کے ساتھ دیکھ کر تو اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا۔

مہواہ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس کی محض ذہنی حالت نہیں بلکہ نیت بھی خراب تھی۔

مہواہ مائی جان کے پاس بالکل ایک کونے میں جا بیٹھی۔ جو کچھ چچی جان نے کہہ دیا تھا اس کے بعد اس کے اعتماد

کا گراف بری طرح کم ہوا تھا۔ اب وہ کسی کی بھی گفتگو کا موضوع بننے سے گھبرار رہی تھی۔

مہواہ اور اس کے گھر والوں نے تناؤ کے ماحول میں ہی اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ نکاح کے بعد اٹھنے والا مبارک باد کا شور۔ سب کا اٹھ کر طلال کو گلے ملنا، مبارک دینا۔ مہواہ سر جھکائے ضبط کیے اپنا دھیان ملا۔ اور فرزند کی بے سرو پا باتوں میں لگانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔

مگر اپنے دل پہ پاؤں رکھ کے چلنا آسان نہیں ہوا کرتا، ہاں دو سروں کا دل ہو تو انسان یہ کام بہت آسانی سے کر لیتا ہے۔ ترمین کو طلال کے ساتھ لاکر بٹھایا گیا تو جیسے جوڑی مکمل ہو گئی۔

مگر یہ۔ مہواہ کے حوصلے اس کی برداشت کی حد تھی۔ وہ ایک نظری ان دونوں کو دیکھ پائی۔ اس کے بعد اس کی توانائی ختم ہو گئی تو وہ تیزی سے اٹھ کر ہال سے باہر نکل گئی۔

موحد آندری نے اسے آنسو پونچھتے اپنے کمرے کی طرف تیزی سے جاتے دیکھا تو اس نے اپنے دل میں مہواہ آندری کے لیے کچھ عجیب سے احساس کو ابھرتے محسوس کیا۔

طلال کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس کے پیانے جلدی رخصتی کا مطالبہ کیا تھا اور طلال۔ وہ شاید مزید برداشت کا مظاہرہ بھی کر لیتا اگر مہواہ کو سامنے نہ دیکھ لیتا۔

وہ اس کی پہلی محبت تھی۔ پیار کا پہلا خواب۔ وہ خواب جو شیشے کا ثابت ہوا تھا۔ یوں ٹوٹا کہ وہ کہیں بھی نہ سمیٹ پایا تھا۔ مگر ترمین آندری کے تو دل کی دنیا کا عالم ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حد سکون اور مسرت سے بھرا ہوا تھا۔

ساتھ بیٹھا شخص۔ جو اس کا خواب تھا، مگر جو کسی اور کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ آج قدرت نے بن مانگی دعا کی طرح اس کا نصیب بنا دیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بہت متوازن تھیں اور لیوں پر حسین مسکراہٹ۔ وہ آج دلہن بنی ہوا تھا۔

واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

مہواہ نے اندھیرے کمرے کی کھڑکی سے بارات کو رخصت ہوتے دیکھا۔ اور طلال کی گاڑی میں بیٹھتی تڑپتین کو تو وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ آج قیامت آئی گئی تھی۔ اور گزر بھی گئی۔ مہواہ نے تمام ماتم اندر دباتے ہوئے اس قیامت کا سامنا کر لیا۔ جسے آج سب نے شادی کا نام دیا تھا۔
آج مہواہ آفتدی کے سارے خواب چکنا چور ہوئے تھے۔ وہ ہاتھوں میں منہ چھپانے بے طرح رو دی۔



”طلال۔“ وہ ابھی تک لاؤنج میں ٹی وی کے آگے براجمان تھا۔ ماما نے آکر اسے گھر کا۔

”سب سو گئے ہیں اور تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ کمرے میں کیوں نہیں گئے؟“ اس نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی ان کا دل کاٹ گئیں۔ وہ بے اختیار اس کے پاس بیٹھ گئیں۔
”اب فیصلہ کیا ہے تو اس پر قائم بھی رہو طلال! مجھے یقین ہے کہ تڑپتین بھی تمہارے حق میں بہت اچھی ثابت ہوگی۔ اٹھو جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“
”مجھے ابھی نیند نہیں آرہی ماما! وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

”طلال۔“ وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ ”پہلے مہواہ نے تمہاری زندگی خراب کی۔ اب تم خود اپنی زندگی خراب کر رہے ہو؟“
وہ اسے جھڑک کر بولیں۔ اس ایک نام ہی کا تو سارا افساد تھا۔ مہواہ کے نام نے اس کی رگوں میں شرارے دوڑا دیے۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر مارا تھا۔

”جنم میں گئی مہواہ۔ میں کسی مہواہ کو نہیں جانتا۔“ وہ غصے سے بولا تھا۔ ماما نے اس کے بازو پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

”میرے بچے۔ میری جان ایسی تو سمجھا رہی ہوں تمہیں۔ اب اگر اللہ نے نئے سرے سے تمہیں زندگی کا سیٹ اپ بنانے کا موقع دیا ہے تو اسے خوشیوں سے بھر لو۔ ماضی کا ماتم کرنا دانش مندی نہیں ہے۔“
وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔ انہیں لگا کہ ان کی باتوں کا طلال پر تھوڑا بہت اثر ہوا ہے تو وہ دوبارہ نصیحت کرنے لگیں۔

”اگر تڑپتین نے تمہارے پروپونزل پر ہامی بھری ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ اس کے دل میں تمہارے لیے سافٹ کارنر موجود ہے طلال۔ اس کی قدر کرو اور یا ہمیں اعتماد اور خوشیوں سے اپنی زندگی کو آباد کرو۔“
وہ ان کی کسی بھی بات کا جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھنکا۔ صبح جب وہ لوگ نکاح کے لیے گئے تو کمریا نکل سادہ تھا اور اب اس کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ گلاب کے تازہ پھولوں سے کمرے کو بھر دیا گیا تھا۔ دیواروں پر بھی گلابوں سے دل بنائے گئے تھے اور بیڈ کے وسط میں نقلی لڑیوں کو بیڈ کے چاروں طرف پھیلا دیا گیا تھا اور بیڈ کے وسط میں چہرہ جھکائے بیٹھی تڑپتین۔
اس قدر غیر متوقع ماحول و منظر نے لمحہ بھر کو طلال کے حواس شل کر دیے۔

اسے اس شادی کی قطعاً کوئی خوشی نہیں تھی۔ تو پھر یہ سب اس نے وحشت سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے لگا جیسے سب نے مل کر اس کی پر بادی کا مذاق اڑایا ہو۔ مہواہ کے انکار کا مذاق۔ ان دونوں کے چھڑنے کا مذاق۔ اشتعال کی تند و تیز لہر دل سے اٹھی اور داغ تک گئی تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر بیڈ کے

اطراف لٹکتی گلابوں کی لڑیاں نوج ڈالیں۔

”واٹ از دس ربش۔“ وہ دیواروں پر بنے گلابوں کے دل کھرج رہا تھا۔ ہاتھ مار کر بستر پر پڑے گلابوں کی پتیاں
قالین پر بکھیر دیں۔

”طلال۔“ تزئین حق دق رہ گئی۔ تمام شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر وہ جلدی سے اٹھی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ اس کا بازو زبردستی تھامتھی متخیر سی پوچھ رہی تھی۔

وہ بے اختیار ٹھٹکا۔ رک کر اس پور پور سچی دلہن کو دیکھا۔ جس کی خوب صورتی میں کوئی شک نہ تھا۔ مگر وہ مہواہ
نہ تھی۔ طلال کی ذہنی روپوشی۔

”تم۔ تم نے نظر لگائی ہے۔ تم نے بددعا کی ہوگی ہمارے لیے۔“ اس نے تزئین کی حیرت سے کھلی آنکھوں
میں دیکھتے ہوئے دانت پس کر کہا اور اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ درشتی سے جھٹکا۔

تزئین کا دل جیسے اتھاہ گرائی میں ڈوبا۔

”طلال۔“

”شٹ اپ۔ جاؤ جا کر سو جاؤ اور دماغ خراب مت کرو میرا۔“ وہ دبی آواز میں چیخا تھا۔ یوں مضطرب و حواس
باختہ وہ پاگل لگ رہا تھا۔

”میرا کیا قصور ہے اس سب میں طلال۔“ تزئین کے تومارے خوف اور پریشانی کے آنسو ہی بہہ نکلے۔ اس
نے ایسی صورت حال کے متعلق تو سوچا ہی نہ تھا۔

”تم پسند کرتی تھیں مجھے۔ تم شادی کرنا چاہتی تھیں۔ مجھ سے۔ تم ہی نے فتیں مانی ہوں گی۔ ہمیں بددعا دی ہو
گی۔“

وہ حقارت سے کہہ رہا تھا۔ تزئین کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ وہ انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

”مگر یاد رکھو۔ وہ مجھے نہیں ملی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا۔“ وہ درشتی سے کہتا کمرے سے ملحقہ دروازہ کھولتا
یا لکونی میں نکل گیا تھا۔ سرد ہوا لمحہ بھر کو اندر آئی پھر دروازہ بند ہو گیا۔

تزئین آفتدی ساکت سی بے یقین نظروں سے بند دروازے کو دیکھتی بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

محض ایک منظر نے اسے پوری زندگی کی فلم کی کہانی بتادی تھی۔

اور وہ رات جس کے وہ دونوں سے سہانے خواب بن رہی تھی۔ وہ آئی بھی تو یوں کہ تزئین آفتدی تھی داماں
پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور طلال سرد ترین موسم میں چھائی دھند سے بے پروا گہرے سانس بھرتا اپنے اندر
کی تپش اور کھولتے لاوے کو سرد کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عقاف

آخرین اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی کیونکہ اس کی ماں اور اس کی بیابھی سیلیوں نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ سن بنے اس کے کانوں میں جو سرگوشیاں کی گئی تھیں ان کا لب لباب بھی یہی تھا کہ اسے اپنے شوہر سے محبت کرنی ہے چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ دلدل کے پانی سا گاڑھایا چوٹیوں کے کنکروں سا لڑکھڑاتا سا ہی کیوں نہ ہو۔ گراوینے پر مائل اٹھالینے میں مستائل ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اس سے محبت کرنی ہے۔

وشمہ اس سے محبت کر رہی تھی۔ بے شک ابھی تک وہ رکابی کو اس کے سامنے بنا آواز کے رکھنا نہیں سیکھی تھی اور کمرے میں ٹہلتے اس کے زیورات بیج اٹھتے تھے جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپاتی پھرتی تھی۔

”یہ کیا بیج رہا ہے۔“ عقاف دھاڑتا۔

اس کا سانس رگ سا جاتا۔ وہ ایسے زیورات کہاں سے لاتی جو شور نہ کریں۔ جو اپنی موجودگی کا احساس نہ دلایا کریں نہ چمک سے نہ کھٹکنا ہٹ سے۔ ابھی وہ صرف سولہ سال کی تھی۔ عقاف سے بہت محبت کرتی تھی لیکن اسے زیورات سے بھی محبت تھی۔ سولہ سال اس نے بیاہتا لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ اب اسے وہی کرنا تھا جو اس نے اتنا عرصہ دیکھا تھا۔ وہ گروہ نہ پہنتی جو دلہنوں نے کئی کئی سال پہلے رکھا تو پھر کیا پہنتی؟ خاموشی لیکن خاموشی تو صرف داناؤں کا حسن ہے نئی نویلی دلہنیں ایسے سنگھار نہیں کرتیں۔ لیکن۔

”عقاف! کتنا پیارا انسان ہے۔“

گھونگھٹ میں تھسی اس کی سہلی عقاف کے قصيدے پڑھ رہی تھی اور وہ وہیں ایمان لے آئی کہ وہ محبت سے آگے جا کر کچھ کرے گی۔ عبارت کا لفظ وہ کفر

یہ شروع شروع کا عہد تھا جس پر وہ قائم رہی پھر اسے لگا کر آگیا اور جیسے کہ اس نے ساری زندگی غیرت نہیں کھائی تھی تو اب اسے غیرت کھائی کہ اس کے عہد کی قسمیں کھائی جائے لگیں۔ وہ خاموش عورت تھی۔

اس کا شوہر اس سے عاجز رہا کرتا تھا۔ وہ اسے اتنا پسند نہیں کرتا تھا جتنا کہ کوئی بیوی چاہتی ہے کہ اسے پسند کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اس سے اتنی محبت نہیں کرتا تھا جتنا کہ وہ چاہتی تھی۔ اتنی کہ وہ اپنی سیلیوں کو نہ بتائے لیکن خود کو ہی بتاتا کر خوش ہوتی رہے۔

عقاف ایک پر جلال انسان تھا۔ بہت نازک طبع اور مطلق العنان اتنا کہ وہ چاہتا تھا کہ اسے جن برتنوں میں کھانا دیا جائے وہ بھی اس کے سامنے موڈ رہا کریں۔ وہ رکابی اٹھائے یا اس میں انگلیاں ڈال کر کھائے بس آواز نہ آئے سماعت کا استعمال اس پر گراں گزرتا تھا یا وہ اپنی سماعت کو زحمت سے بچانا چاہتا تھا۔ جو بھی تھا وہ زیادہ بولتا اور بہت کم سنتا تھا اور وشمہ کو بس اتنی عادت تھی کہ وہ کچھ اچھا گنگنائی تو اپنی کسی سہلی کو بہانے سے بتا دیتی۔

رات میں کیا کیا خواب میں دکھایا تو لا زمائی۔ ایسی صورت میں جب ایک سننے سے بے زار تھا اور ایک بولنے پر مائل۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لیے دلچسپی کیسے بڑھتی۔

وہ عقاف سے محبت کرتی تھی۔ ازبکستان کے نصیب میں لکھے سارے پانیوں اور طارم اخضر کی بلندیوں کی قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ وہ اولین اور



نئی دلہن کے سامنے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کی گئی کہ وہ بس روینے جیسی ہو گئی۔ لیکن دلہن بن کے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی عفاف کے سامنے جسے وہ مسکرا مسکرا کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ آسمان سے جب بادل سیاہ ہو کر برستے تھے تو اسے گدگدا جاتے تھے۔ صلہام گاؤں کے کھیتوں میں جو پھول لہلاتے ہیں وہ اب عفاف کی موجودگی میں سدا بہار رہنے والے ہیں۔ ماں کے ڈر سے جو لفظ اس کے دل میں مقیم رہے وہ اب عفاف کی سماعتوں کا سفر کرنے کا ارادہ

کے ڈر کی وجہ سے لے نہیں سکی۔ ورنہ کچھ کچھ ہی سوچ تھی اس کی۔
• ”عفاف“ نام بھی تو کیسا دلکش تھا اس کا۔ پھر اور بھی دلکش لگا جب وہ اس کے قریب بیٹھ کر مسکرایا۔
”واغستان کی سرزمین کے پھول کو آج میں نے دیکھ لیا۔“ عفاف نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔
وہ مسکرا دی۔ تھوڑی آواز سے اور عفاف کا منہ بن گیا۔

”مجھے ہلبلیوں پسند نہیں وشمہ! بس یہ یاد رکھنا۔“

باندھ چکے ہیں۔ لیکن عفاف تو۔۔۔ وہ تو۔۔۔
”میری سماعتیں پر وہ پوش ہیں۔ تم خالی گھر میں بولو
میرے کانوں میں نہیں۔“

دلہن نے سر اٹھا کر دیکھنا چاہا اس سے پہلے ہی اس کا
گھونگھٹ جھٹک کر گر ادیا گیا۔

ٹھیک کہا گیا تھا۔ اس کی سماعتیں وشمہ کے لیے پر وہ
پوش تھیں۔ اسے خالی گھر میں ہی بولنا پڑا۔

عفاف سر کے اشاروں، آنکھ ہاتھ کی جنبش سے
اپنا مدعا بیان کیا کرتا۔ ایسے کہ واقعی اسے زبان ہلانے

کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جیسے وہ سر کھلو اور وہ گونگا۔
اس نے زیورات پر دھاگے لپیٹ لیے اور پوشاکوں میں

جزے موٹی نونچ ڈالے۔ رییم کی سرسراہٹ کو اپنی
مٹھیوں سے بچھین لیا۔ ہاں سچ اس نے ہی کیا۔

صلہام کا گل واؤدی عفاف کے حکم پر منہ لپیٹ
کر بیٹھ گیا۔

نئی دلہن نے محبت کے عہد کو تو تازہ رکھنے کی جان
توڑ کوشش شروع کر دی۔

عفاف ایک باغ کا رکھوالا تھا۔ وہاں وہ پرندوں کا
شور کانوں میں روٹی ڈالے بغیر سنتا تھا۔ پگنڈیوں پر

بھاگتے گھوٹوں کے ٹاپوں کے قریب سے وہ گزر جاتا
اور بھٹیروں کی رکھوالی گرتے گزریوں کے ہونٹوں پر

مچلتے گیتوں کو سنتا۔ ٹھیل تماشے میں مگن بچوں کے
شور کی پروا کرتا وہ گھر میں ایک وشمہ کو گونگا بنا دینے پر

ہر صورت قادر تھا۔
عفاف کو اپنے بابا سے کچھ ایسی محبت تھی کہ وہ ہر

روزان کی قبر پر جاتا تھا۔ اس کے بابا کے نوادرات گھر
میں ایسے موجود تھے جیسے وہ ابھی کچھ دیر کے لیے گھر

سے نکلے ہیں۔ بس ابھی واپس آنے والے ہیں اور اپنی
مخصوص مروانہ چادر کی بکل مار کر قہوہ پینے والے ہیں۔

چھوٹی کھڑکی کے پاس رکھے بستر پر سو جائیں گے اور
بلوک کی شاعری کی کتاب کو اس وقت تک پڑھیں گے

جب تک چراغ اپنی روشنی تمام کر دینے کا اعلان نہیں
کردے گا۔ اور پھر بچوں کی طرح گھٹنوں کو سر کے

ساتھ جوڑ کر سو جائیں گے۔

وشمہ عفاف کے بابا سے جلد ہی واقف ہو گئی۔
اتنی کہ اسے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سات سال پہلے قبر کو

اپنی قیام گاہ بنا چکے ہیں۔ عفاف جب اپنے بابا محترم کا
ذکر کرتا تو راتیں اپنے خیمے دن کی روشنیوں میں

گاڑنے لگتیں۔ اور زمین کی بلندی پر پہاڑ کی سطح پر
تعمیر مسجد سے اذان بلند ہونے لگتی۔

جتنے بابا محترم گھر میں موجود تھے اتنی ہی والدہ گھر
سے غائب تھیں۔ جیسے ایک پال بھی اگر گنگھی میں

پھنسا رہ گیا تو اسے بھی نکال کر نہیں دور پھینک دیا گیا
تھا۔ پڑوس کی عورتوں نے جو اکثر اپنا سینا روٹالے کر

اس کے گھر کے برآمدے میں آکر بیٹھ جاتی تھیں اسے
بتا دیا کہ عفاف کی ماں کی آواز پہاڑوں کو سلام کرتی سننے

والے کے کانوں تک آیا کرتی تھیں۔ وہ ایک خوف زدہ
رہنے والے دل کے مالک مرد پر ایک لکار تھی۔

سرشام وہ کھانا پکانے میں اتنا واویلا کرتی کہ رزق کے
لقموں کے صبر بر رشک آتا۔

”سزا وہ کھیتی ہے جو اگلوں کو بھی کاٹتی پڑتی ہے۔“
وشمہ اپنے ہاتھ کے زیور پر نئے رنگین دھاگے لپیٹ

رہی تھی کہ وہ کچھ تو جاذب نظر لگیں۔ وہ خالی گھر میں
عفاف کو خیالوں میں بٹھا کر اونچی آواز سے کلام کیا

کرتی۔ وہ اس سے دن بھر کی باتیں کرتی رات بھر کے
خواب سنا تی سنے سنائے گیتوں سے چرائے کچھ اشعار

وہ اپنی آواز میں پرو کر گنگھا دیتی۔
عفاف آتا تو وہ بس بے آواز مسکرا دیا کرتی۔ وہ

بلوک کی شاعری کی کتاب پڑھتی اور چاہتی کہ اپنی خوش
گلو آواز میں اسے سنائے۔ ایک بار اس نے اس کا ارادہ

کیا لیکن عفاف نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔
”کیوں چلا رہی ہو۔ میرے کلن پھٹ رہے

ہیں۔“
اس نے چلنا تائبند کرویا۔ منہ سی لیا۔ اور پڑوس کی

عورتوں کو وہ شاعری سنانے لگی۔
وہ سینے پر ہونے سے اپنا ہاتھ روک لیتیں۔ ”خوش

گلو برندوں نے تمہاری آواز میں قیام کیا ہے۔“ کوئی ایک مہنتی۔
” نیلے چشموں کے کنارے آباد بخارنوں کا جھوٹا پانی تم نے ضرور نوش کیا ہے۔“ دوسری کہتی۔



عفاف کو اپنے دوست عبدالنجیر کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ واپس پاپا کے گھر آگئی۔ اور دن گنتے لگی اور اتنے زیادہ دن گن لیے کہ ایک دن بابا نے پوچھا۔

”کتنے مہینے ہو گئے وشمہ۔ عفاف کب آئے گا؟“
”مہینے؟ کیا اب اسے مہینے بھی گنتے ہوں گے؟“ وہ کائی زدہ نالے کی طرح بدبودار ہو گئی۔

بابا نے چند لوگوں کو عفاف کے دوست کے گاہوں میں معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ وہ شادی کے فوراً بعد ہی روانہ ہو گیا تھا۔ اب خبر نہیں کہ کہاں ہے۔

جب مہینے گنتے، سال گنتے کی نوبت بھی آگئی تو عفاف آگیا۔ اور اسے ساتھ لے گیا۔ گھر کے برآمدے میں جس میں اس نے پھولوں کے کئی گلے رکھے تھے اور جو سوکھ چکے تھے۔ وہ اب پھر سے سرسبز ہو چکے تھے۔ وہاں پھولوں کے پاس ایک پھول کھڑا تھا۔
”خوش آمدید۔“ پھول نے اپنی پیاری سریلی آواز میں بہ آواز بلند کہا۔ ترنگ سے کہا۔

عفاف مسکرا دیا۔ وشمہ برآمدے میں ہی کھڑی رہ گئی۔

وہ عفاف کی بیوی تھی۔ اور وہ اسے بہت جدوجہد کے بعد حاصل کر سکا تھا۔ سزا اس کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا تھا۔ اسے خانہ بدوش لڑکی کی آواز نے جکڑ لیا تھا جو وہ اپنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی گایا کرتی تھی۔ چراغ روشن کر کے۔ ریشمی رومالوں پر پھول کاڑھتے ہوئے۔

فروسیا کے زیورات بردھاگے نہیں لپیٹے گئے تھے۔

اور اسے بولنے میں تامل نہیں ہوا کرتا تھا۔
وہ ایک سزا جو اس کی والدہ کے بدلے میں ایک دوسری عورت کو ملنی چاہیے تھی وہ وشمہ کو مل گئی۔
اب وہ جزا کی طرف آیا تھا۔ جزا فروسیا کے لیے۔
اسی وقت وشمہ کے گلے کے سارے سر مر گئے۔ یہ ایسا صدمہ تھا اور اس واقعے میں ایسی غیرت مندانہ لکار تھی کہ وہ خود سے یہ عہد کیے بنا رہ نہ سکی کہ وہ عفاف کو اپنی آواز سے اس وقت تک محروم رکھے گی جب تک وہ ملک الموت کے پروں کی پھر پھر ہاٹ نہیں سن لے گی۔

صبح وشام فروسیا کے گیت ان کے چھوٹے سے گھر کے کونوں میں دلیری سے گونجتے۔ اس کی آواز جانپاز پرندے کے پروں کی طرح رواں تھی۔ وہ زمین کی سات تہوں میں بیٹھ کر بھی گنگنائی تو زمین کی سات تہوں کے اوپر زندگی کو روک دیتی۔ انسان کو زمین کھودنے کا پابند کر دیتی۔ وہ یہ حق رکھتی تھی کہ اس کی آواز کو سنا جائے۔ پھر اس آواز کو دائرہ نکاح میں لے آیا جائے۔

اپنے زیورات سے سارے دھاگے ادھیڑتی وشمہ اپنی انگلیوں کی حرکات کو بھی گونگا کیے اس کے گیتوں کو سنا کرتی۔ اسے یہ گمان ہوا کہ ہر عورت ایسا گانگتی ہے۔ ہر عورت کے گلے میں یہ سر آباد ہیں۔ ہر عورت ایک جاں باز پرندہ ہے جو اڑان بھر سکتا ہے۔

اس نے اپنے سارے زیورات فروسیا کو دے دیے۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس کے سر کے بالوں کو گوندھ دیا اور ان میں ایک پھول لگا دیا جو جلد ہی مرجھا گیا۔ وشمہ نے بابا کا وہ بستر سنبھال لیا جس پر وہ گھسٹوں میں سردے کر سو جایا کرتے تھے۔ اور اس کتاب کو جو وہ بڑھ پڑھ کر خود کو دنیا سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے ایسے حفظ کر لیا کہ وہ اس جیسی کئی ہزار کتابیں لکھ سکتی تھی۔ وہ صبح اٹھ کر گھر صاف کرتی۔ بڑوس کی عورتوں کے ساتھ مل کر لکڑیاں اکٹھی کر لاتی۔ اس کے قدم زمین پر ایسے پڑنے لگے جیسے وہ ہوا میں تیر رہی



زندگی کے آسمان تلے وہ پوری زمین پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ اس کے نکاح میں آئی ایک عورت کیا حلف لے چکی ہے۔ وہ باغ کی رکھوالی کے لیے جاتا اور چرواہوں کے گانے سنتا ہوا واپس لوٹتا۔ رات قہوہ خانے میں قہوہ پینے چلا جاتا۔ یا فروسیا کا ہاتھ پکڑ کر چشموں کے پانی سے چھینٹ چھاڑ کرتا۔

ایک دن وہ قہوہ خانے میں گیا تو ایک گاؤں اور کام والا لڑکا آپس میں الجھ رہے تھے۔ اور ان کی تکرار اتنی فصاحت لیے ہوئی تھی کہ سب انہیں ایسے سن رہے تھے جیسے وہ انجالی زمینوں کی قصہ گوئی میں مصروف ہوں۔

”یہ کھونا سکھ میرا نہیں ہے۔ تم میری ایک انگلی کاٹ سکتے ہو۔ میں اف نہیں کروں گا تم مجھے دعا باز نہیں کہہ سکتے۔“

”محترم! یہ سکھ آپ نے عنایت کیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے غلطی سے عنایت کر دیا ہو۔“

”میں اپنی جیب میں موجود سب سکوں کو ایسے جانتا ہوں جیسے اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو۔“

”میں بھی سکوں کی پرکھ پر ایسے قادر ہوں جیسے باپ اپنے بچوں کی۔“

”میں اس خاتون کی خاموشی کے عہد کی پاس داری کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جس کی پاس داری میں وہ ایک جنگ جو سے بڑھ کر ہے۔ یہ سکھ میرا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری جیب میں پہلے سے موجود ہو۔“

لڑکے نے خاموشی سے اپنے مالک کی طرف دیکھا۔ قہوہ خانے میں سناٹا سا چھا گیا۔ اور پھر مالک نے سر ہلایا کہ ”جانے دو یہ سچا ہے۔“

عفاف نے ایک تہر بھری نظر اس بڑھے پر ڈالی اور قہوہ پئے بغیر ہی بھاگ بھاگ گھر آیا۔ وشمہ فروسیا کے کپڑے لہر پھول کاڑھ رہی تھی۔

پڑوس کی عورتوں نے ہی سب سے پہلے اسے گونگا پایا۔ پھر فروسیا نے اور پھر پڑوس کے ہی پانی کے گھروں نے۔ عفاف تک بات چینی تو وہ ہنس سا دیا جیسے اسے بے آباد گاؤں کے کسی آدمی کا قصہ سنا دیا گیا ہو۔ اسے پروا نہیں ہوئی اسے ایسے ہی منظور تھا سب۔

وقت گزر رہا پڑوس کی عورتیں اس کی خاموشی کی عداوی ہو گئیں۔ اتنی کہ وہ بولتی جاتیں اور کبھی اس کی طرف سے جواب کی توقع نہ کرتیں۔ فروسیا ایک خانہ بدوش جرات مند عورت! اس نے ایک گیت اس کے لیے بنایا اور اسے پاس بٹھا کر گایا۔ عفاف نے سنا تو فروسیا کو کچھ ایسے دیکھا کہ فروسیا سکتے میں آگئی۔ پھر بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھاگ کر اپنے سلمان میں سے کپڑے کا ایک پارچہ اٹھالائی اور اسے عفاف کے سامنے بچھا۔

”میرا کوئی حق غصب نہیں کیا جا سکتا۔ میرا گانا بھی نہیں۔ میں پابند نہیں ہوں۔“ عفاف پر نظریں گاڑ کر وہ تنک کر بولی۔

وشمہ نے فروسیا کو دیکھا اور اس کے وجود میں جو تھوڑی بہت گویائی بھی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس بار اسے اپنی غیرت پر شرم آئی۔ یہی غیرت نوحہ کنال ہو گئی۔

”میرا کوئی حق غصب نہیں کیا جا سکتا، میرا گانا بھی۔“ وشمہ نے کتاب کو چھوڑ دیا اور وہ اس فقرے کے احساس کو آگ بنا کر سینکتی رہی۔ اسے خود پر اتنی شرم آئی کہ وہ بے آواز رونے لگی اور زمین پر گرتے اپنے آنسوؤں کو دیکھنے لگی۔ اسے بولنے کی جو قوت دی گئی تھی اسے اس نے غلام کر دیا تھا۔ وہ اس کی آقا بننے کے لائق نہیں تھی۔ وہ پابند تھی پابند رہی۔

اب وہ اتنی خاموش ہو گئی۔ اتنی کہ اس کی آنکھ کے اٹھنے اور جھکنے کی گویائی بھی جاتی رہی۔ اس کا پورا وجود حلف میں سمٹ آیا۔ عہد میں ڈھل گیا۔ عفاف اس کی طرف دیکھتا تو تسخیر سے ہونٹ کے کنارے کو دائیں رخ لے جا آئے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال ماگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جلی لیٹروں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ خصوصی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 150 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آرڈر بھی کرر جیٹ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مئی آرڈر اس حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجئے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹہ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹہ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائمنڈ، 37- اروو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

”وشمہ! مجھے اپنے بابا کا نام بتاؤ۔“ وہ تیز آواز میں چلایا۔ اور خوں خوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
وشمہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے پھول کاڑھنے لگی۔

”وشمہ! مجھے اپنے شوہر کا نام بتاؤ۔“
وشمہ نے پھولوں کی پتکھڑیوں کو ایک نیا رخ دیا، اس نے انہیں آسمان کی اور اٹھا دیا۔
”وشمہ! اگر تم میرے نکاح میں رہنا چاہتی ہو تو اپنے بابا کا نام بتاؤ۔“

فروسیا سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وشمہ کو اس کا سرخ پارچہ یاد آیا اور پھر اپنا حلف۔ وہ انھی اور اس نے اپنے وہ چند زیورات بھی اتارنے شروع کر دیے جو صرف شادی شدہ ہونے کی علامت کے طور پر اسے پہنے رکھنے تھے۔ عفاف دنگ رہ گیا۔ جلد ہی اس نے دھاگہ لپیٹے سارے زیورات اتار دیے اور ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی کہ بابا کو پیغام بھجوادیا جائے وہ اسے آکر لے جائیں۔

”فروسیا۔ تم اسے کہو یہ گیت گائے۔“ عفاف نے فروسیا کی کلائی دیوچ جلی۔
فروسیا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”یہ گیت گاتی تو ہے۔“
”کب۔۔؟“

”سنو وہ تو ابھی بھی گارہی ہے۔“
عفاف نے عیسیٰ نظر سے فروسیا کو دیکھا۔ اوہ! یہ دراصل فروسیا ہی تھی جس کے گیتوں نے وشمہ کے گیتوں کو زبان زد عام کر دیا تھا۔ اوہ! یہ وہ پڑوس کی عورتیں بھی تھیں جنہوں نے چشموں کے سنگ یہ عہد عام کیا تھا۔ ندیوں، نالوں، موسموں اور قصوں میں یہ حلف حلول کیا تھا۔

اس کے حلف پر حلف لیے جانے لگے عورتیں اور مرد اس کا نام لے کر اس کی سچائی پر لفظ رکھتے۔ فروسیا نے دو اور نئے گیت گائے۔ یہ گیت بھی ہوا کے دوش پر پہاڑوں سے ٹکراتے دریاؤں سے انگھیلیاں کرتے، زبان زد عام ہو گئے۔ شادی بیاہ کے گیتوں میں

نا تم مجھے۔“

”میں تمہاری بیوی ہوں غلام نہیں۔ تم میرے شوہر ہو، آقا نہیں۔ مجھ سے نکاح کے وقت تم نے میری نسل دیکھی تھی تو میں نے بھی تمہاری نسل پر کھی تھی۔ ہم خانہ بدوش ہیں۔ زمین کو اس سے بہت پہلے چھوڑ دیتے ہیں جب وہ ولدنی ہو جاتی ہے۔ دریاؤں کے رخ بدلنے کی اولین نشانی پر ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہم تمہاری طرح ندی، نالوں، گے خشک ہونے کا انتظار نہیں کرتے۔ تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے۔ خانہ بدوش اپنے فیصلوں میں کہیں زیادہ جرأت مند ہوتے ہیں۔ وہ زمین کی قدر کرتے ہیں اسی لیے اس پر دوسری بار سیرا نہیں کرتے۔“

”تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“

”تم ملکیت کے شوہن ہو۔ اسی لیے چاندی کی صراحی پر اپنا نام کندہ کروایا ہے۔ میرے بچے پر اپنا نام کندہ کروانے کے لیے تمہیں اس کے پتیل یا چاندی ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔“

فروسیا اپنے لوگوں میں لوٹ گئی۔

عفاف کی ذات میں جو تھوڑی بہت دراڑیں پچی تھیں ان میں بھی نفرت حلول کر گئی۔ اور وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کتنے ہی مہینے اس نے کچے پکے جانور کھائے، پہاڑوں میں رہا، خزاؤں میں پلا۔ بہاروں سے پرے رہا۔

اپنے گروہ کے ساتھ اس نے فروسیا کا قبیلہ بھی لوٹ لیا تھا۔ اس نے خانہ بدوشوں کے سارے خیمے جلا دیے تھے۔ اور انہیں دریا کی طغیانی میں کود جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ گروہ کے سردار کا دایاں بازو بن گیا۔ اس نے اپنے گروہ کو مالا مال کر دیا تھا۔ قافلے لوٹتے، اناج چراتے، قصبوں اور گاؤں میں تباہی لاتے وہ اپنے پایا محترم کا نام تک بھول گیا۔

ایک رات وہ ایک گاؤں لوٹنے گئے۔ ہاں! اسے

اس گاؤں کا نام یاد تھا۔ صلیب کا۔

ایک اور گیت کا اضافہ ہو گیا۔ دو لہا دلہن کو لینے آتا تو اسے یہ گیت سنایا جاتا کہ تم اس دلہن سے وہ سلوک نہ کرنا کہ اسے پہاڑوں کی چوٹی پر رہتی و شمشہ کا ساعدہ لینا پڑے۔ جواب میں دو لہا والے بھی گیت گاتے کہ وہ دلہن کو ایسے رکھیں گے کہ وہ بلبل کی طرح گاتی رہے گی اس کی گویائی کسی پرگراں نہیں گزرے گی۔

عفاف نے ایسے ہی کسی گیت کو سنا اور وہ تمللا کر رہ گیا۔ اس نے اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑا اور فروسیا کو لے کر نئی زمینوں کی طرف سفر شروع کر دیا۔ وہ خانہ بدوش بن گیا۔

بازاروں میں کاریگروں نے اپنے فن میں ”عقد سکوت“ کو کندہ کرنا شروع کر دیا۔ صراحیوں پر اس کا حلقہ کندہ تھا۔ قالینوں اور پارچوں، دیواروں اور دیبلیوں پر اس کا نقش نقش فریادی تھا۔ قصہ گوؤں میں یہ قصہ اپنی اپنی طرز پر مشہور تھا۔

کوئی کہتا ”جب اس نے اپنے شوہر کو ہرن کی طرح قلا نچیں بھرتے ہرنی کی طرف بھاگتے دیکھا تو وہ وہیں خاموش ہو گئی۔“

کوئی کہتا ”وہ پاکیزہ اور پابند عورت ہے۔ وہ بحکم خدا خاموش ہوئی ہے۔“

کوئی کہتا ”خاموشی کے حلق سے پہلے اس نے اعلانیہ سب بیان کیا تھا۔ پر افسوس اسے سننے والا کوئی انسان وہاں موجود نہیں تھا۔“

عفاف ہر اس جگہ سے بھاگ جاتا جہاں اسے وشمہ کسی بھی صورت میں مل جاتی۔ اس کا بس چلتا تو وہ سب کو جلا کر راکھ کر دیتا۔ اس کے خون میں غصہ اور نفرت ایسے حلول کرنے لگے تھے کہ فروسیا نے مزید اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم وہ نہیں رہے جو مجھے میرے خیمے کے باہر ملا تھا۔ تم ہر روز ایک نیا لبادہ اوڑھتے ہو۔ پرانا اتارتے ہو۔“

”تم میری بیوی ہو۔ نہ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔“

ایک ہو کر۔ اگر اس نے اپنے باپ کا نام نہ بتایا تو یہ اپنے باپ کا نام بتانے کے لائق نہیں رہے گا۔“

بندوق کا رخ نیچے کے جھولے کی طرف مڑ گیا۔ سارا گاؤں وشمہ کو دیکھنے لگا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے سر کو اٹھائے رکھا لیکن نیچے کی ماں لپک کر وشمہ کے قدموں میں گر گئی۔

”مرد اگر سردار بھی ہو تو اس کی غیرت کو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔ عورت اگر ماں ہو تو اس کی ماستا کو قرار دلانا پڑتا ہے۔ پندرہ سال بعد خدا نے میری طرف رخ کیا ہے۔ اگر یہ مجھ سے پھڑ گیا تو خدا مجھ سے پھڑ جائے گا۔“

سارے گاؤں کو سانپ سونگھ گیا۔ عفاف سردار کے پیچھے والے گھوڑے پر بیٹھا وشمہ کو دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھے۔ غصے سے۔ نفرت سے۔

وشمہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کے ہیونٹ کانپ اٹھے۔ وہ ایک عہد بھی پورا نہیں کر پائی تھی۔

بندوق کا فائر جھولے پر ہوا۔ بچہ ڈر کر رونے لگا۔ وشمہ نے اپنے باپ کا نام بتانے کے لیے منہ کھولا

ہی تھا کہ عفاف نے بندوق سیدھی کی اور فائر اس کی کینٹی پر کیا۔ اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی بیوی کسی اور کے کہنے پر اپنا حلف توڑے۔ اس کی نفرت انگیز شدت پسندی نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ساری زندگی اس کی بیوی نے اس کا حکم نہ مانا۔ اب وہ کیسے کسی اور کا حکم مان کر اس کا سر نیچا کر سکتی ہے۔ کیسے؟

جس وقت وشمہ زمین پر بے روح پڑی تھی اس وقت عفاف اپنے گھوڑے کو لگام سے قابو کرتے چلا رہا تھا۔

”میں ہوں اس غیرت مند عورت کا شوہر جس نے ساری عمر اپنے عہد کی پاس داری کی۔“

وشمہ کے مردہ وجود پر۔ عہد سکوت پر۔ عفاف کی فتح کا پرچم زندہ و جاوید لہرا رہا تھا۔



گاؤں کے سردار کے گھر پندرہ سالوں بعد بیٹا ہوا تھا۔ سارا گاؤں وہاں جشن کے لیے اکٹھا تھا۔ سردار بر تحائف کی برسات کر دی گئی تھی۔ وہ ان تحائف کا بوجھ سردار پر سے کم کرنے چلے تھے۔ جب سارا گاؤں مل کر لڑکے کے جھولے کے پاس گھیرا ڈالے خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا۔ اس وقت ڈاکوؤں کا سردار اپنی بندوق کی نال کو گاؤں کے سردار کی کینٹی پر رکھنے ہی والا تھا۔

گولی ہوا میں فائر کی گئی۔ سارے گاؤں کو سانپ سونگھ گیا۔ نیچے کے جھولے پر بندوق کی نال تنی تھی۔ سردار نے خاموشی سے سب لالا کروا رکھا شروع کر دیا۔ ڈاکوؤں کے سردار کے کان میں کسی نے کچھ کہا۔ سردار نے مجمع میں موجود وشمہ کی طرف دیکھا۔

”تو یہ ہے وہ عورت جس کے قصے ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں کی دلہیز بھی پھلانگ چکے تھے“ سردار نے سوچا۔ بہت پہلے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر اسے یہ عورت مل گئی تو وہ اس کا عہد توڑ کر ہی رہے گا۔ وہ اس کے سلب کھول دے گا۔

”بول تیرے باپ کا کیا نام ہے؟“ بندوق کی نال وشمہ کی طرف اٹھی۔

”یہ گونگی ہے۔“ کسی نے کہا۔ سردار نے نال کا رخ جواب دینے والے کی طرف کیا اور اس کے پیروں میں فائر کیا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور بولا تو تالو پر گولی مار دوں گا۔“

”تمہارا اس سے کیا لینا دینا۔“ گاؤں کے سردار نے جرات سے کہا۔

”میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ ہتھیار میرا غلام ہے۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جسے پاش پاش نہ کیا جاسکے۔ خاموش رہو ورنہ قبروں میں اماروں گا۔“

”تم ایک مرد ہو یہ ایک عورت۔ تم اپنی بہادری اس پر مت آزماؤ۔“

”میں ڈاکوؤں کا سردار ہوں اور یہ اپنے عہد کی سردار۔ سردار اپنی سرداری قائم رکھنا چاہتا ہے۔“



آتے ہیں کہ بھائی صاحب کے لیے کبھی ساگ بنا کر لے آئیں اور کبھی اپنے بچوں کے پرانے کپڑے عبدالرحمن اور عبدالرحیم کے لیے اور میاں صاحب اسی پہ بچھ بچھ جالتے۔ ممنون ہوئے جاتے ایسے میں باریہ کا دل جس درجہ کڑھتا وہی جانتی تھی۔

وہ گھنٹوں پہ ہاتھ رکھتی اٹھی کہ رات نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی تھی سو ارادہ تو آج آرام کا تھا۔ کام والی نو بجے تک سب نپٹا جاتی دو گھنٹے آرام کے بعد اس کا

بچوں کے لیے لٹچ بنانے کا ارادہ تھا، ایک بجے تک وہ آجاتے تھے۔ آج لٹچ باکس بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ اب ان کا لٹچ بناتی یا رافعہ آیا اور ان کے بچوں کے لیے چوٹیلے کرتی۔ اسے نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

دو ایک باریہ بھی کر دیکھا کہ کھانا نہیں بنایا، زبان تھوڑی شیرے میں ڈبو کے رافعہ آپا کی آمد پہ کہتی۔

”رافعہ آیا آپ خود بنا لیں جو دل چاہے۔ اپنے بچوں کی پسند کے مطابق نہ جواباً“ رافعہ آپا کے لہجے میں اس سے ڈبل شیرینی ہوتی۔ ”ارے نہیں ماریہ چندا! تم جو بھی بناؤ گی بچے شوق سے کھالیں گے۔ وہ تو دیوانے ہیں تمہارے ہاتھ کے کھانوں کے ذائقے کے“

اگر تو شیرہ لگا رہتا اور اصرار بھی جاری رہتا تو رافعہ آپا اتنا کچھ بناتیں، منگوواتیں اور گند پھیلاتیں کہ الامان اور اوپر سے میاں صاحب کی تعریفیں کہ دیکھا! اتنا کچھ بنایا اور کتنا مزیدار بھی۔ اپنے خرچے پہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ بناتیں تو بات بھی ”اوروں“ کے پلے سے تو ماریہ بھی اس سے ڈبل کچھ بنالیتی۔

نہ جانے زندگی اس قدر مشکل کیوں ہوتی ہے اور خاص طور سے شادی شدہ زندگی کہ سسرال میں زندگی گزارے نہ گزرے۔ گھیننے سے گھنے۔ جب سے اس کے میاں کا فون آیا تھا کہ آج رافعہ آیا آرہی ہیں وہ یوں ہی بیٹھی جل کڑھ رہی تھی۔

نہ جانے اس رافعہ آیا کا اپنے گھر میں دل کیوں نہیں لگتا۔ شوہر کا اکلوتا بھائی ہونا بھی مصیبت ہی ہوتا ہے۔ شوہر کے لیے نہیں بیوی کے لیے۔ بہنوں کو بیابنے دینے دلانے برتنے میں ہی سب پونجی خرچ ہو جاتی ہے۔ اور بھائی بھی ایسا جو بہنوں کا مان رکھنے والا ہو۔ ٹھیک ہے بہنوں کا حق ہوتا ہے بھائیوں پہ۔ پر کچھ حق ان کا بھی تو ہوتا ہے نال جو بھائیوں کے گھر میں بس رہی ہوتی ہیں۔ صد شکر کہ سعدیہ شادی کے بعد۔

جدہ شفقت ہو گئی ہے۔ ہاں البتہ اس کی شادی پہ آنے والا خرچ اور جیسے اس کے بھائی صاحب نے ارمان نکالے اور جتنے مہینے قرض اتارنے میں لگے، یہ الگ داستان ہے۔ میاں کا کیا ہے۔ آرام سے فون کھڑکا دیا۔

”آج شام رافعہ آیا آرہی ہیں، کھانا اچھا سا بنا لینا۔“ اور تو اور عبدالرحمن اور عبدالرحیم بھی آج لٹچ میں چکن منچورین، مین کباب اور ٹرائفل کی فرمائش کر کے گئے تھے۔ کما کچھ نہیں مہیں اتنا کہ ماما آج دعوتی لٹچ۔ اور اپنے لاڈلوں کی فرمائشیں بھلا کہاں ٹالی جاتی تھیں اس سے۔ اور یہ رافعہ آیا، کبھی ایک سو اسی دن تھا انہیں وہ دن رہ کے گئے ہوئے، ڈھکے اس قدر

Downloaded From Paksociety.com



”اے کاش۔۔۔“ ماریہ دوبارہ صوفے پہ بیٹھی پاؤں
اوپر کر کے قدرے نیم دراز سی ہو گئی ”اے کاش رافعہ
آپا نہ ہوتیں۔۔۔ اس کامیاں ایک ہی بھائی ہوتا یا رافعہ
آپا بھی سعدیہ کی طرح کسی اور ملک شفٹ ہو جاتیں یا چلو
اسی ملک میں کسی دوپار کے شہر میں ہونیں۔۔۔ روز
روز آپا نہ جاتا ان سے۔۔۔ تو زندگی کتنی حسین ہوتی۔۔۔
وہ یونہی نیم دراز سوچ رہی تھی۔

”اے کاش۔۔۔“ ماریہ دوبارہ صوفے پہ بیٹھی پاؤں
اوپر کر کے قدرے نیم دراز سی ہو گئی ”اے کاش رافعہ
آپا نہ ہوتیں۔۔۔ اس کامیاں ایک ہی بھائی ہوتا یا رافعہ
آپا بھی سعدیہ کی طرح کسی اور ملک شفٹ ہو جاتیں یا چلو
اسی ملک میں کسی دوپار کے شہر میں ہونیں۔۔۔ روز
روز آپا نہ جاتا ان سے۔۔۔ تو زندگی کتنی حسین ہوتی۔۔۔
وہ یونہی نیم دراز سوچ رہی تھی۔



بظاہر تو وہ فارغ ہو چکی تھی۔ سب کام فی الحال نمٹ
چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔
نڈھال اتنی کہ۔۔۔ اپنے لیے چائے تک نہ بنا پارہی تھی
وہیں ڈائنگ ٹیبل پہ بیٹھے اس نے ہاتھوں کو آپس
میں الجھا کے اوپر سر نکالیا۔

”بسو ڈرا اک کپ چائے تو بنا دو کڑک سی۔ اور
پھر آ کے میرے سر میں تیل ڈال دو۔ اور ہاں اگر دوپہر
کے کھانے کی تیاری کر رہی ہو تو بریانی اور رشتین بنا دو۔“

”اف یہ زندگی بھی ناں۔ خاص طور سے سسرالی
زندگی۔“ صبح فجر سے ذرا پہلے ہی وہ اٹھی تھی۔ بچوں کے
اسکول میں آج کلر ڈے اور ون ڈش تھی۔ یہ کہنے کو ہی
ون ڈش تھی کیونکہ دونوں بچے ون ڈش کے نام پہ چار
چار ڈش بنوا کے لے گئے تھے ساس سسر کی بیڈی۔۔۔
ناشتہ اور پھر چائے شوہر کے جوتے موزے سے لے کر
ہر کام ناشتے تک۔۔۔ منڈ ڈرائیٹ کالج جانی تھی۔ سو
چار مرتبہ تو ناشتہ ہی بنایا۔۔۔ اوپر سے کام والی بغیر بتائے
دو دن سے چھٹی پہ کھی صفائی اور برتن خاص طور سے
دھوتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے۔ ایسے میں اپنے
ناشتے کا ہوش اسے کہاں رہتا تھا۔ نڈھال ہو جاتی تو یاد
آتا کہ ابھی تک ناشتہ تو کیا ہی نہیں۔ ویک اینڈ تو اور
بھی مصروف گزر تا بیا ہی دو منڈیں بجیٹھ بجھٹھانی اور دو
کتوارے دیوروں کی آمد پہ کھانا نہ صرف مقدار میں

زیادہ پکڑتا بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوتا۔

ارباب اچھا تھا اس کے ساتھ۔۔۔ ماں کی شکایتوں پہ اسے کچھ نہ کہتا تو اس کی جلی کٹی بھی سن لیتا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ارباب کی وجہ سے ہی سب سن اور سہ لیتی عورتیں ایک شوہر کی خاطر ہی تو سب کی سن اور سہ لیتی ہیں۔

چائے کے لیے پانی رکھ کے وہ پھر سے کرسی پہ آ بیٹھی۔ یونہی دل میں ایک خیال سا آیا۔ دلی راکھ میں چھپی چنگاری سی خواہش من آنگن میں سلگی۔ اسے کاش اس کا الگ گھر ہوتا۔ جہاں وہ ارباب اور اس کے دونوں بیٹے رہتے۔ ارباب ایک ہی بھائی ہو گیا چلو ایک اور ہوتا۔ الگ اپنے گھر میں۔ ایک۔ بسن ہونی یا چلو دو بھی ہوتیں لیکن بیانی اور اپنے گھر میں خوش۔ کبھی کبھار ملنے آتیں۔ وہ ان کے لیے ڈھیروں کھانے بناتی ایک فیملی مہمان کے لیے کھانا بنانا بھلا کون سا مشکل ہوتا ہے؟ اور ساس اور سسر۔ کچھ پل کو خواہش کو خیال بنانے سے دبائے رکھا کہ اپنے ماں باپ کا خیال آگیا تھا اور پھر اپنے ہی خیال کو زور سے جھونکا۔

کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ ارباب سودا سلف اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ کاؤچ سے اٹھ بیٹھی۔

”رافعہ آپا گلے ہفتے۔ شاید عمرے پہ جا رہی ہیں سو میں نے سوچا تھوڑا اچھا سا ڈنر بنا لیں۔ کچھ تو بنا بنایا لے آیا ہوں۔ آفٹر آل میری بیوی تھک جاتی اتنا کچھ بنا کے۔“ وہ متاثر آکھڑا ہوا۔

”اٹس اوکے میں بنا لیتی۔“ ماریہ فریش تھی۔

”شیور۔!“

”بالکل۔“ وہ مسکراتے ہوئے سودا سلف اٹھائے کچن میں لے آئی۔ سلیب پہ سلمان رکھتے اس نے بے ساختہ سانس خارج کی۔

صد شکر وہ ایک خواب تھا۔ آشنائی کا۔ آگاہی کا۔ آستینیں اوپر چڑھا کے گنگناتے ہوئے وہ رافعہ آپا کے لیے اچھا سا ڈنر بنانے کے لیے تیار تھی۔



مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گردپوش

کتاب کا نام

450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بلوط کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفرنامہ	گمری گمری پھر مسافر
225/-	ظہر و مزاج	خمار گندم
225/-	ظہر و مزاج	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈیٹر گرین پو این انشاء	اندھارتوں
120/-	ادبیری این انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	ظہر و مزاج	باتیں انشاء جی کی
400/-	ظہر و مزاج	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

آپنی مرضی کا پورا

یا غلطی سے کسی کی زبان پر ان کا نام آجاتا تھا تو مردوں کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگتے۔ زبان سے نفرت و غصے کا اظہار ہوتا۔ گھر کی عورتیں سم جاتیں۔ ماما کے کندھے مزید جھک جاتے اور نانی امی کے چہرے پر

زیر کی خالہ ہمارے خاندان کی داستان کا ایک بند باب تھیں۔ سب افراد کی یادداشت کے طاق میں موجود ہونے کے باوجود ایسی گرد آلود اور بند کتاب جسے کھولنا منع تھا۔ مگر جب بھی کوئی اڑتی خبر کانوں میں پڑتی



Downloaded From Paksociety.com

جھڑیوں کا مزید اضافہ ہو جاتا۔

”مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال مت کرو۔ مذہب تو والدین کی فرماں برداری کا حکم بھی دیتا ہے مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ کون ہے جس نے تمہیں اتنا منہ زور کر دیا ہے۔“ نانا نے بیٹی کی آنکھوں میں جھانکا۔ زری خالہ نظریں چڑا کر رہ گئیں۔

نانا کا شک بے جا نہیں تھا۔ وہ ان کا کوئی کلاس فیلو تھا۔ اس بحث ’ضد‘ انا‘ نا فرمائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ زری خالہ نے کورٹ میں جرح کر لی۔

ہمارے خاندان کے مردوں کی اونچی پگڑیاں اور شلے نیچے ہو گئے تھے، معاشرہ کی نگاہوں میں اور لوگوں کی گفتگو میں، لڑکیوں پر مزید سختی ہوئی۔ ’تعلیم‘ اسکول‘ کتابیں شجر ممنوعہ بن گئیں۔ فصیحی مزید اونچی اور تنگ ہو گئیں۔ گھر کی بھی اور دل و دماغ کی بھی۔

والدین کی دل آزاری کی سزا تھی یا اپنی کوتاہ بینی کی، جو دامن میں پچھتاوے لے کر واپس والدین کے پاس آئیں لیکن سب نے دھکے دے کر نکال دیا۔

مجھے نانا کا چہرہ یاد آتا ہے جس پر دکھ اور صدمہ، پچھتاوا رقم تھا۔ وہ خاموشی سے دیکھتے رہے اور جھکے کندھوں کے ساتھ اندر چلے گئے۔

پچھتاوا انہیں بیٹی کو اتنا پڑھانے پر تھا۔ دکھ اس کی نا فرمائی پر تھا۔

جبکہ صدمہ زری خالہ کو برے حالوں میں دیکھ کر ہوا تھا۔

زری خالہ پھر کبھی واپس نہ آئیں۔ کوئی کہتا انہوں نے خود کشی کر لی ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ فلمی دنیا میں چلی گئی ہیں اور کوئی کہتا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی آلہ کار بن چکی ہیں۔ ہر کیف یہ لوگوں کی قیاس آرائیاں

تھیں۔ حقیقت تو صرف اللہ کو معلوم تھی۔

میں بارہ تیرہ برس کا تھا جب نانا کا انتقال ہوا۔ ایک دنیا جمع تھی۔ سب دور سے تھے۔ جسماموں، چچا اور ابا تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے گیا تو وہاں ایک سیاہ چادر میں لپٹی عورت رو رہی تھی۔

دوسرا کردار پھولی سیکنہ تھیں۔ جن کی برسی پر ہر سال دادا اور چچا دیکھیں پکواتے اور قرآن پاک کا ختم کرواتے ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے جاتے۔ انہیں غیر برادری کے لڑکے سے محبت ہو گئی تھی۔ بارہا بھیجے گئے رشتے کو دادا نا منظور کرتے رہے۔ انہوں نے بھاگنے کا قصد کیا لیکن عین موقع پر بھڑی ہو گئی۔ پھر ایک رات ایسا سوئیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔ کوئی کہتا کہ دماغ کی نس پھٹ گئی اور کوئی کہتا کہ چچا نے زہر دیا تھا۔ یہ سب افواہیں تھیں یا سچ پتا نہیں لیکن دادی نے دادا اور چچا سے پھر کبھی کلام نہ کیا اور آخر ایک دن اسی بھید بھری ناراضی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بچپن میں تو نہیں لیکن لڑکپن میں آگاہی ہوئی کہ زری خالہ ہمارے خاندان کی سب سے خوب صورت اور قابل لڑکی تھیں۔ وہ پہلی لڑکی تھیں جو میٹرک کے بعد کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے چودہ جماعتیں پاس کیں اور سب سے پہلا کام اپنے منگیتر سے شادی کرنے سے انکار تھا۔

”میں حمید کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ ایک ان بڑھ شخص جو صرف کھیتی باڑی کر سکتا ہے یا کھیت میں گہڑے مارا دیات کا چھڑکاؤ۔“ زری نے نخوت سے کہا تھا۔

”کیا تعلیم دوسروں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے یا ان کو حقیر سمجھتا؟ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن دیگر اوصاف سے مالا مال ہے۔“

عادت کے برخلاف نانا تحمل کا دامن تمام کر گفتگو کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ زری نے ان کی خواہش پر تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن کاش وہ ان کی عزت کی سر بلندی کی خواہش کا بھی احترام کر سکتیں۔

”مجھے یہ حق مذہب نے بھی دیا ہے اور معاشرے نے بھی۔“ زری نے اپنی خواہش کو مذہب کے نام پر پیش کیا۔

دانت میں۔ مگر آج جو اس نے اعلان کیا تھا اس نے میری ذات کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور اس نے اپنی رائے کا اظہار تب کیا جب اس کے تایا زاد کا رشتہ اس کے لیے آیا۔

”بابا! میں گاؤں کے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ تعلیم، سوچ، ہر بات کا فرق ہے۔ آپ فراز سے ایک بار ضرور مل لیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

اس کی خود اعتمادی جس پر مجھے ”فخر“ ہوتا تھا۔ آج زہر لگ رہی تھی اور میرے اندر کا وہی روایتی باپ اور مرد جاگ اٹھا تھا جو بیٹیوں کو ہزار تعلیم دلائے ان کے لاڈ نخرے اٹھائیں لیکن شادی کے فیصلہ کا اختیار انہیں نہیں دے سکتے۔

”آپ ایک بار فراز سے مل تو لیں۔ اگر آپ کو پسند نہیں آیا تو میری زبان پر اس کا نام دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ میں زری خالہ نہیں ہوں جو بھاگ گئی تھیں بابا! میں اس گھر میں رہ کر اپنا مقدمہ لڑوں گی اور میں ایسا کر سکتی ہوں۔“

میں نے تھپڑ مار کر اسے خاموش کروایا۔ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور اندر بھاگ گئی۔ میں غصے

”ایک دفعہ ایک دفعہ ابا کا چہرہ دیکھنے دو۔ مجھے ان سے معافی مانگنی ہے۔“

”بے غیرت، دنیا کو بھولے قہے یاد کروانے آئی ہے۔“ ماموں پھنکار رہے تھے۔

”میں دن رات اللہ سے معافی مانگتی تھی۔ میں ابا کو ہر ہفتے معافی کے خط لکھتی تھی۔“ زری خالہ صفائیاں دیتی رہیں لیکن ماموں اور ابا نے دھکے مار کر انہیں حویلی سے نکال دیا۔

روٹی بلمکتی سیاہ چادر میں ملبوس، زری خالہ واپس چلی گئیں۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتیں لیکن اب سب کچھ پتھر کا ہو چکا تھا۔ میری یادداشت کے کسی گوشے میں ان کا آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھنا، ان کی آخری نظر ہمیشہ محفوظ رہی۔

اس واقعے کے بعد میں تانی کا، ہم رازدار اور غم خوار بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے دل میں مجھے غم مشکوے گلے، زری خالہ کی باتیں، یاوس سب باتنا کر میں۔ اس یقین پر کہ میں ان کا بھروسہ کبھی نہ توڑوں گا۔ اور میں نے بھی ان کا یقین کبھی غلط ثابت نہیں کیا۔ اور زری خالہ کو نجانے زمین نکل گئی تھی یا آسمان۔



وقت گزر گیا۔ ہم لوگ بھی گاؤں سے شہر منتقل ہو گئے تھے۔ وقت بدلا۔ رجحانات، خیالات بدلے لیکن اندر سے ہم سب وہی تھے۔ روایات کے پابند، غیرت کے نام لیوا اور اونچے شعلوں کی خاطر جان کی بازی لگانے والے، بہنوں اور بیٹیوں کو قربان کرنے والے۔

میری سوچ قدرے مثبت تھی۔ جو میں نے بیٹوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی منائل کو بھی تعلیم کی روشنی سے منور کیا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میری ذہین، قرباں پرور اور قابل فخر بیٹی۔

اس کی تعلیم پورے خاندان کے لیے سوالیہ نشان تھی اور اس کے پچا اور دیگر رشتہ دار ناگواری کا اظہار کرتے لیکن میں روشن خیال تھا۔ کم از کم اپنی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناول گھر بیٹھے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر
ڈاک خرچ - 100/- روپے فی کتاب منی آرڈر کریں۔

منگوانے اور دستی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

میں چیخ رہا تھا۔ میرے بیٹے بھی طیش میں تھے۔ بیوی پریشانی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

جب ملازمہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”منائل بی بی منائل بی بی نے۔ گولیاں کھالی ہیں صاحبہ جی۔“ سب بھاگتے دوڑتے اسے اسپتال لے کر گئے۔ وہ رات میں نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ میرے اندر کا غصیلا اور انا پرست مرد مر گیا تھا۔ اور صرف ایک باپ اور اس کی بیٹی سے محبت زندہ رہ گئی تھی۔

میں اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا۔ کبھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا کبھی سجدے میں گر جاتا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان کے بعد ڈاکٹر نے اس کی زندگی کی نوید سنائی تو مجھے لگا کہ جیسے میں زندہ ہو گیا ہوں۔ میں پہلی فرصت میں فراز سے ملا۔ ٹل کلاس کا مناسب صورت لڑکا جو تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔

پڑھا لکھا اور بااوب۔ تعصب کی نظر سے نہ دیکھو تو اتنا برانہ تھا۔ سماجی تفاوت کے باوجود وہ قابل قبول تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر منائل کی خاطر اسے قبول کیا۔ بیٹے ابھی مجھ سے خفا تھے۔ ساری برادری میرے اس قدم کے خلاف تھی۔ اور منائل سے شاید میری خاطر چپ ہو جاتی، صبر کی سل رکھ لیتی۔ لیکن میرے پھینڈنے اس کے اندر بغاوت اور سرکشی پیدا کر دی تھی۔ میں اس آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔ اور اس کی خودکشی نے میرے اندر صرف باپ کی محبت جگا دی تھی اور منفی جذبہ سرد کر دیا تھا۔

”بابا! منائل کی اس حرکت نے ہمیں کتنا شرمندہ کر دیا ہے۔“

”ہم تو اسی لیے لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف ہیں۔“

”منائل کی فراز سے شادی۔ ہم برادری سے کٹ جائیں گے۔“

یہ فقرے دل جلانے والی باتیں میں مسلسل سن رہا تھا۔

میں لان میں تنہا بیٹھا تھا۔ منائل کی رخصتی کے بعد سب مہمان بھی رخصت ہو گئے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی اور اداسی بھی۔ وہی اداسی جو بیٹی کی گھر سے رخصتی

کے بعد گھر کے پام ورد سے لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے لان پر ایک نظر ڈالی۔ منائل کے ہاتھوں سے لگائے ہوئے پھولوں کی پنیریاں اس کا جھولا سب اپنی سہیلی کی رخصتی پر اداس نظر آ رہے تھے۔ ایک جنگ تھی جو میں نے منائل کی خاطر اپنے خاندان اور برادری سے لڑی تھی۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

میں نے سب کی ناراضی مول لی تھی۔ کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی بغاوت یا نفس کی سرکشی کے ہاتھوں وہ غلط قدم اٹھاتی جو معاشرے میں اسے ہمیشہ کے لیے ناقابل قبول بنا دیتا۔ اور نہ ہی میرا دل یہ گوارا کر سکتا تھا کہ وہ اتنا پڑھ لکھ کر گاؤں کے تنگ ذہن اور اجڑ مرد سے بیاہی جاتی۔ جہاں حویلی کی تنگ اور اونچی دیواریں اسے اندر سے مار دیتیں۔

شاید یہ ایک باپ کی محبت تھی جو جیت چکی تھی اور ایک مرد کی خاندانی روایات سے محبت دم توڑ چکی تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد وہ نہیں ہوتے جو اپنی عورتوں کو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر معاف کرنے کی بجائے ظالم دنیا کی ٹھوکرس کھانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یا نام نہاد غیرت پر انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ مرد تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے گھر کی عورتوں کی لغزشوں کو معاف کرنا جانتے ہیں۔ انہیں کندھوں سے پکڑ کر اپنے قدموں پر گھرا کر دیتے ہیں۔ وہ ان کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ اور ان کی عزت کروانے کے ہنر سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی حفاظت۔ جبر و استبداد اندھی روایات اور بے جا پابندیوں سے نہیں ہوتی بلکہ عزت و احترام سے ہوتی ہے کہ یہ نازک آجینے ہوتی ہیں۔ دل بہت اداس تھا اور بو جھل بھی۔

یادوں کی منڈیر پر پھوپھی سیکنہ کی قبر تھی اور روتی بلکتی سیاہ چادر میں زری خالص۔ تو دوسری طرف میری برادری کے مردوں کی نام نہاد سسکتی اور کرلائی غیرت۔

لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں اپنے حصے کا دیا روشن کر چکا تھا۔



تحت خط

بیہ، عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، عنایہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموش اور صبر جیت گیا اور میری قربانیاں برواری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر رہتا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاح" سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے لگی۔

دیا کا کمرہ خاص بیہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک پرنس ٹائیگون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناولٹ



Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئر پورٹ پر افسوں پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افرایم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ مرید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور ”دوست“ کو بھی لے آتا۔ حدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیرہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بدماغ اور غصیل بھی ہے۔ انادیا بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روبا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ انادیا نے اس کو ناراضی سے منع کر دیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روبا ہے۔

روبا جب انادیا کے گھر گئی تو اس نے انادیا کے تایا زاد افرایم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشدی کے آئل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لاپرواہ تھا۔ یہ لڑکار رافع افرایم تھا۔ فوزان مشدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشدی کو غصہ آ گیا اور اس نے خروج لگوا کر اسے جیل بھجوا دیا۔

افسوں مشدی کی اپنی سوتیلی ماں آکھینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔

رافع افرایم کے جیل جانے سے افسوں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔

حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین بیگ پہنچا تو مرید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مرید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلا دیا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست سنجاپا ہو گیا تھا۔ وہ مرید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مرید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مرید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید اس کی خالہ زاد بھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مرید کی لاشری نگلی تھی۔

افسوں نے پہلی بار جب رافع افرایم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسوں اسے دل

دے بیٹھی، وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع افرایم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسوں کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کر سکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسوں یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ پہنچ گیا تھا۔

فوزان، مشدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسوں کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کراچکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھسکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

عنا یہ اور دیا کی موت پر سب رشتے دار شکوک کا شکار ہو رہے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے بیہ پر شک کیا کہ اس نے پیسے کی خاطر سوتیلی بہن اور بھانجی کو زہر دے دیا۔

دیا کا پورا نام انادیا تھا۔ روبا جب انادیا کے لیے رشتہ لے کر گئی تو وہاں انادیا کے چچا کے بیٹے افرایم نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور رشتہ بھجوا دیا۔ انادیا کو شدید غصہ آیا۔ اور حسد محسوس ہوا کیوں کہ افرایم نے اس کے لیے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ انادیا کا رویہ سوتیلی ماں کے ساتھ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ فرزانہ ماں بننے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

انادیا نے افرایم کے گھر سے آئی، اس کی منگنی کی مٹھائی بھی چھت پر پھینک دی تھی۔ اس نے نا جو کے ذریعے اماں دیوانی سے جاہد کرایا۔ کاشف اس پر بری طبع رہا۔

انادیہ کا بھائی ناصر ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ اس وجہ سے گھر پر پولیس آگئی اور ابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ابا اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

افراہیم کا نکاح ہونے لگا تو انادیہ نے اماں دیوانی سے اس نکاح کو روکوانے کے لیے تعویذ لیے۔ لیکن انادیہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نکاح ہو گیا۔ چچی نے انادیہ کے بارے میں کہا کہ یہ جس کی زندگی میں جائے گی اسے جہنم بنا دے گی۔ یہ سن کر انادیہ کے تن بدن آگ لگ گئی۔

افراہیم نے ناصر کو جیل سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ انادیہ نے ایک بار پھر اماں دیوانی سے رجوع کیا۔

فرزانہ ایک بچی کو جہنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ روبہ امید سے تھی۔ وہ بیڑھیوں سے پھسل گئی تو اسے انادیہ کی غلطی کہہ کر افراہیم نے انادیہ کو بہت مارا۔ اس تذلیل نے انادیہ کے دل میں شعلے بھر دیے۔ وہ اماں دیوانی کے پاس پہنچ گئی۔

روبا کی زندگی اچانک طوفانوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے گھر میں سائے نظر آتے۔ وہ خوف زدہ رہتی۔ اماں کی حالت بھی خراب رہنے لگی۔

روبا کی شادی کاشف سے ہو گئی تھی۔ انادیہ اس کی سوتیلی بہن اس کے مزاج کی سختی کا شکار تھی۔ افراہیم کی امی نے افراہیم کے بیٹے فلاح سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انادیہ کو اس پر بھی شدید غصہ تھا۔ وہ دن بہ دن غلط عملیات میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

ایک دن ناجو اچانک دیا کے گھر آگئی۔ اس نے بتایا کہ عملیات کی وجہ سے وہ برباد ہو چکی ہے۔ اس نے اس کا زہہ دار دیا کو ٹھہرایا۔ اس کی ساس نے یہ باتیں سن لیں۔ انہوں نے کاشف اور دیا کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔

اماں کے دل میں روبا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ روبا سے خوف زدہ تھیں۔ افراہیم نے بھی تنگ آکر ایک دن کہہ دیا کہ۔ ”تم اماں کے سامنے نہ آیا کرو۔“

چھٹی قسط

”وہیں اپنے ٹھکانے یہ۔“ داوی نے ناگواری سے کہا۔ رافع کا ٹھکانا انہیں کچھ پسند نہیں تھا۔ عنایہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پچھلے صحن کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

داوی کا یہ گھر بڑا پیارا تھا۔ گرمیوں میں بہت ٹھنڈا۔ چاروں طرف جھکے برآمدے تھے۔ نیچی چھتوں والے۔ یہ گھر جھکے برآمدوں کی وجہ سے خاصی انفرادیت رکھتا تھا۔ عنایہ کو یہاں آنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو کبھی کبھار پیپا کے ساتھ یہاں آتی تھی اور اسے یاد پڑتا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتی واپسی پہ اس کی ماں کا سارا عتاب اس پہ گرا کرتا تھا۔ پیپا کے سامنے بس نہیں چلتا تھا مگر دید میں وہ عنایہ کی درگت بنا دیتی تھی۔

”نکلاٹ لے کر آیا ہے، تھکا ہوا ہے، ہلکی حرارت بھی تھی۔ پھر شادی کے ہزار کام ہیں۔ رافع کا تو تمہیں پتا ہے۔ آج کل سب سے خفا موڈ ہو تو کام کرے گا۔“ وہ رافع کے نام پہ فوراً ٹھنک گئی تھی۔ فلاح کو حرارت تھی یا وہ آج تھکا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ اسے بس رافع کے بارے میں سنا تھا۔ رافع کہاں تھا؟ کدھر تھا؟ اتنے دن سے کہاں غائب تھا؟

وہ بے قرار سی ہو گئی تھی۔ بے تاب سی ہو گئی تھی۔

”داوی! رافع کہاں ہے؟“ اس نے اپنی بے چینی چھپانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔

آنکھیں ملتا اپنی جگہ سے اٹھا اور عنایہ کے قریب دو زانو بیٹھ گیا۔ عنایہ بھی کسی طلسم کے اثر سے باہر نکلی۔ جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔

رافع اس کے بہت قریب تھا۔ وہ ہاتھ لگاتی اور اسے چھو لیتی اور اس نے بے خیالی میں ایسا ہی کیا۔ کئی مرتبہ رافع کا گھٹنا چھوا تھا۔ رافع اس ادا پہ نہال ہو گیا تھا۔ اس نے عنایہ کا مکھن سا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔ تم یہاں کیسے؟“ رافع نے کئی مرتبہ بے یقینی بھرے لہجے میں عنایہ سے کہا تھا۔ جواباً ”وہ بھی اس طلسماتی فسوں سے نکل کر ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”مجھے بھی یقین نہیں آتا۔ تم مجھ سے ناراض ہو سکتے ہو اور میرے مسیحج کا رھلائی بھی نہیں کر سکتے۔“

”مسیحج کا رھلائی کیوں کرتا؟ تم جانتی ہونا میرے مزاج کو۔“ فلاح کی دی ہوئی چیز تمہارے پاس تھی۔ کیوں؟ اور اسی موبائل سے تم مجھے مسیحج کرتیں تو میں کیوں رھلائی کرتا۔“ رافع کے لہجے میں بلا کی شدت پسندی تھی۔ عنایہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔ ”تو پھر تم سے رابطہ کیسے کرتی؟ میرے پاس موبائل

نہیں تھا۔ نہ ماما لے کر دیتیں۔“ عنایہ نے بے بسی بھرے لہجے میں جتلیا تھا۔

”میں جا ب ڈھونڈ رہا ہوں اور کوشش بھی بہت کرتا ہوں، لیکن لگتا ہے پاکستان میں میرے لیے کام ہی نہیں ہے۔“ رافع یہ مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ عنایہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر گہرا سانس بھر کے بولی۔

”تم پہلے اپنی تعلیم تو پوری کر لو۔“

”ڈگری لے بھی لی تو جا ب کہاں سے ملے گی۔“ وہ شدید مایوس تھا۔

”تم نے بس یہی سوچ کر ترقی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔“ عنایہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”کچھ نہ کچھ تو کروں گا۔ تب ہی تو دیا ماما تمہارا ہاتھ

وہ تیزی سے جھپٹے سخن کی طرف جاتی کی یاد میں آنسو بھی بہا رہی تھی۔ جانے کیسے ڈھیر سارے آنسو اس کی آنکھوں میں بے ساختہ اتر آئے تھے۔ پھر جب وہ شور نما رافع کے اس ٹھکانے پہ پہنچی تو اسے وہ سامنے ہی وانلن کے ساتھ کھیلتا دکھائی دیا تھا۔

اس گھر میں یا اس کے اپنوں میں صرف دو لوگ اس کی دھنوں اور آواز کے دیوانے تھے۔ ایک فلاح اور ایک عنایہ۔ فلاح کو وہ خود اب کچھ سنا سنا پسند نہیں کرتا تھا اور عنایہ سے وہ ناراض تھا۔ ملتا بھی نہیں تھا اور اس کے گھر جاتا بھی نہیں تھا اور اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ عنایہ اسے منانے آجائے گی۔ عنایہ اپنی ماں کی پابندیاں توڑ کر اس سے ملنے آجائے گی۔

وہ ایک بیجان آمیز کیفیت میں ”ہاں“ میں اکیلا ہوں“ گاربا تھا۔ ایک جنونی سی کیفیت میں اور اس کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے تھے اور آنکھوں کی چلیوں کے پیچھے عنایہ کسی سبک خرام ندی کی طرح بہتی تھی۔ عنایہ اس کے اندر رہتی تھی۔

اور عنایہ اسے بہت یاد آتی تھی۔ اس کی یاد رافع کو ایسے ہی رلا دیتی تھی اور کون جانے؟ رافع کے تنہائی

میں بہتے یہ آنسو بہت قیمتی تھی۔ بہت ان مول تھے اور ہر روز بے مول ہو جاتے تھے، لیکن آج پھر سے انمول ہو گئے تھے۔ عنایہ اس وقت دروازے کے چوکھٹے میں چوڑی جما کر بیٹھی تھی۔ گھٹنے پہ ٹھوڑی نکائے آنکھیں موندے۔ وہ بھی رافع کی آواز کے ساتھ سفر میں تھی۔ تنہائی کے سفر میں اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہتے تھے اور بے قیمت ہو جاتے تھے۔

معا“ دھن کا اختتام ہو گیا تھا۔ وانلن کے سر گہری نیند تلے دے لگے اور نیم اندھیرے کمرے میں خاموشی بنے لگی۔

اجانک رافع کی نگاہ دروازے کے چوکھٹے میں جمی اور ٹھہر گئی۔ اس کا دل اس شدت سے دھڑکنے لگا جیسے سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجائے گا۔ کیا وہ عنایہ تھی؟ ایک وہم؟ ایک خیال؟ ایک عکس؟ ایک خواب؟ وہ

”وہ ماما سے ڈرتی ہے“ عنالیہ نے انہی سمجھ کے مطابق بتایا تھا۔ ظاہری بات تھی۔ دیا کو تو کبھی بھی یہہ کا یہاں آنا پسند نہ تھا۔ نہ اس نے کبھی یہہ کو دادی کے گھر آنے دیا تھا۔

”اور تم؟“ عرہ نے فوراً بات پکڑی تھی۔ عنالیہ نے دانستوں تلے زبان دیالی تھی۔

”میں بھی۔“ اس نے سر جھکا کر اقرار کر لیا تھا۔

”اگر ماما کو پتا چل گیا تم یہاں آئی ہو تو پھر۔۔۔؟“ عرہ نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ عنالیہ کچھ دیر کے لیے گم صم ہو گئی تھی۔

”پھر مار پڑے گی۔“ اس نے ایک کرب ناک دل میں اترتی لہر کو دباتے ہوئے اقرار کر لیا تھا۔

”کیا ابھی تک؟“ عرہ حیح پڑی۔ اسے تو گویا یقین نہیں آیا تھا۔ دیا ماما — اتنی بڑی بیٹی کو بھی

”ہاں۔“ وہ درود کا ہر احساس دباتے ہوئے بے نیازی

میرے ہاتھ میں دیں گی۔“ کچھ دیر بعد وہ اس کثیف فضا کو توڑا گھرے لہجے میں بولا تو عنالیہ کو ڈھیر ساری شرم آگئی تھی۔

”ماما کو متاثر کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرو۔

ورنہ منہ تکتے رہ جاؤ گے۔“ عنالیہ بھی ہنس پڑی تھی اور

اسے شرارت بھرے لہجے میں چھیڑنے لگی۔

”اور میں کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ جاؤں گی۔“

”واٹ؟“ رافع ایسے بد کا تھا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

”اگ نہیں لگاؤں گا۔“

”کس کو؟“ عنالیہ کو بڑا مزہ آیا تھا۔ وہ اسے جلا کٹا

دیکھ کر تنگ کر رہی تھی۔

”جس کی ڈولی میں بیٹھنے کی جرات کرو گی۔“ رافع کا

انداز سخت تھا۔ بڑا ہی دو ٹوک قسم کا۔ بلکہ عجیب جنونی

سا۔ عنالیہ کو تھوڑا سا خوف بھی آیا تھا۔

”اچھا ڈراؤ تو نہیں۔“ وہ سہم کر بولی تھی۔ رافع

بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر عجیب سے

انداز میں بولا۔

”تم ابھی چھوٹی ہو عنالیہ! تمہیں میرے جذبوں کی

سمجھ ہی نہیں ابھی۔ اس گہرائی میں اترو گی تو سمجھو گی۔

میں تمہارے سائے کے ساتھ کسی کا سایہ بھی

نہیں دیکھ سکتا۔“ رافع جس انداز میں بولا تھا۔ وہ کوئی

ایسا انداز نہیں تھا جسے عنالیہ سمجھ ہی نہ سکتی۔ وہ اس

کے لہجے میں اترتی اس پہچانی کیفیت کے اثر کو سمجھتے

ہوئے ٹھرا گئی تھی۔ اس کا لہجہ اور لفظ ایسے نہیں تھے

جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا۔

عنالیہ کے سارے لفظ رافع کی شدید محبت کے

سامنے ہیچ ہو گئے۔ اس کی پلکیں جھک گئی تھیں اور وہ

مزید کچھ بول بھی نہیں سکی تھی۔

پھر عرہ آگئی اور سارا فسون — ٹوٹ گیا تھا۔

”بیہہ کو بھی لے آئیں۔ اسے بھی کبھی خود کو ہوا

لگائینی چاہیے۔ کہیں وہ اپنی متوقع سسرال میں آنے

سے شرم تو نہیں محسوس کرتی؟“

دووش دکنس کا تیار کردہ

Herbal

سوناہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

﴿ اس کے استعمال سے چندوں میں خشکی ختم ﴾
 ﴿ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ﴾
 ﴿ بالوں کو سبوتا اور چمکدار بناتا ہے ﴾

قیمت - 90/- روپے

دہلڑی سے منگوانے پر امرتسری آرڈر سے منگوانے والے

10 بوتلیں - 250/- روپے تین بوتلیں - 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پینٹنگ چارجز شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

دہلی ٹیکس 53، گرگرب مارکیٹ، لاکھنؤ، جہان پور، اتر پردیش۔

دقی خریدنے کے لیے:

کتبہ عمران، انجسٹ 37، ماروہ بازار، امرتسری۔ فون نمبر 32216361

سے بولی تھی۔ جیسے یہ سب اس کے لیے معمول کے مطابق ہو۔ جس میں کچھ نیا پن نہ ہو اور نہ اسے کوئی تکلیف یا اہانت محسوس ہوئی ہو۔ وہ ہر چیز کی عادی ہو چکی تھی یا اتنی بے حس کہ اسے ذرا سی تکلیف کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

پھر اس دن عنایہ نے داوی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھایا تھا۔ وال، چاول اور املی پودینے کی چٹنی بیٹھے میں چاندی کے ورق سے جی ٹھنڈی ٹھار کھیر۔

اس دن پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا اس نے ایک گھر کے ماحول میں کھانا کھایا ہے۔ فارغ اور عزمہ کی نوک جھونک کے درمیان۔ داوی، داوا کی محبت کے ساتھ۔ ہاں، رافع ناراض ہی رہا تھا۔ کم ہی بول رہا تھا اور فارغ سے تو خاص طور پر بے زار تھا۔

جب داوا نے فارغ سے کہا۔ ”عنایہ کو گھر چھوڑ آؤ۔“ تو فارغ نے بے ساختہ رافع کی طرف دیکھا تھا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا۔ ”رافع ڈراپ کر آتا ہے وہ اس کی گاڑی لے جائے۔“ لیکن رافع نے اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً ”ہری جھنڈی دکھائی تھی۔“

”تمیں اس کی گاڑی استعمال کروں۔“ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ”رافع کے چہرے پر لکھا قطعاً“ نولفٹ کا بورڈ سب ہی کو دکھائی دے گیا تھا۔ تب ہی فارغ نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور فوراً ”گاڑی کی چابی لینے اندر چلا گیا۔“

واپسی پر عنایہ بڑی کیفیو زڈ تھی اور بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ فارغ اس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ تب ہی اس نے عنایہ کو تسلی دی تھی۔

”ڈونٹ وری عنایہ! تم ماما سے مت ڈرو۔ میں ساتھ ہوں نا۔“ اس کا ڈھارس پہنچاتا لہجہ۔ وہ اس کی پریشانی کو چہرے سے کھوج چکا تھا۔ عنایہ حیران رہ گئی تھی۔ فارغ نے بن کہے اس کا ڈر اور سراسیمگی کو بھانپ لیا تھا۔ یہ کتنی حیران کن بات تھی۔ کوئی آپ کی اندرونی کیفیات کو سمجھ لے۔ آپ کی سوچ کو پڑھ لے اور آپ کے خوف کو شیر کرے۔ آپ کی ڈھال بنے۔ عنایہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی یہاں تک

کہ اس کا گھر آ گیا تھا۔

عنایہ سہمی سہمی سی گاڑی سے اتری۔ حالانکہ وہ فارغ پہ اپنا ڈر ظاہر کرنا نہیں چاہ رہی تھی، لیکن اسے اپنے یا اثرات چھپانے بھی نہیں آتے تھے۔

فارغ کی اسی وقت ضروری کال آگئی تھی۔ وہ سائیڈ پہ ہو کر فون سننے لگا تھا۔ عنایہ سر جھکا کر اندر چلی گئی۔ گیٹ سے آگے پتھر ملی روش تھی۔ اس سے آگے لاؤنج کا دروازہ اور سامنے دیوان تھا جس پہ دیا فروکش تھی اور اس کی ایک نگاہ گھڑی پہ جاتی اور دوسری گیٹ کی طرف اٹھتی۔

جیسے ہی عنایہ نے لاؤنج کے اندر قدم رکھا۔ دیا کے جسم میں کرنٹ دوڑ پڑا۔ وہ کسی چیتے کی طرح غراتی ہوئی عنایہ کی طرف لپکی تھی اور پھر اس نے اپنی جوتی اتاری۔ اس وقت وہ غصے اور اشتعال میں بالکل پاگل ہو رہی تھی۔

”بے جیا! اتنے گھنٹے سے ماں سولی پہ بٹگی ہے اور تجھے اپنی آوارگیوں سے فرصت نہیں۔“ دیا نے جوتی اتار کر ابھی لہرائی ہی تھی اور قریب تھا کہ دیا کی چپل عنایہ کا سر گھما ڈالتی اسی وقت فارغ نے لاؤنج کے اندر قدم رکھا تھا۔ دوسرے ہی بل صورت حال کو سمجھتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ دیا کی طرف بڑھا تھا اور پھر اس نے دیا کے ہاتھ سے جوتی پکڑ کر نیچے پھینکی۔

”سوری ماما!“ اس نے فوراً ہی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”غلطی ہماری ہے۔ آپ کو اطلاع نہیں کر سکے۔ عنایہ کی وین خراب ہو گئی تھی۔ سوئے اتفاق میری نظر پڑ گئی اور میں نے دیکھ لیا۔ یوں عنایہ نے آج دوپہر اپنی داوی کے ساتھ گزارا ہے۔ آپ کوئی غلط خیال نہ کریں۔“ فارغ کی وضاحت پہ دیا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ بلکہ فارغ کو دیکھ کر ہی اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس کا غصہ بیٹھ گیا اور برہم تاثرات فوراً نارمل ہوئے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ میں شیرینی کھل گئی تھی۔

”اچھا تو۔ عنایہ تمہارے ساتھ تھی۔ بتا دیتے نا۔ میں فکر تو نہ کرتی۔“ دیا نے خوش اخلاقی کے سارے

کی شروعات میں ایک بل کا کام کرے گی۔ دیا کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔
 ”تو پھر آپ بیہ کولائیں گی ناما ہی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر دیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو سوچوں کے بھنور میں الجھ رہی تھی۔ ایک دم چونک گئی۔
 ”آں۔ ہاں، کوشش کروں گی۔“ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”کوشش نہیں کرنی۔ لے کر آنا ہے۔“ فاتح نے اپنی ایک ایک بات پہ زور دیا تھا۔ دیا کو سر ہلانا ہی پڑا۔ وہ فاتح کو خفا کرتا نہیں چاہتی تھی۔
 اور پھر فاتح بیہ کو خاص طور پر آنے کی تاکید کر کے چلا گیا تھا۔ بیہ کو ایک خوش گوار سا احساس دے کر۔
 ایک امید کا دیا تھا۔ وہ اس دیرے میں روزانہ اپنی ایک طرف محبت کا تیل ڈالتی تھی اور اس دیرے کو اپنے خوابوں کی تیلی سے روشن کرتی تھی۔
 یہ ایک بے نام سی آس تھی جو اگر ہاتھ میں تھی تو آگے کا سفر ایسا مشکل نہیں تھا۔ راہوں میں کٹھنایاں تو تھیں اور انتظار کی اذیت کا احساس بھی ساتھ ساتھ تھا، لیکن امیدیں کب تھکتی ہیں۔ امیدیں تو طاقت ہوتی ہیں۔ روشنی ہوتی ہیں جو تاریکی میں اجالا کرتی ہیں۔

اور امیدیں مسافر بھی ہوتی ہیں۔ تمام عمر سفر میں رہتی ہیں اور سانسوں کے تسلسل کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور سانسوں کا تسلسل تو صرف موت توڑ سکتی ہے۔



جھکے برآمدوں والا دادا کا منفرود سا گھر بقیعہ نور بنا ہوا تھا۔ قہقہوں کے بڑے بڑے ہار مکان کے ماتھے پشت اور دیواروں پہ جلوہ گر تھے۔
 دادا کے گھر میں شادی کی رونق تھی۔ دور دراز سے مہمان شادی میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ دادا نے عذہ کی شادی میں سارے ہی دور نزدیک کے رشتے داروں کو بلایا تھا اور مایوں تک کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ

ریکارڈ توڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔ فاتح نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور دیا لحوں میں ہشاش بشاش۔ فاتح کو زبردستی بٹھایا اور پھر اپنی خوش اخلاقی کے سارے جوہر آج ہی دکھا ڈالے۔ عنایہ حیران تھی تو بیہ مہاجرین۔
 دیا نے فاتح کے لیے بڑے تکلف چائے بنانے کا آرڈر دیا تھا۔ وہ کچن میں مصروف تھی اور عنایہ اپنے کمرے بند۔

جب بیہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں لائی تو دیا کا واضح طور پر اسے دیکھ کر رنگ بدلا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے فاتح کے سامنے آنے کی؟
 اور پھر فاتح کا چونک کر اپنی جگہ سے اٹھنا۔ اس کا منہ اندازاً باوقار اور نفیس سا نشست و برخاست کا اسٹائل۔ دیا تو اسے نظروں میں تول تول کر عنایہ کے لیے اوکے کر چکی تھی۔ اور رہی ہے؟ تو اس کی خیر تھی۔ کہیں بھی شادی ہو جاتی اور پھر رافع بھی تھا۔ خوب صورت شاندار خاندانی۔ چلو، جا ب بھی کہیں مل ہی جاتی۔ آگے بیہ کے نصیب ہوتے۔ دیا نے بالا ہی بالا سب کچھ طے کر لیا تھا۔ اب اسے اپنی پسند کے مطابق ماحول بنانا تھا۔ ایک بساط بچھانی تھی اور من پسند مہرے ترتیب دینے تھے۔ یہ کام مشکل ضرور تھا، مگر ناممکن ہرگز نہیں تھا۔

لیکن ایک چیز غلط ہو چکی تھی۔ بیہ کا فاتح سے ٹکراؤ اور فاتح کی آنکھوں میں بیہ کے لیے مخصوص نرمی پسندیدگی اور چمک۔ جو ایک خاص رشتے کی بدولت نگاہوں کا رخ بدل دیتی ہے۔ دلوں میں نرمی بھرتی ہے اور انہیں ایک دوسرے کے قریب کرتی ہے۔

فاتح کا بیہ کو چائے پہ روک لینا اور ان کی عام سی گفتگو جو دیا کو بہت خاص محسوس ہو رہی تھی اور اسے چھ رہی تھی۔ پھر جاتے جاتے فاتح کا بھدا اصرار دیا سے کہنا بار بار کہنا۔

”عذہ کی شادی میں آپ بیہ کو بھی ساتھ لائیے گا مائی۔“ وہ دیکھ بیہ کو رہا تھا اور مخاطب دیا سے تھا۔ بظاہر کچھ خاص نہیں تھا، مگر دیا کو بہت ہی خاص لگ رہا تھا۔ یوں جیسے یہ سرسری اور اتفاقیہ ملاقات کسی نئے جذبے

داوا، عزمہ کی شادی کے ساتھ ساتھ کسی اور کی شادی کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔

اور سب سے حیران کن واقعہ یہ تھا۔ داوا کی اکلوتی بہو بے شمار سالوں کے بعد ساری خود ساختہ ناراضیاں بھلا کر اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے پہنچ چکی تھی اور آج کے دن داوی نے بھی گزشتہ ساری کدورتیں بھلا کر سو کو گلے سے لگایا اور پیار بھی کیا اور یہ سب کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔ بڑے ظرف اور بڑے دل کی بات تھی۔ حالانکہ داوی نے جو کچھ ان کی اکلوتی بیٹی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ مر کر بھی اسے منہ نہ لگاتیں، لیکن بعض فیصلے وقت اور حالات کرواتے ہیں۔ سوان کے تابع ہونا پڑتا ہے۔

داوی نے بڑے سالوں بعد سسرال میں قدم رکھا تھا اور اس گھر میں ہونے والی تبدیلیوں نے اسے چونکا دیا تھا۔ سب سے اہم چیز جو اس گھر میں موجود تھی وہ اس کی ساس کا لاڈلا نواسا تھا، فاح افرامیم، داوی کو آج پتا چلا تھا۔ فاح اپنے پورے خاندان میں کس قدر مشہور و مقبول تھا۔ لڑکیوں کی مائیں پکڑ پکڑ اس کا تعارف اپنی بیٹیوں سے کرواتیں تھیں۔ اس کی گلیموں سے بھری زندگی، شان دار مستقبل اور بہترین نوکری۔ اس کی شخصیت میں چار چار چاند لگے ہوئے تھے۔

اور پہلی مرتبہ داوی کو اپنی عام سی سوتیلی بہن۔ رشک آیا تھا۔ اگر فاح اس کے نصیب میں تھا تو یہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی، لیکن ضروری تو نہیں تھا۔ فاح یہ کاہی مقدر بنتا۔ تقدیر بدل بھی سکتی تھی۔

اور ادھر عزمہ کی شادی میں خوشی سے اڑتی پھرتی عتایہ اور یہ کو داوی کے اندر چھڑنے والی جنگ کی خبر ہی نہیں تھی۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بہت خوش تھیں۔ وہ اپنی زندگی کا پہلا فنکشن اینڈ کر رہی تھیں اور ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

داوی نے بیہ کو ابٹن گھولنے کے لیے کہا تو وہ دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھ کر بڑے سے کٹورے میں ابٹن گھولنے لگی۔ اس نے سبز انگر کھا

پہنا ہوا تھا اور بالوں کی فرنیچ ٹاٹ کر رکھی تھی جو بار بار کندھے سے جھولتی اور سامنے آگرتی۔ دونوں ہاتھ اس کے ابٹن گھولنے میں مصروف تھے۔ اب وہ بال پیچھے کیسے ہٹاتی؟ ہاتھ تو کندھے سے ابٹن میں لٹھڑے ہوئے۔

معا" تیسری منزل سے فاح اپنی جھونک میں اترتا دکھائی دیا تھا۔ وہ شاید لائننگ والوں کا کام ختم کروا رہا تھا۔ باقی لوگوں کو نیچے بھیج کر وہ ستون کے پیچھے فرش پر بیٹھی جھنجھلائی سی بیہ کے قریب آگیا۔ پھر اس نے گلا کھنکھار کر بیہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ بیہ کی نگاہیں اس کی سیاہ چہل سے ہوتی ہوئی اوپر کو اٹھیں اور ٹھنک گئیں۔

فاح اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ بیہ کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑک اٹھا۔ اس کے چہرے سے ہلکا سا گلال پھیلا تھا اور اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس کے قریب دو زانو بیٹھنے والا فاح ابھی کیا کرنے والا ہے۔ وہ اپنے دھیان میں مگن ابٹن گھولتی بار بار کندھے سے آگے جھولتی چٹیا۔ جھنجھلا رہی تھی۔ فاح نے اس کی جھنجھلاہٹ کو بغور نوٹ کیا اور اس کے کندھے سے جھولتی بل کھاتی چٹیا کو پیچھے لگے کیچو میں اٹکا دیا۔ یہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"اب بتاؤ کیسا؟" وہ مسکراتے ہوئے بہت نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ حیران بیٹھی بیہ کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہوا۔ وہ اتنی حیران تھی کہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"اچھا۔" اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا اور دل اس شدت سے دھڑکا جیسے پینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔

"کیا اچھا۔؟" فاح نے اسے چھیڑا۔ "کیا میں اچھا؟" وہ بہت دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔ بیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہاں۔" وہ مسکراہٹ چھپا کر سر جھکا گئی تھی۔

"میں اس تعریف کو کیا سمجھوں؟" بڑی معصومیت سے پوچھا جا رہا تھا۔ بیہ کو بڑی شرم سی آئی۔ وہ فاح کی قربت سے گھبرا رہی تھی۔ اوپر سے اس کی گہری نگاہیں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریبنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”فاتح“ لکھا تھا۔ ایسا خوب صورت ”اظہار“ جس نے بیہ کو اگلے کئی گھنٹوں تک ایٹن کی نہ ختم ہونے والی مہک سے گوندھے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ پھر وہ سب ہو گیا۔ جو کسی کے گمان میں ہی نہیں تھا۔ جو کسی کے خواب و خیال میں ہی نہیں تھا۔



آخر عزا کی شادی میں ہوا کیا تھا؟

اس دن بڑا سانا موسم تھا اور شام بھی بڑی دل فریب تھی۔

اس شام عزا اور ڈاکٹر ارمیز کا نکاح تھا۔ گھر میں نکاح سے پہلے والی ہانچل تھی اور سب مصروف تھے۔ فاتح اور رافع شامیانوں کا انتظام چیک کر رہے تھے۔

لڑکیاں بالیاں اپنی تیاریوں میں لگی تھیں۔ اور خواتین اپنی پسندیدہ چغلیوں میں مصروف تھیں۔

دادی نے عنایہ سے کہا۔ اوپر سے پھولوں والے تھال اٹھالائے۔ وہ جیسے ہی گلابوں کے تھال اٹھاتی نیچے آئی۔ سامنے سے آتے فاتح سے ٹکرائی تھی۔ نتیجتاً سارے پھول کچھ فاتح کے اوپر اور کچھ میڑھیوں پہ بکھر گئے تھے۔

”الہی خیر میرے سرے کے سارے پھول تنکا تنکا بکھر گئے۔“ وہ انتہائی شوخی سے کہتا خفا عنایہ کی ساری خفگی کو بھول کر میڑھیوں سے تیزی سے پھول سمیٹتا بول رہا تھا۔ اور عنایہ آنکھوں میں خفگی سمونے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ سارا قصور فاتح کا معلوم ہوتا تھا۔ جو اندھا دھند میڑھیوں پر بھاگ رہا تھا۔

”تو آپ بے نتیجے نیل کی طرح جھومتے نہ اوپر آتے میرے سارے پھول آپ نے گرا دیے۔“ وہ منہ پھلا کر واضح طور پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

”لیکن یہ پھول تو میرے تھے۔“ فاتح نے جان بوجھ کر اسے چڑایا۔

”آپ کے کہاں سے آئے۔ جائے اپنا راستہ ناپئے۔“ وہ خفگی سے منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اور بھرپور توجہ۔ وہ بیہ کو بڑی اپنائیت سے دیکھ رہا تھا۔ ”پتا نہیں۔“ بیہ گھبرائی۔ ایسی شوخ نگاہیں ایسی توجہ کے انداز ایسی قربت۔ اس کا دل بڑا ہی بے قابو ہو رہا تھا۔

”سنو بیہ!“ فاتح نے کٹورے میں لگے ایٹن کو اپنی ایک انگلی سے مس کیا تھا۔ بیہ اس طرز تخاطب پہ چونک گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ بکھر گئی تھی اور دل سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

”یہاں آنے کا شکریہ۔“ وہ انگلی لگے ایٹن کو دکھاتا دھیمی آواز میں بولا تھا۔ پھر اس نے ایٹن کی انگلی سے بیہ کا ماتھا چھوا۔ اب وہ اس کے ماتھے پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ کیا؟ بیہ چونک اٹھی۔ گھبرانے لگی۔ وہ ذرا سا جھک کر اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر اس کی سہمی سہمی ہنسی جیسی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

”میں نے یہاں کیا لکھا؟“ وہ اس کی پیشانی کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا۔ بیہ نے نفی میں دھیمے سے سر ہلایا۔

”پتا نہیں۔“

”کیا جاننا چاہو گی؟“ فاتح نے ملافت سے کہا۔ بیہ نے ہاں کی صورت میں ایک مرتبہ پھر سر ہلایا تھا۔ فاتح اس اوپے مسکرایا۔

”تم زبان کو بالکل تکلیف نہیں دیتیں۔ سر بے چارے کی ایک سر سازگرواتی ہو۔ اپنی اوے۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار سے لگے ایک شیشے کو اتار کر بیہ کے سامنے لے آیا۔

”دیکھو یہاں۔“ وہ اس رخ پہ بیٹھا تھا کہ بیہ اور اس کا چہرہ ایک شیشے میں واضح طور پہ نظر آ رہا تھا۔ بیہ نے اپنی پلکیوں کی چلن کو اٹھایا اور شیشے میں نظر آتے اپنے اور فاتح کے عکس کو دیکھ کر رونگ رہ گئی تھی۔

اس نے بے ساختہ ایٹن سے لتھڑی انگلیوں سے اپنے ماتھے کو چھوا اور اس کی آنکھوں میں حیرت گھلتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی پیشانی کو دیکھتی اور چھوٹی تھی۔ اس کی صبح پیشانی پہ بہت واضح لفظوں میں

خیال کرتے ہیں۔ اگر میں ان سے بات کر لیتی ہوں۔ تو کیا گناہ ہے اس میں۔“ عنایہ نے اپنی معصومیت میں رافع کے غصے کو اور ہوا دے ڈالی تھی۔ وہ کوچی کو ہاتھ پر پھیرتی پریشان دکھائی دی۔ داوی نے اسے کہا تھا سونے چاندی کے زیور صاف کرنے والی کوچی اور پر سے لاوے۔ وہ کوچی لے کر نیچے جا رہی تھی جب رافع نے اسے روک لیا تھا۔

”وہ اپنے خیال کا دائرہ یہ تک رکھے تمہارا احساس کرنے کے لیے میں موجود ہوں۔ خبردار جو وہ تمہارے آس پاس بھی دکھائی دیا۔ جان نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا اس کی۔“ رافع کے دھیسے لہجے میں ایسی پھنکار تھی جس نے عنایہ کو دہلا دیا تھا۔ اور وہ ایسی ڈیری سمی کہ جہاں بھی فلاح کو دیکھتی آگے پیچھے ہو جاتی تھی۔ اب جو یہ اتفاقہ ٹھہر ہوئی تھی اس کی رپورٹ نبجانے کیسے رافع کو مل گئی۔ جو اب ”وہ شامیائے کی نگرانی چھوڑنا کچھ دیر کے لیے عنایہ کو اور بدحواس کرنے پہنچ گیا تھا۔

”فلاح جو ڈرائے کر رہا ہے۔ میں صاف سمجھ رہا ہوں۔ اور دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں؟“ ابھی مجھے نانا ایک ضروری کام کے لیے بھیج رہے ہیں۔ عزنہ کا جینز شوروم سے اٹھا کر اس کی سسرال پہنچانا اور سیٹ کروانا ہے۔ کچھ دیر میں وہ لوگ نکاح کرنے بھی پہنچ رہے ہیں۔ سلمان آج ہی سیٹ کروانا ہے۔ ورنہ میں اسے مزہ چکھا دیتا۔“

وہ آگ بگولہ ساعتیہ کے حواسوں کو اڑاتا پیروں کی دھمک چھوڑتا چلا گیا تھا۔

اور اس کے پیچھے وہ کچھ ہو گیا تھا جس کا تصور عنایہ اور رافع دونوں نے نہیں کیا تھا اور نہ ہی فلاح اور بیہ کے گمان میں تھا۔ یوں لگا بس لحوں کے کھیل میں زندگی کے عنوان بدل گئے تھے۔ منزلوں کے نشان بدل گئے تھے۔

یہ ایسی بد نصیبی اور سیاہ سختی تھی جو عنایہ اور بیہ دونوں کے نصیبوں میں اچانک — بھری اور پھیل گئی تھی۔ بد قسمتی اور نحوست کا یہ حلقہ ان دونوں کو ہی نہیں فلاح اور رافع کو بھی ان دیکھے عذابوں میں

گلابی گونا گئے لہنگے میں ملبوس ماتھے پر بندیا سجائے کھلے پالیوں کے ساتھ وہ عزنہ سے زیادہ دلہن لگ رہی تھی۔ فلاح کی رگ شرارت پھڑک اٹھی تھی۔

”وہیے عنایہ! آج تمہاری مایوں تو نہیں؟“ کہیں عزنہ کی جگہ تمہیں رخصت کرنے کا ارادہ تو نہیں بن گیا؟“

”جی نہیں۔ ہمیں ابھی شادی نہیں کرنی۔“ عنایہ نے ناک چڑھائی۔ فلاح کو اس کی یہ سادی سی ادا بہت اچھی لگی تھی۔

”یہ نہ ہو۔ نانا نواسی کے ساتھ پوتی سے بھی جان چھڑالیں۔“ وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔

”کیا ہے فلاح بھائی۔ ہمیں تنگ نہ کریں۔“ عنایہ نے خفگی سے کہا تھا۔ فلاح اس کے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے کیا؟“ فلاح نے نہایت حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور آنکھیں خوب پھیلا رکھی تھیں۔

عنایہ جھنجھلا گئی۔ وہ جلدی سے نیچے جانا چاہتی تھی۔ مبادا وہ ”جن“ دوبارہ اسے یہاں دیکھ لیتا۔

”جی نہیں۔ ہم اکیلے ہیں۔“ اس نے ایک ادا سے کہا اور تھال اٹھا کر جانے لگی۔

”تو پھر آج آپ خود کا اتنا ادب و احترام کسی خوشی میں کر رہی ہیں؟“ وہ سیڑھیوں کی ریٹنگ تھامے اسے پیچھے سے آواز دیتا چھیڑ رہا تھا۔ عنایہ خفگی سے کندھا مارتی آگے بڑھ گئی تھی۔ دراصل وہ کچھ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اور اس کی پریشانی کا دائرہ۔ بس رافع تک محدود تھا۔ جو رات سے اکھڑا اکھڑا دکھائی دیتا تھا۔ آج صبح بھی وہ اپنے کپڑے استری کرتے ہوئے پاس سے گزرتی عنایہ کو روک کر الجھ بڑا۔

”یہ فلاح تم سے کس خوشی میں بے تکلف ہوتا ہے؟ اسے کہو خود کو بیہ تک محدود رکھے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ رافع کی شہد بھری آنکھوں میں اتنا غصہ اور نفرت تھی جس نے عنایہ کو ٹھنکا دیا تھا۔

”تو کیا ہوا رافع! فلاح بھائی بہت اچھے ہیں۔ میرا اتنا

وہ رونے لگی تھی۔ آنسو لگا تا اس کی آنکھوں سے
گر رہے تھے اور ابا ہکا بکا رہ گئے۔ وہ کاشف کے نام پر
ٹرپ اٹھے تھے اور ٹرپ تو اس کی سانس بھی اٹھی
تھیں جب اندر آتے ہوئے انہوں نے دیا کے منہ
سے کاشف کی آخری خواہش سنی تھی۔

ان کے لاڈلے بیٹے کی آخری تمنا؟ آخری التجا؟
ماں کا دل ٹرپ اٹھا تھا۔ ان کے اندر بے قراری بڑھنے
لگی۔

”کاشف نے مرنے سے پہلے مجھے کہا۔ ”اللہ مجھے
ایک موقع دے تو میں اپنے ماں باپ کے قدموں میں
سر رکھ کر صرف اتنی سی التجا کروں کہ میری عنایت کو در
در بھٹکنے سے بچالیں۔ اسے اپنی بیٹی بتالیں۔ کاشف کو
مجھ پہ بھروسا نہیں تھا۔ اگر وقت آجائیں مہلت دیتا تو وہ
آپ کے قدموں پہ سر رکھ کر بھی اپنی بات منوالیتے۔“
دیا ہچکچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی اور اس کے
ساتھ اماں بھی رونے لگیں اور پھر ابا بھی۔ وہ تینوں بے
آواز رو رہے تھے۔ اماں کے سینے کے اندر اپنے جوان
بیٹے کی جدائی نے ایک مرتبہ پھر آگ بھردی تھی۔ اماں
کے اندر آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ
روتے ہوئے ہو سے کہا۔

”میرے کاشف نے کیا کہا تھا؟ مجھے بتا؟ میں اپنے
بچے کی آخری خواہش پوری کروں گی۔ چاہے میری
جان چلی جائے۔ ماں کاشف کی خواہش پہ واری
جائے۔“ وہ جذباتی طور پر ٹوٹ چکی تھیں۔ دراصل دیا
کا وارہی ایسا تھا۔ وہ شکستہ سے بوڑھے والدین اپنے
اکھوتے بیٹے کے غم میں ٹوٹنے لگے۔

جتلا کر گیا تھا۔
ان کی قسمت کا گروں اچانک سیاہ پڑ گیا تھا اور
پندرہویں اس سے بارش کے قطروں کی طرح ٹپکتی
تھی۔

اس شام عزمہ کے سرالیوں کی آمد سے پہلے دوا اپنی
لاٹھی میکے مکان کے اس حصے میں پہنچے تھے۔ جہاں پہ
دیا براجمان تھی اور کسی ملکہ کی طرح گردن تان کر بیٹھی
تھی۔ دیا سر کو دیکھ کر چونک گئی اور پھر دوا بہو کے
قریب بیٹھ گئے اور انہوں نے بڑے سہاؤ کے ساتھ
اپنی اور اپنی بیوی کی مشترکہ صلاح اور خواہش کو دیا کے
سامنے رکھا تھا۔

”میں اور تمہاری سانس چاہتے ہیں کہ آج عزمہ کے
نکاح کی تقریب میں قانع اور اثاب یہ کا بھی نکاح کر دیا
جائے۔ ماشاء اللہ قانع اب شادی کی عمر میں ہے اور یہ
بھی پڑھ چکی۔ بچپن کے اس طے شدہ رشتے کو اب
باقاعدہ ایک شرعی بندھن میں تبدیل کرنا چاہیے۔ ہم
چاہتے ہیں آج نکاح ہو جائے اور عزمہ کے ساتھ ہی
رخصتی بھی کرالیں۔“

دوا نے بڑے قرینے سے اپنی خواہش بہو تک
پہنچا دی تھی۔ وہ تو کب سے اس موضوع پر بات کرنے
کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اگر ابا خود نہ بات کرتے
تو وہ از خود اپنی تمنا کا اظہار کر دیتی۔
اس نے محل کے ساتھ ابا کی پوری بات سنی پھر وہ
اٹھی اور ابا کے قریب فرش پہ دوڑا تو بیٹھ گئی۔ اس نے
ابا کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

”ابا! ساری عمر میں نے اپنی مرضی کی۔ اپنی تمناؤں
کے سامنے سر جھکا لیا۔ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگی۔
جانے کس کس کا دل دکھایا۔ ابا مجھے آپ کو ایک بات
بتانی تھی۔ آپ کے بیٹے کی آخری خواہش۔ جو میں
اپنی خودی اور روبا سے جیلسی کے اثر میں آ کر نہ بتاتی
اور شاید اپنی اکڑ میں کاشف کی اس آخری خواہش کو
اندر ہی اندر دبا دیتی لیکن ابا! میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا
ہے۔ مجھے کچھ کے لگاتا ہے۔“

حضرت انس کا گہرے دل کی کہانی

کانیا ایڈیشن قیمت - 750 روپے

کے ساتھ کمانا پانے کی کتاب

کھانا کھانا

قیمت - 225 روپے پائل ملٹ حاصل کریں۔

آج ہی - 800 روپے کا مئی آڈر ارسال فرمائیں۔

”اور اگر قلعہ مان جائے تو میں ابھی نکاح کے ساتھ رخصتی کے لیے بھی تیار ہوں۔“ وہ گیند ان کے کورٹ میں ڈال کر اب چین کی بانسری بجاری تھی۔ اماں اور ابا سوچوں میں گم تھے۔ ان کے چروں پہ پریشانی کی ریت اڑ رہی تھی۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ ہو گیا تھا جو دیا نے چاہا تھا اور جس کی اس نے خواہش کی تھی اور جو دیا چاہتی تھی ایسا نہ ہو۔ یہ کہاں لکھا تھا۔ کس کتاب میں لکھا تھا؟



زندگی میں کبھی کبھار انسان دور ہے پہ آکھڑا ہوتا ہے جہاں سے نہ آگے بڑھا جاسکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹا جاسکتا ہے اور قلعہ اسی مقام پہ کھڑا تھا۔ متذبذب پریشان اور دور راہوں کا مسافر۔ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نانا کی فرمائش اور نانی کے آنسوؤں نے قلعہ جیسے نرم خور ترقی القلب انسان کو بے بس کر دیا تھا۔ ان کی خواہش ایسی نہیں تھی جس پہ فوراً سر جھکا کر وہ فرماں برداری کا ثبوت پیش کر دیتا۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ ایک معصوم لڑکی کی آنکھوں میں اپنی پسند کی شمع روشن کر آیا تھا۔ اسے ڈھکے چھپکے اظہار کی ڈور تھما آیا تھا۔

”اگر ماموں کی ایسی کوئی خواہش تھی تو یہ بھی میرے پاپا اور دادی کا طے کیا رشتہ ہے۔ ان کی روح کو تکلیف ہوگی۔“ مگر نانا کے پاس دلائل بہت تھے اور نانی کے پاس آنسوؤں کا ہتھیار تھا۔

”مجھے بس اتنی سمجھ بوجھ ہے کہ اگر تم نے عنایہ کے لیے انکار کر دیا تو وہ بڑی ضدی عورت ہے۔ ہماری عنایہ کو انتقالاً کسی کنوس میں دھکیل دے گی۔ وہ عنایہ کے لیے کبھی بھی اچھا فیصلہ نہیں کرے گی۔ وہ میرے بیٹے کی واحد نشانی ہے قلعہ! مجھے اس عورت سے آج بھی اتنا ہی خوف آتا ہے جتنا پہلے دن آیا تھا۔“

نانی کی منتیں، ان کی بے بسی اور التجائیں۔ قلعہ ہارنے لگا تھا۔ گو کہ اسے بیہ سے دھواں دھار محبت نہیں تھی، لیکن ایک انیسیت ضرور تھی۔ اس وقت

”وہ اپنی تمنا دل میں لے کر کیوں چلا گیا؟ اس نے اپنے ماں باپ کو کیوں نہ بتایا؟ ہائے میرا بچہ۔ میری جان۔“ اماں کی آہیں دل چیر دینے والی تھیں۔ ابا کا سر جھکا تھا اور مونڈھے ڈھلک گئے تھے۔ ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔

”کاشف کو وہم تھا۔ میں ان کی بیٹی کے لیے کوئی اچھا فیصلہ نہ کر سکوں گی اور ان کی خواہش تھی۔ عنایہ اپنی دادی کے زیر سایہ رہے۔ عنایہ قلعہ کی دلہن بنے۔“ دیا نے دل کڑا کر کے روتے ہوئے بالآخر کہہ دیا تھا اور ابا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اسی طرح اماں بھی فق رنگت کے ساتھ دیا کو دیکھ رہی تھیں۔

”میں جانتی ہوں۔ یہ آپ کے لیے مشکل ہوگا۔ اسی لیے کہہ نہ سکی، مگر میرے دل پہ بڑا بوجھ تھا۔“ دیا سسکنے لگی اور اماں، ابا و حشت بھری نگاہوں سے دیا کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

”اور بیسے؟“ بہت دیر بعد اماں نے لب کشائی کی تھی۔ ان کے ماتھے پہ بار بار پسینہ آ رہا تھا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی کبھی شوہر کو دیکھتی تھیں اور کبھی بہو کو۔ دیا نے گہرا طویل سانس اندر کو کھینچا اور اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ اب مطمئن تھی کیونکہ سانس اور سر کے حواس اڑانے کے بعد اسے پورا اطمینان تھا کہ وہ کاشف کی آخری خواہش کو رد نہیں کریں گے۔

”اسی لیے میں نے پہلے بیہ سے بات کی اور یقین مانیں بیہ نے میرا مان رکھ لیا۔ دراصل کاشف کی خواہش کا اسے بھی بہت احترام ہے۔ آخر عمر بھر کاشف کی بنائی چھت تلے رہی اور ان ہی کا دیا آج تک کھایا۔“ اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھوکی اور ان دونوں کے چروں کو دیکھنے لگی۔ ان کے چروں پہ واضح طور پہ تبدیلی آئی تھی۔ دیا نے خود کو شاباشی دی۔

”بس مجھے قلعہ کی طرف سے پریشانی ہے، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گا۔“ اس نے آخری پتا بھی آزمایا اور اپنے اندر گہرا سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

دونوں ہاتھ دیا کے سامنے جوڑ دیے تھے۔
 ”دیا! یوں مت کرو۔ میرا دل یوں برباد نہ کرو دیا قلع
 کو مجھ سے مت چھینو۔“ اس نے دیا کے قدموں میں
 اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اس نے مانگا بھی تو کس سے؟ وہ
 عورت جس کا اپنا کشلول عمر بھر خالی رہا۔ وہ کسی اور کو کیا
 دیتی؟

”قلع کو بھول جاؤ بیہ! بچپن کا یہ نام نہاد تعلق ختم
 ہی سمجھو اور صرف اتنا یاد رکھو کہ یہ خواہش میری
 نہیں۔ کاشف کی ہے اور کاشف وہ انسان ہے جس کے
 نکلڑوں پہ عمر بھر تم پلیں۔ اسی نے تمہیں چھت دی
 تعلیم دی، عزت اور پیار دیا۔ اب تمہارا یہ فرض بننا
 ہے کہ کاشف کے احسانات کے بدلے میں اپنا حق
 چھوڑ دو اور عتلیہ کے دادا سے از خود کہو۔“ اس نے
 نہایت نخوت اور تکبر سے کہا تھا۔ بیہ نے دیوار کا سارا
 لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ پھر اس نے اپنے اندر
 سے اٹھتے جو اربھائے کو روکتے ہوئے کہا۔

”تم نے کاشف بھائی کے احسانات کی اتنی کم قیمت
 لگائی ہے دیا! اس شخص کے احسانات تو میں شاید اپنی
 جان دے کر بھی نہ اتار سکوں۔“ کچھ دیر بعد وہ بڑے
 ضبط اور۔۔۔ حمل کے ساتھ خود کو تیل تیل جوڑتی
 دیا سے مخاطب تھی۔ ”وہ اتنا پیارا انسان جو تم جیسی خود
 غرض عورت کے ساتھ نباہ کرتے کرتے تھک گیا تھا۔
 اپنی زندگی بھی ہار گیا اگر یہ کاشف بھائی کی خواہش ہے
 تو یہ کی دس زندگیاں بھی ان کی خواہش پہ قربان۔ کہو
 قلع سے جا کر بات کروں یا اس کے نانا کے سامنے اپنا
 انکار پیش کروں؟“

وہ ایک ایک لفظ کا بھلا دیا کے اندر اتارتی ضبط سے
 کھڑی تھی۔

دیا اس کے صبر اور ضبط کے ساتھ اعتماد کی طاقت کو
 دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کمزور پڑی تھی، لیکن اس نے
 اسے آرام سے عتلیہ کے دادا کی عدالت میں پیش
 کر دیا۔

ابا نہیں چاہتے تھے کہ کاشف کی خواہش کو پورا
 کرنے کے چکر میں وہ قلع کے ساتھ زیادتی کریں یا بیہ

سے جب عزم نے پایا کی جیب میں سفر کے دوران اس
 کے کانوں میں گھس کر اسے بیہ کے ساتھ جڑے
 رشتے کے متعلق بتایا تھا۔ تب وہ حیران ہوا تھا اور یہ
 حیرانی پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے بیوں
 کے طے کیے اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ وہ
 اپنے رویے مزاج اور جذیوں میں اعتدال پسند تھا۔ جو
 ہے جس طرح ہے اسے قابل قبول ہوتا۔

جیسے اس وقت وہ نانا اور نانی کے مجبور کرنے پہ
 بے بس ہو گیا تھا اور اسی شام عزم کے ساتھ ہی عتلیہ اور
 قلع کا نکاح ہو گیا تھا۔

اور قلع کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ دیا کو
 بیک وقت کتنے محاذوں پہ لڑنا پڑا تھا۔

یہ نکاح اتنی آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہوا تھا۔
 پہلے تو دیا نے اپنی بہن کے حواسوں پہ بم پھوڑا تھا۔ وہ
 اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس
 نے دیا ہی بیہ کے سامنے ڈراما کیا تھا جیسا ڈراما اپنی
 ساس اور سر کے سامنے کیا۔

”بیہ! تمہارے لیے تو روشن راہیں ہیں۔ پوری
 زندگی پڑی ہے مگر میری عتلیہ مرجائے گی۔ وہ قلع کو
 چاہتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کی چیٹ
 پڑھی۔ قلع بھی یقینی طور پر اس سے محبت کرتا ہے تب
 ہی تو عتلیہ اس مقام تک آ پہنچی ہے۔ پھر کاشف کی بھی
 یہی خواہش تھی۔“ دیا نے روتے ہوئے بیہ کے سر پہ
 دھماکا کیا تھا اور بیہ کے وجود سے روح تک کو کھینچ لیا
 تھا۔

”دیا! خدا کا واسطہ ایسے مت کرو۔ اس طرح
 ظلم مت ڈھاؤ۔ عتلیہ کب قلع سے؟ وہ تو رافع کو چاہتی
 ہے۔“ بیہ کی پھٹی پھٹی آواز اس کے حلق میں گھٹ کر
 رہ گئی تھی۔

”عتلیہ کے چاہتی ہے؟ یہ میرا درد سر ہے۔ بس تم
 قلع سے دست بردار ہو جاؤ۔“ وہ آن کی آن میں فولاد
 بن گئی تھی۔ بیہ نے وحشت بھری نگاہوں سے اپنی
 بہن کو دیکھا۔ جو اس وقت کوئی بلا لگ رہی تھی۔

وہ دیا کے قدموں میں گر گئی تھی اور اس نے اپنے

ہو، مگر اس کے اندر زندگی ختم ہو چکی ہو۔ اس کے سامنے بھی آگ تھی۔ پیچھے بھی آگ تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔ عنایہ چاروں طرف سے آگ میں گھری ہوئی تھی۔



چالیس چلنے والے کو اپنی چالوں پہ کمال حاصل تھا۔ اس نے مہرے آگے پیچھے کیے اور بازی کو ہاتھ میں کر لیا۔

دیانے بالکل ایسا ہی کیا تھا۔ عنایہ کا نکاح ہوتے ہی رخصتی بھی ساتھ کر دی۔ یوں عزہ سے پہلے عنایہ شادی شدہ ہو گئی تھی۔ اس سے اگلے دن عزہ کی رخصتی تھی اور پھر ولیمہ۔ عزہ کے ولیمہ کا فنکشن نمٹنا کر ابانے فلاح اور عنایہ کا ولیمہ بھی کر دیا تھا۔

دیانے اپنی بیٹی کے ولیمہ پہ بے پناہ خوش تھی اور اس کی خوشی دیوانوں کو بھی دکھائی دیتی تھی۔ ابابا اور اماں بھی خوش تھے۔ عزہ اپنی خوشیوں میں گم تھی اور یہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فلاح بالکل نارمل تھا۔ وہ اپنے مزاج کے عین مطابق کسی بھی تبدیلی کو فوری طور پہ قبول کر لیتا تھا۔

اماں اور ابابا اس لیے خوش تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی آخری خواہش کو پورا کر دیا تھا اور اس کی دنیا سے ناخوش گئی روح کو سکون پہنچا دیا تھا اور سب سے بڑی خوشی تو یہ تھی فلاح نے عنایہ کو قبول کر لیا تھا۔ پچھلے چار دنوں سے وہ اتنا ہی مطمئن اور خوش دکھائی دیتا تھا۔ نارمل انداز میں گفتگو کرتا اور روزمرہ کے معاملات کو نمٹاتا۔

اور اس پورے فنکشن میں ایک عنایہ تھی جو اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کم صم حیران پریشان، اپنے دھیان میں اور ایک رافع تھا جو کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

رافع کہاں تھا؟ سب سے پہلے ثانی کو خیال آیا اور پھر عزہ اور نانا کو جب کہ عنایہ تو پچھلے چار دن سے پریشان تھی۔

کے خواب نروچ ڈالیں۔ انہوں نے دیا یہ پورا اعتبار نہیں کیا تھا انہوں نے بیہ کو بلا کر اس کی خواہش جانچی۔ بیہ نے نہایت آرام کے ساتھ دیا سے کی گئی یا میں دہرا دی تھیں۔ اس نے اقرار کیا۔ وہ فلاح کے لیے گہرے جذبات نہیں رکھتی اور یہ کہ وہ کاشف بھائی کی آخری خواہش کا احترام کریں۔ وہ اس پگنی کی اعلا طرفی کے سامنے جھک گئے تھے۔ وہ شرمندہ ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا تھا۔ جب فلاح مرد ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا تو وہ عورت ہو کر کیا کر سکتی تھی؟

اور جب دیا نے گلابی لہنگے میں ملبوس اپنے آپ میں گم عنایہ کا بازو دوچ کر اسے ایک کونے والے کمرے میں دھکیل کر صرف اتنا کہا کہ۔

”آج“ ابھی اور اسی وقت تمہارا نکاح ہے۔ اگر زبان ہلائی تو نکاح کے کتوں کو ڈال دوں گی۔“

تب عنایہ کا گلابی رنگ سفید پڑ گیا تھا اور اس کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ نیل میں ڈھل گئے تھے اور اس نے صرف سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا تو دیا نے اس کا بازو دوچ کر جھنجھوڑا اور اس کی ہنسی کی ہڈی پہ اپنا پنجہ گاڑ دیا تھا۔

”ایک لفظ بھی نہیں۔ ورنہ بہت ماروں گی عنایہ! میں نے یہ سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں کیا۔“ وہ زہر خندی دھاڑی تھی۔

”ماما! پلیز یہ مت۔ کریں۔“ عنایہ نے نظروں سے التجا کی تھی اور اس کے کندھے پر ایک گھونسا پڑا۔ حالانکہ اس نے زبان بھی نہیں ہلائی تھی۔ اس نے بس سر جھکا دیا تھا جانے ابھی اسے کتنا اور کہاں کہاں صبر کرنا تھا۔

بیہ نے دیکھا۔ ہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عنایہ نکاح نامے پہ دستخط کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ اپنی موت کے پروانے پہ دستخط کر رہی تھی۔

عنایہ صابر تھی۔ بیہ کو یقین آ گیا تھا۔ اس نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نے خود کو قربان کر دیا تھا اور وہ ایسے مجتہد میں ڈھلی لگ رہی تھی جو سانس تو لیتا

اور جب فالخ اس کے قریب آیا اور اسے بے چین دیکھ کر نرمی سے وجہ دریافت کی تو اس نے بڑی غائب دماغی سے پوچھا تھا۔

”رافع کہاں ہے؟“

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ فالخ لمحہ بھر کے لیے حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے تاثرات پہ قابو پایا۔

”اے بخار ہے۔“

فالخ کے جواب نے عنایہ کے دل کو عکسے لگا دیے تھے اور اس نے اپنے پاس سے اٹھتے فالخ کا بے ساختہ ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس کے لہجے میں بے قراری پنہاں تھی۔ فالخ نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی اور پھر آہستگی سے بولا۔

”اپنے اسٹوڈیو میں۔“ فالخ یہ کہہ کر اسٹیج سے اتر گیا تھا اور اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا۔ اور عنایہ پورے فنکشن کے دوران گم صدم ہی رہی۔

دیا سے ڈھیر سارا پیار کر کے بیہ کو ساتھ لے کر چلی گئی تھی اور جاتے سے بیہ نے عنایہ کا ملائم ہاتھ پکڑ کر صرف اتنا کہا۔

”عنایہ! اپنے حواسوں میں آ جاؤ۔ خود کو سنبھالو۔ فالخ رافع نہیں ہے، لیکن رافع سے بہت اچھا ہے۔ اپنی نئی زندگی کو قبول کر لو۔“

بیہ اسے بدحواسی کے ساتھ گم صدم نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ عنایہ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے خبر تھی کہ دیا نے صرف اس کے ساتھ ہی کھیل نہیں کھیلا تھا بلکہ عنایہ کے دل پہ بھی شب خون مارا تھا۔ اسے دلوں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔

مگر آتے ہی اس نے داوی سے پوچھا۔

”داوی! رافع کو دیکھ آؤں؟“ اس کے لہجے میں واضح بے قراری پنہاں تھی۔ داوی نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں بیٹا۔“ انہوں نے ملائمت سے منع کیا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ داوی نے کیوں منع کیا تھا؟

”کیوں داوی؟“ اس کی آنکھوں میں نمی اٹھ آئی جسے

اس نے بڑے ضبط کے ساتھ اندر دھکیلا۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ دو آئی کھا کر سو رہا ہے۔“ انہوں نے نرمی سے کہا اور نگاہ چڑائی تھی۔ ”تم اپنے کمرے میں چلو۔ فالخ ابھی آتا ہی ہو گا۔“ انہوں نے اسے زبردستی اس کے کمرے میں بھجوا دیا تھا اور وہ کھوئی کھوئی سی اندر چلی آئی۔

یہ اس کا کمرہ تھا اور اسے اتنا ہی پر اپنا نظر آتا۔ یہاں پہ فالخ تھا۔ اس کی خوشبو تھی اور عنایہ کو فالخ کی خوشبو سے وحشت ہوتی تھی۔

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی مسہری پہ ڈھے گئی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ تنہائی تھی۔ ایک مہیب سا ساٹنا تھا۔ جو اس کے اندر بھی ڈیرا جمائے بیٹھا تھا۔ اس مہیب خاموشی میں باہر سے داوی کی دبی دبی آواز آتی تھی۔

”دو آئی نہیں کھاتا“ بولتا بھی نہیں، کچھ کھاتا بھی نہیں، بات بھی نہیں کرتا۔ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ کہتا ہے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ کوئی میرے سامنے نہ آئے۔“ داوی شاید داوا کو بتا رہی تھی۔ پھر اسے فالخ کی آواز سنائی دی تھی۔ یعنی ان دونوں کے ساتھ فالخ بھی موجود تھا۔

”مجھ میں نہیں آ رہا۔ رافع ایسے کیوں کر رہا ہے؟ اپنے ساتھ دسمنی؟ دو آئی اٹھا کر پھینک دی ہے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ نانی! آپ اسے سمجھائیں۔“ وہ بھائی کے لیے فکر مند تھا اور اس کی پریشانی کبجے سے مترشح تھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔ اب تم اندر جاؤ۔ عنایہ اکیلی ہوگی۔“ داوی نے شاید فالخ سے کہا تھا۔ وہ سر ہلا کر کچھ سوچتا ہوا اندر آیا تو عنایہ مسہری پہ نیم غنودہ سی پڑی تھی۔ آڑی ترچھی بے آرام سی۔

فالخ اسے ایک نظر دیکھ کر اپنے کپڑے نکال کر باہر نکل گیا تھا۔ پھر کافی دیر بعد لوٹا تو بے حد تروتازہ تھا۔

عنایہ ابھی تک روایتی لباس میں تھی۔ سچی سنوری سی۔ فالخ کئی بالوں میں انگلیاں پھیرتا مسہری پہ آ گیا۔ پھر اس نے بگھری بگھری عنایہ پہ نگاہ ڈالی۔ اس کا فالسی

متوقع تو فاتح کے لیے بھی تھا، لیکن وہ مرد تھا۔ اس نے جلدی حالات کو قبول کر لیا تھا لیکن عتیہ کے لیے یقیناً یہ سب بہت مشکل تھا اور ابھی فاتح اسے وقت دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کو دل و دماغ کی رضامندی کے ساتھ قبول کر لے۔

”بس ایسے ہی۔ ابھی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔“ عتیہ نے تھکن زدہ لہجے میں کہا تھا۔

”چلو، موڈ بناتے ہیں۔ آؤ یہ امینیکس کھاؤ۔“ اس نے زبردستی عتیہ کو امینیکس کھلائے تھے۔ پھر اس نے خود بخود چائے پی لی تھی اور تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ گئی۔

”اب یقیناً تم سونا چاہو گی؟“ فاتح نے اس کے بکھرے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا تھا۔ عتیہ کا دل حلق میں آگیا۔ فاتح اس کے قریب تھا۔ بہت قریب۔ اس کی سانسوں کی حدت عتیہ کو اپنی پیشانی پہ محسوس ہوتی تھی۔

”جی۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تھا۔ ”بچو جی! کر لو انی نیندیں پوری۔ پورا پورا حساب لوں گا۔“ اس نے مسکرا کر عتیہ کی ناک دبا لی تو اس کا دل بڑی شدت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔

عتیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ کیا اس نے عتیہ کے ساتھ شادی کو قبول کر لیا تھا؟ کیا یہ زبردستی نہیں تھی۔ دینے سے اسے بھی بلیک میل کیا تھا۔ دادا دادی کو بلیک میل کیا تھا تو کیا فاتح نے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔ قلبی روحانی طور پر؟

عتیہ کا دل بند ہونے لگا تھا اور فاتح اس کے تاثرات کو دیکھتا گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”عتیہ! تم خود پہ بوجھ مت ڈالو۔ پریشان مت ہو۔ یہ شادی جتنی تمہارے لیے غیر متوقع ہے۔ اسی قدر میرے لیے بھی۔ جب تک تم ذہنی طور پر مان نہ لو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ اب تم سو جاؤ۔ سوٹ ہارٹ۔ اچھی سی نیند لو اور فریش ہو جاؤ۔ میں تمہیں پہلی سی عتیہ کے روپ میں دیکھنا چاہوں گا۔“ وہ اس کا گال نرمی سے سہلاتا اپنی جگہ سے اٹھا اور

رنگ کا شرارہ پوری مسہری پہ بکھرا تھا۔ فاتح نے اس کے شرارے اور روئے کو سمیٹ کر اپنے لیے جگہ بتائی تھی پھر اس نے عتیہ کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ اسے عتیہ کی پیشانی بہت برقی محسوس ہوئی تھی۔ ایک دم ٹھنڈی۔

”عتیہ!“ فاتح نے اسے نرمی سے پکارا تھا۔ عتیہ ایک دم ٹھنک گئی اور پھر کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔ تب ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا روپہ فاتح کے کھٹنے تلے دبا ہے۔ اس کی اٹھنے والی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے عتیہ!“ فاتح نے ایک مرتبہ پھر پوچھا تو عتیہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”نہیں۔“

”ہوں۔ بی بی لو لگ رہا ہے۔ رکو، میں چیک کرتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولی اور بی بی آپریشن نکال کر اس کی کلائی میں لگایا تھا۔ عتیہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکی تھی۔ فاتح نے کچھ دیر بعد بی بی آپریشن اتار کر عتیہ سے کہا۔

”بی بی تو نارمل ہے۔ عتیہ! لگتا ہے تم تھک گئی ہو۔ چائے پیو اور آرام کرو۔ میں چائے لے کر آتا ہوں، لیکن اس سے پہلے اپنا ڈریس چھینج کرو۔“ فاتح کچھ سوچتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ پھر جب واپس آیا تو عتیہ عام سے سوٹ میں مسہری پہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ وہ چائے کے ساتھ امینیکس بھی لایا تھا۔

”تم نے کھانا نہیں کھایا نا؟ اپنے ولیمہ کا۔ ایسا یادگار کھانا نہیں کھایا۔“ وہ عام سے انداز میں چائے اسے تھماتا بلکہ پھلکے لہجے میں بولا تھا۔ عتیہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں تھی۔ میرا دل نہیں چاہا۔“ اس نے سر جھکا کر وجہ بتائی۔

”دل کا بھوک سے کیا تعلق ہے؟“ فاتح نے گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ وہ جان بوجھ کر عتیہ کو بولنے پہ آکسا رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے وہ ایسی ہی گم صم حیران پریشان تھی۔ جیسے یہ سب کچھ غیر متوقع ہو اور غیر

کہ اپنے دل کی بازی بھی ہار گیا۔ اپنی زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔ جب محبت ہار دی تھی تو پیچھے کیا رہ جاتا تھا اور اسے ہرانے والے اس کے بہت اپنے تھے۔ ماں باپ :- بیٹھ کر چاہنے والے نانا نانی۔ انہوں نے رافع کو ہرا دیا تھا۔

وہ ایک گھنٹے کے لیے منظر سے غائب ہوا اور انہوں نے اسے مرا ہوا تصور کر کے اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائی کے نکاح میں شامل ہوتا، لیکن وہ اس کا بھائی کہاں تھا؟ وہ تو اس کا رقیب تھا۔ اس کا دشمن تھا۔ جس نے اس کی اولین چاہت یہ شب خون مارا تھا اور رافع افرایم کو کسی ایسے موقع کی ہی تلاش تھی۔ جب وہ اپنے دشمن کو نچا دکھاتا۔ اور ان ساری باتوں میں بس ایک چیز واضح تھی۔ عنالیہ کی نیلی آنکھوں میں جمی ہوئی تھالی اور محبت کو کھودینے کا دکھ۔

وہ جب بھی گھر آیا کبھی عنالیہ سے سامنا ہوتا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں اتری ویرانی اور آنسوؤں کا ضبط کی شدت سے ٹوٹ جانے والا بند رافع کے اندر قیامت کی ہلچل مچا دیتا تھا۔ اس کا جنونی سا جذباتی ذہن صرف ایک ہی بات کو سوچتا اور تڑپ تڑپ اٹھتا۔

”عنالیہ رافع کے ساتھ خوش نہیں ہے۔“ اور یہ سوچ رافع کے اندر تھلکہ مچا دینے کے لیے کافی تھی۔ شہرورد کے کھنڈر اور لٹی ہوئی چاہتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کبھی برائی نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ ایک سی لگتی ہیں۔ اس کے اندر ایسی آگ لگی تھی جو بجھتی نہیں تھی۔ کبھی عنالیہ کی آنکھوں میں جئے ہوئے آنسو دکھائی دیتے تو اس آگ میں بھانجھڑ لگ جاتے۔ رافع افرایم کے پاس اتنی سمجھ نہیں تھی۔ نہ اس کے پاس ایسی آنکھ تھی جو عنالیہ کے اندر اتر کر جھانک لیتا۔ وہ رونی ضرور تھی، مگر اس کی جدائی میں نہیں۔ اس کی تھالی پہ اس کی دیوانگی ہے۔ اگر رافع افرایم تب صرف اتنی سی بات جان جاتا تو یہ سب نہ ہوتا؟ وہ درد نہ بھگتا۔ وہ مگر مگر پاسا نہ بھرتا۔ وہ پچھتاؤں کی اس

باہر نکل گیا تھا اور عنالیہ اس کے جاتے ہی تکیے میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کے رونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر روئے اور ہر طرف اپنے ”لٹنے“ کی منادی کرادے۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی اتنی مشکل نہ ہوتی۔ اتنی بوجھ زدہ، تکلیف دہ نہ ہوتی۔

وہ فلاح کے قابل تھی کیا؟ وہ اتنے عالی شان بندے کے قابل تھی کیا؟

اسے اپنا آپ فلاح کی محبت، توجہ اور خیال کے سامنے بہت ہی سچ اور کم تر لگتا اور فلاح واقعی بہت اچھا تھا۔ اتنا اچھا، ہر رو خیال رکھنے اور چاہنے والا۔

وہ عنالیہ سے پہلے بھی بہت پیار کرنا تھا اور جب سے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی تب سے بہت زیادہ ہی توجہ دینے لگا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی۔ فلاح نے بیہ کو بھلا دیا کیا؟ حالانکہ بیہ کے اندر تو فلاح اب بھی بستا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں اور زندگی میں بستا تھا جب کہ فلاح نے اسے ایسے بھلایا جیسے بیہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق کبھی نہیں تھا۔

وہ اپنی زندگی اور عنالیہ میں گم ہو گیا تھا اور عنالیہ اس کی بے پناہ توجہ، محبت اور چاہت کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ فلاح کی محبت کے سامنے ”سرنگوں“ ہو چکی تھی۔



وقت اچھا ہوا یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ یوں وقت بیہ کے اوپر سے گزرنے لگا تھا مگر رافع کے اندر جمنے لگا تھا۔ جم جم کر کھلنے لگا تھا۔

وہ رافع افرایم تھا۔ ایک ناکام انسان۔ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ ہر میدان میں اپنے بھائی سے پیچھے رہ گیا تھا۔ تعلیم، کھیل، معاشی، سماجی حتی کہ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشی میں اپنے بھائی سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ فلاح تھا، ہر میدان میں فتح یاب ہوتا رہا۔ وہ رافع تھا۔ ہر میدان میں ہارنا رہا۔ حتیٰ

آگ میں بھڑ بھڑنے لگتا۔

اگر رافع افرایم تب جان جاتا کہ عنایہ کی آنکھ میں آنسو اس لیے نہیں آتے کہ وہ فالج کے ساتھ خوش نہیں۔ یہ آنسو تو اظہارِ تشکر تھے۔ ایک اچھی چیز کے کھوجانے کے بعد اس سے زیادہ اچھی چیز کے ملنے کی خوشی میں۔

وہ ان آنسوؤں کی کہانی جان ہی نہ سکا۔ خود بھی لٹا، خود بھی برباد ہوا اور اپنے ساتھ کتنے ہی لوگوں کو بھی برباد کر دیا۔ ہاں تب وہ ایسا ہی جنونی تھا۔ ایسا ہی جذباتی تھا۔ اس نے وہ کام کیا تھا۔ جو رہتی دنیا تک یاد رہتا۔ اس نے ذلت اور رسوائیاں سمیٹی تھیں۔ اس نے کیا خریدا تھا؟ کیا کھویا تھا؟ کیا پایا تھا۔ جانے کس جہاں کا زہر خریدا تھا۔ جو امرت سمجھ کر پیا اور نیل نیل ہو گیا تھا۔ عنایہ خوش نہیں تھی۔ یہ اس کا وجدان کہتا تھا۔ عنایہ کی جھکی آنکھیں بھگی رہتی تھیں اور رافع کو دیکھ کر وہ منظر سے ہٹ جاتی تھی۔

ایک گھر میں ہوتے ہوئے یہ کیسے ناممکن تھا کہ آمانا سامنا نہ ہو۔ حالانکہ رافع نے خود کو بے پناہ مصروف کر لیا تھا۔ کیے بعد دیگرے ملنے والی ناکامیوں کے بعد اچانک ہی اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ اس کو نی وی پہ گانے کا ایک موقع ملا تھا۔ جو اس کے لیے کامیابیوں کا سنگ میل ثابت ہوا تھا۔ اسے کیے بعد دیگرے دو تین کنسرٹ مل گئے تھے اور وہ موسیقی کی دنیا پر راج کرنے لگا۔

اور رافع کو پکا یقین تھا۔ اس کی کامیابی پر نانا اور نانی خوش نہیں ہوں گے اور ایسا ہی تھا۔ نانی نی وی پہ اسے ناتے اور جھومتے دیکھ کر اٹھ کر باہر نکل جاتی تھیں اور ان کی بڑبڑاہٹ۔ ”ہماری عاقبت خراب کرے گا۔“

عنایہ تاسف سے داوی کو دیکھتی اور زیر لب بڑبڑاتی۔

”ایچھا تو گاتا ہے داوی!“ وہ خوب دل لگا کر نی وی دیکھتی تھی۔

مشہور ہونے کے ساتھ ہی اس کے پاس وقت کم ہو گیا تھا۔ اب وہ ہفتوں گھر نہ آتا تھا۔ یہ اس کے لیے

بہت بہتر تھا۔ اسے فالج اور عنایہ کو دکھانا نہ پڑتا اور عنایہ کی جھکی بھگی آنکھیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن یادیں کہاں پیچھا چھوڑتی تھیں۔ وہ نئے بننے والے پرستاروں اور شہرت کے بیچ سفر کرتے ہوئے بھی ان یادوں سے پیچھا چھڑانے سے قاصر تھا۔ اسے عنایہ بہت یاد آتی تھی۔ وہ چینی کی گڑیا جو اس کی تھی اور جو اس سے چھن لی گئی تھی۔ اسے دیا یہ غصہ چڑھتا تھا جس نے عمر بھر اسے دھوکے میں رکھا اور ہمیشہ یہی باور کرایا کہ عنایہ اسی کی ہے۔

ہاں جب فالج کو کامیاب ہوتا دیکھ لیا تو اس نے اپنی نیت بدل لی تھی۔ اس نے عنایہ کے لیے خود غرضی کی حد تک اچھا سوچنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہتر نئے سفر میں بہت سارے دیوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ پھر دیا کیسے سکون سے رہ سکتی تھی؟

اور ایک دن اسی طرح اپنے کامیاب کنسرٹ سے واپسی کے بعد اس کا ایسے میٹر گھوما کہ وہ اپنی نئی ٹکڑ چمکتی کار میں اپنے ماموں کے گھر سیدھا چلا گیا تھا۔ اس وقت دیا اکیلی تھی اور رافع کو دیا سے حساب لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے دیا کے ساتھ بہت لڑائی کی تھی۔ اب وہ پہلے سارا رافع نہیں تھا۔ جو اس کی ساری کڑوی کسہلی سن کر آجاتا۔ اب وہ ایک مشہور ہستی تھا۔ لوگ اس سے ملنے کے لیے وقت لیتے تھے اور بات کرنے سے پہلے بہت دفعہ سوچتے تھے۔

جیسے اب دیا کو بھی سوچنے کا اور ناپ تول کر بات کرنے کا ارادہ کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رافع کی بدلی ہوئی پر سنائی تھی اور اس کی چمکتی کار، برانڈڈ کپڑے، اعلا خوشبو، بہترین گھڑی اور اعلا گلاسز۔ وہ پہلے والے رافع سے بہت مختلف تھا اور دیا کو سوچ سمجھ کر اس سے بات کرنا تھی۔ اس کا شکوہ دیا کے اندر ترازو ہو گیا۔

”بس سمجھ لو، وہ تمہاری قسمت میں نہیں تھی۔“

دیا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابا فالج کے لیے عنایہ کو

تمہیں زہب نہیں دیتی۔ عنایہ اب تمہارے بھائی کی عزت ہے۔“ ثانی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنا سینہ پکڑ لیا تھا۔

”عزت داروں میں ایسی باتیں گناہ سمجھی جاتی ہیں۔“

”تو آپ مجھے عزت دار ہی نہ سمجھیں۔“ وہ انتہائی بد تمیزی سے چنچا تھا اور باہر کھڑکی سے چمکی عنایہ کا دل لرز اٹھا۔ یہ رافع کو آج کیا ہو گیا تھا؟ وہ اس طرح کیوں کر رہا تھا؟ اب تو اسے عنایہ کو خوش دیکھ کر سنبھل جانا چاہیے تھا۔ پھر وہ اتنا شور کیوں کر رہا تھا؟ اگر اس کی بکو اس فاح سن لیتا تو کیا ہوتا؟

عنایہ کی جان نکلنے لگی تھی۔ بہر حال اسے رافع سے زیادہ اپنا گھر بچانے کی فکر تھی اور اسے اتنی سوجھ بوجھ تو تھی۔ بلا کا حلیم الطبع فاح کم از کم ایسی بکو اس سن کر اپنی ساری حلیم کو بھول سکتا تھا۔ وہ غصے یا غیرت میں آکر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن فاح نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔ وہ گھر میں اٹھتی شورش کو دیکھ کر بھی خود کو اس سارے معاملے سے لا تعلق رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ رافع نے ابھی تک فاح کی موجودگی میں اپنے سرکش ہوتے جذبات کو ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔

مگر اس دن وہ دونوں بھائی مد مقابل تھے۔ بہت دن بعد ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تھے اور اس دن فاح نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے بھائی کی آنکھوں میں سرکشی کے رنگ نظر آتے تھے اور وہ اپنے لب و لہجے سے رشتوں کا باغی دکھائی دیتا تھا۔

ہاں اب وہ امیر ہو گیا تھا۔ اس کے ٹھٹھا باٹ سے نخوت نکلتی تھی اور وہ فاح کو ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے اس نے کسی کی ناجائز زمین پر قبضہ کر لیا ہو۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے قیمتی رشتوں کو ایک ایک کر کے کھونے کے بعد اب اپنی حیا کو بھی کھوتا جا رہا تھا۔

ثانی اس سے دور ہو چکے تھے۔ بہن اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ فاح کو وہ اب کھورہا تھا جب کہ

مانگ لیں گے میرے تو ذہن میں تمہارا ہی خیال تھا۔“ دیا نے کمال چالاکی سے معصوم بن کر ساری ہمدردی رافع کے ساتھ کر لی تھی۔ رافع کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی تھی۔

”تو یہ سب نانا کی چال تھی؟ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی پوتی کے قابل مجھے نہیں سمجھا۔“ وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا تھا اور دیا کو مزید اچھا بننے کا موقع مل گیا۔

”انہوں نے تمہارا نام بھی نہیں لیا۔ ورنہ مجھے رافع اور فاح میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرے لیے تم دونوں برابر تھے۔ بلکہ فاح سے زیادہ عزیز تھے۔ تمہیں یاد بھی ہو گا۔ میں تم سے ہمیشہ پیار کرتی تھی۔“

اس نے بازی پھر سے اپنے ہاتھ میں کر لی تھی اور اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اپنے بچاؤ کے لیے اس نے کتنے غلط بندے سے دل اوچھڑوینے والی گفتگو کی تھی۔ جو بلا کا جذباتی تھا اور جلد بدگمان ہونے والا تھا اور وہ اپنے اندر اٹھتے جوار بھانے کو روک نہ پایا اور اپنے نانا ثانی کے سر پہ پھٹ پڑا۔ اس کے الفاظ ایک تباہی تھے جو اٹھے تو ہر چیز کو تباہ کرتے چلے گئے تھے۔

”آپ نے ہمیشہ فاح کو مجھ پہ فوقیت دی۔ اس میں ہیرے جڑے تھے نانا! یا وہ بہت پیارا تھا آپ کو۔“ وہ رونے لگا تھا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ اتنا بڑا ہو کر بھی رونے لگے گا۔ جیسے بچپن میں فاح کے پاس اچھی چیز دیکھ کر چل اٹھتا تھا۔ وہ اب بھی بچوں کی طرح یو رہا تھا اور اب بات چیز کی نہیں تھی۔ بات عنایہ کی تھی اور بات عنایہ کی بھی نہیں تھی۔ بات تو رافع پہ فاح کو فوقیت دینے کی تھی۔ بات تو ساری ٹھکرائے جانے کی تھی اور ٹھکرائے جانے کی ذلت ہر ذلت پہ بہت بھاری ہوتی ہے۔

”عنایہ تو میری تھی۔ پھر آپ نے اسے فاح کا نصیب کیسے بنا دیا۔“ وہ چیخنے لگا تھا۔ وہ اپنے آہے میں نہیں رہا تھا اور نانا ثانی شدید پریشان تھے اور رافع کی باتوں پر ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

”کیسی بے شرمی کی بات کرتے ہو رافع! یہ بات

عناہ کو تو اس نے پہلے ہی کھو دیا تھا۔

رشتوں کے نام پر رافع کے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا تھا، لیکن اس نے اپنی دیامانی سے ایک چیز ضرور چھپی تھی۔ آخری پتے تک ہارنا نہیں۔ جیتنے کی لگن میں جنگ لڑتے رہتا ہے۔ پھر چاہے ہاتھ میں کچھ آتایا نہ آتا۔

”کسی کے مفتوحہ علاقے پر اپنی فتح کا پرچم لہرانے سے کوئی عظیم ”فتح“ نہیں بن جاتا۔“ وہ اپنے برائے وانلن کو جھاڑنا انتہائی معنی خیزی سے قریب بیٹھے فتح کو دیکھ کر بولا تھا۔

فتح جو چھٹی کے روز اخبار دیکھ رہا تھا۔ واضح طور پر اس کی بات سن کر چونکا تھا۔ رافع کی اس بات کے پیچھے کیا شیطانییت کار فرما تھی۔ وہ قطعی طور پر انجان نہیں رہ سکا۔

”ضروری نہیں کہ کسی کا وجود تسخیر کر لینے سے اس کا دل بھی اپنے اختیار میں کر لیا جائے۔ جذبے اور احساسات بھی۔“ وہ وانلن پہ کوئی پرانی دھن بکھیرتا لمحہ بھر کے لیے فتح کی طرف دیکھنے لگا۔ فتح کے تاثرات اسے مزہ دے گئے تھے۔ وہ خواہ مخواہ اتنا عرصہ جلتا رہا۔ یوں جلا جلا کر لطف اٹھاتا تو مزہ آتا۔

عناہ چکن میں تھی اور اس نے واوی سے بہت کوشش کے بعد فتح کی پسندیدہ کافنی بنانا سیکھی تھی اور اب کافنی بناتے ہوئے اس کے ہاتھ بار بار لرز رہے تھے۔ اس کا دھیان بھٹک بھٹک کر رافع کی باتوں تک جاتا تو اس کا دل کانپنے لگتا تھا۔ رافع کی بکواس کے جواب میں فتح خاموش تھا اور اس کی خاموشی عنایہ کو گھبراہٹ میں جلتا کر رہی تھی۔

”کیا کوئی غیرت مند شخص اس احساس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے کہ اس کی بیوی کسی اور کی محبوبہ بھی رہ چکی ہو؟“

اس نے نہایت معصوم بنتے ہوئے وانلن کے سارے نوٹ سروں کو ایک ہی ساتھ چھیڑا تو ایک معنی خیزی طنزیہ دھن فضا میں بکھر گئی تھی۔

معا ”فتح نے اخبار میز پر بیٹھ دیا تھا اور بڑے ہی ضبط

کے ساتھ رافع کا طنزیہ مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک وانلن کے منوں کو پھونکنے میں مار رہا تھا۔

”پھر ایسے شخص کو ”غیرت مند“ نہیں کہنا چاہیے۔ ہے نفاق؟“ رافع نے آخری پھونک سے وانلن پہ پھیلی نا دیدہ دھول کو اڑایا اور جیسے فتح کی ذات کے پرچے بھی اڑا دیے۔ معا ”چکن میں موجود عنایہ کے ہاتھ سے کلچ کی پیالی گر کے ٹوٹ گئی تھی۔ ماحول پہ ایک ناگوار شور پھیلا تھا جسے ان دونوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

”کبھی کبھی رشتے انسان کو بے غیرت بنا دیتے ہیں۔“ فتح ایک زہر خند نگاہ رافع کے بے حس ہوئے وجود پہ ڈالتا کرسی و حکیل کراٹھا اور عنایہ کو آواز دیتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رافع نے ایک جھلسا دینے والی نگاہ عنایہ پہ ڈالی تھی جو حکم ملتے ہی کسی کینیر کی طرح بھاگتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں گم ہو گئی تھی۔ جب کہ رافع سے یہ منظر دیکھنا محال تھا۔

اس نے پیر کی ٹھوک سے میز کو ہوا میں اچھالا اور وانلن سمیت اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اسٹوڈیو میں جانے کے بجائے وہ فتح کے برابر والے اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا اور پھر رات سے دن دن سے دوپہر دوپہر سے اگلی شام اتر آئی تھی، مگر وہ کمرے سے باہر نہیں آیا تھا۔

مستل کئی گھنٹوں سے ایک بیجانی کیفیت میں وانلن بجا بجا کر اس نے اپنی انگلیوں کو زخمی کر لیا تھا لیکن نہ اس کے ہاتھ تھک رہے تھے اور نہ ہی اس کا جنون کم ہو رہا تھا۔

فضا میں مختلف دھنوں کا پسندیدہ شور اعصاب پہ گراں گزر رہا تھا اور رافع کی آواز اس شور کو مسلسل سوگوار کرتی تھی۔

”گناہوں کے سفر میں میں اکیلا ہوں۔“ فضا میں اس کی آواز کا درد دلوں کو چیر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ ثانی سے اس کا درد سہا نہیں جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے دروازہ پینا شروع کر دیا۔ پھر ان کے بوڑھے ہاتھ

دروازہ بجا بجا کر تھک گئے تھے، لیکن رافع نے دروازہ کھولنا گوارا نہیں کیا تھا۔
وہ ابھی تک ایک عالم جنون میں وائلن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

”تمہیں جیتوں یا نہ جیتوں یہ بازی جیت ہی جاؤں گا۔“ اس کی آواز عنایہ کے کمرے تک بھی آئی تھی اور اس کے دل تک بھی آئی تھی۔ وہ اس حال میں عنایہ کی وجہ سے پہنچا تھا۔ عنایہ کو لگا، رافع کو اس منزل تک لانے والی وہ خود ہے۔ اسے سارا قصور اپنا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ اسے رافع سے الفت ہوتی نہ رافع کو اس سے محبت ہوتی۔ نہ رافع اس حال کو پہنچتا۔

عنایہ اپنے کمرے میں موجود اس کے جنون سے سہم رہی تھی۔ اس کے اوپر ایک دہشت سوار تھی۔ حالانکہ فاح نے رافع کو حوالے سے اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ہلکی سی باز پرس بھی نہیں کی تھی۔ جانے وہ اس کے معاملے میں اتنا نرم دل کیوں واقع ہوا تھا یا پھر وہ بہت ہی اعلا طرف تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ عنایہ بھی خاموش رہتی۔ اسے رافع کی سرکشی کو روکنا تھا۔ اس کے جنون کو لگام دینی تھی۔ اسے نرمی سے سمجھانا تھا۔ کیا بتا وہ اس کی بات کو سمجھ جاتا۔ مان جاتا۔ اور تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جاتا۔ لیکن ایسے محبتوں میں باغی لوگ بنا ٹھوکر کھائے سمجھتے نہیں۔

اور اسے محبت کے اس باغی کو روکنے کے لیے بہت سی عقل اور فہم کی ضرورت تھی۔ جو اس کے پاس نہیں تھا۔ پھر اس نے رافع کو سمجھانے کا ایسا پارہ کیوں اٹھایا۔ جسے اٹھانے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ حالانکہ داوی نے عنایہ کو رافع کے کمرے کی طرف بدھتا دیکھ کر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اس کے حال یہ چھوڑ دو اسے ہم نہیں سمجھاپائے تو وقت اسے سمجھا دے گا۔ اس راہ پر نہ چلو، جس پر ببول آگے ہیں۔“ داوی کی تنبیہ کو اس وقت کون سنتا؟ عنایہ پہ تو ایک دم غصہ سوار تھا۔ وہ رافع کا منہ توڑ دیتی۔ جو اسے فاح کی نظروں میں بے مول کر رہا

تھا۔ جو اس کا گھر خراب کر رہا تھا۔

اس نے دروازے پہ دستک دی تو وہ دستک کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا۔ آنے والا کون ہے؟ اور اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ عنایہ ایک پھرے طوفان کی طرح اندر آئی تھی۔ لیکن رافع پہ نگاہ بڑی تو اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر عنایہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ آج جو کچھ رافع تھا۔ عنایہ کی وجہ سے تھا اس کے ٹھکرانے پر وہ ضد میں آکر محنت کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اور اس کی بے وفائی نے رافع کو سودائی کر دیا تھا۔ یہ وہ رافع نہیں تھا۔ جسے عنایہ جانتی تھی۔ جو کبھی اس کا محبوب تھا۔ اور اسے انسانوں کے اس ہجوم میں سب سے پیارا لگتا تھا۔

یہ وہ رافع تھا۔ جو اتنے انسانوں کے ہجوم میں بالکل اکیلا تھا۔ فگار جذبوں اور فگار دل کے ساتھ۔ اس کا چہرہ سرخ اور پرشورہ تھا۔ اس کے بال الجھے تھے۔ یوں لگ رہا تھا۔ اس نے کئی گھنٹوں سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

وہ عنایہ کو دیکھ کر چیخنے لگا تھا۔

”اے زرگس مخمور! آؤ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ آؤ اور میرے حال پر شادیاں بجاؤ۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وائلن کے قریب لے آیا تھا۔ پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے وائلن کو توڑ پھوڑ کر کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ یہ اس کا بڑا پیارا وائلن تھا۔ جو اوائل عمری میں پاکٹ منی جمع کر کے اس نے خریدا تھا۔ ایسا ہی ایک وائلن اس نے عنایہ کو بھی تحفے میں دیا تھا۔

”تمہاری نسبت سے ملی ہر چیز مجھ پر حرام ہے۔ ہر کامیابی، ہر شہرت۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف تمہارے سوا۔ یہ سب میرے لیے بے کار ہے۔ لیل و نہار میں کچھ بھی نشاط افزا نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ تاریکی ہے اور زندگی بہت بُری ہے۔“ وہ رونے لگا تھا۔ اتنا بڑا رافع رونے لگا تھا۔ یہ رونا عنایہ کے نہ ملنے پر تھا یا شگستگی کی ذلت اٹھانے پہ۔

بردا نہیں تھی۔ عنایہ ملتی یا نہ ملتی۔ عنایہ برپا ہوتی یا
 آیا ہوتی۔ عنایہ اس گھر میں رہتی یا نہ رہتی۔ عنایہ
 فلاح کے دل میں ٹھہرتی یا نہ ٹھہرتی۔ عنایہ فلاح کی زندگی
 سے نکلتی یا نہ نکلتی۔ اس نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا
 تھا۔ اس نے فلاح پہ ”جتنا“ دیا تھا کہ اس نے واقعی پہلے
 سے مفتوحہ علاقے پر اپنی فتح کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔
 اس نے اپنے بھائی کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس نے فلاح کو
 جو کھٹ پار کرتے اس حال میں دکھا تھا کہ وہ قدم کہیں
 رکھتا تھا۔ اور پڑتا کہیں تھا۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ فلاح اس شام چپ چاپ
 گھر سے نکل کر کس سمت جا رہا ہے۔ ”کیا اس جگہ“
 جہاں سے واپسی کی کوئی راہ نہیں بچتی تھی۔

اور اے کاش کہ فلاح افراتیم اس شب اپنے دل
 کے اجڑنے اور بیہ کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کا
 حساب لینے اپنے ماموں کے اس شیشے کے گھر کبھی نہ
 جاتا۔ جہاں یہ ایک سنہری بالوں والی جاو گرنی کا قیام
 تھا۔ اور جس کا جاو ابھی تک سرچڑھ کے بولتا تھا۔ وہ
 اپنی ”ساحری“ میں اب بھی ناممکن کو ممکن بنا دینے کا
 کمال رکھتی تھی۔



اور اتنے مہینوں کے اعداد و شمار کے بعد اس پہ ایک
 حقیقت کا انکشاف بالآخر ہو ہی گیا تھا۔
 ”عنایہ خوش نہیں۔“ اس انکشاف سے اس کے
 اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

آخر عنایہ خوش کیوں نہیں تھی؟ من کی مراد پر
 بھی عنایہ خوش نہیں تھی؟ اور اگر عنایہ اب بھی خوش
 نہیں تھی تو اس کی ریاضت تو سراسر بے کار تھی۔ دیا
 نے کا ہے کوہِ نوح خریدی۔ جنم کے پاتال منتخب کیے؟
 حالانکہ یہ اسے بہت دفع تسلی دے چکی تھی کہ عنایہ
 بہت خوش ہے۔ بس انتقاما ”دیا کے سامنے اپنی خوشی کا
 اظہار نہیں کرتی۔“

”انتقاما کیوں؟“ دیا انتہائی بے وقوفوں کی طرح اپنی
 اس بسن سے ڈھارس لینے والے سوال پوچھتی تھی

”اسے تو عادت تھی مجھے پچھاڑنے کی۔ ہمیشہ کلاس
 میں اول اس لیے آتا تھا کہ مانا اور بابا سے تعریفیں بنور
 سکے اور میری شامت بلوا سکے۔ اسے تم سے لگاؤ نہیں
 تھا۔ اسے ہمیشہ سے بیہ پسند تھی۔ اس نے تمہارے
 لیے ہا ہی اس لیے بھری تاکہ مجھے ہراسکے اور تانا تانی
 کے سامنے خود کو عظیم ثابت کر سکے۔ وہ اپنی فرماں
 برداری کے جھنڈے گاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے تو تب
 مجھے ہرایا۔ مجھے بس ایک جواب چاہیے عنایہ! تم نے
 اس طوق کو گلے میں کیوں ڈالا؟ تمہیں کس نے مجبور
 کیا؟“ اس کی مدھ بھری آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا
 عنایہ نے ایسی خونی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی
 تھیں۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ اس سے جواب لینا
 چاہتا تھا۔

”بتاؤ وہ مجھ سے محبت تھی یا ایک ڈرامہ تھا؟ وقتی
 لگاؤ انیسیت؟“ وہ چیخ رہا تھا اور عنایہ خوف سے منجمد
 تھی۔

اسے داوی کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ اسے
 رافع کے سامنے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے یہاں
 نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر آہی گئی تو رافع کو ”وضاحتیں“
 نہ دیتی۔ یہ وضاحتیں بے سود تھیں۔ جو صرف اتنا کام
 کر سکتی تھیں کہ اس کے شوہر کو بدگمانی کے کنویں میں
 دھکیل دیا۔ آخر وہ ایک انسان تھا کوئی پتھر تو نہیں تھا۔
 ”میری بات کا یقین کرو رافع! میں اپنی ماں کے
 سامنے سر اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتی۔ یہ میری
 بزدلی ہے یا کم ہمتی۔ یا فرماں برداری یا کچھ بھی سمجھ لو۔
 میں دیا کے سامنے ایک لفظ نہیں بول سکتی۔ مجھے دیا
 نے مجبور کیا تھا اور میں نے تمہارے ساتھ کوئی ڈراما
 نہیں کھیلا۔ میں نے تو صرف تمہیں چاہا تھا۔“

رافع نے وہ سب سن لیا تھا جس کی اسے تمنا تھی۔
 اور اسے بھی سنوا دیا جسے عنایہ کے منہ سے یہ سب
 اگلا کر سنوانا چاہتا تھا۔ آخر اس کے ہاتھ میں چوسرکی
 ایک گوٹ تھی۔ شطرنج کا ایک مہو اس کے ہاتھ میں
 تھا۔ اس نے وہ مہو بہ آسانی تھیل لیا۔ اس نے شطرنج
 کی پوری بازی اپنے ہاتھ میں کر لی تھی۔ اب اسے کوئی

سے ہٹ جائے گا؟“ یہ اسے آپ سے باہر ہوتا دیکھ کر بڑے تحمل کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر بولی تھی۔

”پہلی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ ساری عمر تم ہمیں سناتی رہی ہو۔ ہم پہ حکم چلاتی رہی ہو۔ ہماری زندگیوں کے ساتھ کھیلتی رہی ہو۔ تو آج مجھے کہہ لینے دو۔ تم ایک خود غرض عورت ہو۔ تم نے ہمیشہ اپنے لیے سوچا۔ ہمیشہ اپنا فائدہ دیکھا۔ اور ہمیشہ اپنے شوہر کے تعلق داروں سے نفرت کی۔ ہاں تم نے نفرت کی۔ کاشف بھائی کی ماں سے، ان کے باپ سے۔ ان کی اکلوتی بہن سے اور اس کے شوہر سے۔ تم نے ہمیشہ نفرت کی ان دونوں کے بچوں سے بھی۔ یہ نفرت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ تمہیں ہمیشہ رافع اور فالح سے نفرت رہی۔ سوجہ کچھ بھی ہو۔

وہ افرایم بھائی کے بچے تھے۔ یا وہ رویا بھائی کے بچے تھے۔ ان دونوں کے پاس اولاد نہ رہی تھی اور تم اس نعمت سے محروم تھیں۔ تم نے رافع کو اس کے گھر والوں سے دور کرنا چاہا۔ اور اس کے لیے عنایہ ایک بہت اچھا ہتھیار تھی۔ تم نے رافع کو عنایہ سے اس حد تک الٹیج کیا کہ وہ اس کے بغیر رہنے کا سوچنے سے بھی گیا۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور تب تمہاری سوچوں کا بہاؤ ایک مرتبہ پھر بدل گیا تھا۔ کیونکہ وہ تمہارے تصور آتی خاکے پہ پورا اترنے سے قاصر تھا۔ فالح ہر لحاظ سے اسٹرونگ تھا۔ اور اپنے حالات تو تمہارے سامنے ہی تھے۔ کاشف بھائی کے بعد ان کا بزنس تباہ ہو گیا تھا۔ سوائے اس گھر کے پر اپنی کیے نام پہ تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ اور تم نے سوچا فالح اپنا ہے۔ عنایہ کے ساتھ تمہیں بھی سپورٹ کرے گا۔ اور تم نے کامیابی تو پالی لیکن اپنا سکون ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ اس لیے کہ تم نے بہت سارے دلوں کو توڑا۔ تم نے ایک کامیاب کھیل کھیلا۔ لیکن یہ ہرگز بھی تصور نہ کرو کہ ہر کامیابی صرف تمہارے لیے ہے۔“

بیہ کے الفاظ نہیں تھے۔ کوڑے تھے۔ طمانچے تھے۔ جو دھڑا دھڑا دیا کے منہ پر پڑ رہے تھے اور وہ ایسی

جس کے اندر سے اس نے خوشی کا اکلوتا احساس تک اکھاڑ ڈالا تھا۔ اور اب اسے اپنی اس بہن سے تسلی چاہیے تھی۔ اور توجہ بھی اور وقت بھی دیا کا ان دونوں اپنے ”عبادت کدے“ میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ سارا دن بولائی بولائی چکراتی پھرتی تھی۔ ایسی بے قراری دل سے بندھی تھی کہ چین کہیں پڑتا ہی نہیں تھا۔

”کیا تم نہیں جانتیں دیا!“ اس نے استہزائیہ لہجے میں دیا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”جب زبردستی کا رشتہ اس پر مسلط کرو گی تو کیا وہ تم سے انتقام نہیں لے گی؟ اور اس کا انتقام بھی اسی کی طرح معصومانہ ہے۔ وہ تم پہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ فالح کے ساتھ خوش نہیں۔ حالانکہ وہ بہت خوش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم میں محسوس کرنے کی ”حس“ نہیں۔“

”یہ زبردستی کا رشتہ تھا کیا؟ تم گواہ نہیں فالح اور عنایہ کے تعلق کی۔ فالح کا عنایہ کے لیے لگاؤ وہ تحائف کا لین دین۔ عنایہ کا اسے لے لے لے لے مسیح کرنا۔ اور میں نے خود ان کی گفتگو مسیحی کی صورت میں پڑھی تھی۔ تب مجھے لگا تھا۔ عنایہ رافع کو بھول کر فالح میں دلچسپی لے رہی ہے۔ میں نے تو عنایہ کے لیے سب کچھ کیا۔ اس کی خوشی کے لیے؟ اور کاشف کی روح کو سکون دینے کے لیے کہ میں نے اس کی بیٹی سے انتقام لینا ترک کر دیا اور میں نے کاشف کی روح کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے فالح کو عنایہ کے لیے چنا۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ فالح ہی وہ شخص ہے جسے کاشف اپنا داماد بنا کر خوشی محسوس کرتے۔ میں نے تو عنایہ کے لیے سب کچھ کیا۔ اور عنایہ مجھ سے ناخوش ہونے کا بہروپ بھر کے انتقام لے رہی ہے؟ اپنی ماں سے؟“ دیا ہدیبانی انداز میں چیخ پڑی تھی۔ بیہ اسے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

”تم نے محسوس کیا۔ تم نے سوچا۔ تم نے چاہا۔ تم نے سمجھا۔ ہمیشہ خود کو اپنی ہی خواہشات کے تابع رکھا؟ کیا ہمیشہ جو تم چاہو گی وہی ہو گا؟ جیسا تم محسوس کرو گی ویسا ہی ہو کرے گا؟ تم چاہو گی تو عنایہ رافع کی طرف متوجہ ہو گی۔ تم چاہو گی تو عنایہ کا دھیان رافع

ساکت کہ بیہ کے ہاتھ میں پکڑا آئینہ دیکھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ بیہ روتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

جبکہ دیا جو اس باختہ سی چکراتے سر کو تھام کر کراہنے لگی۔ ابھی تو ایک عدالت لگی تھی اسے خبر نہیں تھی کہ ابھی ایک اور عدالت لگنی تھی۔ اور ابھی کئی کئی کٹھنوں کے منتظر تھے۔ ابھی کئی عدالتیں باقی تھیں۔ اور ابھی کئی حساب اس کے سر کے اوپر قرض کی طرح لدے ہوئے تھے۔

اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا اور کوئی دے بے قدموں اس کی راج وصالی میں داخل ہو گیا۔ اس حال میں کہ دیا چلا چلا کر خود سے مخاطب تھی۔

”یہ میں نے کیا کر دیا؟ عنایہ کی خوشی کو اس سے دور کر دیا۔ میں نے عنایہ کی محبت اس سے چھین لی۔ یہ مجھ سے کیسا گناہ ہو گیا۔ میں تو اسے زندگی میں پہلی مرتبہ خوشی دینا چاہتی تھی اور میں نے اس کو کس شان سے چوٹ پہنچائی۔ عنایہ کا دل خالی کر دیا۔ ہائے افسوس! یہ مجھ سے کیسا جرم ہوا؟ تھوڑا سا انتظار کر لیتی تو رافع بھی فلاح کے مقابل آجاتا۔ آہ! اب میں کیا کروں؟“ وہ روتے روتے ایک دم ٹھنک گئی تھی۔ پھر اس کے دماغ میں ازلی بالچل نے ادھم مچا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک منصوبہ اس کے ذہن میں بن گیا۔ جسے تکمیل تک پہنچانے میں چند لمحے بھی نہیں لگتے تھے۔ کیونکہ اس کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فلاح بے نفس نفیس خود ہی آگیا تھا۔

اور دیا کے لیے ایک اور عدالت تیار ہو چکی تھی۔ آج اس کی جان شکنجے میں آن پھنسی تھی۔

”جو کچھ بیہ نے کہہ دیا اس سے آگے میرے کچھ بولنے کی تو ذرا بھی گنجائش نہیں بنتی۔ لیکن کیا کروں۔ اس دل پہ ندامت اور ذلت کے پار لدے ہوئے ہیں۔ ندامت تمہاری بہن کا سچا اور پاک دل ٹھکرانے پر ہے۔ کہ مجھے میرے چاہنے والوں نے واسطے دے کر مجبور کر دیا تھا۔ جبکہ ذلت کا بوجھ ہر احساس پہ بھاری ہے۔ میں شرم سارہوں اپنے بھائی

کے سامنے جس کی آنکھوں کے سامنے اپنی خوشیوں کا جشن مناتا رہا۔ میری عزت و وقار اور غیرت کی دھجیاں تمہاری بیٹی نے میرے سامنے ”قرار محبت“ کے بعد اڑا کر رکھ دیں۔ میں اور کتنا بے غیرت بنوں؟ تمہارے غلط فیصلوں نے کتنے لوگوں کو جہنم کی دہکتی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اے کاش تمہاری آنکھوں پہ بندھی پٹی اب بھی کھل جائے۔ مجھے عمر بھر خود پہ ندامت رہے گی۔ میں ایک ناجائز فیصلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں؟ جو الاؤ تم نے ہمارے ارد گرد دیا ہے۔ انہیں کون بچھائے گا۔“

وہ اتنی شدت سے دھاڑ رہا تھا کہ کمرے میں بند یہ تک دہل کر باہر آگئی تھی۔ مگر وہ فلاح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے حلیم انسان تھا اور اس وقت سب سے زیادہ وحشی لگ رہا تھا۔

جب دیا نے جان لیا کہ اس کی چال فلاح اور بیہ دونوں پہ کھل چکی ہے۔ اور اب ساری بساط الٹ چکی ہے۔ مہرے بھر چکے ہیں۔ سو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک اور انتہائی فیصلہ کر لیتی۔ اس نے کچھ بھر کے لیے سوچا اور فلاح کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم میری بیٹی کو طلاق دے دو۔ عنایہ تمہارے ساتھ خوش نہیں۔ وہ رافع سے سے محبت کرتی ہے۔ یہ میرا غلط فیصلہ غلط مشاہدہ تھا۔ جس کا نتیجہ میری بیٹی کو بھگتنا پڑا۔ تم عنایہ کے حال پہ رحم کرو۔ اور ایک آخری مہربانی کرو۔“

جب دیا فلاح سے عنایہ کے لیے طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔ تب پہلی مرتبہ بیہ کو احساس ہوا تھا کہ اس کی بہن کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ الٹی سیدھی چالوں نے اس کی ذہنی رو بہکا دی ہے اور اب وہ ایک مرتبہ پھر جذباتیت اور اپنے پاگل پن میں غلط فیصلہ کر رہی ہے۔

بیہ کا دل چاہا۔ وہ بھاگ کر فلاح کے قدموں سے لیٹ جائے۔ اور اس کے پیروں پہ اپنا سر رکھ کر عنایہ کے لیے رحم کی بھیک مانگے اور فلاح کو بتا دے۔ ”عنایہ صرف تم سے محبت کرتی ہے۔ اپنے ماضی کو بھلا کر۔ تم

اس عورت کی باتوں میں نہ آؤ۔ تم عنایہ کو زندہ درگور نہ کرو۔

لیکن بیہ کا ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگے لگے زمین پہ گرتی گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ اور اس پہ طاری نیند کے دوران ہی بیہ کی لاڈلی عنایہ اجڑ کر گھر آ گئی تھی۔

عنایہ اور فلاح کے بیچ طلاق ہو گئی تھی۔
عنایہ برباد ہو گئی تھی۔



وہ دن نفرت کی حد تک تکلیف دہ اور بوجھ کی حد تک ناقابل برداشت تھے۔ وہ منحوس ترین دن تھے جن کی یاد اب بھی بیہ کو پہروں دلائی تھی۔ اور ان دنوں کی یاد اور بھی کچھ لوگوں کو بری طرح سے تڑپاتی تھی۔ جن میں ایک رافع بھی تھا۔ اور جن میں ایک فلاح بھی تھا۔ اور ان تین لوگوں کی تکیوں میں اب عنایہ کہیں نہیں تھی۔ وہ نہ کسی کو یاد کرتی تھی نہ کسی کے لیے روتی تھی۔ وہ قطعی طور پر بے حس ہو چکی تھی۔ لیکن بیہ کے لیے بے "حس" ہونا ناممکن تھا۔ وہ ان دنوں کو یاد کر کے روتی بھی تھی تڑپتی بھی تھی۔ اور اکثر عنایہ کو بھی تڑپانے کے لیے کچھ یاد دلانے کی کوشش کرتی۔

اسے فلاح کی محبتیں یاد دلاتی تھی اور رافع کی بے رخی بھی۔ وہ چاہتی تھی۔ عنایہ کے اوپر چڑھا خول چھ جائے اور عنایہ کسی بھی چیز کی راہ نہ کرتے ہوئے اتنا روئے کے اس کے اندر جمی ہوئی کائی صاف ہو جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ عنایہ کو زندگی کی طرف لانا ممکن نہیں تھا۔

عنایہ کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے اس کا ایک ایک زخم کھلا ہوا تھا۔ ایک ایک زخم ادھڑا ہوا تھا۔ ان زخموں پہ کھرینڈ کسے آسکتا تھا؟ پھر وقت آگے کو کھسکنے لگا۔ لیکن عنایہ کو اپنی جگہ پہ گاڑ گیا۔ نہ وہ آگے بڑھ سکی۔ نہ پیچھے ہٹ سکی۔ وہ اسی مقام پر پتھر کی صورت میں ڈھل گئی تھی۔

جس مقام پر اسے فلاح چھوڑ گیا تھا اور جس مقام پر اسے رافع چھوڑ گیا تھا۔

ہر مشکل انسان کی ہمت، جرات، طاقت اور ثابت قدمی کا امتحان لیتی ہے۔ لیکن عنایہ نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ ایک کم ہمت، بزنل لڑکی ہے۔ وہ ہر امتحان میں فیل تھی۔ محبت کے بھی اور زندگی کے بھی۔

بیہ کی عنایہ کے لیے ہر کوشش بے کار تھی۔ وہ بیہ کے ساتھ یادوں کے سیل رواں میں بننے سے ہمیشہ کے لیے انکاری تھی۔ عنایہ نے اپنا دل اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کر لیے تھے۔

جبکہ بیہ پیچھے رہ جانے والی یادوں میں ان لمحوں کو تلاشتی جس میں اس کے لیے لمحاتی خوشی کا کوئی جگنو کبھی اڑا کرتا تھا۔ اسے فلاح نے طرح یاد آیا کرتا تھا۔

کتنا کٹھن تھا بھول جانا۔ کسی کا یادوں سے نکل جانا۔ اور یادیں حادثے کی طرح ہوتی ہیں۔ جاتے جاتے بھی اپنے پیچھے ان مٹ نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ وقت نہیں ٹھہرتا لیکن یاد ٹھہر جاتی ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے یادوں کی سوغات دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی دو بھر تھا کسی کو بڑی ہی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ رات دن یاد کرنا اور یہ فرض نماز کی طرح یہ "فرض" بھی نباہتی جا رہی تھی۔

حالانکہ یادوں میں سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں تھا۔

اسے وہ دن یاد آتے تھے جب شیشے کے محل میں عنایہ کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

جب فلاح نے دیا کے مجبور کرنے پہ عنایہ کو طلاق دے دی تھی اور پھر بغیر کسی سے حساب کیے چپ چاپ دنیا کی اس بھٹ میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔ وہ قرینہ عشق کو بھول گیا۔ عنایہ سے دور ہو گیا اور عنایہ اس کے پیچھے دیوالی۔ تب عنایہ کو ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ اور وہ پورے گھر میں پاگلوں کی طرح چلاتی پھرتی تھی۔ بیہ، عنایہ کو سنبھال کر تھک جاتی۔ رونے لگتی۔ خود کو کونسنے لگتی۔

دیا تھی تو ایک سال ہی۔ اور اب عنایہ کی حالت زار

پہ وہاڑس بار بار کر روتی تھی۔

کا علم ہوا تو وہ کسی پھرے طوفان کی طرح دیا کے سر پہ
آکر پھٹ پڑی تھی۔ اس نے اتنا واویلا کیا اتنا شور مچایا
اتنی آہوں لگائی کہ جس کی حد نہیں۔

”میرے ایک بھائی کو برباد کر کے سکون نہیں ملا۔
جو دوسرے کو بھی برباد کرنے پہ تلی ہو۔ خدارا ہمارے
ناکردہ گناہوں کو معاف کرو۔ اور ہماری جان چھوڑ
دو۔“

عزہ کا یہ واویلا اور روناد ہونا کسی کام نہیں آیا تھا۔ وہ
روتی چلاتی واپس لوٹ گئی تھی۔ لیکن اپنے رونے کی
نحوست یہیں چھوڑ گئی تھی۔ جس نے ایک مرتبہ پھر
عناہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

رافع، عنایہ کو پا کر شروع کے چند دن بہت خوش
رہا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اپنی خوشیوں کو چھین کر
حاصل کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ اس نے چند دن
عناہ کے دوروں اور چیخوں کے ساتھ سمجھوتہ کیے رکھا
اور خود کو مختلف بسلاؤں سے بلاتا رہا۔ اسے امید تھی
کہ عنایہ جلد ہی اسے قبول کر لے گی لیکن اس کی یہ
امید آہستہ آہستہ دم توڑتی رہی۔ عنایہ اول روز کی
طرح ہی رافع کو دیکھ کر چیخنے چلانے لگتی تھی۔ وہ اسے
دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ چیزوں کے پیچھے چھپنے لگتی۔
اور مدد کے لیے فاج کو پکارتی تھی۔

رافع کو اندازہ نہیں تھا کہ جس فاج کو وہ عنایہ کی
زندگی سے نکال چکا تھا۔ وہ فاج اب بھی عنایہ کے
حواسوں پہ سوار تھا۔ فاج خود چلا گیا تھا لیکن اپنی
پرچھائیاں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ یہ صورت حال رافع کو
پریشان کرنے لگی۔ وہ الجھتا غصہ کرتا اور دیا اسے عنایہ
کے ٹھیک ہونے کی سوسوامیدیں دلا کر ٹھنڈا کرنے کی
کوشش کرتی تھی۔

پھر ایک دن دیا نے فاج کی یاہوں سے عنایہ کو
نکلانے کے لیے رافع سے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا۔
”تم عنایہ کو اپنے رشتے کا احساس دلاؤ۔ تم اس کے
ساتھ زبردستی کرو۔ کیا خبر بہتری کے کچھ آثار دکھائی
دیں۔“

دیا کے مشوروں نے رافع کو امید کا آخری سراتھا

دینا کے کسی حکیم، طبیب کے پاس عنایہ کا علاج نہ
تھا۔ انہوں نے کئی ڈاکٹر بدل کر دیکھ لیے تھے۔ دیا نے
اپنے مشہور زمانہ تعویذ دھاگے بھی آزمائے۔ اماں
دیوانی تو جنم واصل ہو چکی تھی۔ دیا نے کسی اور عامل
سے عنایہ کے لیے تعویذ لیے۔ جن کا الٹا اثر پڑا اور
عناہ کی حالت مزید بگڑتی تھی۔

پھر دیا دوبارہ اسے ڈاکٹر کے ہاں چکر لگانے لگی۔
ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر نے عنایہ کی کہانی جانتے
ہوئے اس کے لیے دوبارہ شادی کا مشورہ تجویز کیا تھا۔
جو دیا کو بہت پسند آیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ عنایہ
اب اس ”سوگ“ کا خاتمہ کر کے اپنی نئی زندگی کی
شروعات کرے۔

اور اس کے لیے دیا نے رافع کی خدمات حاصل کی
تھیں۔ رافع خود بھی عنایہ پہ فریفتہ تھا اور اس کی صحت
یابی کے لیے بے قرار بھی۔

جیسے ہی دیا نے ڈاکٹر کی تجویز رافع کے سامنے رکھی
اس نے فوراً ”عناہ سے نکاح کے لیے ہامی بھری تھی۔
وہ تو کب سے تیار تھا۔ بس عنایہ کی حالت کے پیش نظر
خاموش تھا۔

”جب ”شر“ انسان کے اندر نمودار ہوتا ہے تو اسے
تب سمجھ میں نہیں آتا۔ جب یہ تناور درخت بن جاتا
ہے تب اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور پھر وہ اس کی
جڑوں کو کاٹنے کے لیے تباہ ہوتا ہے۔

یوں عنایہ کا عقد ثانی کسی ملکی اور قومی اہم ترین
معاملے کی طرح ”صیغہ راز“ میں رکھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ
رافع نے اپنے نانا، نانی کو بھی ہوا تک لگنے نہیں دی
تھی۔ ویسے بھی فاج اور عنایہ کی طلاق کے بعد رافع
نے گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ نانا اور نانی اس جیسے شخص کو
اپنے گھر میں رکھنے سے معذور تھے۔ وہ اس کی صورت
تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ نانا نے اسے جوتے
اور دھتکے ٹھڈے مار کر گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس
بد کردار ذلیل انسان سے نفرت کرتے تھے۔ رافع کو پھر
جانا ہی پڑا۔ لیکن جب عزہ کو رافع کی نکاح والی کارروائی

www.paksociety.com

رافح کو لگا وہ مزید یہاں بیٹھا رہا تو مجلس جائے گا۔
جل جائے گا۔ تباہ ہو جائے گا۔

اس کے دل پہ آ رہے تھے اور اندر کہیں
کوئی دوزخ دہک گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور سر پٹ
بھاگنے لگا۔ وہ بغیر مڑے یا بغیر رکے بھاگ رہا تھا۔

یہ نے اسے ایسی حالت میں اتنی شدید بارش اور
طوفان میں باہر کی طرف بھاگتے دیکھا اور ٹھنک گئی
تھی۔ پھر وہ رافع کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ اسے روکنا
چاہتی تھی۔ ایک مرتبہ اسی حالت میں کاشف بھائی
بھی گھر سے نکلے تھے ان پر بھی اتنی ہی وحشت سوار
تھی۔ مگر وہ پھر واپس نہیں لوٹ سکے تھے بالکل ایسے
ہی رافع اس گھر سے وحشت کے عالم میں نکل رہا تھا۔
بھاگ رہا تھا۔ اپنی جان چھڑا رہا تھا۔ کوئی آسیب اس کی
جان لینے پہ تلا ہوا تھا۔ اور اس آسیب نے پھر ملی
روش پہ بھاگتے رافع کی پشت پہ پہلا چابک مارا تھا۔
رافح پانی پہ پھسلتا ہوا منہ کے بل گر پڑا۔

”کیا ملا تمہیں۔ اندھی خواہش کے پیچھے بھاگ
کر۔ اپنے بھائی کو خوار کر کے۔ اتنے دلوں کو روگ لگا
کر آخر تمہیں کیا ملا؟ اب مجھ سے کیوں بھاگ رہے
ہو؟ او، مجھے گلے لگاؤ۔ میں تمہاری اندھی خواہشوں کا
آسیب ہوں۔ میں آج سے تمہارا سا تھی ہوں۔ تمہارا
ہمراز ہوں۔“

اس کے پیچھے آتا آسیب اندھا دھند اس کی پشت پہ
کوڑے برسار رہا تھا۔ اسے لہو لہان کر رہا تھا۔ رافع نے
اٹھنے کی کوشش میں بڑے ہاتھ پیر مارے تھے لیکن اس
سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھتا کرتا۔ پھر اٹھتا پھر گر
پڑتا۔ گر کر کے اٹھتا اور پھر پانی میں پھسل جاتا۔

”اور میں تمہارا ضمیر ہوں۔ مجھ سے بھاگ کر آخر
کہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں ہر روز کوڑے ماروں گا۔
اور تمہیں تمہارے گناہوں کی یاد دلاؤں گا۔ تب
تمہیں اندازہ ہو گا۔ تم نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟
اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا کیا؟ اور تمہیں خبر ہو گی

دیا تھا۔ اس نے سوچا، وہ یہ آخری حربہ بھی آزما لیتا
ہے۔

اس دن باہر بارش ایک تو اتر سے برس رہی تھی۔
رات تک بھی یہی موسم رہا اور اھر رافع بھیکے موسم
میں عنایہ کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔
اسے یہ سب تو کرنا ہی تھا۔ کیا خبر، اسی بہانے عنایہ
اسے قبول کرتی۔

وہ عنایہ کے روم میں آیا تو وہ مسہری پہ بیٹھی کسی
سے باتیں کرتی دکھائی دی تھی۔ وہ خود میں اتنی مگن
تھی کہ اسے رافع کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔

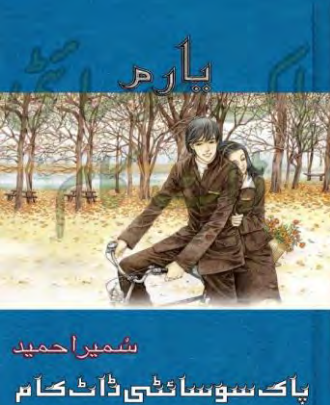
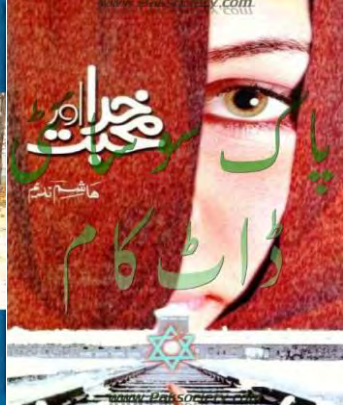
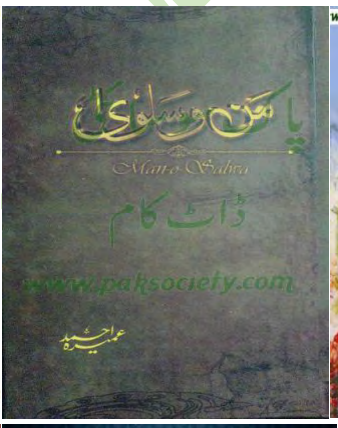
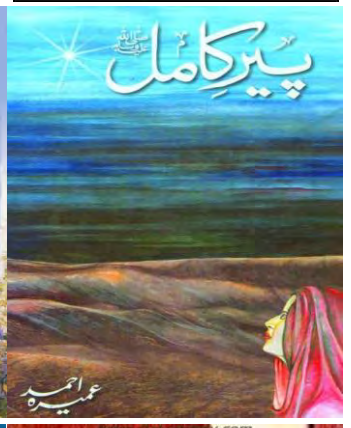
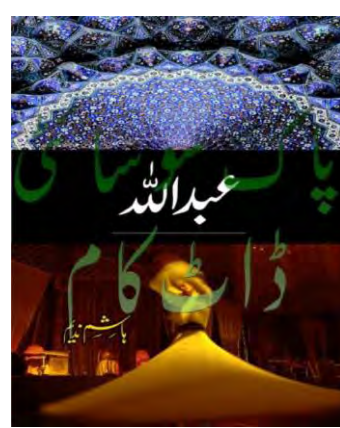
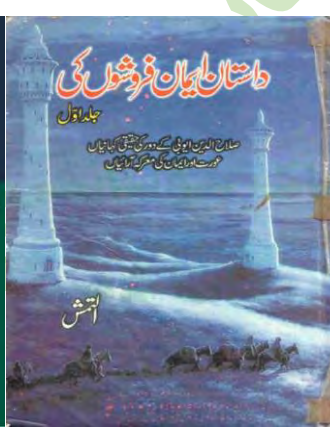
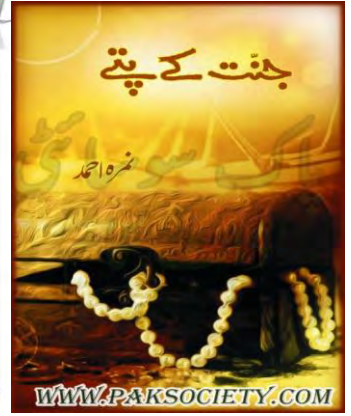
رافح کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ کیا باتیں کر رہی ہے
اور کس سے مخاطب ہے۔ تاہم وہ دھیرے دھیرے چلتا
عنایہ کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ عنایہ اپنے دوھیان میں اس
قدر گم تھی کہ چونگی بھی نہیں۔ وہ خود سے بول بول کر
اور ہنس ہنس کر تھک گئی۔ اور وہیں اسے دواؤں کے
زیر اثر نیند آئی۔ وہ مسہری پہ لیٹی اور تھوڑی دیر میں
غافل ہو گئی۔ رافع عجیب سے تاثرات کے ساتھ عنایہ
کو دیکھنے لگا۔ وہ سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہی
تھی۔ کسی کم سن سہمی سہمی بچی کی طرح۔

رافح کے دل میں عجیب سے جذبات مچنے لگے۔ وہ
عنایہ پہ تھوڑا سا جھکا۔ تو اس کا دل قریب چہرہ اس کے
قریب آ گیا۔ وہ اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ لمبی لمبی
مڑی ہوئی پلکوں والی خوب صورت آنکھیں۔ جو کسی
بندگلی کی طرح بند تھیں۔

اور اس کا شفاف چہرہ کٹاؤ دار گلابی ہونٹ۔ رافع کا
ہاتھ بڑھا اور عنایہ کے لبوں تک آتا رک گیا۔ اور پھر
اس کے اوپر عجیب سے جھلسا دینے والے تاثرات اور
کیفیات کا نزول ہونا شروع ہو گیا تھا۔

یہ عنایہ تھی۔ اس کے بھائی کی بیوی، اس کی زندگی
کا ایک حصہ۔ اور اس کی قیمتی متاع۔ اور یہ چہرہ عنایہ کا
چہرہ تھا۔ جسے نجانے کتنی مرتبہ فالج نے چھوا ہو گا۔ ان
آنکھوں کی تعریف کی ہوگی۔ ان پلکوں کو چوما ہو گا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



جب نگر نگر کی خاک چھانو گے اور پھر بھی سکون نہ پاؤ گے

کوئی اس پر کوڑے برسار رہا تھا۔ اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اسے طمانچے مار رہا تھا۔ وہ پانگلوں کی طرح اس حال میں اٹھا کہ رونے کی کوشش میں اس کے آنسو آنکھوں کی پتلیوں میں جم گئے تھے۔ پھر اس نے نانا کے گھر کی دہلیز پکڑ لی۔ ہر طرح سے پیروں میں گر کر معافی مانگی مگر بے سود۔ وہ خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ وہ خالی دل جا رہا تھا۔ وہ ایک ایسا مسافر تھا۔ جس کے پاس زادراہ کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ کسی لٹے بٹے ہارے ہوئے مسافر کی طرح اس اندھیری رات میں گھر سے نکلا اور ہمیشہ کے لیے ”بے گھر“ ہو گیا۔“

اس روئے زمین پہ رافع افرایم کے لیے ایک بھی شبستان نہیں تھا۔

یاد ایک گلاب کے پھول کی مانند ہوتی ہے۔ پھول کی پتی پتی بکھر بھی جائے تو خوشبو ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یادوں کی خوشبو، نیتے نخلستان میں بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے انسان پھنڑ جاتے ہیں۔ کھو جاتے ہیں مگر ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ کبھی نہ جانے گئے لیے، کبھی نہ کھونے کے لیے۔

یادوں کا یہ سلسلہ رافع، فلاح اور اتاب یہ تک محدود تھا۔ یہ تین افراد ایسی ہی نکلون کے تین حصے تھے۔ جن کا ایک سرادو سرے کے ساتھ ایک یاد کی صورت میں بندھا ہوا تھا۔ یادوں نے انہیں آپس میں جوڑا ہوا تھا۔ یہ رات کا تیسرا پر تھا۔

باہر مصنوعی جمیل پہ رات اتری ہوئی تھی۔ رات جو ہزار بھید اپنے پیٹ میں چھپائے رکھتی ہے۔ رات جو گنہگاروں جیسی سیاہ ہوتی ہے۔ رات جو شر اور خیر کا سنگ میل ہے۔ جو چاہے تو شر کی طرف بھاگے اور جو چاہے خیر کی اوٹ میں پناہ لے۔

رات خیر کی تلاش میں جاگنے والوں کو ”فلاح“ دیتی تھی۔ فلاح بھی بہشت بھی اور شر کے پیچھے لپکنے والوں کو

تباہی اور نرگ یعنی آگ۔

وہ ایک مست ازل خواب کے پروں پہ سوار تھا۔ وہ خواب جو سردی تھا۔ جس کی نہ کوئی ابتدا تھی اور نہ کوئی انتہا۔ یہ خواب اسے تب ہی ستاتا تھا جب عشوے دکھائی اچھی نیند اس کی پلکوں پہ کبھی کبھی مہربانی دکھاتی۔ وہ خواب کے سفر پہ تھا۔

جھکے برآمدوں والا ایک گھر۔ جو اپنی شان و شوکت میں کمال نہ تھا۔ اس کے جھکے برآمدوں اور کمروں میں ٹھنڈک بارہ مہینے قائم دائم رہتی تھی۔ وہ گھر جو اس کے خوابوں کا مسکن تھا۔ وہ گھر جو امن کا گوارا تھا۔ محبتوں کا گڑھ تھا۔ جہاں پہ ہنسی کی جھنکاریں اور قہقہے سنائی دیتے تھے۔

معا“ ایک تیز بگولا اٹھا تھا۔ پورب سے اٹھتی آندھی جیسا اور عجیب سا شور۔

وہ اس شور کی آواز سے گھبرا گیا تھا۔ یہ کیسا شور تھا؟ رونے کی آواز؟ اور نعتوں سے نگرانی عجیب سی خوشبو۔ یہ کیسی خوشبو تھی؟ اسے خوشبو پہچاننے میں بڑی دیر لگی۔

یہ خوشبو کافور کی تھی اور کسی دور نگر سے آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پردہ سادھ غ بند ہونے لگا تھا اور یہ کافور کی خوشبو اس کی حس شامہ کو نہایت ازیت دے رہی تھی۔

وہ جائے نماز پہ کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا۔ اسے پہلے کیا پردھنا تھا؟ شامہ، تسمیہ، تعویذ؟ اس نے نیت باندھ لی اور قبلہ رخ کیے کھڑا ہو گیا۔

ایتنے سالوں بعد نماز تہجد میں اس کی کوئی یکسوئی نہیں تھی۔ اس کے دھیان کا پتھری بار بار اڑنے لگتا۔

اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے وہ جاو گرنی تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس جاو گرنی کی پچھلی کہانی کسی دن وہ کھوج نکالے گا۔

لیکن عنایہ سے محبت؟ یہ وہ چیز تھی جو فلاح کے دائرہ

دین

ماہنامہ

فروری 2017 کا شمارہ شائع ہو گیا

❖ اداکارہ "اڈریکا ڈینیل" سے شاہین رشید کی ملاقات.

❖ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "اجو ہنائی اجینی".

❖ اداکار "ڈاکٹر فہد مرزا" کہتے ہیں "میری بھی سنیے".

❖ اس ماہ "مڈرہ کوثر" کے "مقابل ہے آئینہ".

❖ "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا

سلسلے وار ناول.

❖ "رائیڈز" تیز لیڈ ریاض کا سلسلے وار ناول.

❖ "گل گھسار" فرح بخاری کا مکمل ناول انتہام کی طرف.

❖ "آزمائش" مقدس مشعل کا مکمل ناول.

❖ "وہ نہیں ملا تو طلال کیا" نادیہ احمد کے ناول کا

دوسرا اور آخری حصہ.

❖ "محبت کہانی" فضا محسن علی کا ناول.

❖ "خبر ہونے تک" سحرش بانو کا ناول.

❖ "گرفقار سحر" منعم ملک کا ناول.

❖ نغیہ سعید، راشدہ علی اور آسیہ مظہر کے افسانے

اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

"سوپ اور چائے میز کھانے"

کرن کے پڑھنے کے ساتھ ہی اسے منعم میں منعم

اختیار سے بہت باہر تھی۔ وہ اس کی بیوی ہوتی یا نہ ہوتی۔ وہ فاح سے بے وفائی کا اقرار کرتی یا نہ کرتی۔ اسے عنایہ سے بے بہا محبت تھی۔

وہ چینی کی گڑیا جو اپنے ماں باپ کی عدم توجہی سے ایک سہمی ہوئی ہرنی میں بدل گئی تھی۔ وہ فاح کے ساتھ تین مہینے نہیں۔ تین قرن گزار کے گئی تھی۔ وہ اس کے اندر بستی تھی۔ وہ چینی کی مورت تھی چاہے جانے کے لائق۔ خوف زدہ ڈری سہمی۔ ماں کی مار اور ستم کا شکار۔ وہ ان کی زندگیوں کا سب سے مظلوم کردار تھی۔ لیکن وہ "بے وفا" بھی تھی۔ اور بے وفاؤں کے لیے فاح کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نفرت کا معمولی سا جذبہ بھی نہیں۔

وہ لائینی سوچوں سے بچنے کے لیے اونچی آواز میں سجدے کی تسبیح پڑھنے لگا۔ پھر جلسہ اور بعد میں قیام کے دوران اس کی سوچوں کو پھر سے پتک لگ گئے تھے۔ اس نے ویا کے مجبور کرنے پر عنایہ کو طلاق دے دی تھی۔ اور خود وہ اس رات اپنا مختصر سامان باندھ کر گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا تھا۔ اسے یہ شہر چھوڑ کر نہیں یہ دیس ہی چھوڑ کر چلے جانا تھا۔ لیکن آج کی رات وہ کہاں گزارتا؟ پھر اسے اپنے مرحوم تایا ناصر کے اکلوتے بیٹے مدید کا خیال آیا۔ مدید جو اس کی جند جان تھا۔ اس کا گہرا اکلوتا اور بہت پیارا دوست۔

اور جب چارویگینس بدل کر مدید کے نصیبی چوزوں کے ڈربانما مکان میں تھکا ہارا بکھراٹوٹا پنچا تو مدید اس کے دکھ درد اور تکلیف کو بانٹنے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔

وہ فاح پہ ٹوٹ پڑنے والی مصیبت سے واقف تھا۔ بلکہ وہی کیا اس کا پورا خاندان جانتا تھا۔ اور اسی لیے یہاں پہ ایک رات بھی ٹھہرنا محال ہو چکا تھا۔ اتنی عورتیں ان کی چہ میگوئیاں اشارے، طنز اور طعنے۔ سونے پہ سماگہ اسی رات مدید کا ایک سیڈنٹ ہو گیا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اوپر سے اس کی ماں مدیحہ مائی کا اوہلا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

107 2017 فروری شمارہ شائع

شدت سے بند ہو رہا تھا۔

”تم مجھے یہ اطلاع کیوں دے رہی ہو؟ تم نے غلط نمبر ڈائل کیا ہے۔ تمہیں یہ اطلاع رافع کو دینی چاہیے۔“ وہ اسے بڑی رکھائی سے کہہ رہا تھا۔ بیہ کو بڑی زور کا دھچکا لگا۔

”کیا عنایہ کے ساتھ ایک ہی رشتہ تھا؟ وہ ایک رشتہ ٹوٹ گیا تو باقی سب رشتے بھی ٹوٹ گئے۔“ یہ وقت ان سوالوں کا نہیں تھا۔ مگر وہ پھر بھی سوال کر رہی تھی۔ اور سوال میں جرح کر رہی تھی۔

”ہاں سب رشتے ٹوٹ گئے۔“ اس کا لہجہ بلا کا بر فیلا تھا۔

”تم اس کے شوہر ہو فلاح؟“ بیہ اسے کیا یاد کروانا چاہتی تھی؟ کیا وہ پاگل ہو چکی تھی یا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ ہاں اس انادپہ نامی عورت کے ساتھ رہتے ہوئے کس کا ذہنی توازن ٹھیک رہ سکتا ہے۔

”میں اس عہدے سے معزول ہو چکا ہوں۔“ وہ زہریلے لہجے میں اسے حسائے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہاری بیوی مری ہے فلاح۔“ یقینی طور پر وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔

”وہ میرے لیے ایک سال چھ مہینے دو ہفتے پہلے ہی مر گئی تھی۔ جب میں پاکستان چھوڑ کر آیا تھا تو اسے وہاں دفن کر کے ہی آیا تھا۔“ فلاح نے رکھائی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے نماز جنازہ کی تفصیل بتا رہی تھی کہ اگر فلاح نے آنا ہو تو وہ لوگ تدفین میں تاخیر کر لیں گے۔

فلاح نے فون بند کر دیا تھا اور پھر خودیہ چڑھایا ضبط کا خول اپنے ہاتھوں سے تڑتڑ توڑتا وہ بے آواز رونے لگا تھا۔ بے انتہا شدت کے ساتھ۔ پھر اس کی گھٹی گھٹی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ وہ ضبط کے سارے اختیار کھونے لگا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

وہ بھول گیا تھا کہ فلیٹ میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ کوئی اور یعنی حریر؟ اس کا دوست جو اپنے شہر ظہران سے لوٹ آیا تھا۔ اس کی اپنے گھر والوں سے صلح ہو چکی تھی۔ وہ فلاح کو اپنے گھر لے جانے کے لیے

”یہ ساری فلاح کی نحوست ہے۔ جو ان کی سات پڑھیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سارا خاندان ہی منحوس ہے۔ اس کی ماہی ایسی منحوس بلا تھی۔ اپنے شوہر سمیت اپنے اکلوتے بھائی کو بھی بھری جوانی میں نکل گئی تھی۔ اور فلاح کی ماں بھی بلا کی منحوس عورت تھی۔ ایسی سبز قدم جو افرایم کا گھر بھی بد بختی کی لپیٹ میں آ گیا۔“

تائی کی دہائیاں کونے اور آہوں سے بے نیاز فلاح نے مدید کو اپنے جسم کا خون دے کر اس کی زندگی کے گل ہوتے چراغ کو روشن کیا اور خود اجسی فضاؤں کے حوالے اپنے آپ کو کر کے ہر رشتے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

لیکن یہ مدید تھا جو اس سے کبھی رابطہ نہ توڑ سکا اور مدید کی وجہ سے ہی حریر۔ دنیا کے دو بہترین دوست اور عم گسار۔ زخموں پہ مرہم لگا کر مسیحا کرنے والے۔

اسے یاد آیا۔ وہ نماز کے لیے کھڑا ہے اور اسے قعدہ اور پھر تشہد کے بعد سلام پھیرتا ہے۔ لیکن وہ بار بار سجدے کی تسبیح پڑھ رہا تھا۔ ”سبحان ربی الاعلیٰ“ اس کا دل اللہ کی کبریائی کے خوف سے لرزنے لگا تھا۔ اور وہ نماز میں ہی بلند آواز میں رونے لگا۔ اور جانے وہ کتنی دیر سجدے میں بڑا رہتا۔ جب فون کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ فون تک آیا۔ اس نے فون اٹھایا اور دوسری طرف سے آئی سانسوں کی آواز سن کر ہی تھرا اٹھا تھا۔

وہ اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے ہی سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف کون ہے۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہلے اور ریسیور پہ اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ ”انا بیہ!“ اس کی بڑبڑاہٹ لبوں کے اندر ہی دم توڑ گئی۔ دوسری طرف بیہ اس کے سر پہ دھماکے کر رہی تھی۔

”فلاح! وہ مر گئی ہے، تمہاری عنایہ۔“ بیہ کے دل پہ خنجر چل رہے تھے۔ اس نے آنکھیں موند کر وہ سب کچھ کہہ دیا۔ جسے کہنے میں اتنی دشواری کسی فون کال میں نہیں ہوتی تھی۔ اور اس وقت بیہ کا دل صدے کی

آیا تھا۔ رہتی آرہی ہے جس تعالیٰ میں کھایا اسی میں چھید کیا۔

لکھو الوجود مجھ سے۔ اسی نے کام تمام کیا۔“

ارسل کی دادی نے فرد جرم عائد کر دی تھی۔

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بیہ اسی قاتل بھی اور وہ

واقعی اسی قاتل تھی۔ ڈھیر ساری گلہریوں میں ایک اور

گلہری کا اضافہ ہونے والا تھا اور اب کے بولنے والی عزمہ

تھی۔ فلاح اور رافع کی بہن۔ جو اپنے گرتے آنسو

پوچھتی تھیں کہ کدھے سے لگی پوچھ رہی تھی۔

”کیا یہ سب بیہ نے کیا؟ ماما سے اپنا انتقام لینے کے

لیے؟ بیہ نے اپنی ناکام حسرتوں کا قتل عام ہو کر دیکھ کر

پہلے اتنا عرصہ صبر کیا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے اور پھر

موقع دیکھ کر کام کر دکھایا۔ بیہ نے دیا ماما اور عنایہ کو

قتل کر دیا۔“ اس کے سرسراتے لہجے میں تو کیلی ہوا

سی کاٹ تھی۔ جو اپنا ”عنایہ کے دادا اپنی آنسوؤں میں

بھگی آنکھوں کو پوچھتے نفی میں سر ہلانے لگے۔

”بھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ از میر دیکھ رہا ہے۔ وہ

چیک اپ کرے گا۔ طبی معائنے کے بعد پوسٹ مارٹم

کی حتمی رپورٹ ملے گی۔ تب ہی بتا چلے گا۔ یہ طبی

موت مری ہیں یا انہیں سازش کے تحت قتل کیا گیا

ہے۔“ ان کا گہرا لہجہ درد سے بھرا تھا۔ وہ ایک دم بہت

ضعیف اور معمر لگنے لگے تھے۔ ان کے کدھے جھکے

ہوئے تھے۔

کتنا مشکل تھا۔ اپنے جان عزیز کا سرمایہ اس کے

پہلو میں دفن کر کے آنا۔ کتنا ٹھن تھا۔ کاشف کے

اکھوتے اٹانے کو زمین کے اندر اتار آنا۔

ستون سے ٹیک لگائے لگائے ہی بیہ نے پورے

گھر میں ایک نامعلوم سی ہلچل محسوس کی تھی۔ شاید

ڈاکٹری رپورٹ آگئی تھی یا نہیں۔ باہر تو کوئی اور آیا

تھا۔ ایک تھکا ہارا مسافر۔ اپنے آشیانے سے اڑان

بھرنے والا پنچھی۔

بیہ نے اپنی کھلی سرد اور تھکی تھکی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ فلاح افرایم لوٹ آیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا

اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ۔ ان شاء اللہ)

وہ چاہتا تھا۔ اسی ہفتے فلاح اس کے ساتھ ظہران

چلے۔ ظہران میں فلاح کے لیے ایک ”سیرپرائز“ تھا اور

ابھی سونے سے پہلے ڈنر کے دوران فلاح نے حریر کے

ساتھ ظہران جانے کی ہامی بھری تھی۔ کیونکہ حریر کے

سیرپرائز کو دیکھنے کی بے چینی اسے بھی لاحق ہو چکی

تھی۔

اور اب اس کا پروگرام تبدیل شدہ تھا۔ اسے

ظہران نہیں جانا تھا۔ روتے روتے اسے احساس ہوا کہ

کوئی اور بھی کمرے میں اس کے ساتھ موجود ہے اور

پھر بن دیکھے وہ آنے والے کی خوشبو کو پہچان گیا تھا۔ وہ

آنے والے اپنے دوست کو جان گیا تھا۔ وہ حریر تھا۔ جو

جانے کب سے کمرے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ شاید

اس نے فون کال بھی سن لی تھی۔ کیونکہ جب فلاح اس

کے کدھے سے لگا روتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”حریر! عنایہ مر گئی ہے۔“ تو حریر نے اپنی آنکھوں

کو مسلتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”میں نے پاکستان جانے کے لیے دو سیٹیں کنفرم

کر والی ہیں۔ ہم عنایہ کے جنازے میں شرکت کرنے

پاکستان جا رہے ہیں فلاح۔“

اور فلاح حریر کے سامنے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

اتنا سا انکار بھی نہ کر سکا۔ اسے جانا تھا۔ عنایہ کے

جنازے کو کدھا دینے جانا تھا۔ عنایہ کو لحد میں اتارنے

کے لیے جانا تھا۔ عنایہ کو ”الوداع“ کہنے کے لیے جانا

تھا۔ یہ اس کا عنایہ سے بہت پرانا عہد تھا۔ اسے اپنا

عنایہ سے کیا گیا عہد نباہنا تھا۔ اسے لوٹ کر اپنے

آشیانے کی طرف جانا تھا۔



”مجھے تو صاف صاف قتل کی واردات لگتی ہے۔ نہ

چور نہ مور نہ کوئی ہو۔ ان ماں بیٹی کے بعد کون ہے جو

اس وراثت کا حق دار ہے؟ رویا اور افرایم کے بیٹے تو

پردیس میں ہیں۔ عزمہ اپنے گھر کی۔ نانا نانی آج مرے

کل دو سرا دن۔ تو یہی نا پھر؟ جو سالوں سے اسی گھر میں

پاکو دیا گیار

سے معذور۔ ان کی ذمہ داری بخوشی نندنے لے لی۔
محرم کا مسئلہ اللہ نے حل کر دیا۔ پاسپورٹ بنا رکھا تھا۔
بھائی جان نے ایک دفعہ لاہور بلوایا، کچھ بیانات کچھ
دستخط کچھ انکو تھے لگوائے، لیجئے جناب پورے
ستائیس اٹھائیس دن کے بعد ٹکٹ ہاتھ میں تھا۔
ٹکٹ کو چوما آنکھوں سے لگایا۔ دو چار لان کے
سوٹ اور چند ضروری اشیاء۔ غیر ضروری سامان تو
انہوں نے گھر میں بھی نہ جمع کیا تھا کجا مسافرت میں
لیے پھر تیں۔ وہاں کا زور اور ایک ہی سے تقویٰ۔ حج
کی معلوماتی کتابیں، دعا میں سب ازیر تھیں۔ بس
چھبیس اگست آئے اور انہیں فضاؤں میں لے جائے۔
بچپن کی سنی نعیتیں، تو الیاں اب کانوں میں رس
گھولتیں۔

صبا دینے اگر ہو جانا نبی سے میرا سلام کہنا
کبھی۔

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کھنچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
یوں ہی آنسو پونچھتے اشک بہاتے اگست کی چوہ آ
پہنچی۔

”سنئے! مجھے کل چیچہ وطنی اور بہاولپور جانا ہے۔“
میاں چوہہ اگست کی چھٹی کی وجہ سے آرام سے لیٹے
ہوئے تھے صفیہ سلطانہ نے انہیں مخاطب کیا۔
”کیوں؟ وہ کیوں؟“ نادر صاحب نے حیرانی سے
پوچھا۔

”حج سے پہلے سب سے مل ملا کر دل صاف کر کے
جانا چاہیے نا۔“ صفیہ سلطانہ نے کہا۔ ان دونوں

انہیں علم ہی نہ تھا کہ برسوں کی تمنا اچانک یوں
پوری ہو جائے گی۔ تمنا تو محض ایک چھوٹا سا لفظ ہے
اس کے لیے تو آرزو، خواہش، حسرت، دعا، مراد،
چاہت، لگن، نعت کے سارے لفظ ناکافی ہیں۔ صفیہ
سلطانہ کے روئیں روئیں میں یہ چاہت تھی۔
ناخنوں سے گوشت کا وہ تعلق نہ ہو گا جو اس خواہش کا
ان کے وجود سے تھا۔ یقین کامل تھا کہ مراد پوری اسی
وقت ہوگی جب کاتب تقدیر نے لکھا ہوگا!

اور کاتب تقدیر نے یہ کیسے لکھ دیا؟ عقل دنگ اور
حیران تھی، جب حالات ہی نہ تھے سوچا بھی نہ جا سکتا
تھا۔ اچانک بالکل اچانک ان کی بڑی بھانج کا فون آیا۔
”میں نے اور تمہارے بھائی جان نے اس سال حج
کا پروگرام بنایا ہے، سرکاری طور پر تو درخواست دینے
کے اہل نہ تھے پرائیویٹ طور پر جانے کا ارادہ ہے اگر
ممکن ہو تو تم بھی چلی چلو۔“

صفیہ کا دل چاہا تھے بچوں کی طرح اڑیوں کے بل
گھومیں۔ جیسے بچپن میں گلیوں میں جھوما کرتی تھیں
بھائی کا ہاتھ پکڑ کے اور لپکتی ہوئی گاتی تھیں۔
”کالے بادل آئیں گے۔“

”اگر مینہ برسا میں گے۔“
ہائے رحمت کے بادل آگئے۔ بلاوا آگیا۔ چھم
چھم آنسو برسنے لگے۔

پہلے میاں سے بات کی وہ چونکہ چوہہ پندرہ سال
قبل حج کر چکے تھے اور مالی طور پر زیادہ مستحکم نہ تھے۔
اس لیے جانا تو صفیہ کو ہی تھا مگر مسئلہ محرم اور ساس کا
تھا۔ ساس مریض تھیں، بڑھاپے کا شکار، چلنے پھرنے

”بھابھی آمنہ رضیہ آیا“ شکور بھائی سب کے گھروں میں گئے۔ دو پار کے اور قریبی سب رشتہ داروں کے نام انہوں نے میاں کو گنوائے۔

”یہ تو بہت اچھا ہوا ورنہ ہمیشہ وہی آتے تھے“ میاں نے بھی اظہار مسرت کیا۔

”ہاں اب گاؤں والے ماموں سرفراز اور چاچا اشرف رہتے ہیں، کل پرسوں موٹر سائیکل پر ہی لے جائیں، کہیں ان بے چاروں سے ملنے سے نہ جاؤں۔“

شہروں میں ان کے عزیز واقارب رہتے تھے۔ ”افوہ۔۔ خود ہی آجائیں گی وہ تم اپنا اسٹیٹمنٹ جمع رکھو حج کے لیے۔“

”ارے واہ۔۔ ایسے ہی۔“ صفیہ سلطانہ نے چمک کر کہا ”آپ کو نہیں پتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ سے پہلے سب سے دعا کا کہنے گئے تھے اور جب عمرہ کر کے آئے تو لوگ ان سے ملنے آئے تھے۔“

دلیل وزنی تھی۔ نادر صاحب چپ ہو گئے۔ دو گھنٹوں کے بعد بیٹے کے ہمراہ صفیہ بیگم سفر پر روانہ ہو گئیں۔ قیام مختصر ہی تھا لیکن سب سے ملاقات ہو گئی۔۔۔ واپسی پر انہوں نے خوشی سے بتایا۔



”ہاں بھی ضرور۔ غریب رشتہ داروں کا تو ویسے ہی پہلا حق بنتا ہے، کچھ دے دلا بھی آتا۔“ نادر صاحب نے مشورہ دیا۔

پچیس اگست کی علی الصبح انہیں لاہور روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ آس پاس کے محلے دار سب الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ سب کی نگاہیں ہی عقیدت سے بھری ہوئی تھیں۔ سب کے دلوں میں اس گھر اور اس در کی چاہ تھی۔

بیٹا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

سب سے مل ملا کر وہ فارغ ہوئیں۔

”چلیے امی جان!“ بڑا بیٹا فرحان موڈ ہو کر بولا۔
 ”ایک منٹ میں دو نفل تو پڑھ لوں اللہ آسمانوں کا اور قبولیت کا سفر بتائے۔“ انہوں نے لاؤنج میں ایک جانب بچھے جانماز پر فوراً ہی نفلوں کی نیت کی اور دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔

بیٹا پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی انہوں نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، بیٹا سرگوشی میں بولا۔
 ”امی جان! آپ حج پر جا رہی ہیں۔ آپ کے حج کو قبول ہونے کے لیے کن کن لوازمات کی ضرورت ہے؟“

”کیا مطلب؟ سیدھی صاف بات کرو۔“ صفیہ بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ بڑا بیٹا بہت عقل مند، مدبر اور سودا نشوروں کا ایک دانشور تھا۔ فضول بات کرتا تھا نہ سننا پسند کرتا تھا۔

”مطلب یہ ہے کہ آپ سب رشتہ داروں سے ملنے، سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے گئیں۔ آپ نے ایک دفعہ بھی نہ سوچا کہ آپ کے دائیں ہاتھ کے پڑوس میں آپ کی سگی بہن رہتی ہیں۔ اس بات پہ کہ انہوں نے آپ کی بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔“

”آب ان سے تین ساڑھے تین سال سے خفا ہیں۔ صلح کی تمام تر کوششیں ان کی جانب سے ہوئیں۔ آپ نے آخری فقرہ یہ کہا تھا آئندہ جو بھی عطیہ سے

ملے گا یا اس سے تعلق رکھنے کی کوشش کرے گا آپ اس سے کٹ آف ہو جائیں گی۔ اس دھمکی سے ڈرتے ہوئے ہم لوگ بھی ان سے نہ جڑ سکے۔ اگر آپ ان سے ملے بغیر چلی گئیں تو کیا آپ کا حج ہو جائے گا؟“ نرم لہجے میں اس نے ماں کو اس عیب کی جھلک دکھائی جو دیکھنا ناگوار ہی نہیں ناپسند بھی تھا۔
 ”لیکن زیادتی اس کی طرف سے ہوئی تھی، بچپن میں اس نے ہی کئی دفعہ اس رشتہ کو جوڑنے کی بات کی تھی۔“ صفیہ نے تڑپ کر کہا۔

طنزیہ سی مسکراہٹ فرحان کے چہرے پہ لکھ بھر کے لیے نمودار ہوئی۔

”امی جان! زیادتی کرنے والا ہمیشہ میرے ساتھ ایسے کیوں ہوا“ کارونا رتا ہے حج پر تو آپ جا رہی ہیں ناں، پہل آپ کو کرنی چاہیے۔ ویسے بھی اجر سارا اسی کے لیے ہے جو پہل کرنا ہے۔ دو سری بات یہ کہ رشتے ناتے بچپن یا جوانی میں نہیں اللہ کے حکم سے ملے ہوتے ہیں اللہ نے یہ رشتہ نہیں لکھا تھا تو خالہ کیسے مان جائیں۔ امی جان۔“

فرحان کی آواز میں لرزش آئی۔
 ”سوچ بیٹے حج کرنا ہے حج مقبول یا۔ ایسے ہی پلٹ آنا۔“

”نہیں۔“ تڑپ کر صفیہ سلطانہ نے کہا۔
 ”جھکے۔ جھکے۔ ہی سہی بہن کے گھر پر تین سال کے بعد دستک دے کر انہوں نے حج مقبول کا دروازہ بھی کھول دیا تھا، حالانکہ شیطان مردود کی اسکیم میں یہ بات شامل تھی کہ حج، حج مغفور ہی بنا دیا جائے ایک روٹھی بہن سے نہ بھی مل کر جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے!“

خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے، دونوں بہنیں آپس میں گلے مل کر اشک بہا رہی تھیں۔ اب دونوں بہنیں پاک دل و پاکباز تھیں۔ فرشتے فتح کا نشان بنا رہے ہوں گے۔ ایک ہستی جلنے سڑنے والی بھی ہوگی جس کے قلع قمع کے لیے توج کا ارادہ کیا تھا۔



برگے جھول

جرے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے۔ باتیں کرتے۔ کتنے پر جوش دکھائی دے رہے تھے۔
ہاں یہ ہی گراؤنڈ تھا۔ جو آج مزید کشادہ کر لیا گیا ہے۔ اور وہ دور پیچھے۔ جہاں ایک خوب صورت ہال ہے۔ تب ایک لان ہوتا تھا۔ خوب صورت سا۔ اور اسی لان میں تو بیٹھی تھیں۔ ہم تین چار لڑکیاں۔ ہمارے گروپ میں وہ آج بھی سب سے خوب

صورت لگ رہی تھی۔ وہ اتنی مہنگی میکسی نہ بھول پھنتی۔ جو اس کے پاپا نے سعودی عرب سے بھجوانی تھی اس کے لیے وہ تب بھی نمایاں ہی رہتی۔

اونچاقد خوب صورت نین نقش اور ذہانت چھلکاتی آنکھوں سے دیکھتی۔ وہ مقابل کو مسحور کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی اور ہم سب مرعوب ہو کے اس کی باتیں سن جاتے۔ اس نے میک اپ نہیں کیا تھا پھر بھی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ہم تینوں بشریٰ کے میک اپ رہتے تھے۔ سرخی ہونٹ کے گرد پھلتی تھی۔ کالے کالے گل بھی سرخ لپ اسٹک سے بھرے تھے۔ اس پر آنکھوں پر سرخ چشمہ لگائے۔ وہ بے چاری مضحکہ خیز سے بڑھ کر کچھ لگ رہی تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے آنکھ پر بھی اس کی اماں نے سرخی لپی ہے ہی ہی ہی۔“

”آٹے کی بوری میں ایک بار سر ڈوڑھتی۔ کھی کھی کھی۔“

”ارے نہیں۔ چونا کروالیتی، فنکشن سے ایک دن پہلے۔ بابا۔“

”اے دیکھو۔ بخاور بی بی کو۔“ بخاور بی بی کو۔

میں حیران تھی۔ اگر میری نظریں مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھیں، تو میں دھوکا کیوں کھا رہی تھی اور اگر میں دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ تو کیا وہ حقیقت بھی یا بھیا تک جھوٹ جو مجھے دکھایا جا رہا ہے۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ تو یہ سچ کیسے بن گیا اور اگر فریب ہے تو حقیقت کیسے بنا۔ گمان ہے تو یقین کیونکر ہوا۔ اور یقین ہی ہے۔ تو اتنی بے یقین کیوں ہوں میں۔

اور پھر اس اسٹیج پر کھڑی لڑکی، بلکہ خاتون کہنا چاہیے۔ ہاں تو اس خاتون کو شاید میری نظر کا ارتکاز محسوس ہوا۔ مگر اس وقت جب وہ مسکرا کر شیلڈ لے رہی تھی۔ تب اس کی نظر مجھ سے ٹکرائی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے لحظہ بھر کو۔ بس۔ نظر ٹکرائی اور اس نے ہنالی۔ وہ مریم احمد ہی تھی اور کہیں سے بھی وہ مریم احمد نہیں لگ رہی تھی۔ ہاں یہی اسکول ہی تو تھا۔ یہیں سے میں نے میٹرک کیا تھا۔

کئی سال پہلے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وقت کا پیہہ پیچھے کی طرف گھوم رہا ہے۔ سن 2016ء کی دھوپ معدوم ہوتی گئی۔ لوگ معدوم ہوتے گئے دو ہزار تیرہ۔ دو ہزار بارہ۔ وقت گھڑیاں الٹی گھومنے لگیں۔ اور ہوتے ہوتے اسی جگہ پر اسی اسٹیج پر۔ مارچ 1988ء کی سنہری دھوپ اتر آئی۔

ہر طرف شناسا چرے ابھرنے لگے۔ اے گزر چکے غول کے پیچھی نظر آنے لگے۔ کم عمر بے فکر بے خبر، رنگ برنگ سوٹ پننے، مسکراتی لڑکیوں سے گراؤنڈ بھر گیا۔

امنگ، ولولہ، جذبہ، لیے۔ خوش ہنستے معصوم

www.paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM

اور دیکھا دیکھی تالیاں شروع ہو گئیں۔ بے چاری
بختاور کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔

”یہ تالی بجانے کی بات ہے؟“ عمر رسیدہ میڈم نے
عینک کے اوپر سے گھورا۔ تب تک لڑکیوں کی تالیاں
بھی ماند پڑ چکی تھیں۔ ہوش آگیا۔ کہ اوہو۔ تالیاں
کیوں بجا رہے ہیں ہم۔

زلزلہ جاری تھا۔ اور اب نیکیسٹ کلاس کا
زلزلہ اناؤنس ہو رہا تھا۔



اور آج وہی اسکول تھا۔ وہی گراؤنڈ۔ مگر نقشہ
بہت تبدیل ہو چکا تھا۔ سب چہرے اجنبی تھے اسکول
کی عمارت جدید ہو چکی تھی۔ دراصل حکومت کی
طرف سے۔ اچھی کارکردگی دکھانے والے ٹیچرز کے
لیے تقریب منعقد کی گئی تھی چھوٹی سی۔ میں سوچ
بھی نہیں سکتی تھی۔ میرا مریم احمد سے سامنا ہوگا اور
یوں ہوگا۔

شہر کے تمام اساتذہ مدعو تھے اور دھوپ سے بجاؤ
کے لیے شامیانے لگائے گئے تھے کرسیاں رکھی گئی
تھیں۔ کچھ فاصلے پر بیڈنٹل فین رکھے ہوئے تھے۔
آج تو یوں بھی دھوپ معدوم تھی۔ اتنی گرمی نہیں
تھی جتنی زیادہ لوگوں کی وجہ سے اور کچھ تھک جانے
کی وجہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ جس ساہو رہا تھا۔
اور شامیانہ ہلکی پھلکی نرم گرم ہوا کی بدولت کبھی بلند
ہو جاتا اور پھر جھک جاتا۔

میری توجہ میسج ٹون نے کھینچ لی۔ انفہ کامیسج
تھا۔

”میں۔۔۔ آج شاید مجھے دیر ہو جائے۔ میرا پریکٹیکل
ہے۔“

”لو کے بیٹا! جب فارغ ہو جاؤ تو میسج کرونا۔
ڈرائیور کو بھیج دوں گی میں۔“ میں نے جواب دیا۔

مریم احمد اب دوبارہ وا میں طرف رکھی کرسیوں پر
آکے بیٹھ چکی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک بار پھر
ٹکرائی تھیں۔ میری سمجھ میں آگیا۔ وہ یہ تو پہچان گئی

ہم تینوں نے دیکھا۔ سرخ سفید فرائڈ۔ فل میک
اب تھوپ کر وہ بھی کچھ دیکھنے کے قابل لگ رہی
تھی۔ اگر وہ چھپانے بیٹاتی اپنی۔

”تجی بھی بری نہیں لگ رہی سوائے اس گردن پر
لگتی چھپکلی کے۔ ہاہاہاہ۔“

اس کے تھوڑے سے بالوں کی زیر دستی لاغری چھپا
ہی تھی۔ وہ اسے پار پار پکڑ کر آگے کرتی اور ذرا سا سر
ہلانے پر پیچھے ہو جاتی دوبارہ۔

ہمیں ہنسی آئی اس پر بھی۔ وہاں بیٹھ کر ہم ہنس ہی
تورہے تھے۔ بلاوجہ ذرا ذرا سی باتوں پر ہنسا اور کام کیا
تھا ہمارا۔ اور پھر چند لمحے سر کے۔ ساری لڑکیوں کو
گراؤنڈ میں بٹھایا گیا۔ ٹیچرز کے لیے کرسیاں رکھی
گئیں۔ میڈم تشریف لے آئیں۔ زلزلہ شروع
ہوا۔

اور حسب توقع بیک وقت تین بھاری ٹرافیاں
لیے۔ اعتماد سے مسکراتی۔ مریم احمد کا دلکش چہرہ
سب کی نظروں کا مرکز بن گیا۔

ہیسٹ اسٹوڈنٹ کا۔ پوزیشن لینے کا۔ اور
اسپورٹس کی مایہ ناز کھلاڑی ہونے کا۔ وہ مسکرا رہی
تھی اور ٹیچرز سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ اس کے چہرے
سے پھوٹی خوشی اور آنکھوں سے چھلکتی ذہانت بے
حد حسین لگ رہی تھی۔ اور لگتی بھی چاہیے تھی۔
اور وہ اسی اعتماد سے ہم دوستوں میں آکر بیٹھ گئی۔

ہماری نظروں میں اس کے لیے رشک تھا۔ ہم نے
اسے مبارک باد دی میں نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔
سو۔ میں نے بھی اپنا انعام جا کر وصول کیا مجھے پتا تھا
میری سیکنڈ ہی ہوگی مریم احمد کے ہوتے ہوئے کسی بھی
لڑکی کو سیکنڈ ہی ہونا تھا۔ اس پر فرسٹ کا ٹھہرا تھا جیسے
پیدائش سے ہی وہ اول تھی۔ اس کے لیے اول ہی
لکھا گیا تھا۔

اور اس وقت کتنا مذاق بنا۔ جب فیل ہو جانے والی
لڑکیوں کے نام لیے گئے اور سب سے پہلے بختاور بی بی کا
نام تھا۔ دوسری بار بے چاری فیل ہو رہی تھی اور جانے
پچھلی رو سے کس لڑکی نے بے دھیانی میں تالی بجانا۔

تھی کہ یہ شکل دیکھی بھائی ہے۔ مگر وہ شاید یاد نہ کر پائی۔ مجھے بھول جانا کون سی بڑی بات تھی۔ ہاں جہاں تک مریم احمد کی بات تھی۔ وہ جتنی بھی بدل جائے۔ وہ مریم احمد تھی۔ وہ بھولنے کی چیز تھی ہی نہیں۔

”مریم احمد۔“ میں نے پھر تصدیق چاہی۔
”حتا فاروق۔“ اس نے مسکرا کر دہرایا۔ اور ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

”کیسی ہو حتا؟ کیا کر رہی ہو آج کل۔“ ہم دونوں ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ خوشی بھی۔ دکھ بھی۔ اپنے ایک حسین وقت کو پیچھے چھوڑ دینے کا احساس۔ بہت آگے بڑھ جانے کی بھی مرست۔

جب بہت سال بعد آپ کو اپنے بچپن کا کوئی ساٹھی ملے۔ تو بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ہم کتنا آگے آجاتے ہیں اور کتنی چیزیں پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ کوئی بہت سال آگے جا کر ہی جان سکتا ہے۔

”تم۔ تم آج کل کیا کر رہی ہو مریم؟ بہت بدل گئی ہو۔“ میں نے اسے دیکھا۔ مجھے لگا اس کی مسکراتی آنکھوں میں اداسی کے سائے لہرائے ہوں۔

”ہاں۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”بدل گئی ہوں شاید۔ تم سناؤ، کیسی جا رہی ہے لائف۔ ہنرینڈ کیا کرتے ہیں تمہارے۔؟“

”آفس جا ب کرتے ہیں۔“
”اور بچے؟“

”ماشاء اللہ۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں انفہاب ایم ایس سی کر رہی ہے۔ بختاور کی بھابھی بنی ہوں نا میں۔ یاد ہے بختاور۔“

”بختاور۔“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
”بختاور بی بی۔ کی بھابھی بنی ہو۔“ وہ حیران تھی۔

”ہاں۔“ میں مسکرائی۔
”اچھا۔ گٹ۔“ تالاق تھی۔ مگر اچھی لڑکی تھی اور وہ کیا کر رہی ہے آج کل۔“

”وہی میں ہوتی ہے۔“
”خود تو ایک کلاس میں دو سال لگاتی تھی۔ مگر جس سے شادی ہوئی ہے وہ ٹاپ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے مزید اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
”اچھا۔“ وہ ہنس دی۔

”تم سناؤ، کتنے بچے ہیں کیا کرتے ہیں تمہارے ہنرینڈ۔؟“ ہماری گفتگو جا رہی تھی برسوں بعد ملے تھے۔ بتانے کو بہت کچھ تھا۔ نہ بتانے کو بھی بہت کچھ تھا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ کبھی کبھار ہمارے پرانے دوست ہمارے لیے ڈھارس بن جاتے ہیں۔ سہارے جیسے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں دیتے۔ پھر بھی دل کو سکون ملتا ہے۔ ان سے باتیں کر کے۔ ہاں۔ وہ ہمارے خوش گوار وقت کے ساٹھی ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی مریم سے مل کر اور مریم کو مجھ سے مل کر۔

”ہاں۔“ وہ چپ ہو گئی۔ ”ایک بیٹی ہے بس۔“
میرے موبائل پہ کل آنے لگی تھی۔ اسفند تھے۔

”تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی؟“ اسے جیسے خیال آیا۔

”مجھے تو نہیں مگر یہ اسفند۔ بیٹی بھی پھر ان ہی کی طرح خضدی ہے۔“

اچھا تم سیل نمبر دے دو اپنا میں جلد رابطہ کروں گی تم سے۔“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ وہ پرس کھول کے موبائل نکالنے لگی۔

موبائل نمبر کے بتا دے ہوئے۔
”اور تمہارے ہنرینڈ؟“ مجھے دوبارہ اپنا سوال یاد آیا۔

”بتاؤں گی حتا آرام سے۔“ اس نے مسکرا کر بات ٹالی۔

”اچھا۔“ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ بھی رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی بیک وقت سمجھ میں آتا۔ اور نہ آتا۔

۳۱ رہے۔ تو پھر ہوتے بھی سب سے مختلف ہیں میری بیٹی کے۔“ اس کی ماں کے لہجے میں محبت اور مان تھا۔

مجھے یہ بات اس لیے یاد تھی کہ پھر گھر آ کر کتنی ہی دیر میں نے اپنا اور اس کا موازنہ کیا تھا۔ میری ماؤں وائف ماں۔ ایک ہی درزن سے کپڑے سلوانی تھی اور میں نے کبھی فیشن کے مطابق کپڑے بنوانے کی ضد نہیں کی تھی۔

مریم احمد ہم دوستوں میں بھی تو ملکہ جیسی ہی تھی۔ وہ مغرور نہیں تھی۔ خوش اخلاق تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ اسے اپنی قابلیت کا اندازہ تھا۔ سو اس لیے گردن اٹھا کے چلتی۔ چلنا بننا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ کون ہے۔ اور کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے پرانی مریم یاد آئی۔ اور میں نے نئی مریم کو دیکھا۔ افسردگی کا گہرا احساس میرے اندر تک اتر گیا۔

”تم نے پھر بھی مجھے پہچان تو لیا۔ میرا خیال تھا شاید تم نہ پہچان سکو۔ مجھے ایک بار اریبہ ملی تھی۔ اپنی بیٹی کے لیے میرے پاس آئی تھی۔ مس مس کہہ کے بات کرتی رہی۔ وہ انتہائی جلدی میں تھی۔ مگر پھر بھی۔ مجھے بہر حال پہچان نہیں سکی وہ۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم بھول گئیں۔ اریبہ کتنی بھلکڑھوتی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ مس نے اسے رجسٹر دے کر کیا بات کہی ہے۔ دوبارہ جانا پڑتا تھا۔“

وہ ہنس دی۔ ”ہاں شاید۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جہاں زیب ایسے نکلیں گے۔ تم تو بہت خوش تھیں مریم مجھے یاد ہے جب آخری بار ہم ملے تھے۔ شاید کسی تقریب میں میٹرک کے ایک دو سال بعد۔ تم نے مجھے بتایا تھا ان کے بارے میں۔ تب تمہاری شروع شروع کی جان پہچان تھی ان سے۔“

”ہاں۔!“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ان دنوں تو ہواؤں میں اڑا کرتی تھی میں۔ کم عمری تھی۔ یک

وہ آج پھر میرے سامنے تھی۔ میرے گھر کے لان میں۔ ہلکی ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ اور وہ چائے کے کھونٹ بھرتی ہوئی آہستہ سے بول رہی تھی۔

”بعض اوقات ہم اتنے برے نہیں ہوتے۔ جتنا برا ہم سے ہو جاتا ہے۔“ اس کی آواز دھیمی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں تلے حلقے کتنے گہرے تھے۔ میں نے دیکھا وہ شان دار اور عالی شان ڈریسنگ کرنے والی لڑکی۔ کتنے عام سے سوٹ میں تھی۔ مجھے یاد ہے وہ اونچی پونی ہلانے ہوئے کہا کرتی تھی۔

”فیشن وہ نہیں جو چلتا ہے مارکیٹ میں۔ مریم احمد کا فیشن وہ ہے جو اس کا دل پسند کرتا ہے۔ وہ جو میں چاہوں اپنے لیے وہ نہیں جو لوگ پسند کریں۔“

اور ہم مرعوب ہوئے اسکی باتیں سنے جاتیں۔ ٹھیک ہی تو کہتی تھی لڑکیاں اسے فالو کرتی تھیں۔

وہ جو ہنسا سائل بناتی۔ ہوتے ہوتے وہی سب لڑکیوں میں ان ہو جاتا۔ اس کے کپڑے نت نئے ڈیزائن کے ہوتے تھے منفرد۔ خوب صورت۔ اس کی پسند انلا تھی۔ ڈریسنگ بھی۔ اس کے کپڑے فیشن تک محدود نہ تھے۔ جس ڈیزائن کا سوٹ چاہا۔ جیسا چاہا بنوا لیا۔

ایک بار میں اس کے ساتھ۔ اس کے گھر پر منعقد سالگرہ کی دعوت پر گئی تھی۔ تب اس کی ایک خالہ کہہ رہی تھیں۔

”ہاں! بہت ضد کر کے بنوایا ہے اس نے تو۔ کہاں۔ بس جو بھا جائے اس کے دل کو۔ جیسا سوچ لے۔ ویسا بنوانا ہوتا ہے۔ وہی پہننا ہوتا ہے۔ اتنے تو خرابے ہیں اس کے۔“ اکلوتی خالہ تھیں اور اکلوتی ہی بھانجی تھی۔

ان کے لہجے میں بھانجی کے لیے شفقت تھی۔ وہ اس کی ماں جیسی ہی تھیں۔ کیونکہ پانچ بیٹے تھے اور ایک بھی بیٹی نہیں تھی۔

طرفہ پسندیدگی تھی۔ پتا نہیں۔ شاید کوئی وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب ہم اتنے بے وقوف ہو جاتے ہیں کہ خود کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں۔

اور رفتہ رفتہ بات بڑھی ہماری دوستی بھی ڈیڈ نہیں مانتے تھے۔ جہاں زیب کا فیملی بیک گراؤ بیڈ اتنا اچھا نہیں تھا۔ مگر وہ ایک اعلا پوسٹ پر تھے۔ اچھا کماتے تھے اور میرے لیے اتنا کافی تھا کہ میں ان میں انٹرنشڈ تھی۔ میں نے بہت ضد کی۔ ماما کے آگے بھی ڈیڈ کے سامنے بھی۔ حتیٰ کہ میں نے ان کے طے کیے گئے رشتے کو خود فون کر کے انکار کر دیا تھا۔ تو پھر مجھے سزا تو ملنی تھی۔ حالانکہ آنی کی شدید خواہش تھی مجھے ہو بنانے کی۔ علی سے میری منگنی بھی کروادی بابا نے۔ ابھی تک جہاں زیب نے مجھے پروپوز نہیں کیا تھا اور جب کیا تو میں نے بخوشی ساری پیملی کی مخالفت مول لے لی۔ میں نے علی کو فون کر کے خود انکار کر دیا۔ اور دیکھو آج تک بھگت رہی ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”بس جو ہو چکا ہے مریم۔ اسے بھول جاؤ۔“
 ”بھول ہی تو جانا چاہتی ہوں۔ بھول چکی ہوں بہت کچھ۔ کتنی ہی بار جہاں زیب نے شراب میں دھت ہو کر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔ بعد میں پیر پکڑنے تک آجاتے تھے۔ میں محبت میں معاف کرتی رہی۔ وہ جانتا تھا۔ میں کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ سو۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتا تھا وہ میں نے پرانی عورتوں کو بھی برداشت کیا ہے اپنے گھر میں۔ اور وہ رات میں بھی نہیں بھول سکتی۔ جب اپنی گیارہ سالہ بیٹی کے ساتھ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“

میں بابا کے گھر بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں نے بابا کو کبھی بتایا ہی نہیں۔ کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ میں سمجھتی تھی میرے بابا ناواقف ہیں اور مجھے خوش و خرم سمجھ رہے ہیں۔ مگر میری غلط فہمی تھی۔ میرے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا میں کتنی خوش ہوں حالانکہ میں بہت کم گنی تھی شادی کے بعد میسکے۔ جہاں زیب کو

پسند نہیں تھا اور میں بابا اور سب کے سامنے بہانے گھڑ لیتی۔ اس رات مجھ میں ہمت نہ ہو سکی کہ بابا کے گھر جاؤں۔

میں تین دن اپنی آنی کے گھر رہی، پھر گھر والوں کو کچھ گڑبڑ کا پتا چلا۔ میں نے آنی کے ذریعے کرائے کے گھر کا بندوبست کیا تھا۔ بابا آئے تھے مگر میں اب کس منہ سے اس گھر جاتی۔ اور شکر ہے کہ میری شرمندگی اور ندامت دیکھ کر انہوں نے مجبور نہیں کیا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی حنا۔ جہاں زیب کے ساتھ نبھانے کی تم تو جانتی ہو۔ شکست میرے لیے کتنی تکلیف دہ ہوتی تھی۔ اور میں نے زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں کیسی کیسی کوششیں نہیں کیں۔ کامیاب ہونے کی۔ مگر بد حصلت لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ اگر کوئی فتنہ برپا کرنا چاہے تو اس کے لیے وہ کسی وجہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ کوئی وجہ نہ بھی ملے تو بھی سے فساد برپا کرنے والے کو فرق نہیں پڑتا۔ جہاں

زیب بھی۔ کم از کم کسی وجہ کا محتاج نہیں تھا۔ میں نے پوری کوشش کی حنا نبھا کرنے کی مگر۔ اس کی آواز بھیک گئی۔

”پھر بھی۔ میرے ہاتھوں میں طلاق کے کاغذ آگئے۔ اس نے ایک اور شادی رچالی۔ اور میں۔“

اب کئی سالوں سے۔ اکیلی رہ رہی ہوں۔“
 مجھے تنہائی کے ان سالوں نے اتنا نہیں بدلا حنا! بدل تو میں تب گئی تھی۔ وہ بھیا تک وقت جو میں نے جہاں زیب کے ساتھ گزارا تھا اور اس وقت کے گزر جانے کے بعد۔ بہت بعد مجھے پتا چلا میں خود کو کھو چکی ہوں۔ میں وہ موم احمد نہیں رہی جو میں تھی۔ میں خود سے پھڑک رہی۔ بہت دور جا چکی ہوں اور اس دن کتنے ہی سائے میرے اندر اتر گئے۔ جب بابیہ بولی۔

”ماما! میرا فیشن وہ ہے جو مجھے اچھا لگے۔ جو بابیہ کا دل پسند کرے۔ بابیہ کے لیے۔“ اور میری آنکھوں میں مسکراہٹ اور کمی بیک وقت آگئی تھی۔

وہ مسکرا دی اور میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔
”مجھے خوشی ہوئی مریم۔ تم اپنی زندگی میں لوٹ آئیں۔“
وہ مسکرا دی۔

”ہاں۔ میں نے ایک بھیا تک سبق سیکھا اور نہ وہ وقت جو تکلیف دہ تھا۔ میرے پیچھے بڑا روتا۔ اگر میں بھاگ کر۔ کوشش کر کے خود کو آگے نہ لے آتی۔ اگر بابیہ میری بیٹی نہ ہوتی۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ ہوا اب بھی خوش گوار تھی۔
”تم یہ کیک لوٹا گھر پہنچا ہے میں نے۔“
وہ ہنس دی۔ ”ہاں کیوں نہیں۔“
مجھے اسفند بتا رہے تھے کہ تمہاری کوکنگ بری نہیں انتہائی بری ہے۔

میں بھی ہنس دی۔ میں عادی تھی اسفند کے اپنے بارے میں ایسے ریمارکس سننے کی۔
خاموشی ایک بار پھر ہمارے درمیان چھا چکی تھی اور مریم لان میں بکھرے پتوں پہ نظر جمائے کہیں کھوئی ہوئی تھی میں بھی خاموشی سے پلیٹ میں کاٹنا چلانے لگی۔

اور وقت کے ہاتھوں مریم احمد کو سکھایا گیا سبق تحریر ہونے لگا۔
”وہ پتے جو قدر نہ کریں۔ شجر سے اپنے مضبوط تعلق کی جو وقتی ہوا کے سرور میں درخت سے اپنا سالوں کا تعلق بھلا بیٹھیں۔ ان کی منزل بے سمت ہوتی ہے اور تقدیر قابل رحم۔“
برگ۔ جو بے رحمی سے پرانے ناطے توڑ لیں۔
مگر مگر گھومنے والی ہوا کے ہر کاوے میں آگ۔ وہ بے مول ہو جاتے ہیں اور یہ نقصان کبھی نہیں بھرا جاسکتا۔



تب مجھے کوئی اور یاد آیا حنا۔ تم نہیں جان سکتیں۔ اس دن میں کتنی تکلیف میں تھی۔ میں کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ کتنے عرصے بعد کتنے منظر میری نگاہوں میں گھومتے رہے تھے۔ وہ ہنستی ہوئی مریم وہ قہقہے لگاتی دوستوں کے جھلکنے میں نمایاں رہنے والی مریم۔ وہ محفلوں میں چھا جانے والی مریم۔ اعتماد سے مسکرائی، ٹرافیاں اپنے حق کی طرح وصول کرتی مریم۔ نہ جانے کب سے وہ تھوڑی تھوڑی کر کے پھرتی رہی مجھ سے۔

میں اس رات بہت روئی تھی حنا۔ بہت روئی تھی۔ تم نہیں جان سکتیں میری تکلیف۔ میں کتنا دور جا چکی تھی زندگی سے، تمہیں اندازہ نہیں حنا۔ وہ مریم احمد۔ زندگی تو اس کے اندر گیا کرتی تھی۔ میں نے روتے ہوئے طے کیا تھا کہ نہیں مریم احمد کو یوں شکستے اور پارا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتی ہوں۔“
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”وہ مریم احمد مجھے کبھی نہیں مل سکتی۔ لیکن میں اسے اب تلاش کرتی ہوں۔“ وہ رکی۔

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہمت، حوصلہ، وہ ابھی بھی۔ آج بھی مضبوط لڑکی تھی۔

”میں اسے جتنا تلاش کر سکتی ہوں حنا۔ وہ تم نے کل دیکھا تھا۔ کل مجھے ملا تھا۔ آئیڈیل نیچر ایوارڈ۔ ایک چھوٹا سا، بہت عام سا ایوارڈ مگر وہ میرے لیے خاص تھا۔ کیونکہ وہ ہسٹ نیچر ایوارڈ نہیں تھا۔ میرے لیے وہ میری تلاش کے ناکام نہ ہونے کا عندیہ تھا۔ وہ حوصلہ تھا کہ مجھے مریم احمد کے حصے مل رہے ہیں۔ میں نے مریم احمد کا کچھ حصہ تلاش کر لیا ہے جس میں عزم، کوشش اور حوصلہ شامل تھا۔

اور بابیہ۔ میری بیٹی۔ وہ مجھے زندگی کی طرف لاتی ہے۔ میں اب جینے لگی ہوں اپنی بیٹی کے لیے۔ زندگی میں بے شک وہ رنگ وہ رعنائیاں نہیں رہیں، لیکن میں اب خوش رہتی ہوں۔ بہت آگے آچکی ہوں اس کرانسس سے۔“

پیار کا ادو کا نام

”کیا تمہیں وہ اولین گیت یاد ہیں؟“ کاٹ وار
ہوا میں سماعتوں میں چٹکھاڑیں۔

اس نے ایک جھرجھری لی چھٹی حس کہہ رہی
تھی کہ وہ دور نہیں۔

”یہیں کھڑی رہو گی تو تمہاری قلفی جم جائے گی۔
اندر آ جاؤ مینو!“

اس کے قریب سے گزرتی کاشیہ نے کپکپاتی آواز
میں کہا تو اس کے منجمد وجود نے حرکت کی۔ انیسویں کے
اندر آتے ہی ان سب کی پہلی ترجیح آتش دان میں
جلتی سرخ نارنجی ”آگ“ تھی۔

اس واوی میں قدم رکھنے تک وہ حیرت کے تمام
جہانوں میں سفر کر چکی تھی۔ اس برف پوش سفید پناہ
گاہ کے سامنے ٹھہر کر اسے دیکھ کر اس کا اندھا حال جسم
ٹھنڈے کپکپا اٹھا۔ وہ سفید قیام گاہ اس کے اندر کیوں
دھڑکنے لگی تھی۔

اس کی سوچ تک کسی اور کی رسائی کیسے ممکن
تھی۔ وہ صرف اس کا خواب تھا پھر کسی اور کی آنکھوں
میں کیونکر اتر پایا۔ اگر یہ عمارت اسی خواب کی تعبیر
تھی تو اتنی کامل تعبیر کس کے شدت عشق نے مجسم
حقیقت میں ڈھالی تھی۔

مُکھِلِ تَاوِلِ

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



میں ان دونوں کے پاس آگئی۔
 ”اب دونوں خواتین کا کیا پروگرام ہے؟ کرنل مبین
 کی آواز میں بشارت نمایاں تھی۔
 ”مبین بھائی یہ رہائش گاہ کس کی ہے؟“ جواب
 کے بجائے اس نے الٹا سوال داغ کر انہیں بری طرح
 چونکایا۔ دونوں میاں بیوی نے عائب وماغی سے پہلے
 اسے پھر ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھا۔
 ”دوست کی ہو یاد دشمن کی ہمیں تو یہاں قیام کرنے
 سے عرض ہے۔“ وہ خود کو سنبھال کر بولے۔
 ”افوہ! اونچ گئے یہاں تو دوپہر کو ہی شام کا گماں ہوتا
 ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پھر یاہر چلتے ہیں۔“ وہ اٹھتے
 ہوئے بولے۔ اس ذرا سی لڑکی کے اندازے اور انداز
 انہیں سٹپٹا گئے تھے سو انہوں نے مزید سوالوں سے
 بچنے کے لیے وہاں سے کھسکنے میں عافیت جانی۔
 ”میں ابھی آتی ہوں۔“ کاشیہ ہلکا سا مسکرا کے شوہر
 کے پیچھے لپکی۔

کچھ تھا۔ کچھ تھا کہ وہ اپنے احساسات کے بدلتے
 رنگ ڈھنگ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ان کے پیچھے
 ہی اٹھی۔ تیار بھی ہوئی مگر کہیں بھی ان کے ساتھ
 جانے میں اس کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔



دوپہر نے شام کی طرف سرکنا شروع کیا۔ وہ ذرا ہی
 دور آئی تھی کہ ایک خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا
 وہ وہم نہیں تھا اس کے پاؤں کے نیچے برف دینے کی
 کراچی مدھم ہوئی پھر معدوم ہوئی۔ وہ ساکت تھی
 بھاری قدم اس کے قریب رکے تھے۔ کبھی اس خوشبو
 کی تلاش نے بڑے سے بڑے شاپنگ مالز کی بڑی بڑی
 برانڈڈ دکانوں پہ اسے بھٹکایا تھا، کتنے ہی مہنگے ترن
 پر فومز اس نے خریدے، کچھ پھینک دیے، کچھ کسی کو
 دے دیے مگر وہ کبھی اس خوشبو کا پتہ نہ پاسکی، یہاں اتنی
 دور اس برقی وادی میں تنہا بستے ہواؤں میں وہی خوشبو
 اس کے ارد گرد تھی۔ اس کے قریب تھی۔ یہ الوژن
 نہیں تھا۔ خواب بھی نہیں تھا۔ دل۔ دھڑکا۔

”ف کیا کڑا کے کی سردی ہے۔“ کاشیہ نے
 دستا نے اتار کر ہاتھ آپس میں مسلے اس کا شوہر کھل کر
 مسکرایا۔

”میں نے اچھا کیا ناں۔۔۔ شدرہ کو اس کی دادی کے
 پاس چھوڑ آئی۔“

”آپ برا کب کرتی ہیں۔“ کرنل مبین
 مسکرائے۔ ”آپ کی طوفان نمائی میری بوڑھی ماں کا
 تو حشر کر دے گی۔“

”لو جی۔۔۔ بچی کونہ بھیجوں تو وادی ناراض۔۔۔ بھیج
 دوں تو بیٹے کو سو ظالم لگنے لگتی ہے۔“ وہ پیچھے کھسک کر
 منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ وہ ان دونوں میاں بیوی کی نوک
 جھونک سے محفوظ ہوتی ان کے پاس چلی آئی۔
 وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی زندگی یہ پڑے کئی گرد
 آلود پر دے اس وادی کی ہوا اکھاڑ پھینکے گی۔



وہ تینوں اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ دوسرے دن
 کہیں دوپہر کو بیدار ہوئے۔ وہ باہر آئی تو دونوں میاں
 بیوی کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
 ”تمہارا ناشتہ ٹیبل پہ موجود ہے۔ ہم نے تمہارا
 انتظار کیے بغیر کر لیا۔ سوری۔“

کاشیہ کی سوری پہ اس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ
 ہنس دی۔

”ناشتہ آپ نے بنایا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”کرنل صاحب کے دوست نے بھجو لیا ہے۔“
 ”ہنہ گٹ۔۔۔! مگر ٹیبل پہ دھرا ناشتہ دیکھ کر اسے
 حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ ناشتے کے تمام لوازمات اس
 کے پسندیدہ تھے۔ میدے کا پراٹھا، ہری مرچوں سے
 بھرا آملیٹ اور سفید جمازی ملک میں ڈارک براؤن
 چائے اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔

”اوون میں چائے گرم کر لینا۔“ کاشیہ کی ہدایت
 اس نے عائب وماغی سے سنی۔ اس کی بھوک نے
 چمک کھودی تھی اس نے چائے گرم کی اور سٹنگ روم

تم کہو، تمہیں یہ حادثہ کیسا لگا
 ہمیں تو بسنے سے اجڑنا اچھا لگا
 اس کے کان کے قریب آواز ابھری تھی دھیمی سی
 جلتی بجھتی سی آنچ دیتی ہو انکو آگ لگائی۔ یہ آواز بلاشبہ
 وہی تھی۔ وہ کسی خود رو پودے کی طرح اچانک اس کے
 سامنے اگا تھا پھر اس کے مقابل یوں جم کر کھڑا ہوا کہ وہ
 ایک قدم بھی آگے بڑھاتی تو اس چٹان جیسے شخص سے
 نگرہ کے رہ جاتی۔ پورے بارہ سال اس نے رب عظیم
 سے گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں کہ قبروں سے دوبارہ
 اٹھانے جانے کے دن بھی ہم دونوں کا سامنا نہ کرانا۔
 دعائیں رائیگاں گئیں۔ تب ہی تو وہ لمحہ موجود میں
 تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ہر شے نے سفید رنگت
 اوڑھ لی تھی۔ وہ اس کی پوری کھلی متوحش آنکھوں
 میں دیکھتا رہا۔

”یا خدا۔۔۔ یا خدا۔۔۔“ نمکین پانی اس کی آنکھوں میں
 جمع ہونے لگا۔ سامنے کھڑے شخص کی نگاہوں کا ارتکاز
 نہیں ٹوٹا تھا۔ منجمد پلکیں ذرا سا اٹھیں اور خود رگڑی
 نگاہوں میں الجھ کر رہ گئیں نظروں کے تصادم نے اسے
 پھٹانا نہ کر دیا۔

”اب نظروں جھکا کر دیکھو جھکا سکتی ہو۔۔۔ جھکا پاؤ
 گی۔“ ایک دو کتنے ہی لمحے سرکنے لگے۔ گھر گھر
 کی آواز سماعتوں سے دور ہوئی۔

”بارہ سال اپنے رب کریم سے ایک ہی دعا مانگتا رہا
 ہوں کہ زندگی میں بس ایک بار ہی اسے میرے مقابل
 لے آتا۔ میرے روبرو کرنا۔“ بخ ہواؤں سے بے نیاز
 حرارت نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اس نے سرگوشی
 کی۔

”میں پکھل جاؤں گی پانی بن کر کسی پوشیدہ رستے کو
 جاتی ندی کا حصہ بن جاؤں گی۔ مجھ پر سے اپنی
 حرارت آمیز نگاہیں ہٹالو۔ پلیز۔“ اس نے اپنی آنکھیں
 زور سے میچیں۔ سو آنسو رخساروں پہ آکے جم گئے۔
 ”میری وحشتوں کا مداوا۔ بس یہ دو آنسو۔“ وہ
 عجیب سے ضدی لہجے میں بولا۔

وہ گھر سے اتنا دور نہیں تھی مگر وہ اپنے قدم پیچھے
 کیسے ہٹائے کیا وہ اٹنے قدموں بھاگنا شروع کر دے۔
 اس نے کوشش کی۔ مگر ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ سکی۔
 شام کے دھند لکوں میں اس کی بن خستہ سماعتوں میں
 ایک سرگوشی ٹوٹے ستارے کی طرح چمکی۔
 ”میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“

چار سو گھپ اندھیرا تھا۔ اس کا دل یک بارگی
 اٹھا گھرا یوں میں اتر۔

وہ برفانی نیند میں اترنے لگی اس نے لب کھولنے
 چاہے۔

تیرا پیار کمرے کی بوند تھا۔ دل مضطرب پہ جو جم گئی

تیری یاد جاڑے کی شام تھی سو ٹھنڈی اور ڈھل گئی

یہ آخری الفاظ تھے جو اس کے سن ہوتے ذہن میں
 لہرائے تھے ابھرے تھے اس کے ہاتھوں نے ایک وائر
 پروف جیکٹ کو پکڑنے کی کوشش کی اس کے بعد اس
 کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



اسے وہ آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔
 کوئی بے قراری سے اسے پکار رہا تھا۔ اس نے
 آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس کا رخسار ایک
 بھاری ہاتھ نے تھپتھپایا۔

”آنکھیں کھولو پلیز۔“ اس کی سوئی حسین بیدار
 ہونے لگیں۔ اسے یاد آنے لگا۔ وہ اپنے حواس کن
 حالات میں اور کیونکر کھو بیٹھی تھی۔ اسے اور بھی
 بہت کچھ یاد آنے لگا۔

”میں تو! آنکھیں کھول دو پلیز۔“ غصہ تفکر
 نرمی۔ یا محبت۔ اس کی آواز ان احساسات سے عاری
 تھی یا نہیں۔ مگر وہ آواز جان لینے اور جان نثار کرنے
 جیسی تھی حیرت انگیز طور پر دوسرے ہی لمحے اس نے
 آنکھیں کھول دیں۔ اسے ہوش میں۔ آنا دیکھ کر
 وہ ایک دم سیدھا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے

مگر آج کچھ حد سے سواتھا۔

صرف ایک بار میرا سامنا ہونے پر تمہاری مضبوطی کی اوقات مجھ پہ کھل گئی۔ اس نے بے چین سانس بھر کے پورا سگریٹ مسل دیا۔

”کیا اللہ صرف تمہارا تھا؟“ ایک تلخ سی بے رنگ سی مسکراہٹ نے اس کے بے رنگ ہونٹوں کو چھوا
”اللہ صرف تمہارا نہیں تھا مینو۔!“ اس نے
دائیں بائیں سر جھٹکا، پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر
خود گلای کی۔

”مگر ہر بار سامنا ہونے پر ہوش و حواس کھودو گی تو
میری اجازت زندگی کا حساب کیسے دے سکو گی۔ میری
زندگی سے نکل جانا تمہارے لیے کس قدر آسان
تھا۔“

اس کی دھڑکنوں تک میں کانٹے چھبے۔ آج محبت
نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے تسلی دینا چاہی
تھی، آج محبت کا رنگ بدلا ہوا تھا۔



تمام رات وہ سوتی جاگتی رہی اسے محسوس ہوتا تھا
کہ ایک ہجوم اس کے کمرے میں آئے۔ جا۔ رہا تھا۔
خواب میں اس نے اپنا بچپن بھی دیکھا۔ نازنین نے
اس سے گڑیا چھینی تھی اور تیسری منزل سے نیچے
پھینک دی۔ وہ روئی رہی۔ چلائی رہی، نہ کسی نے
اسے چپ کروایا نہ کوئی اس کی ٹوٹی پھوٹی گڑیا واپس
لے آیا۔ وقت گزر گیا۔ گڑیا کی چوٹی میں اب ٹھیک نہیں
ہو سکتی تھیں۔

اس نے ایک اور خواب دیکھا، کاشیہ کے گھر میں
بیل۔ صرف سفید پھول آتے تھے اس بیل پہ ایک
سرخ گلاب بھی کھلا ہوا تھا پھر اس کی پتیاں مرجھانے
لگیں۔ وہ بکھر گیا، زمین پہ گری خشک پتیاں بوانے
سمیٹ کر انہیں کئی محرابوں پہ لپیٹ دیا ان
پتوں سے لوبان کی خوشبو آنے لگی۔ گلاب لوبان کی
خوشبو دینے لگا ایسی خوشبو بھی آنے لگی جو دور گاہوں پہ
دبے کی جلتی لو سے آتی ہے۔

اس قدر سناٹا اور خاموشی تھی کہ وہ قیامت تک اب
کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

پھر وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ کمرے سے جاتے
ہوئے دروازہ دھڑام سے بند ہوا تھا۔ کمرے میں نظر
دوڑائی تو وہ انیسکی کا ہی بیڈروم تھا۔

وہ تو بے سمت اور ہجرت زدہ برندوں تک کو دیکھنا
چھوڑ چکی تھی کہ کیا خبر کوئی اس دشمن جاں کا پیغام بر نہ
ہو۔ پھر وہ خود کیسے؟ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔
وہ عالم بے ہوشی میں یہاں تک کیسے پہنچی۔ تو کیا وہ
اسے اٹھا کر۔ اس کا پورا وجود کانپا۔ اس کی گردن
سے لپٹی شال سے وہی خوشبو پھوٹی۔ حشر پاپا ہوا۔

تیری آس ایسا جہان تھی۔
کبھی چل پڑی کبھی ٹھم گئی۔

کیوں، کیوں؟ اب کیوں؟ اس کے اپنے ہی سوال
اس میں ہی ابھرتے اور مٹتے رہے۔
بیڈ سائینڈ ٹیبل پہ گرم پانی کا فلاسک بھی موجود تھا

اس نے بیگ سے نیند کی گولیاں نکالیں جنہیں وہ ہمیشہ
اپنے بیگ میں رکھتی تھی۔ دو گولیاں ہتھیلی پہ رکھیں
پھر گلاس میں پانی انڈیلا اور اپنے ماؤف ہونے حواس
کے ساتھ دونوں نکل لیں۔ اس کے حلق میں آنسوؤں
کا پھند اڑا۔ وہ محبت نہیں بس چاہت تھی۔ وہ چاہت
بھی نہیں بس خواہش تھی۔ ایک جذبہ تھا یا پھر
خواب۔ ان ہی الفاظ کو دہراتے دہراتے اس پہ غنودگی
غالب آنے لگی۔



واوی فلتور راتر نے والی آج کی رات اس کی گزشتہ
بارہ سالہ زندگی کی تمام بو جھل بھاری اور طویل راتوں
سے ہٹ کر تھی۔ اس نے سرخ جلتی بکھرتی سلکتی راکھ
کو الیش ٹرے میں جھٹکا۔ موسم کی شدت سے بے نیاز
پچھلے کئی گھنٹوں سے راکنگ چیئر سنبھالے وہ بے تحاشا
سگریٹ پھونک چکا تھا۔ کمرے میں ملجی روشنی اس کی
اس بے قراری اور اضطرابی کیفیتوں سے واقف تھی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبداللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

واضح تھی وہ دونوں اس کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔
 ”ہاں بھئی، کیا حال ہیں گڑیا؟“ کرمل مبین کے کھنکھتے لہجے سے شدید ٹکا۔ ساتھ ہی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پہ طمانیت کے رنگ مفقود تھے ”ہم واپس آئے تو آپ وادی فلتو کے تمام جانور بیچ کے سو رہی تھیں۔“
 جبکہ کاشیہ نے پوری توجہ ناشتے پر مبذول کر رکھی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”میں تو! ناشتا کرو۔“ اسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرا دیکھ کر کاشیہ کو بولنا پڑا۔

”نہیں بس چائے لوں گی۔“ وہ کسل مندی سے بولی۔

”کیوں۔؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ فکر مندی سے ہوئی۔

کپ میں چائے ڈالتی راین نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ شکوے، صدمے اور شدید اذیت کے معنی کاشیہ کی حیران آنکھوں کے آگے ناچنے لگے، وہ

اس نے وہ دن بھی دیکھا جب نازمین نے اسے آسمان سے نیچے پٹخا تھا۔ وہ روئی کیوں نہیں تھی، کیا اسے تکلیف ہوئی تھی؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ہتھیالیوں پہ لوبان کی اور جلی ہوئے تیل کی خوشبو پھوٹی پھر کسی لباس سے اٹھنے والی خوشبو اس کے رخساروں پہ رہنچی۔ پندرہ، اکیس، پینتیس۔
 پچپن۔ ہاں اس نے اتنے ہی پرفیوم توڑے ہوں گے۔ پھر یہ خوشبو۔ ایک ہجوم پھر سے اس کے کمرے میں آنے جانے لگا۔

اگلے دن وہ بیدار ہوئی تو نہ صرف اس کا سر بھاری تھا بلکہ پورے وجود پہ ایک نامعلوم سی ٹھکن غالب تھی۔ اس نے غٹا غٹ پانی کا گلاس حلق میں اندھا پھر بھی اسے خشک ہی محسوس ہوا، کیا یہ دونوں میاں بیوی باخبر ہیں کہ وہ اسی وادی میں موجود ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میرے ساتھ اس سے بڑھ کر وہ اور کیا ظلم کر سکتے ہیں۔ اس کا ذہن تیزی سے سوال و جواب کے تانے جانے بننے لگا۔ وہ بستر چھوڑ کر اضطراری کیفیت میں کمرے کے چکر کاٹنے لگی۔

”اوہ تم جاگ گئیں۔“ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا، ادھ کھلے دروازے سے کاشیہ کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے شکوہ آمیز غصیلی نگاہوں سے اسے گھورا۔

”باہر آ جاؤ ہمیں نے ناشتا پلس دوپہر کا کھانا لگا دیا ہے۔“ وہ گردن سمیت غائب ہوئی۔ اس نے گہری طویل سانس بھری۔

”مجھے جلد از جلد یہاں سے جانا ہوگا۔“ اس کا فیصلہ سن کر دل سکڑ کر۔ رک کر دوبارہ دھڑکا تھا۔



”آج کیا پروگرام ہے؟“ مبین نے حلیم کا ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔

”راین مجھے زندہ چھوڑے گی تو ہی پروگرام سیٹ کروں گی۔“ اس نے کہہ کر محتاط نظروں سے بیڈ روم ایریا کی طرف دیکھا۔ جہاں اب دروازہ کھلنے کی آواز

خواتین ڈائجسٹ
 کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



دیکھ زہ محنت

قیمت -/300 روپے

صائب اکبر چنگیزی

مکانات کا پتہ:

کتبہ مران ڈائجسٹ: 37 - 100 بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

موتا" بھی مسکراتی رہی، روئے یا جانے کی وجہ سے
 رامین کی آنکھیں بے تحاشا سوجی ہوئی تھیں، ان
 تینوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔

"بھائی! آپ میری واپسی کا بندوبست کر سکتے
 ہیں؟" لہجائی سکوت نے انہیں اپنی جگہ سُن سا کر دیا۔
 کاشیہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شوہر کا اشارہ پا کر خاموش
 رہی۔

"میں کوشش کروں گا۔ مگر۔ ایک دم اس فیصلے
 کی وجہ جان سکتا ہوں۔ آپ تو یہ بریلی وادی دیکھنے کے
 لیے کب سے اصرار کر رہی تھیں اب ایسا کیا ہو گیا۔"
 ان کی سوالیہ نگاہوں کو رامین نے کرنٹ کھا کر دیکھا،
 پھر اس نے اسی کیفیت میں گردن موڑ کر کاشیہ کا سپاٹ
 چہرہ دیکھا۔

"اب یہ ہو گیا ہے مبین بھائی کہ آپ اپنی بیوی
 سے اچھی خاصی ایکٹنگ سیکھ گئے ہیں۔"
 پانی پیتے ہوئے انہیں اچھو لگا۔ کاشیہ نے ٹھوڑی
 سینے تک لے جا کر مسکراہٹ ضبط کی۔

"میرے جانے کی وجہ آپ دونوں کی سمجھ میں
 نہیں آ رہی۔ مگر آپ دونوں کے یہاں آنے کی وجہ
 میں نہ صرف جان چکی ہوں۔" وہ رکی پھر بولی۔ بلکہ
 دیکھ بھی چکی ہوں۔" ان دونوں کے تھے ہوئے نقوش
 کچھ ڈھیلے ہوئے۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر
 کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑی ہوئی۔

"سوری۔ آج آپ دونوں کو پھر میرے بغیر گھومنا
 پڑے گا۔" اب اس کا رخ اپنے چند روزہ بیڈ روم کی
 طرف تھا۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر تک منہ سر پٹیٹ کر پڑی رہی۔
 نزر ہوا وقت، پرانی یادیں اس پرانے سامان کی مانند
 کیوں نہیں ہوتیں جو کسی بھی غریب کو دان کر دیں یا
 کسی روٹی خریدنے والے کو اونے پونے بیچ دیں، اس
 نے بے چین ہو کر کروش بدلی۔

"تو کیا وہ یادیں اب کاٹھ کباڑ میں پڑا سامان

ٹھہریں؟" دل نے بے یقین سرگوشی کی۔

اس کی بھوک کل شام سے اڑ چکی تھی صرف
 بھوک ہی کیا اس کا صبر و تحمل، اپنا خود پہ اعتبار، سب
 رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے کا جواز
 سا ترمگ بنایا اور سیدھا سٹنگ روم میں آئی۔ آتش
 دان کے سامنے بڑی نازک سی کرسٹل کی تپائی پہ مگ
 رکھا، پھر دو بے پاؤں کھڑکی تک آئی۔ ذرا سا پرہ سر کا کر
 یاہر جھانکا۔ برف باری کے مزاج میں تیزی نہیں
 تھی، سبک روی سے ہوئی برف باری دیکھنا کبھی اس کی
 اولین خواہشوں میں تھا۔

"کبھی اسے دیکھنا بھی تمہاری اولین خواہشوں میں تھا
 جس کی وجہ سے آج تم یہاں سے بھاگنا چاہتی ہو۔"
 دل نے وہابی دی تو بے اختیار آہ نکلی۔

وہ شخص عجیب تھا جس سے وہ کبھی کھل کر نہ محبت
 کر سکی نہ ہی نفرت۔ وہ پرہ برابر کرنی آتش دان کے
 قریب فلور کشن پہ بیٹھی چائے گھونٹ، گھونٹ پینے
 لگی۔ شال کندھوں کے گرد لپیٹی، کیلے ریشمی بالوں کی
 کچھ لمبی لٹیں بل کھا کے آگے آئیں۔ "دلتنا" عقب
 میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کلون کی بے قرار
 خوشبو رگ جاں میں اترنے لگی۔

"سنو رامین!" وہ آتش دان کے سامنے بڑی واحد
 کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ کانپا۔
 آنے والے نے ان دونوں کے درمیان حائل مٹی
 سی تپائی کو اپنے مضبوط ہاتھ سے اٹھا کر سائیڈ پہ رکھا، پھر
 اس کے ہاتھ میں لرزتا مگ پکڑ کر اس تپائی پر رکھا۔ وہ
 شاکڈرہ گئی۔ اس کے ننگے پاؤں مردانہ جوتوں سے مس
 ہوئے۔ اس کی گیلی لائبرٹیوں نے ان جوتوں کو چھوا، وہ
 ساکت پلکوں کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔ اس شخص
 نے حالت رشک میں زمین کو چھوئی بالوں کی نم نوکیں
 دیکھیں، پھر اس کی گہری۔ سرخ۔ بو جھل۔ چین
 قرار لوٹی۔ حواس چھینتی آنکھیں اس کے دھڑکتے
 وجود پہ نکلیں۔ اسے سانس لینا یاد نہیں رہا، کسیری

رنگ اوڑھے جوگیوں کے ہاتھوں میں زمانہ قدیم کے
ساز تھے وہ پتا نہیں کس زبان میں گیت گارے تھے کہ
ہر بول کے ساتھ دیوار کا قد اونچا ہو جاتا۔ نہیں وہ
نوجے پڑھ رہے تھے۔

”ارے کوئی حیلہ وسیلہ نکالو۔ دلہن کیا سوچے گی
اس پہ کیا بیٹے گی۔“ عورتیں کُرا لیں۔ اب سمجھ میں
آنے لگا کہ وہ جوگی گیتوں کو نوحوں کے ساتھ ملا کر
گارے تھے۔

آنے والا بے نور ہی لوٹ گیا۔ دیواروں کا غور
بڑھتے قد کے ساتھ تناور ہوا، گیتوں کے بول نوحے کھا
گئے۔ برباد حال شہر جوگیوں کی اس ادا پہ غصے سے باگل
ہوا۔ وہ جھم جھم لے کر ماضی کے حصار سے نکلی،
وقت رواں کے ہاتھ بھی کھر درے اور بدرنگ تھے سو
اس نے پوری قوت سے جھٹکے اور کسی خوش رنگ
وقت کا سنہرا اور بچہ وا کیا۔

ساتھا کہ وہ آئیں گے انجمن میں۔

ساتھا کہ ان سے ملاقات ہوگی۔

حال کے لمبے ہاتھوں نے وہ در بچہ کھٹاک سے بند
کیا، انجمن میں جلتی شمعوں کو جھٹکی ہوانے چھولیا
تھا۔ سو وہ آداب ملاقات بھلا بیٹھیں۔ ماضی پہ پڑے
زر دروں کو نگلاب اور صندل گھلی ہوانے اٹھا دیا ہوا
کے ہاتھوں پہ لکھے وہ حروف شہر محبوب کے راستوں پہ
کیسے نثار ہوتے تھے، ہوا کی ہتھیلیوں پہ لفظ محبت لکھ
کر، انہیں مٹھیاں بند رکھنے کی تاکیدیں کرنا، در محبوب
پہ اس لفظ کو کندہ کرنے کی تاکیدیں کرنا، تو پھر کیا ہوا تھا؟
ہوا کی مٹھیاں راستوں میں ہی کھل گئیں، سب
خواہشیں ہوا برد ہو گئیں کیا۔

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ میں
انہیں راستوں میں بیٹھیں کہیں کسی کنج گل میں اتار دو
ایبٹ آباد کی سڑکوں پہ محو سفر ہونے کے باوجود۔
وہیں کہیں قیام کی طلب، چاند سے روبرو ہونے کی
آرزو۔ تو کیا کوئی دشمن ہوا کارا زدار تھا۔ محبت کو پناہ
دینے سے اس کا وجود کیوں انکاری ہوا۔

شہر مخالف کی تند ہوا میں وہ نامے اڑالے گئیں، کنج

گل برباد ہو گئے وہ چاند کچھ بولوں مقابل تھا کہ سانسیں
گنی جاسکتی تھیں۔ شاخسار کی اوٹ بھی نہیں تھی مگر
آج بھی رامین کے پاس اس شخص سے بات کرنے
کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ الفاظ کم ہو چکے تھے۔
کوئی ایک جملہ بھی کیونکر بن پاتا۔ ماضی کے پاؤں میں
چھٹکتی سنہری پائلیں یک لخت ساکن ہوئیں۔ مقابل
کی آنکھوں نے ایک نا دیدہ اور بوسیدہ ڈائری اس کے
سامنے پھینکی۔ ان ہی آنکھوں نے اور اراق کھولے۔

”اسے پڑھو رامین!“ اصرار کرتی آواز نے صفحات
بدلے۔ فلاں دن، فلاں دن، پھر وہ سنہرا، قرمزی، اودا اور
آخر کار سیاہ پڑا وہ دن نکالو۔ اور اس گرہن زدہ دن سے
ایک دن، دو دن، آٹھ۔ بیس دن تم کہاں تھیں؟ اگر
جاگ رہی تھیں تو ہوش و حواس کیوں سلا دیے۔ اگر
سو گئی تھیں تو پھر قیامت سے پہلے تمہیں اٹھنے کا کوئی
حق نہیں تھا۔ تمہیں میرے لیے اپنی بینائی اور
سماعت کو واپس بلانا تھا۔ اپنے ہی گھر میں تم کیسے گم
ہو سکتی تھیں۔ ان بیس دنوں میں وہاں جو کچھ بھی ہوا،
مجھ سے سب کچھ تم نے کیوں نہیں بتایا۔ کیوں؟“

اس کی پست آواز زیر سوال کپکپائی۔

”عورت کسی بھی محبت سے پہلے اپنے آنگن کی
دیواروں سے محبت کرتی ہے، وہ پُر غرور محبت ہوتی ہے
ان دیواروں میں صرف اینٹ اور سیمنٹ، بھری نہیں
ہوتی۔ پرت در پرت تمام رشتے انہیں اونچائی تک لے
جاتے ہیں۔ کوئی ایک رشتہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے تو
محبت پُر غرور نہیں رہتی۔ اونچائی کا غرور ٹوٹ جاتا
ہے۔“

”پھر بھی بیس دنوں میں ایک ہی بار مجھ سے رابطہ کیا
ہوتا۔ تو میں نہ آسمانوں سے گرنا نہ زمینوں کی پائال
میں اترتا۔“

”کچھ کمو رامین۔ کچھ تو کہو۔“ اس نے جھٹکے سے
ہاتھ مار کر چائے کا کپ زمین بوس کیا۔ رامین کا سفید
بڑا چہرہ اس کی اشتعال انگیز حرکت پر زرد ہوا۔ ضبط
کے باوجود آنسو رخساروں تک ڈھلک آئے۔

”میری بربادی میں سوائے تمہارے پورا عالم

”وہ ایک سازش تھی۔ وہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس لیے تو دو خاندان ذات و رسوائی کے گڑھے میں اوندھے منہ گرے، آپ کو اس دن اپنے بابا کا حکم مان لینا چاہیے تھا۔“

شہرام کی رنگت متغیر ہوئی، ہتھیلی میں چھبنے والے کاٹیج کی نوک دل کے اس حصے میں چھبی جہاں محبت تھی۔ مان۔ تھا۔

”میرے نام کا تماشا دو خاندانوں کے سامنے لگا کر بھی آپ کے حصے میں کامیابی نہیں آئی تھی۔ بولنے والی کی آواز دکھ سے اور سننے والے کا دل ان الفاظ سے ادھر تا چلا گیا۔

”محبت خاندانوں کی عزت سے بالاتر نہیں ہوتی۔“

”خاندان۔ عزت۔ سازش۔ سب چھوڑ۔

تم صرف اپنی بات کرو۔“ وہ مشتعل ہوا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ہل بھی نہیں سکی۔ میں وہاں صرف تمہیں اپنانے گیا تھا۔ میں تمہیں چاہتا تھا۔ تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں ہی دیکھ کر جینا چاہتا تھا۔ پھر کیسے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا میں کیسے تمہارا نام نہ لیتا اور کیوں نہ لیتا۔“

وہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اسے ٹمکنی باندھ کے دیکھتی رہی۔

”جب تم نے میرا نام لیا تب میں دنیا کے آخری

کنارے پر کھڑی تھی اس سے آگے کچھ بھی نہیں تھا نہ زندگی نہ میں نہ تم۔ میرے لیے پیچھے ہٹنا بہتر تھا۔“

اس کی آواز میں کاٹیج سا ٹوٹا تھا۔ شور سا برپا ہوا۔ یہ پہلی بات تھی جو رامین نے پہلی بار اس سے اپنی ذات سے متعلق کی تھی۔

”جو تمہارے لیے آخری کنارہ تھا وہاں سے میری

دنیا شروع ہو رہی تھی جس میں میں بھی تھا، میری

محبت بھی تھی۔ مجھ پہ بھروسہ تو کرتیں۔ کچھ دیر

ٹھہرتیں، کچھ دیر سوچتیں، تم اس قدر دیوانہ وار کیوں

بھاگی تھیں کہ خود کو دنیا کے آخری سرے پر کھڑا

کر لیا۔“

وہی ضدی لہجہ۔ وہ بے بسی کی کون سی انتہا تھی جو

ہوتا۔ تو مجھے بھی چار آنسو بہا کر صبر آجاتا۔ مگر تمہاری بے وفائی نے مجھے کبھی شاد رہنے دیا نہ آیا۔“ لہجہ زخم خورہ تھا۔

”بے وفائی لازم تھی شہرام! کسی نہ کسی سے تو منہ

موڑنا تھا وہ بھی عمر بھر کے لیے۔ سو میں نے تمہارا

انتخاب کیا۔ رشتوں اور محبت میں ٹھن جائے۔ وہ

بالمقابل ہوں تو ایک بیٹی کو رشتوں کا انتخاب کرنا پڑتا

ہے۔ کرنا چاہیے۔“

وہ اس خاموشی سے کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا جو

یوں بے حس و حرکت بیٹھی تھی کہ جیسے نبض برائے

نام رہ گئی ہو۔ روز حشر لگ گیا تھا، حساب کتاب کا

مرحلہ سر پہ آن پہنچا اب قوت گویائی کو پکارنا لازم تھا۔

وہ بھی گہری گہری سانسیں لے کر بکھری تو اتنی سلیمتے

لگی۔

”میں نے سنا تھا کہ وہ فیصلہ آپ کی مرضی سے کیا گیا

تھا۔ وہ اٹکتے ہوئے نم آلودی ہو کر بولی۔

”ویاٹ؟“ وہ پھٹی۔ پھٹی بے یقین نگاہوں سے

اسے تکتا رہ گیا۔ پارہ سال بعد اس بے مہر کے لبوں

سے ادا ہونے والا وہ فقرہ زہر کا پالہ تھا شہرام کے لیے

”بس۔ تم مجھے اتنا ہی جانتی تھیں کہ کسی نے کہا اور

تم نے یقین کر لیا۔“ اس کے متحیر لہجے میں بے یقینی

تھی۔

”مجھ پہ اتنا ہی اعتبار تھا مینو۔!“ اس نے کرسٹل کی

تپائی پہ زور دار ہاتھ مارا۔ وہ پوری جان سے کانپی۔

رامین نے کئی گنا زیادہ چھٹا کا اس کی آواز میں سنا نہ

کبھی وہ یوں رو برو بیٹھے نہ کبھی ایک آدھ جملے سے بڑھ

کر گفتگو کی۔ اور آج وقت نے انہیں مقابل کیا بھی تو

کس قدر بد صورت حالات میں وہ واقف تھی کہ وہ

اس دل میں دھڑکنوں کی صورت ہے۔ وہ دلکش

آنکھیں اسے دل کی کہانیاں زیر زیر پیش کے ساتھ

سناتی تھیں۔ مگر وہ خود کو ان رشتوں سے کیسے جدا

کرتی جن کے وجود میں بچن کے خون سے اس نے

نمو پائی تھی، زندگی پائی تھی۔ وہ موت تک ان کی جھکی

ہوتی گردنوں کی وجہ خود نہیں ہو سکتی تھی۔

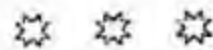
اس چہرے پر رقم تھی۔ یہ محبت کی کیسی داستان تھی جو آخری صفحے کے بعد پھر سے شروع ہونے لگی تھی۔
اب اس شخص کے لہجے کی شائستگی قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔ اس نے کن انھیوں سے اسے دیکھا۔
کبھی یہ آنکھیں بولتی تھیں بہت سی تھیں جو اب کثرت سگریٹ نوشی سے ”مضمحل“ بھاری اور بوجھل تھیں۔ سامنے بیٹھا یہ بروقار سا بندہ کبھی اس کا تھا، کبھی اس کا ہوتے ہوتے اب کسی کا بھی نہیں تھا۔

آتش دان میں لکڑی زور سے جتنے سے وہ اپنے احساس سے چونکی۔ اس کی خون آلود مٹھی سے قطرے ٹپک کر اس کی اپنی چادر میں جذب ہونے لگے۔
”کک۔ کک۔ کک۔“ ہیلی میں اتر گیا ہے۔“ وہ ہکلائی اور ہچکچا کے اسے دیکھا۔

”میرے اندر سے وہ سفاک دن نکالو وہ تکلیف دہ بارہ سال نکالو مینو۔ جو کئی برسوں سے چھ رہے ہیں۔“
اس کی شکوہ بھری آواز دل بند کرنے لگی۔ وہ بھیگی آنکھوں اور سرخ ناک کے ساتھ اس کا پتھر ملا چہرہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ قطرے جذب کرتی چادر جیسے راین کا دل بن چکی تھی۔

ان خفا آنکھوں کی سرخی دھیرے دھیرے مدہم پڑنے لگی شاید وہ اس کے جتنا بے رحم نہیں تھا۔
”یہ لمحے میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں، مگر یہ وقت میری زندگی کے بے حد پریشان کن احساسات سے دوچار ہے۔ میرے لیے یہ آنسو تمہاری بے وفائی اور جدائی سے بھی زیادہ اذیت کا باعث ہیں۔“

وہ اس کے سامنے سے باوقار انداز میں اٹھا۔ کالج چہ چلتا اسے روندتا گلے چند لمحوں میں وہ نگاہوں سے او جھل ہوا۔ ایک جانب آتش دان دہک رہا تھا۔ دوسری طرف کرسیاں تھیں۔ اس کے آنسو اور برف باری سب کچھ آپس میں گٹھڑ ہونے لگا۔



دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے کبل سر تک کھینچ لیا۔ وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس نے

خود کو سوتا ظاہر کیا۔
”میں جانتی ہوں۔ تم جاگ رہی ہو۔“ کاشیہ نے بیڈ سائڈ پر بیٹھتے ہوئے خشک آواز میں کہا۔ یہ جملہ سن کر بھی کبل کے اندر زرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔
”بلیوٹی۔ راین! کہ اس دن کے بعد کبھی ہم دونوں میاں بیوی نے شہرام سے رابطے کی کوشش تک نہیں کی۔“ کچھ دیر کے وقفے پر اس کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔

”اس دن کسی نے بھی کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔“ راین نے کروٹ لینے کی بے چین خواہش کو شدت سے رو کیا۔ ”چھ ماہ پہلے اسلام آباد ایک ڈنر پر ہماری ملاقات ہوئی۔ اس کی مجرم میں بھی تھی، مگر وہ مجھے دیکھ کر بے قراری سے میری طرف بڑھا تو شرم سے میرا گڑ جانے کو جی چاہا تھا۔ جب اس نے ملتے ہی تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں ساکت رہ گئی۔ وہ مجھے اپ سیٹ، الجھا ہوا، بھٹکا ہوا کسی ویرانے کی مانند دکھا تھا۔“

چت لیٹی راین کا سانس کسی نوک دار شاخ سے الجھا۔

”جتنا میں اسے جانتی تھی وہ عام لوگوں کی طرح نہیں تھا۔ ایک عمر میں سب کو محبت ہو جاتی ہے۔ جسے ناکامی یا کامیابی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر جس طرح چھوٹے ہی اس نے تمہارا احوال پوچھا میں شاکڈ رہ گئی۔ اس نے عام لوگوں کی طرح تمہیں نہیں چاہا تھا۔“

”کاش وہ عام مردوں کی طرح ہی مجھے چاہتا۔“
”وہ شاید کبھی تمہیں بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔“
”کاش وہ مجھے بھول جاتا۔ محبت ایک بننے والا سیال کیوں نہیں گلن کی بو میں، نمکین پانی سے بھگیں۔“
”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ابھی تک ان میرڈ ہو گا۔“ کاشیہ کی اس سرگوشی نے اس کے کانوں کے پردوں میں چھید کیا۔

”تو تمہیں واقعی بسنے سے اجڑنا اچھا لگا شہرام! محبت کو پتھر کی بھاری سل نہیں ہونا چاہیے۔ پچھلے چھ

چلتے چل کے وسط تک آئی۔ دو لڑکیاں آپس میں گپ
شپ کرتی دوسری طرف سے آرہی تھیں۔

”ہکسکوزی۔ وادی میں واپس جانے کا یہی
ایک راستہ ہے؟“ اس کا خیال تھا کہ وہ اب کسی
دوسرے راستے سے واپس جائے تاکہ اسے یہاں کے
راستوں سے مکمل واقفیت ہو۔

”واپسی کے ہزار راستے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“
اس نے اچانک سامنے آکر اور ایک ذمہ معنی بات کہہ کر
اسے خاموش سا کر دیا۔

”آپ کیسے ہیں؟“ ان دونوں میں سے ایک لڑکی
شہرام کی طرف گھومی۔

”فائن!“ جواب نہایت مختصر آیا۔ وہ پھر رامین کی
طرف متوجہ ہوا۔ تو وہ ان دنوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ
اچھالتی اس کے پیچھے ہوئی۔ وہ دونوں بعد نظر آیا تھا۔
رامین نے اس کے بجائے نگاہ اٹھا کر دور پہاڑوں کو
دیکھا۔ اس کا حال پوچھنے والی لڑکی پیچھے مڑ مڑ کے دیکھ
رہی تھی جب کہ دوسری اسے اس حرکت سے روک
رہی تھی۔

”یہ راستہ واپسی کا تو نہیں۔“ اس نے لڑکوں سے
نظر ہٹا کر سامنے دیکھا۔

”جانتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ واپسی کا سفر طے
کر سکو گی۔“ نہ چاہنے کے باوجود بھی اس نے اسے
دیکھا۔ وہ چہرہ ایک ذمہ معنی مسکراہٹ کی زو میں تھا۔

”آئندہ یوں اکیلے مت نکلنا۔ راستہ بھٹک گئیں تو
یہاں کے جانور مجھ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے
ہیں۔“ وہ اس وقت کلسنے کے سوا اور کچھ نہیں
کر سکتی تھی۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے اس
کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔

”اور بے فکر ہو میں تمہیں برف میں دفن نہیں
کروں گا جیسے تم نے مجھے زندہ دفنایا تھا۔“ اس کے
چہرے پر سلگانے والی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے حواس
باختہ سا ہو کر اسے دیکھا۔ وہ کسی اور طرف متوجہ تھا۔
اسے اچانک دھیان آیا تو بے ساختہ پوچھا۔
”آپ کا زخم کیسا ہے؟“

مہینوں میں اس نے کروڑوں بار تم سے ملنے کی خواہش
ظاہر کی کہ ہم دونوں بے بس ہو کر رہ گئے۔ محبت روح
میں بچے گاڑنے والی بلا ہے۔“

آنکھوں سے بننے والا پانی بے آواز تھا۔ گونگا تھا
ورنہ کاشیہ سے پوچھتا کہ تم نے اپنی معافی تلافی کے
لیے مجھے اس کی عدالت میں پیش کر دیا۔ اور خود تو وعدہ
معاف گواہ تھریں۔

”اور میں۔ ہم نے کئی جگہوں کے پروگرام بنائے
مگر وہ تم سے اس وادی میں ملنا چاہتا تھا۔“

”مجھے پھر سے برباد ہونے کے لیے اسی جگہ آنا تھا۔“
”اتفاقاً“ ہی تم نے برف باری دیکھنے کی خواہش ظاہر
کی۔ تو یہ سب ممکن سا ہو گیا۔“

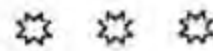
”یہاں برف باری کب ہو رہی ہے یہاں تو سنگ
باری ہو رہی ہے۔ وہ جملے وہ نگاہیں۔ وہ پورے کا
پورا سنگ مرمر میں ڈھل چکا ہے۔ تم کہہ دیتیں وہ
مرمری ہے۔ کہہ دیتیں وہ تم ہو گئی ہے۔ تو مجھے اس
کے سامنے ذلیل نہ ہونا پڑتا۔“ اس نے ایک جھٹکے
سے کبل اتار پھینکا۔

”میں اس دفعہ اس کی آس نہیں توڑ سکی مینو!“
کاشیہ نے نگاہیں چرا کر کہا۔

”چلو تم تو اس کی نظروں میں سرخرو ہوئیں۔“ وہ
ہنسی۔ اس کے کھلے طنزہ کاشیہ کے پیٹ میں گرہیں
پڑیں۔

”تم کوئی ملاضعیف نہیں ہو جسے میں نے امریکا کے
سفاک ہاتھوں کے سپرد کر دیا ہے۔“ اس نے اس کے
بستر سے اٹھنے میں ایک سیکنڈ لگایا۔

”اس سے اچھا تھا تم مجھے امریکا کے سپرد ہی
کر دیتیں۔“ وہ دانت کچکا کر بولی۔



رات کے اس پہر اسے منزل عشق کے ہر گام پہ
رونا آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا وہ کافی دور آگئی ہے۔
ٹھہر کر اس نے چہار سو نظر دوڑائی سامنے دریا تھا جس
کی دوسری جانب یقیناً ”ایئر فورس میس“ تھا۔ وہ چلتے

”تمہیں۔“ وہ اک ذرا توقف سے لب کشا ہوا۔
 ”پھر؟“ آنکھوں میں تیرتی نمی برف ہوئی۔
 ”پھر۔“ شہرام نے دانستہ دہرایا۔ ”پھر یہ کہ تم تو
 کہیں ہو ہی نہیں۔“ وہ ٹیبل پہ دونوں کہنیاں ٹکا کر
 آگے کوچک کر سرگوشی نما بولا۔ ”تمہاری ذات میں ہر
 جگہ میں ہوں۔ تم جتنا مرضی خود کو چھالو۔“ لہجہ
 بریقین تھا۔ وہ اس کی پُرتیش آنکھوں میں لہجہ بھری دیکھ
 پائی۔

”اب کچھ مت دریافت کرو۔“ اس نے ایک
 ٹھنڈی سانس بھری۔ ہلکی سی دستک دے کر ایک گیارہ
 بارہ سالہ لڑکا کافی لیے اندر آیا۔ شہرام کا اشارہ پا کر اس
 نے ٹرے میز پہ رکھی۔ کافی کی اشتہا انگیز خوشبو۔
 حواسوں کو چھوٹی محبت کی خوشبو۔ برف باری کی انوکھی
 خوشبو سامنے بیٹھے شخص کی موجودگی ہر شے پہ غالب
 تھی۔

وہ بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں اب جاہ
 سناٹے تھے۔ ان چپقل آنکھوں سے خوابوں کے ڈھیر
 جہاں گم ہوئے وہ جانتا تھا، مگر وہ ان خوابوں کو ڈھونڈ کر
 ان آنکھوں میں دوبارہ بسانے کا حق کھو چکا تھا۔

”سنبل! یہ کیا پاگل پن ہے۔“ ورنہ اسے گھنہ بھر
 سے ٹیرس پہ جما دیکھ کر بھنجلائی۔ ”ٹھنڈے
 مرچاؤ گی۔“ اس نے اسے گھیٹا۔

”تم دیکھنا وہ واپسی پہ اس کے ساتھ ہو گا۔“ وہ اس
 کے ساتھ ٹھنڈی دانت پس کر بولی۔

”تو ہوتا رہے، ہمیں کیا۔“ ورنہ نے ٹیرس کی
 طرف کھلنے والا دروازہ بند کیا۔
 ”تمہیں کچھ نہیں، مگر مجھے ہے۔“ وہ لفظ چبا کر
 بولی۔

”تم نے دیکھا، کیسے اسے پہلو سے لگائے میس کی
 طرف جا رہا تھا اور مجھے برج پہ بھی کھڑا نہیں ہونے دیتا
 کہ اس کی شہرت، نیلی پیلی اور کالی ہوتی ہے۔ کسی کو
 اپنی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہ دینے والے کے
 ساتھ آج کوئی لڑکی ہے تو کیوں ہے۔ کیوں ہے؟“ اس
 نے مٹھیاں غصے سے کھولیں اور بند کیں۔

”کون سا زخم؟“ وہ استہزا سے ہنسا۔ وہ ہر دوسرے
 پل اسے کٹرے میں کھڑا کر دیتا۔ اس نے ٹیکسی نظر
 اس پہ ڈالی۔

آج شہرام کے مزاج میں اشتعال مفقود تھا بلکہ ایک
 سرد مہری سی نمایاں تھی۔ وہ اس کی شکوہ کنناں نگاہیں
 خود پہ اٹھتی محسوس کر چکا تھا۔ سرسری سا اسے دیکھا۔
 وہ میس کے قریب پہنچ کر ٹھکی۔ وہ ایک کارنر کیبن
 کی جانب بڑھا۔

”یہاں کافی بے حد مزیدار ہوتی ہے۔“ اس نے مڑ
 کر اس سے یوں کہا جیسے وہ دونوں تمام دن بد مزہ کافی
 پینے کے بعد اب اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچے ہوں۔

استقبال پہ موجود لڑکے کے سلام کا جواب شہرام
 نے ہلکی مسکراہٹ سے دیا۔ وہ کیبن اندر سے خاصا
 کشادہ تھا۔ گپیں لگاتے فوجی جوان اپنے آفسر کو دیکھ کر
 کھڑے ہوئے اور خفیف سے سیلوٹ کے بعد
 دروازے کی طرف بڑھے۔ ان میں سے کئی ایک نے
 مڑ کر بھی انہیں دیکھا۔ رامین نے ان کی آنکھوں میں
 ایک محظوظ سی مسکراہٹ اترتی دیکھی۔ وہ نوعمری میں
 آگریساں آتی تو پاگلوں کی طرح پورا میس گھوم چکی
 ہوتی۔ وہ بے تالی وہ جوش گئے زمانوں کا حصہ بن چکے
 تھے۔ اندر گرمانش تھی۔ اس نے دریا کی طرف کھلنے
 والی کھڑکی کے ساتھ کی کرسی سنبھالی۔ وہ اس کے
 سامنے ہی بیٹھا۔

واوی فلتو۔ اترنے والی نیلگوں شام نے اس اجنبی
 مہمان کا چہرہ کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کے
 چہرے پہ نکلی اس آفسر کی رشوق نگاہی نے اس کا ارادہ
 نا کا اپنایا۔ کئی سال گزرنے کے بعد بھی وہ سادہ و شفاف
 چہرہ ویسا ہی کچھ چھپاتا کچھ جتا ہوا تھا۔ اب آنکھوں
 کے نیچے شفافیت کی جگہ حلقوں نے گھیر رکھی تھی۔ ان
 آنکھوں میں آج بھی گلابیاں کھلی ہوئی تھیں جن میں
 شہرام کی طرف دیکھتے ہیٹھ ایک بھجک اور حیا مانع رہی
 تھی۔

”کیا دریافت کر رہے ہو؟“ وہ نظروں کے اتنے جاہد
 ار تکاڑیہ بے چین سی ہوئی۔

پہنایا پھر تمہارا ریل ٹیک سوئیٹر لیک ہونا چاہیے تھا۔
 رامین کا جسم گپکپایا۔ جواب دینا آسان نہیں تھا، مگر
 وہ اس کا جواب سننے کے لیے سانس روک کے بیٹھا
 تھا۔

”وہاں موجود میرے تمام خاندان نے یہ ہوش و
 حواس تمہیں میرا نام لیتے سنا تھا۔“ سچ بولنے کا تہیہ
 کر کے وہ باہر جھانکتے ہوئے بولی۔

”میرے کردار کی وقعت تمہارے لبوں سے ادا
 ہوتے میرے نام نے اسی پل ختم کر دی تھی۔“ آخری
 جملہ اس نے اس کے چہرے پر نظر ناک کے کہا تھا۔ اس
 کا لہجہ دکھ، صدمے یا شکوے کسی بھی جذبے سے
 عاری تھا۔

اس گرم ماحول میں ایک ٹھنڈا سکوت طاری ہوا۔
 ”میری آنکھیں تو محبت کے زم زم سے دھل کر یہ
 چہرہ چھوٹی تھیں پھر میری بے بس سی پکار یہ بے
 وقعت کیونکر ٹھہرائی گئیں جسے میں نے ہمیشہ بے وفا
 جانا۔ اس کی زندگی کے بھی قیمتی حصے سے موسم گل
 بے شکر گزر گیا۔“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر وہ پہل کر گئی۔
 ”اس وقت اپنی فیملی کی حالت دیکھ کر مجھے آپ
 غصہ آتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ میں تمہاری مشکور
 ہوتی گئی کہ اس دن تمہاری جرات نے میرے نام کو
 کسی بھی دوسرے نام کے بوجھ سے ہمیشہ آزاد رکھا۔“
 مسکراہٹ اس کے لبوں پر اک پل ٹھہر کر معدوم
 ہوئی۔ دھوپ میں آئینہ چمکا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر دیکھتا
 رہ گیا۔

”سب ختم ہو گیا۔“ رامین کی آواز دھیمی ہوئی۔
 ”سوائے تمہارے۔“ آواز اب بھرائی، پلکوں پر اٹلے
 آنسو دلعتاً پھسل پڑے۔ ایک سفاک درون نے اس
 شخص کے وجود کو ٹکڑوں تک کاٹا۔ آنسو بہاتی اس لڑکی
 نے برفیلے صحرا میں اڑتی لوبان اور صندل کی خوشبو
 کے ساتھ اڑان بھری تھی۔



وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی اور کاشیہ کے پہلو میں

”تم اس کی ہمسائی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ تمہاری
 ریپوٹیشن خراب ہو۔“ وردہ نے آرام سے بات مکمل
 کی اور اپنے سامنے اخبار پھیلایا۔ ”ویسے بھی وہ تم سے
 کافی بڑا ہے اور یہاں کون سا فوجیوں کی کمی ہے۔ تم تو
 اتنی خوب صورت ہو، کوئی بھی دل ہار سکتا ہے۔“ وردہ
 کی بات اور مسکراہٹ نے اسے جلا کر خاک کیا۔
 ”خاک خوب صورت ہوں۔ اگر ہوتی تو تم بھی تو وہ
 مجھے ایک نظر دیکھتا۔“ وہ سچ سچ رو بانسی ہوئی۔

”کم آن۔ سنبل۔ وہ ایک میچور بارعب اور زمہ
 دار کمائڈر ہے۔ بیس ایکس سالہ لڑکا نہیں کہ اوہر اوہر
 افسر چلاتا پھرے۔ وہ بھی تمہاری اتج کی لڑکیوں کے
 ساتھ۔“

”جو لڑکی اس کے ساتھ تھی وہ بھی ساٹھ سال کی
 نہیں تھی۔“ وہ بل کھا کر بولی۔

”وہ اب اس عمر میں محبت کے لیے لڑکیاں
 ڈھونڈنے سے رہا۔ جس لڑکی کو وہ دیدہ دلیری سے
 ساتھ لیے گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی زندگی میں بہت پہلے
 سے ہوگی۔“ وردہ ایک دم سنجیدہ ہوئی۔

”جو بہت پہلے اس کی محبت تھی اس لڑکی نے اسے
 چھوڑ دیا تھا۔“ سنبل کی آواز دھیمی ہوئی۔

”اومائی گاڈ!“ وردہ جیسے کرنٹ کھا کے اچھلی۔
 ”یعنی تم جانتی ہو۔ پھر بھی۔“ اس کی آنکھیں باہر
 ایلنے کو ہونیں۔

”ہاں پھر بھی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔“ وہ سر جھکا
 کر بولی۔

”تو اپنے جذبات بس پسندیدگی تک محدود رکھو۔
 اس کے پاس اب کسی سے بھی کرنے کے لیے محبت
 نہیں ہوگی۔“ وردہ کے دھیان میں اس کا چہرہ ابھرا تھا۔



”اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“
 کچھ زیادہ ہی پھلنے والی خاموشی کو اس کے سر و سیاٹ
 انداز میں پوچھے گئے سوال نے سمیٹا۔ اس نے مشکل
 بات اس قدر آسانی سے کی۔ جیسے آج یہ رنگ کیوں

”آپ دونوں کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیے۔“
اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

”لوجی! یہ اچھی فرمائش ہے۔ جب ہم انوائٹ ہی نہیں تو بن بلائے کیوں جائیں۔“ اس نے صوفے پر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔ ”اور تم کیا کسی فٹ پاتھ کے جمعہ بازار سے کتابیں خریدنے جا رہی ہو۔“ وہ از سر نو اس کا جائزہ لے کر بولی۔ ”کوئی تمہارا یہ حلیہ دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا کہ کمانڈر صاحب کی اکلوتی مہمان ایک کینڈل ڈنر کے لیے تیار ہوئی ہے۔“

کاشیہ اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکی تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی نروس تھی اوپر سے اس کے ارشادات سن کر وہ اچھی خاصی کوفت میں مبتلا ہوئی۔

”اچھا بابا۔ اب موڈ مت خراب کرو۔“ پھر اس کے شانوں سے براؤن شل کھینچی۔ ”کم از کم شال تو خوش رنگ اوڑھو۔“ اس نے اس کے آف وائٹ اور ٹی پنک ایمر ایڈ ڈسوشیہ اچھتی سی نظر ڈالی۔

”جب تماشہ لگا ہی دیا ہے تو لطف اندوز ہونا تمہارا حق بنتا ہے۔“ وہ اس کا شرارتی چہرہ دیکھ کر کھولنے لگی تھی۔ اس کے لیے یہ رویہ غیر متوقع نہیں تھا سو اس نے ڈونٹوری جیسے اسٹائل میں کندھے اچکائے۔

”خدا بہتر جانتا ہے کہ تم غلط سوچ رہی ہو۔“ صرف اتنا کہا۔ پھر اس کی الماری سے نفیس سی کالی شال نکال کر اس کے شانوں پر پھیلائی۔ ”ویسے آپس کی بات ہے اس مدہم سے کابل نے بھی تمہاری آنکھوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔“ اس کی چھٹی ترقی نگاہوں سے وہ لمحہ بھر کو سرخ ہوئی۔

”اچھا اب مجھے نہیں سنتا۔ چلو اٹھو۔ ہاں البتہ وہاں تم پر جو بھی بیٹے گی واپسی پر ضرور سنوں گی۔“ یوں سنجیدگی سے کہا کہ اس کا پورا منہ کھلا۔
”کیا بکواس ہے؟“ وہ جھل سی ہوئی۔

”او۔ ہو۔ جاؤ بھی۔ ایک شاندار سا بندہ شاندار ڈنر پر تمہارا منتظر ہے۔“ وہ اسے کھینچ کے باہر لائی اور لاؤنج سے بھی باہر دھکیل کر دروازہ فوراً بند کیا۔



اس نے بھاری دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازے کی خوب صورتی کو سراہا۔ ذرا سا وقفہ دے کر دوبارہ دستک دی۔ پھر وہ توقف سے دستک دینے لگی۔ اس گھر کا واحد کمین جیسے سوچکا تھا۔ تو کیا وہ لوٹ جائے؟ اس نے آخری دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ قدموں کی قریب ہوتی آواز پر اس کا ہاتھ رک۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ان دستکوں کو سنتے رات تمام ہو جائے جائے کیوں مگر اس کی نگاہ جھکی۔

”اس گھر کا دروازہ کسی خوش بخت وقت میں کھولوں تو باہر تمہیں پاؤں یہ میری خواہش نہیں تھی، یہ میری دعا تھی۔ دعا جو یقین ہے اس لیے تو آج تم میرے سامنے ہو۔“ یقین بن کر اس دروازے پر ہو۔“

وہ نرم آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اس نے سماعت پر زور دے کے سنا۔ اس نے اپنے سر اور جسم کو سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکا سا خم دے کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس نے محتاط سا ہو کر دروازہ عبور کیا۔ پھر اس کا دل زور سے دھڑکا۔

ایک خواہش۔ دوسرا عشق۔ ایک خواب۔ دوسرا تعبیر۔ ایک یونیا۔ دوسرا حقیقت۔ دماغ میں دو کپس گزرے وقت کا الارم بجنے لگا۔

دیوار گیر کھڑکیوں پر گرے گرے سرمئی پردے۔ ہلکے زرد پینٹ سے سجی دیواروں پر آویزاں ہر پینٹنگ میں ساحل سمندر نمایاں تھا۔ آبشاریں، جھیلیں اس کی جلتی سانسوں میں کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر جمنے لگا۔

ڈیکوریشن ہمسز سے لے کر کارنر پلانٹس تک۔ دیواروں پر سجی آرائشی اشیا، فرنیچر کے تمام آئینے۔ کیا وہ عالم نیند میں ہے۔ اس کے ذہن میں بچنے والے الارم میں ماضی کی ٹیون گونجی۔ ایسی واوی ایسا گھر ایک جانب جھیل کا ساحل ہو، دوسری طرف گرتی ہوئی آبشار کی گنگناہٹ مجھے صبح بخیر کہا کرے۔ ایک بار پھر اس کا اپنا ہی تہقہہ یاد میں ابھرا۔

وہ اس ٹرانس کی کیفیت سے نکلی تو اس کی غیر

موجودگی کو محسوس کیا۔ وہ خاموش تماشائی پتا نہیں کب اس کے عقب سے فرار ہوا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑ کر اس طرف دیکھا جہاں کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ پھر وہ کچن ایریا کی طرف بڑھی۔ وہ کسی ماہر کک کی طرح کھانا ڈش میں نکال رہا تھا۔ اس کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ عقب میں جھانک کے مسکرایا۔

”میں زیادہ اہتمام نہیں کر سکا۔ بس اتنا ہی کیا جتنا تم میرے لیے کرتی تھیں۔“ وہ بنا مڑے بولا۔ اس کی سانسیں ٹھنسنے لگیں۔

”تم مجھے زبردستی کھلاتی تھیں۔“

”میں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔“ جانے کیوں وہ روانی سے بولی۔ وہ سرعت سے اس کی طرف مڑا۔

”میں تمہاری آنکھوں کا کاتب بھی جان لیتا تھا۔ وہ سب میں اب شوق سے کھاتا ہوں۔“ وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے مسکراتی آنکھوں سے بولا۔

ایک خاموشی نے رامین کو حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے نیبل سیٹ کرتے دیکھتی رہی۔ ایک آدھ منٹ بعد دونوں آمنے سامنے کھانے کی نیبل پہ موجود تھے۔ کبھی اس شخص کو ہری مریچوں اور لیمن کی قاشوں سے جھانکتی میکرونی سے چڑھی۔

آج وہی سجاوٹ اس نے خود کی تھی۔ اس کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ چائیز رائس کا حشر گارتے ان ابلے سفید چاولوں کو دیکھ کر وہ فلک شکاف قمقمے لگاتا تھا۔

آج وہ ان پر ابلے انڈوں کو سجاتے ہوئے پرجوش سا تھا۔ دکھ کو راستہ چاہیے تھا ورنہ دم گھٹ جاتا۔

کھچپ لگی فرائیڈ فش۔

”بھابھی! ذرا چیک کریں۔ میرے سامنے کہیں خود کش فش تو نہیں۔“ اس کا شرارتی بشاش سالجہ کان کے پاس چمکا۔ رامین نے نظر اٹھا کر ان آنکھوں میں دیکھا۔ وہ پلک جھمکائے بنا اسے نکلتی رہی۔ شراب

نے خود پہ جھی ادا اس آنکھوں کی سرخی کو اپ سیٹ سا ہو کر دیکھا پھر خاموشی سے چاولوں کی ڈش اس کی طرف

برہائی۔ آنسو دکھ کو راستہ دکھانے لگے۔ وہی ذائقہ منہ میں ڈالتے ہی حیرت و پند ہوئی۔

”یہ ذائقہ میں نے ہمیشہ یاد رکھا۔“ وہ زیر لب مسکرایا اور پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے نیبل پہ رکھا۔

آنسو بے اور انہوں نے اس کے لرزتے ہونٹوں پہ تمکین ذائقہ دھرا۔ ”میں نے رشتوں کے اعتماد و اعتبار کے تمام ذائقے آج تک اپنے حلق سے اتارے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ کبھی یاد نہیں رکھا۔

ایک چیز جو میں نے سس کر دی وہ اب تم بناؤ گی۔“ مدھم سی آواز ابھری۔ رامین کا دل اس خواہش پہ اس لہجے پہ دھڑکا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔

”جو ہمیشہ تم کھانے کے بعد بطور سوٹ ڈش پیش کرتی تھیں۔“ لہجہ خود بخود ہیما پڑا۔

”سب کچھ اتنا کچھ کیونکر اور کیسے یاد رکھا؟“ ان جلتی بجھتی آنکھوں سے بھیگی آنکھوں نے عجب انداز میں شکوہ کیا۔ ہری مریچ نے دل تک جلا ڈالا تھا۔

”کمال ہے یہ سب کھاتے ہوئے ان آنکھوں سے پہلے پانی کب بہتا تھا۔“ اس چہرے کی سرخی کو دوپچھی سے دیکھتے ہوئے اس نے نشوونما اس کی جانب کھسکایا۔

”تو پانی بہتا تھا۔“ وہ کہنا چاہتی تھی۔

”جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا اس کے بعد میری ہر خواہش، میری ہر پسند اپنی زندگی میں شامل کر کے یہ چاہتا ہے کہ میں آنے والی زندگی پچھتاؤں کے ساتھ گزاروں۔“

”میں اس ڈنر کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ کر بولا۔

رامین نے ہاتھ میں پکڑا کائنا پلیٹ میں واپس رکھا۔ اور جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑتی سننگ روم میں آئی۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اسے تھوڑی دیر لگی، مگر بمشکل ہی سہی اس نے آنسوؤں کے سلسلے کو روک لیا۔

”اب اس عمر میں مجھے شوگر جیسا مرض لاحق ہو سکتا ہے اسی خدشے کے تحت تم سوٹ ڈش بنانے

کی بجائے بھاگ آئی ہو۔“ کچھ دیر بعد وہ ہاں آیا تو اس کے مسکراتے لبوں پر یہ جملہ اور ہاتھوں میں کافی کے گم تھے۔ وہ اس کے برابر صوفے پر ایک مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھا۔

رامین نے سوچی ہوئی، سرخ بھگی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ وہ سب باتیں مجھے مت یاد دلاؤ۔ قافلہ گزر چکا۔ اب بلندیوں کی انتہا پہ کھڑے ہو کر بھی پکارتے رہو تب بھی قافلہ واپسی کی راہ پکڑے گا نہ وقت پلٹ کر دیکھے گا۔“ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا ان آنکھوں میں رقم تنبیہ پڑھ کے وہ افسردگی سے مسکرایا۔

”کافی اچھی بناتے ہو۔“ وہ پیتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔
”شکریہ۔“

”گھر بنا لیا تھا تو اسے آباد بھی کر لیتے۔“ بات کرتے ہوئے سرسری سا اسے دیکھا۔

”میں اس گھر میں رہتا ہی نہیں۔“ اس نے بنا ہاتھ اٹھائے رامین کے منہ پر کھینچ کر پھپھار مارا تھا۔ کہ میرے اس قیام گاہ کا مقصد پہلے نہیں سمجھیں تو اب جان جاؤ۔ کہ یہ ایک خواہش کی تکمیل ہے۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں کرتے شہرام! زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کی خوب صورتیوں کو اس کے تقاضوں کو محبت کے بوجھ تلے نہیں دفناتے۔“ وہ منت سے گویا ہوئی۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ بھی ایک نارمل خوشیوں سے بھرپور نہ سہی۔ فطرت سے قریب زندگی گزار رہے ہوں گے۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ جیسے زندگی ایک سیدھی ڈگر پہ چلنے لگی تھی مگر وقت نے ایک بار پھر ہمیں سامنے لا کر ہمارے ساتھ پھر اچھا نہیں کیا۔ میں اگلی زندگی اس گلٹ کے ساتھ ذرا سے سکون کے ساتھ بھی نہیں گزار پاؤں گی کہ تم میری وجہ سے تنہا ہو چکے ہو۔ مانا کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔“

”میں نے بھی تمہارے ساتھ برا کیا۔“ وہ جو اسے

توجہ سے سن رہا تھا۔ ایک دم بولا۔
”مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔“ ڈوٹا ہوا لہجہ کچھ اور دھیمہ ہوا۔

”مگر مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس کی طرح اس کے الفاظ و آواز بھی سر اٹھا کر آوا ہوئے۔

”اگر میں تمہارا نام نہ لیتا، فقط خاموشی سے اٹھ آتا تب بھی مجھے کوئی پکار تانہ روکتا، مگر میرا بے صبر پن اور بدحواسیاں تمہیں بھی لے ڈوٹیں۔“

”میں اکیلی نہیں ہوں۔ میری ای، میری باقی فیملی میرے ساتھ ہوتی ہے۔ میری ماں پانچ سال سے فوج کی مریضہ ہیں۔ میں اللہ کی مصلحت پہ مطمئن ہوں۔“

میں تو عورت ہوں شہرام۔ میری تربیت میں صبر ہے۔ میں ایسی دسیوں زندگیاں گزار سکتی ہوں مگر آپ کو اب تک اکیلے زندگی نہیں گزارنا چاہیے تھی۔ یہ بات کہنا مشکل مرحلہ تھا تو ان شکوہ کنناں آنکھوں کا سامنا کرنا مشکل ترین تھا۔ سو نظر موڑنی پڑی۔

”جو تم کہنا چاہتی ہو۔“ میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ تحمل سے گویا ہوا۔ ”اور بہت تھیں جنہوں نے میری جانب محبت کے ہاتھ بڑھائے۔ میری زندگی میں آنا چاہا، ان میں سے چند ایسی بھی تھیں جو بہت آگے تک بھی آئیں۔“

دل اس بات پر عجیب طرح دھڑکا، بھٹکا۔ ”مگر سچ کہوں مینو! میں ان کا ہاتھ بھی نہیں چھوس سکا۔“
دل ٹھہرا اور پر غور ہوا۔ ”میرے وجود یا میرے دل نے عورت کی طلب یا قربت پہ کبھی آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔“

وہ اس برے نظر ہٹا کر اس کافی کو دیکھنے لگا جو اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ان کے درمیان سکوت بیکراں ٹھہر گیا۔ اس کی نگاہیں بدستور اس خوش اطوار اور باکردار شخص کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”مجھ میں تو ایسا کچھ نہیں شہرام! کہ کوئی میرے راستوں پر بھٹک کر ہمیشہ کے لیے راستہ بھول جائے۔“ اس کی آواز چپکچائی۔ اس کے احساسات میں

ایک انہونی نے انگڑائی لی۔

”میں تو تمہاری محبت ہمیشہ مجھ سے کسی آسانی آشار میں ڈھل کر رہی، متواتر، مسلسل۔ کب تمہاری محبت کا سکہ میری مٹھیوں میں جل کر کندن ہوا۔ تمہیں چھونے کی خواہش کب میرے وجود میں مٹی ہوئی۔ میں نہیں جانتا۔“

اس نے ماتھے پہ اترا پینہ ہاتھ کی پشت سے خشک کیا۔ وہ دوبارہ سگریٹ سلگانے لگا۔

”اس طرز زندگی سے تمہارے بابا یا تمہاری باقی فیملی کبھی مطمئن نہیں رہ سکتے شہرام۔“ بات کرتے ہوئے اس کی سانسیں ناہموار تھیں۔ اس نے ہولے سے دائیں۔ بائیں یوں سر ہلایا جیسے زمانے بھر کی نفی کر رہا ہو۔

”تمہارے بعد دنیا ہی ذرا سی رہ گئی تھی۔ زمین و آسمان، سمندر، دریا، سب سمٹ کر نقطہ ہو گئے۔“ وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔ اب یہ آنکھیں اس اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کی نہیں۔ ”وہ کچھ اداس ہوئی۔“

”اب یہ آنکھیں خالدہ حیات کی بیٹی کی ہیں جو اب بنت حیات کے نام سے ہی دفنائی جائے گی۔“ وہ اسے سیدھے سادے انداز میں زندگی کے نئے سبق پڑھا رہی تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے اس کی بات یکسر نظر انداز کر کے چھیڑتے ہوئے سے بھاری لہجے میں بولا۔“

”جو تبدیلی میرے لیے ضروری ہے وہ تمہارے لیے کیوں نہیں؟“

”میں اب بس اتنا ہی کا جل لگاتی ہوں۔“ اس نے بھی اس کی دوسری بات ہوا میں اڑا کر پہلے سوال کا جواب دیا۔ تو وہ بس آنکھوں سے مسکرایا۔

”ان آنکھوں کا اس قدر ہی اہتمام، ہم دل گزیدوں پہ بھاری ہے۔“ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی، لہجہ اس سے بھی گہرا ہوا۔ وہ نظریں چرا کر کھڑی ہوئی۔

”باہر چلیں۔“ دو لفظ بول کر قدم بیرونی طرف بڑھائے۔ یہ اجازت نہیں تھی، حکم تھا۔

”کاش حکم دینے کا اور پھر منوانے کا ہنر کوئی ہمیں بھی سکھا دے۔“ نہ ٹھہرنے کی التجا کی۔ نہ رکنے کی استدعا کی۔ بس اک حسرت زدہ آہ بھر کے ایسا ہی جملہ اس کی جانب اچھلا مگر رات کے اس پہر بھی اس کے ہم قدم ہونے کی خواہش پہ دل کو روک نہیں سکا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں باہر سرد ماحول میں تھے وہ خاموشی سے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے اس کے ہمراہ چلتا نیکیسی تک آیا۔

”یہ ڈنر میں بھی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ زیرِ شمال وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے مقابل ٹھہر گیا۔

”اپنے ہی گھر میں شب کے کسی حصے کی مہمان داری ہمیشہ یاد رکھنے والی چیز ہے؟“

سردی کا احساس بھگ سے اڑا۔ وہ ٹھہرا نہیں تھا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

”یہ کھلی آنکھوں کا خواب تھا جو اس شب ہم نے دیکھا۔“

دروازہ کھولنے سے قبل اس نے مڑ کر نیکیسی کی جانب نگاہ کی، اور بت ہی اس لڑکی کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پہ رنگنے والی مسکراہٹ اسے اچھی لگی۔

”تو کیا کتاب عشق سے لفظ ”ختم شد“ فنا کا ذاتہ چکھنے لگا تھا۔“ وادی فلتو میں اس لہجہ موجود میں محبت شب وسط میں راگ پہاڑی گارہی تھی۔



وہ دھیمی چال چلتی گھر سے کافی آگے نکل آئی۔

”ہیلو، ہیلو!“ اس نے پکارا۔ عقب میں جھانکا۔ ایک نوجوان لڑکی اب اس کے برابر کھڑی ہانپ رہی تھی۔ رامین مسکرائی۔

”ہم شہرام صاحب کے ہمسائے ہوتے ہیں بلکہ ہمیں ان کی ہمسائیگی کا اعزاز حاصل ہے۔“ لڑکی نے ہلکا سا تہقہ لگایا۔ رامین نے اسے سر اہتی نگاہوں سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ انتہائی خوب صورت تھی۔

”آپ ان کی رشتہ دار ہیں؟“ اس نے جانے کیوں

بغور رامین کو دیکھا۔
 ”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”میں نے دو روز قبل آپ کو شہرام کے ساتھ میں کی طرف جاتے دیکھا تھا ان کے گیٹ روم میں لوگ آتے رہتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی مہمان لڑکی کو یوں ان کے شانہ بشانہ نہیں دیکھا۔ تو پھر آپ رشتے دار ہوں گی۔ یقیناً“ رامین نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔

”ان کے بھائی اور بھالی سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔“ اسے ٹھکنے پر اس نے لڑکی کی حد تک جانتی ہوئی۔

”آپ مقامی ہیں؟“ اس نے بات بدلی۔
 ”میرے بابا کا شمار یہاں کے سیاحوں میں ہوتا ہے یہ وادی انہیں اس قدر بھائی کہ اب وہ مقامی ہیں اور میں سیاح۔“ لڑکی نے اپنی بات پہ خود ہی فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ وہ خاصی باتوں میں رامین کو اچھی لگی۔

تب ہی ان کے قریب بھاری ٹائر چرتے ہوئے ایک جیپ رکی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھلا اور وہ نکلا۔

”سنا ہے آج کل آپ لیوہ ہیں؟“ لڑکی اسے دیکھتے ہی بشارت سے مسکرائی۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر رامین کی طرف متوجہ ہوا۔

”چلیں۔“ یوں جیسے وہ گھر سے پروگرام طے کر کے نکلے تھے بے ساختہ اس نے لڑکی طرف دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پہ مسکراہٹ کی جگہ اب حیرانی ابھری۔ اس کے گھوم گئے آنے تک وہ جیپ کا پنجر ڈور کھول چکا تھا۔

شہرام نے ہاتھ ہلا کر وہاں موجود لڑکی کو گڈبائے کہا۔ جنگل کے بیچ کچی سڑک پہ جیپ رواں دواں تھی۔ اسے درختوں کے بیچوں بیچ لاتعداد آبشاریں نظر آئیں راستوں کی خوب صورتی نے اسے ہنساتا کر رکھا تھا۔ رامین کا لباس برفانی موسم کا سامنا کرنے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔

شہرام نے اسے نظر بھر دیکھنے کے بعد نگاہیں ٹیڑھے میڑھے راستوں پر مرکوز کیں۔ آج وہ ایک معتبر سی خاموشی کے حصار میں تھا۔

”اتنے خاموش کیوں ہیں؟“ آدھا راستہ طے ہو چکا تو وہ پوچھ بیٹھی۔ وہ اس کے استفسار پہ باوقار انداز میں مسکرایا۔

”اگر یہی سوال میں تمہیں لوٹاؤں تو۔“ زرب دلی دلی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کی سنجیدگی کو دل نواز سا کیا۔ آج اس نے نگاہ بھی باختیار رکھی ہوئی تھی۔

”اس وادی میں اور اتنا دور رہنے کا کیوں سوچا؟“ وہ اس قدر انجان لہجے پر بریک لگاتے لگاتے رکا۔

رامین کی نگاہیں تاحد نگاہ پھیلی برفانی سفیدی پہ تھیں۔ جیپ کے لڑکھڑانے پہ اس نے اس کو اگ نظر دیکھا۔

”صحیح کہہ رہی ہو۔ اس سے بھی دور بنانا چاہیے تھا، جتنا تم چاہتی تھیں۔“ اس نے سہل انداز میں کہہ کر اسے یاد دلایا۔

”وہ ڈراموں کے ڈائلاگز، فلمی باتیں اور گیتوں کے بول تھے۔ میری خواہشیں کب تھیں؟“ کتنی ہی دیر کی خاموشی کے بعد وہ شکایتی انداز میں بولی۔

”جو بھی تھا۔ مگر میں جانے انجانے میں سنے گئے تمہارے جملوں کو کبھی بھول نہیں سکا۔ تمہاری خواہشوں کے حکمتے موتی میں نے کر گن کر رکھے۔“

وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ وہ چہرہ دیکھنا یاد رہا۔ جو اس لمحے اس کی موجودگی سے آباد تھا۔ جیپ ایک ملکہ جھٹکے سے رکی۔ دونوں دروازے ایک ساتھ کھلے۔

جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا وہ ایک جھیل تھی وہ خواب تھا یا پھر وہ بھٹک کر جنت میں آگئی تھی۔ اگر کوئی زمینی جنت تھی۔ وہ یہیں تھی وہ اس سے دو قدم آگے تھا۔ اسے اسے ساتھ نہ پا کر قدم واپس موڑے۔

”یہ جگہ تجھنی خوب صورت آج ہے، پہلے نہیں تھی ساتھ چلتے ہوئے اس نے مدھم سی سرگوشی کی۔

”نہیں پلیز وہاں میرے کزن بھی ہوتے ہیں۔“ وہ سرعت سے بولی۔

”تم اب بھی لوگوں سے ڈرتی ہو۔ ابھی تک۔“ اس کی درشت آواز پست ہوئی۔

”شاید۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولی اور شراب کی خواہش کے ہزاروں ٹکڑے کیے۔ کافی کے مک دونوں نے ایک بگاری اٹھائے۔ شراب کا موڈ خراب تھا۔ اسی پل ایک لڑکی ان کے قریب سے گزری۔

”اوہ۔ خدا۔۔۔ یہ لڑکی کس قدر خوب صورت ہے۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ وہ پر تکلف انداز میں کافی پر نظریں جمائے رہا۔

”جیسے ایک جیتی جاگتی باربی ڈول ہو۔“ وہ سابقہ انداز میں خوش ہوئی۔

وہ گردن جھکائے کافی میں جیسے الجبرے کا سوال حل کر رہا تھا۔

”اس کے بال تو دیکھو۔ جیسے ریشم واطلس سے بنے ہوں۔“

اس نے لڑکی سے نظریں ہٹا کر سامنے موجود پتھر نما شخص کو گھورا۔

”اس کے ہاتھ تو دیکھو، سچ مچ کے سفید گلاب۔“ پتھر کی آنکھوں نے جنبش کی اور کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔ ”کس قدر مشکل اور مستقل مزاج ہو۔“

لڑکی ایک کیمپ کے اندر چلی گئی تو وہ مایوس سی ہو کر بولی۔ بے اختیار ہی اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، کتنے ہی عرصے بعد رامین نے اسے اس طرح منتے دیکھا تھا، سو دیکھتی ہی گئی، وہ ان نگاہوں میں جھلکتی دلچسپی بھانپ چکا تھا اس نے فوراً ”نظروں کا زاویہ بدلا۔“

”تم اب بھی ویسی ہو۔“ وہ لب کچل کر پھر سے ہنسا۔

”کیسی؟“ وہ رَجَبَتِ سِی ہوئی۔

”اب بھی جھمپے چھپ چھپ کر دیکھتی ہو۔“ وہ آنکھوں سمیت مسکرایا۔ سحر طرازی سے مسکراتا وہ ساحر لگ رہا تھا۔

”یہ جھیل بہت خوب صورت ہے۔“ وہ اس

”یہاں برف باری سے قبل پرندے ہجرت کر جاتے ہیں، جنگلی درختوں کی شاخیں تازہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ گھونسلے خالی ہو جاتے ہیں۔ مگر اس جنوری یہ گھونسلے خالی نہیں ہیں۔“ اس نے چوٹیوں کو عالم جذب میں پریقین ہو کر دیکھا۔

”اس جنوری میرے دل کی طرح کچھ بھی بے آیاو نہیں۔“ وہ اک سرخوشی سے بولا۔ رامین کی آنکھوں میں می اتری وہاں جا بجا ٹیلے نما جھاڑیاں تھیں۔ وہ کچھ پل کو قریبی ٹیلے پر رکی۔ آج وہاں اکا دکا لوگ بھی تھے ان کے ہاتھوں میں چائے یا کافی کے تھرماس تھے، جھیل کے اطراف تین چار ڈھابے نما کیبن تھے اور سیاحوں کی کھینگ جنگل میں منگل کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔

دو تین افراد نے کمانڈر کو دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا وہ مقامی لوگ تھے آری کے ہوتے تو سیلوٹ کرتے۔ جھیل کنارے کرسیوں کی صورت ان کی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

”جانب کیوں کرتی ہو۔“ اس کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔

”خود کو مصروف رکھنے کے لیے بھی۔ اور میں اپنا اور امی کا بوجھ کسی پہ نہیں ڈالنا چاہتی۔“ نگاہیں چرا کر جواب دیا۔

”جبران کا کینڈا میں اپنا بزنس ہے۔ وہ تمہیں اور تمہاری امی کو احسن طریقے سے سپورٹ کر سکتا ہے۔“ اس کے انداز میں جرح سی در آئی۔ رامین نے اس کی تنی تنی سی پیشانی پہ خمیر بھری نظر ڈالی۔

”اس کے بچے اب جوان ہو رہے ہیں۔ ان کی اپنی ضرورتیں بے حساب ہوں گی پھر وہ اکثر رقم بھیج دیتا ہے۔“ وہ سہولت سے بولی۔ پتا نہیں وہ بھائی کا دفاع کر رہی تھی یا خود کو مطمئن وہ سمجھ نہیں پایا۔

ایک لڑکا انہیں کافی سرو کرنے لگا، دونوں ہی وقتی طور پر خاموش ہوئے۔

”کبھی پنڈی کا چکر لگا تو تمہارے آفس آؤں گا۔“ اس کی بھاری آواز نے خاموشی توڑی۔

بعد جس گھر کو جن چروں کو تم نے دیکھا تھا آنکھیں بند کرنے سے پہلے آخری بار بھی تم اسی آنگن اور ان ہی چروں کو دیکھنا چاہو گی۔“

ان جملوں کے ہجوم میں رامین نے خود کو تنہا اور بے بس پایا، وہ اس کی بو جھل آنکھوں کے بو جھل تاثر تلے اس تپتی کی مانند اڑی۔ جسے شہر محبت میں اڑنے کے باوجود کتاب وقت کے کسی کی پھر پھرتے صمٹے تلے بند ہونے کا خوف ستاتا ہے۔



رامین سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اجنبی لڑکی اس سے کچھ سننا چاہتی ہے یا اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ وہ روزانہ کچھ وقت ان کی اینگیسی میں گزارنے لگی۔

”آپ نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔“ وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

”آپ نے بتایا ہی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”سنبل!“ نام پکارتے وقت اس کے خوب صورت ہونٹ گول ہوئے تو وہ اور سیاری لگی۔ ”شہرام یہاں آتا ہو گا۔“ اس کی آنکھیں چمکیں۔

اور وہ جو کہنے والی تھی کہ نام بہت پیارا ہے، ان آنکھوں کی چمک نے اسے صدمے سے گنگ سا کر دیا۔

”ہاں!“ وہ خشک لبوں پہ زبان پھیر کے بولی، تب ہی کاشیہ اس کے لیے کافی لے کر آئی۔

”آپ پہلے بھی اسی طرح یہاں قیام پذیر مہمانوں سے ملنے آتی تھیں۔“ کاشیہ منہ پھٹ تھی سو تین چار روز کے خدشات اس کے منہ پہ دے مارے۔

”یہاں اکثر جینٹس ہی قیام پذیر ہوتے ہیں۔“ وہ کچھ برامان گئی تھی۔ رامین نے کاشیہ کو گھورا۔

”مگر جب جب بھی شہرام کی بھالی آتی ہیں پھر ضرور آتی ہوں۔“

”مچلو آؤ باہر چل کر کافی پیئے ہیں۔“ وہ جانتی تھی کہ کاشیہ اب سوالات کا سلسلہ شروع کرنے والی ہے۔

”آپ میرا ہیں؟“ وہ اچانک ہی بیرونی گیٹ سے

سادھوؤں جیسی نظر اور نظر میں جلتے چراغوں کا فسوں توڑتی چہار سو دیکھ کر بولی۔

”جب سورج افقی لکیر کے پیچھے چھپ رہا ہوتا ہے تو اس کی آخری کرنیں جھیل کو چھو کر قوس قزح کے تمام رنگ دان کرتی ہیں۔ وہ رنگ دیکھنے سیاح دور دراز سے آتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں آس، امید اور خواہش لٹی تھی، دل کے خالی کونوں میں توجہ کے سنہرے پتھری موسم وصال کے گیت سناتے پھیریاں لگانے لگی۔

”مجھے تو آج اور ابھی بھی سورج کی غیر موجودگی میں یہ جھیل قوس قزح کے رنگوں سے آباد دکھ رہی ہے کیونکہ آج یہاں تم ہو۔“

محبت کی خالی تھیلی کو اس گلزار لہجے نے رنگوں سے بھرا۔ محبت نے تادیر انہیں دیکھا، پھر تھیلی سے تمام رنگ جھٹک دیے۔ پھیریاں لگاتے پتھریوں کی یادداشت سے موسم وصال کے گیت ختم ہوئے۔

”مجھے میری نظروں میں اور کتنا گراؤ گے۔“ وہ حد ضبط پہ کھڑی ہوئی۔

”خود پہ نثار ہونے والوں کی اس قدر توہین نہیں کرتے مینو۔“

”مجھے کیوں لگتا ہے شہرام کہ تم میرے ضمیر کے آئینے قدم قدم میرے سامنے رکھتے ہو۔“ اس کی بھیگی نگاہوں نے گلہ کیا۔

”ایسا کچھ نہیں رامین!“ وہ بے تاب سا ہوا۔

”ہزار بار بخ بدل کے دیکھ چکی ہوں، مگر بس آئینہ بھی وہ خوش آمد وقت نظر نہیں آتا جو میری پیشانی پہ تمہاری تقدیر رقم کر سکتا ہو، میری ہتھیالیوں پہ تمہارے نام کی لکیروں کا اضافہ اب ممکن نہیں۔“

ان خیالات کا شور اس کے چہرے پہ پاپا تھا جسے اس کی تیز سماعت سے سن لیا تھا۔

”مجھے تم سے اب ایسا کچھ بھی نہیں کہنا جو تمہیں دورا ہے۔ کھڑا کر دے۔ جو تمہیں پھر سے توڑ دے۔ مجھے اب تمہیں گزرے وقت کا آئینہ بھی نہیں دکھانا۔ میں جان گیا ہوں کہ پہلی دفعہ آنکھ کھلنے کے

اندر آیا۔ رامین نے اسے ایک نظر دیکھا، وہ اس سے خفا تھا اور دو چار روز سے غائب تھا۔ وہ اسے جواب دینا بھول گئی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ سنبل قریب سے گزرتے شہرام کی راہ میں آ کر بولی۔

”خدا کا شکر ہے۔“ وہ خفیف سا مسکرایا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے حد خاموش اور سنجیدہ تھا۔

”آپ نے کہا ہے تو ماننا پڑے گا ورنہ لگ نہیں رہا۔“ اس نے جیسے راستہ روکا۔

”پلیز سنبل!“ وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے رامین کو میسر نظر انداز کیا تھا۔

”یہ ایسے ہی ہیں۔“ وہ مسکرائی اور نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے دیکھا۔ رامین نے اس کے یوں مڑ مڑ کر دیکھنے کو بے چینی سے دیکھا۔

”پھر ملیں گے۔“ وہ اسے ہاتھ ہلاتی وہاں سے چلی

گئی۔ ابھی وہ شش و پنج میں تھی کہ اس کے پیچھے اندر جائے یا یہیں کھڑی ہو کر انتظار کرے کہ وہ اسے باہر آتا دکھائی دیا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی، آن ساجر آنکھوں کے الاؤ میں جو شباب سا جلا تھا، اس میں اک خواب سا جلا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزر گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت پھلکی پڑی۔ اب وہ جیب کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اس سے دور ہونے لگا۔

”شہرام۔“ وہ اپنے نام کی پکار پر رکا، وہ آواز اسے وقت آخر بھی پکارتی تو وہ خدا سے ضرور مہلت مانگتا، وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی اس تک پہنچی۔

”سوری!“ اس نے تیزی سے کہا۔

”اوکے“ کہتا ہوا وہ جیب میں بیٹھا۔ قبل اس کے کہ وہ بھگائے جاتا، رامین نے شیشے پر زور دار دستک دی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

”سوری کہہ تو دیا ہے۔“ اس کا لہجہ تاسف آمیز نہیں تھا، لانا احسان جتانے والا تھا۔

”میں نے بھی کہا ہے کہ اوکے۔“ اس کا انداز بھی

اکڑفوں اور بے لچک تھا۔

”تو پھر اب کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کا استحقاق بھرا انداز شہرام کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر گیا۔

”میں تو تم؟“ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے پہلوؤں پر ہاتھ رکھے۔

”آج آپ لچ ہمارے ساتھ کریں۔“ وہ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی اس یقین کے ساتھ کہ وہ پیچھے ہی آئے گا۔

”محبت بس جاں کا زیاں ہے۔“ وہ منہ میں بڑبڑایا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ اپنے ٹیس پر کھڑی سنبل نے اس منظر کو بے یقینی سے دیکھا۔ اس کا پورا وجود مضطرب سا ہوا، محبت سیاہ راتوں میں جاگنے والا پرندہ ہے جس کی قسمت میں بس صبح کی نیند لکھی جا چکی ہے۔



”کیا تم پھر آؤ گی؟“ ضطراب سوال امید و صل کے گرد بھٹکا۔

”میں اس شہر روایات کی پروردہ ہوں جس کے قفل زندہ دروازوں پر، تعینات پہرے داروں کی نیند نہ بھی ٹوٹنے پائے، تو ہم تکین کسی بھی خوشبو کو قفل کھولنے کی اجازت خود ہی نہیں دیتے۔“

وہ ایک دم کھڑا ہوا۔ آج وہ نلتو جھیل سے آگے دس بارہ منٹ کی مسافت پر نئی جھیلیں دکھانے لایا تھا، مگر اب اور آگے جانے کے بجائے وہ واپسی کا راستہ طے کر رہے تھے۔

”آپ تو کہہ رہے تھے آگے ایک کالی جھیل ہے وہاں چلیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ میرا عکس چھو کر سنہری ہو جائے۔“ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کی مسکراتی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

”تم نے اپنی ذات سے تمام رنگ اڑا دیے ہیں۔ اب تمہارا عکس مجھ سمیت ہر چیز کو خس و خاشاک کر دیتا ہے۔“ وہ اس قدر تلخ لہجے میں لب کشا ہوا۔ کہ وہ اس چہرے کے تاثرات دیکھنے کی بھی جسارت

نہیں کر سکی۔ ”ان خوش امید آنکھوں کو اس کی اداس آنکھوں نے آپ جیتی سنائی۔“

ورہ نے سنبل کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹوکا کہ یہ تذکرہ اب چھوڑو مگر وہ سنبل ہی کیا جو دل کی نہ سنے۔ ”وہ اس کے لیے تمام محبتوں سے منہ موڑ چکا ہے۔ جس نے عین نکاح کے وقت شہرام کو ٹھکرا دیا۔“ اس نے رامین سے تیل چھڑکا۔ اور بنا پل کی مہلت دیے جلتی تیلی چھینکی۔

”شہرام کی بھالی نے مجھے بتایا تھا بھلا آپ بتائیں کہ ان جیسے ڈھسنگ آدمی کے ساتھ کوئی لڑکی ایسا کیسے کر سکتی ہے۔“ اس کے تحیر بھرے سوال پہ رامین نے بلاوجہ نگاہ نہیں جھکانی تھی وجہ بنتی تھی۔ ”ان کے لیے تو زمانے ٹھکرائے جاسکتے ہیں۔“ اس کا لہجہ جھکا۔

”سنبل آپ پوری بات نہیں جانتیں۔ لہذا خود بھی چائے پیئیں اور ان کو بھی پینے دیں۔“ ورہ مروتاً مسکرائی۔

”آپ ابھی چھوٹی ہو۔ آپ لوگوں کی مجبوریاں ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔“ اس نے نرمی سے کہہ کر اس کا رخسار چھوا۔

”مجھے شہرام کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ محبت اس لڑکی کا ڈراما تھی۔“ اس کے لہجے میں تلخی گھلی۔ ”ورنہ قسمت نے اس لڑکی کو ایک موقع دیا تھا اختیار دیا تھا۔“

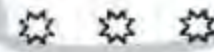
رامین کا دل کہیں بہت نیچے پھسلا اتنے سالوں بعد وہ لڑکی کسی مجھے ہوئے وکیل کی طرح اس کیس کی پرانی فائل کھولے اسے کٹہرے تک لے آئی تھی۔

وہ اختیار اسے اخلاقی اور معاشرتی اقدار سے گرانے والا اختیار تھا۔ وہ یہ سب سوچ سکتی تھی اسے بتا سکتی تھی نہ اس لڑکی کی صفائی میں کچھ بول سکتی تھی۔

”محبت کے سفر میں راستوں کا انتخاب اس سمت کرنا چاہیے جہاں اس عظیم جذبے کی توقیر کوئی حرف آئے نہ اسے سر جھکا کر جینا پڑے۔“ اس نے

”ایک بات کہوں شہرام! وہ آہستہ سے بولی ”تم نے سچ کہا کہ رنگ میری ذات سے اڑ چکے ہیں مگر مجھ میں اب بھی ایک رنگ ہے۔ جب موسم بدل جائے گا ان جھیلوں کا پانی رواں ہوگا۔ تو اسے چھو کے دیکھنا۔“

شہرام کی پیشانی پہ چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ ”تمہارا لمس جو رنگ بھی جھیلوں کو عطا کرے گا۔ وہ میرا ہوگا۔ مدھم مدھم گہرا کابل۔ ٹھنڈا روشن۔“ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پہ کانپے جب نے جھٹکا کھلایا۔ اس لڑکی کی ہنسی میں دیوانگی کی خوشبو جنگل میں اترتی شام کے وجود سے لپٹ رہی تھی۔



آج وہ سنبل کے گھر چائے پہ انوائٹ تھی۔ وہ بالکونی میں نشستیں جمائے برف باری کا نظارہ کر رہی تھی۔ سنبل کے دو بھائی کوسٹہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی ایک بہن منگلا ڈیم کے پاس رہتی تھی۔ ”تم یہاں اکیلی کیسے رہ سکتی ہو؟“ رامین نے نرمی سے پوچھا۔

”یہاں میرا دل لگ گیا ہے۔“ ذو معنی انداز سے بولی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے دل لگنے کی وجہ جانتی ہے وہ کتنی دیر کچھ بول نہیں سکی۔ اسے اس گلابی سی لڑکی پہ ترس آیا۔

”آپ انہیں کب سے جانتی ہیں؟“ اسے بغور دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”مجھے اسے جاننے کا تردد کبھی کرتا ہی نہیں پڑا۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو مجھ پہ ہمیشہ عیاں کیا۔ اور آپ انہیں کیوں جاننا چاہتی ہیں؟“ اس نے سنبل کی آنکھوں میں جھانکا تب ہی ورہ چائے لیے وہاں آئی۔ ”ناکہ میں یہ جان سکوں کہ انہیں اب محبت کرنا کیوں نہیں آتا۔“

دھڑ دھڑ دھڑ۔ رامین کے اندر لفظ ”اب“ نے تمام دروازے کھولے۔ اسے محبت کرنا ہی تو آتا

سے ملنا چاہوں، چھٹی مل جاتی ہے۔ ” وہ آنکھیں وہ چہرہ وہ لہجہ ایک شریر سی مسکراہٹ سے مزین تھا۔ اس کے سرخ چہرے پہ ایک مشتعل سی حیا نمایاں ہوئی۔

”یقین کرو مینو کہ جب بھی چھٹی لی تمہارے لیے ہی لی۔“ وہ اب اک برفانی ڈھلان پہ پہلو پہ پہلو چل رہے تھے۔ ”یہ الگ بات ہے کہ اس فوجی کو کسی نے چھو کے کبھی خوش بخت نہ کیا۔“ ایک ننھا سا لاؤ۔ اس لہجے میں بھڑکامل معمول سے ہٹ کر شوریدہ ہوا۔ سامنے ہی ایک چوڑے تنے کا درخت سجدہ نما جھکا ہوا تھا۔

اس گھنے درخت کی برفلی شاخوں سے ڈھکا ایک ٹین کا کیبن تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسی سائز کے ایک ٹکونے کیبن کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ وہ قریب پہنچے تو آہٹ — پا کر ٹکونے کیبن سے ایک آدمی نمودار ہوا، اس نے لمبا گیروے رنگ کا چغہ پہنا ہوا تھا۔ اس نے شہرام سے مصافحہ کیا۔

”ہم کچھ وقت مرشد صاحب کے حجرے میں قیام کر سکتے ہیں۔“ اس نے باادب ہو کر اجازت مانگی۔ اس چغہ پوش نے چوکور کیبن کا دروازہ کھولا، خفیف سی چرچر آہٹ ہوئی۔ زمین پہ ایک بوسیدہ قالین تھا، وہ اس کے برابر ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی ٹھنڈک نہیں تھی۔ دیوار میں بنی چھوٹی سی محراب میں چند موم بتیاں ماچس اور آگریتیاں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہی چغہ پوش آدمی چھال کی ٹرے میں چائے لے کر آیا، ساتھ خشک میوہ جات بھی تھے۔ شہرام نے چائے کے ایک کپ میں چاکلیٹ ملائی اور ٹرے سے اٹھا کر اسے پکڑا۔

”اور آپ؟“ وہ اسے دیکھنے لگی۔ ”میٹھی چائے چھوڑے بارہ سال گزر گئے۔“ وہ روانہ وار مسکرایا۔ اور اپنا کپ اٹھا کر نشست گاہ سے گھر نکالی۔ رامین کی سانسیں تھمیں۔

”تین سال مجھ جیسی بے وفالڑکی کو اس قدر کیوں یاد رکھا شہرام کہ زندگی کے اتنے قیمتی سال یوں ہی گزار

فقط اتنا کہا اور اجازت چاہی۔

”آپ ان سے اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ میں ان کے لیے کبھی میس چلی آؤں۔ بس وہ مجھے اتنی سی اجازت دے دیں۔“ وروہ نے شرمندگی کے ہزار جھٹکے کھائے۔

”چلیں یہ نہ سہی، مجھے اپنے راستوں میں کھڑا ہونے کی ہی اجازت دے دیں۔“ وروہ کا چہرہ فق ہوا۔ ”اچھی لڑکیاں راستوں میں کھڑی نہیں ہوتیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”مجھے اچھی لڑکی نہیں بننا۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔ ”بری لڑکیاں کبھی محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ صرف خواہش کو محبت کا نام دے سکتی ہیں۔“

سنبل کا چہرہ زرد ہوا۔ شاید رامین کے لہجے سے زرد رنگ بندھا تھا کہ انوں کا رنگ جو گیوں کا رنگ۔



تھوڑی دیر بعد وہ ایئر فورس میس کی مغربی سمت چڑھائی کی طرف گامزن تھے۔ دونوں اطراف آبشاریں تھیں۔

”ایک بات پوچھوں؟“ اس نے ایک ہاتھ کا دباؤ گھٹنے ڈالا اور آگے بڑھی۔ شہرام نے چہرہ موڑا۔ ”ایئر فورس والے تمہیں اتنی چھٹیاں کیسے دے دیتے ہیں؟“ وہ پھولے پھولے سانس کے ساتھ بولی۔ وہ اس کی بات پہ کھل کر ہنسا، پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ ”میں نے کوئی جوک تو نہیں سنایا۔“ وہ قدرے جھینپی۔

”در اصل میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک حسین اتفاق سے کیپٹن صاحب تمہارے بہنوئی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جن سے تم نے باقاعدہ اجازت طلب کی تھی کہ میں ایک فوجی کو چھو کے دیکھ لوں۔“

مدتوں بعد وہ نظر شوخ ہوئی تھی، وہ بھی اک عرصے بعد وہ سرخ ہوئی۔

”لہذا تمہارے اتنے شدید مخلصانہ جذبات سے پاک فوج ابھی تک متاثر ہے۔ اس لیے جب بھی تم

کہا وہ سن کر میرے اندر بھڑکتے دکھ پہ پانی پڑا تھا۔
انہوں نے کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

”جو فقیر کر دیتی ہے وہی محبت ہوتی ہے۔ مل جائے
تو ٹھیک۔ نہ ملے تو بھی ٹھیک۔“

”اس کے بعد مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ محبت نے
میری روح کی جانب کب سفر کیا، مجھے صبر سا آگیا۔“

آج رامین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتا رہے گفتگو تمام
نہ ہو۔ وہ اس کی خاموشی پہ بے قراری ہوئی۔ وہ عشق

کے قرینے اسی شخص سے پیار کے اس دوسرے شہر
میں سیکھ رہی تھی۔

”میں پہلے تمہیں چاہتی تھی، مگر مجھے تم سے عشق
اب ہوا ہے۔“ حجرے میں اگر بتی کی مہک محبت کو

کھینچ کر اپنی سانسوں سے لپٹنے لگی۔
”محبوب سونے کا نہیں ہوتا، خدا نے تمام انسانوں

کو مٹی سے بنایا ہے، مگر اس مٹی سے جتنی محبت ہم
عشق گزیدہ کرتے ہیں کوئی کیا جانے۔“ اس آرزو ہنسی

نے رامین کو ساکت کیا۔
”مٹی سے اتنی محبت نہیں کرتے شہرام! اسے مٹی

نے ہی سمیٹ لیتا ہے۔“ اس کی آواز آنسوؤں سے
بھیگی۔

”تو پھر وہ خود سے محبت کروائے، کسی ہمارے ہی
جیسے انسان کے لیے ہمیں کیوں بھٹکاتا ہے کہ ہم در بدر

ہو جاتے ہیں۔ وہ تو مختار کل ہے، پھر ہمیں اپنی ہی بنائی
ہوئی مٹی کی صورتوں کے لیے بے اختیار کیوں کر دیتا

ہے۔ ہماری توجہ ہمارا عشق اپنے تک کیوں نہیں
رکھتا۔“

محبت اس چھوٹی سی تگوتی محراب میں جلتی موم بتی
کی لو کے نیچے پناہ گزین ہوئی، مگر رامین کی سانسوں کو

دل کش بل پناہ دینے سے انکاری ہوا۔
وہ اس کی بن نما حجرے سے باہر آئی۔



”تو بے اس لڑکی کو دیکھو، اس موسم میں بھی چین
نہیں۔“ سٹبل کے جانے کے بعد کاشیہ نے اس کے

دلے۔ اس کی آواز غم سے بھیگی۔ دل میں گڑبی
چھانس نکالنے میں ایک لمحہ لگا گیا۔

”کوشش کی تھی، چاہا تھا کہ تمہیں بھلا دوں مگر
سارے جہاں کی خاک چھاننے کے بعد۔ وہ جیسی

جیسا لمحہ میرے سامنے آکر ٹھہر جاتا جب میں نے
تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو سوچو بعد کا تمام وقت۔ وہ

سارے سال۔ وہ ایک عرصہ کیسے بھلایا نا۔ اس دن
مجھے لگا تھا کہ میں نے پہلی بار اس کو دیکھا، میں نے

پہلی بار بارش کی بوندوں کو پتوں پہ دیکھا، سچ کہوں تو اس
کے بعد میری آنکھوں نے کچھ بھی خاص، کچھ بھی نیا

نہیں دیکھا۔ میں خانہ بدوش ہو گیا تھا۔ کہیں دل ہی
نہیں لگتا تھا۔“ وہ ایک آرزو سی ہنسی ہنسا۔

”ان چار پانچ سالوں میں بارہا، مبین کے گھر ایسے
مواقع بھی آئے کہ دل چاہا کہہ دوں۔ میں تمہیں چاہتا

ہوں مگر میری فہلنگز کا اظہار یہ الفاظ نہیں کر سکتے
تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ دنیا میں وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو

میرے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔“
اس حجرے میں خاموشی اور خوشبو تک ساکت

ہوئی۔ اس پل وہ بھی ایک خانہ بدوش ہو گئی تھی۔ وہ
اس لہجے کے جاوئی، سحر انگیز جملوں میں ان لفظوں

کے سنہری قمقمے روشن کرتی پھر رہی تھی۔
”اس دن میں تمہارے گھر سے سیدھا آرمی میں

چلا گیا تھا اور اسی رات یہاں آنے والے ایک آفسر
کے ساتھ میں واوی میں آگیا۔ مجھے لگتا تھا میرے اندر

ہر چیز ٹوٹ پھوٹ چکی ہے جسے جوڑنا ناممکن نہیں۔
میں نے کئی ماہ اسی حالت میں گزار دیے۔

پھر ایک روز میرا دوست نیل جو اب ونگ کمانڈر
ہے، یہاں ایک اپنے مرشد کے پاس لے آیا جو یہاں

تیلنگی دورے پہ آئے ہوئے تھے۔ ان ہی بزرگ کے
کہنے پر وہ مجھے یہاں چھوڑ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے تھے، کہتے

کچھ نہیں تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے سے میری
بے قراری بڑھ جاتی۔ ایک رات میں نے تمہیں

خواب میں دیکھا اور میں غنودگی میں تمہارا نام لے کر
روتا رہا۔ دوسری شب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور جو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”تم نے ہمیشہ میرے ساتھ برا کیا“ ہوا رہتا نہیں تم
اسے کہاں سے ڈھونڈ کر میرے مد مقابل لے آئی
ہو۔ ”پہلے لوجہ بھگا، پھر آنکھیں چھلکیں۔ اس نے تنی
ہوئی گردن پہ بہتا گرم پانی ہتھیلیوں سے پونچھا۔ پتا
نہیں وہ کون سا دن تھا جس دن محبت کا شہہ مبین کے گھر
کی دیواروں کے ساتھ گھات لگائے بیٹھی تھی۔



”سالی اور گھر والی ہمہ تن گوش ہوں کہ مہمان
آچکے ہیں جب کہ کھانا ابھی تک آدھے ادھورے
مراحل میں ہے۔ تم دونوں ست خواتین میں اول
انعام یافتہ ہو۔“ مبین نے کچھ چھیڑتے ہوئے کچھ
مسکراتے ہوئے بیوی کو دیکھا۔

”جناب آپ کو اجازت ہے ہشیار قطار میں اول
انعام یافتہ خاتون لے آئیں۔“ کاشیہ نے مسکراتے
شوہر کو گھورا اور کڑاہی سے بروٹس پیس نکالا۔
راہین جو فریج سے مسالا لگی فش نکال چکی تھی۔
پالہ کچن سلیب پر تقریباً بیٹھا۔

”ارے۔۔۔ بریگیڈ سیرچا آگئے، میں ذرا پاک فوج کو
سیلوٹ مار کے ابھی آئی۔“ وہ کچن سے ملحقہ لاؤنج کی
جانب سرپٹ بھاگی، مگر نگاہ سامنے اٹھتے ہی قدم من
من بھر کے ہوئے۔ سامنے یکسر اجنبی بندہ تروتازہ
چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ سجائے جو کہ یقیناً اس کی
سیلوٹ والی بات سن چکا تھا اب پر شوق چمکتی نگاہوں
سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہڑبڑا کے پلٹی۔

”یہ بے چارا بھی پاک فوج کا حصہ ہے سیلوٹ بے
شک مت کرو، سلام تو کرو۔“ مبین نے اسے روکا تو
مریل سی آواز میں سلام کیا جس کا جواب کچھ زیادہ ہی
توانا مسکراہٹ سے دیا گیا۔

”اور آپ کے بریگیڈ سیرچا ابھی دیگر مہمانوں کا
سرپیر کھا رہے ہیں۔“ راہین کی گھوری کٹ وار تھی۔
”میرا مطلب ہے ان کے ساتھ ہیں۔“ فوراً بیان
بدلا۔ ”ابھی آپ کو اتنی ہی پاک فوج پہ گزارا کرنا
ہو گا۔“ اشارہ پھر اجنبی کی طرف کیا۔

لتے لیے تھے۔
راہین جو ابھی تک سنبل کی بات میں الجھی تھی،
کچھ بڑبڑا کر ہی ہو کر بولی۔
”مجھے تو لگتا ہے یہ شہرام میں انوالو ہے۔“ کاشیہ
جیلے کی پھانس اس کے حلق میں اڑکا کر کمرے سے چلی
گئی۔

سنبل نے اسے میس کی طرف جاتے اور پھر واپسی
پر شہرام کے ساتھ آتے بھی دیکھا تھا۔
”آپ نے میرا پیغام کمانڈر تک پہنچایا؟“ کاشیہ کے
ادھر ادھر ہوتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔ راہین
کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی۔
”میں جانتی ہوں، آپ دونوں دن بھر ساتھ رہے
ہیں۔“

وہ اسے کیا بتائی کہ اس بندے کی گفتگو کس کے ذکر
سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ کوئی
آدھے گھنٹے بعد کاشیہ بڑی سنجیدگی سے اس کے سامنے
آکر بیٹھی تھی۔

”بہت سارا سوچنے کے بعد میں ایک نتیجے پہ پہنچی
ہوں۔“ اس نے سرخ پالش سے رنگے ناخنوں کو
ریمور سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کہ آئندہ تمہاری چوائس سرخ کیونکس نہیں
ہوگی۔“ اس نے کشمش اور یادام ملا کر منہ میں ڈالا،
ساتھ ہی سرکتی شال کندھوں پہ نکالی۔ کاشیہ نے ہاتھ
روک کر اسے جیکھی نظروں سے دیکھا۔

”میں نہیں چاہتی کہ اس کے خاندان کی بددعائیں
تا عمر تمہارا پیچھا کریں۔ تم اسے کسی سے بھی شادی
کے لیے رضامند کرو۔“ اس نے انتہائی سکون سے کہہ
کر اس کا سکون تہہ وبالا کیا۔ اس کے چہرے پر زردی
چھائی تھی، موت کی سی زردی۔



کاشیہ نے پھریری لی اور اس کے ہاتھوں کو یوں ڈر
کے چھوا جیسے اس کے چھوتے ہی وہ غائب ہو جائے
گی۔

میں اپنی دھن میں ایک بات کہہ کے پیوی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

پھر مبین شہرام کو بتانے لگا کہ آرمی کی متوالی راین کس طرح اس کے پروپونل پہ لٹو ہوئی کہ رشتہ کروا کے ہی دم لیا۔ کچھ واقعات اسے کاشیہ نے سنائے کہ کس طرح مری میں پنڈی پوائنٹ پر فوجیوں کی رہائش گاہیں دیکھنے کی خاطر وہاں ڈیوٹی پہ موجود گارڈ کی یہ متیں کرتی تھی اور وہ اندر کمرے میں کاشیہ کی گردن موڑنے کے پروگرام بناتی رہی۔



اسے ہر وہ شہرا چھا لگتا جہاں ڈھیروں کی تعداد میں فوجی جوان مٹر گشت کر رہے ہوتے۔ فیملی ٹوورز پہ جب بھی ان کا وادی جانا ہوتا تو وہ سب آتے اور جاتے ہوئے ایامیوں کے درینہ دوست بریگیڈ پروانٹن عظیم کے گھر کینٹ ایریا میں ضرور ہی قیام کرتے تھے اور وہ بیرونی گیٹ پہ کھڑی آرمی آفیسرز کے بچوں کو بھی شوق و محبت سے دیکھتی رہتی۔ فوجیوں کی رہائش گاہیں اس کے لیے ہمیشہ ایک تصور آتی دنیا کی مانند رہیں اور ایک ایسا پنل باکس جیسے وہ ہمیشہ کھولنے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی۔ ابا کے ان ہی دوست کے توسط سے لینٹن مبین سعود کا رشتہ آیا تو اس کے پاؤں خوشی اور غرور سے زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ انہیں ”ہاں“ کر کے واپس بھیجا جائے۔ جب اماں نے سوچنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت مانگی تو اس کی بلاوجہ کی بھوک ہڑتال پہ انہوں نے اس کی پشت پہ دو دھمو کے جڑ کے کہا۔ ”تاوان! ایسے ہی منہ پھاڑ کے تھوڑی ہاں کہہ دیتے ہیں۔“

رشتہ طے کرنے سے پہلے سو باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ ”اماں نے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے کھسائی۔“

”آپ بس یہ بات دیکھیں کہ لڑکا فوجی ہے۔ باقی تناوے ہاتوں پہ لعنت بھیجیں۔“ تو ساتھ ہی لیٹی کاشیہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

وہ کھیانی سی ہوئی۔ ”اس بار وہ دونوں ایک ساتھ ہنسنے تھے اب وہ شرمائی اور کچن کی طرف دوڑ لگائی۔“

”یہ بندہ صرف مبین کا دوست ہی نہیں دونوں کی برسوں ہمسائیگی رہی ہے۔ یہ تو مبین شادی کے بعد کینٹ شفٹ ہوئے ہیں۔ شہرام جب بھی گھر آئے تو ہماری طرف ضرور آتا ہے۔“ کاشیہ نے اسے بتایا۔

”اب تم سب چھوڑو فنانٹ ٹیمبل سیٹ کرو اور محنت کو میرے پاس بھیجو۔ سارے جہاں کی فنکسی لڑکی ہے۔“ کاشیہ بدبھائی۔

”میں کھانا ڈش آؤٹ کرنے لگی ہوں۔“ اس کی نگاہوں کی دلچسپی ذہن میں ابھری تو وہ رک سی گئی۔

”فوفہ جاؤ گی۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ کاشیہ نے آنکھیں دکھائیں تو ناچار ڈانٹنگ روم تک جانا پڑا۔

”شکر ہے لاؤنج خالی ہے۔“ مگر اسانس بھرا۔ بس وہاں اب مردانہ کلون کی مسک تھی۔

”شہرام تمہاری وجہ سے جھج گیا ہے ورنہ ابھی کچن میں آکر تمام ڈشز چکھ چکا ہوتا۔“ اب وہ دونوں کچن ٹیمبل پہ ہی کھانا کھا رہی تھیں۔ کاشیہ کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد راین پہلی مرتبہ وہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

پھر وقت بے وقت راین کو اس کی آمد کو وقت زدہ سا کر دیتی۔ ”ہم نے تو سن رکھا تھا کہ وادی کی وفات پہ بھی آرمی والوں کو یہ مشکل چھٹی ملتی ہے، مگر مبین بھائی کے دوست کے لیے فوجیوں کے پاس کوئی کام کارج نہیں۔“ وہ منہ کے زاویے رنگاڑ کر بولی اور جب کاشیہ کی گہری ہوتی مسکراہٹ پر اس کے عقب میں جھانکا تو وہ پس پشت کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے رخ سیدھا کیا۔

”یہ بندہ پائلٹ کے عہدے پہ اینڈین ایر فورس میں بھرتی نہیں ہوا۔ یہ بھی پاکستانی آرمی آفیسر ہے۔ لہذا پاک فوج سے محبت کا دم بھرنے والوں کو اس آفیسر سے کبھی محبت کا مظاہرہ دکھانا چاہیے۔“

”اللہ۔۔۔“ اچانک چہرہ گلابی ہوا۔ سیٹا کے اسے دیکھا۔ وہ اس کی کیفیت سے محفوظ سا ہو کے ہنسا۔

”کاشیہ! کیوں رو رہی ہو۔“ رائین نے اس کی آنکھوں پر دھرا بازو ہٹایا۔
”نہیں تو۔“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

”کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو؟“ اس نے ملگجے اندھیرے میں اندازے کا تیر چلایا۔
”ارے نہیں بابا! وہ کچھ جھنجھلائی۔“

”تو پھر یقیناً نازنین آبی کی کسی بات پہ دیکھ پہنچا ہو گا۔“ اس بات پہ کاشیہ چسکی رہی۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ جبران ان کا بھائی تھا جسے پیدا ہوتے ہی خالہ کلثوم کو دے دیا گیا، مگر بانی کی کہانی سے سولہ سالہ رائین لاعلم تھی۔

”ماضی میں جو بھی ہوا، میری رضا سے تو نہیں ہوا تھا۔ اگر چچا مشتاق نے اس کے اچھے مستقبل کی وجہ سے کینڈا بھیج دیا تھا تو اس فیصلے میں بھی میری مرضی نہیں تھی اور نہ ہی وہاں جبران نے میرے مشورے سے انڈین مسلم لڑکی سے شادی کی۔“ آنسوؤں سے بھرا اس کا دردناک لہجہ رائین کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔

”اچھا چھوڑو بھی۔ خوشی کے موقع پہ آنسو بہانا نیک شگون نہیں ہوتا۔“ اس خاندانی قصے میں اس کو ریتی برابر دلچسپی نہیں تھی۔ آج کل وہ بس اتنا چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس کی شادی کینڈن مبین سے ہو جائے تاکہ کاشیہ بھی کینڈن میں رہائش پذیر ہو۔ اس کی عمر کا تقاضا تھا یا پھر وہ اپنی پہلی خواہش کے پورا ہونے پہ خوش تھی مگر اس کو پر لگ گئے تھے۔



حیات، مشتاق، طارق اور فاضل چاروں بھائیوں کا کپڑے کا سا بچھا کاروبار تھا۔ دو کنال کی کوٹھی میں وہ اوپر نیچے رہائش پذیر تھے پچن چاروں کا الگ تھا۔ ان کی اکلوتی بہن ناظمہ بھی قریب ہی رہائش پذیر تھی۔
مشتاق بھائیوں میں ذرا رنگین مزاج قسم کا یا رہا باش بندہ تھا۔ اس کے تعلقات ہر قسم کے لوگوں کے

دو گھنٹوں سے جاری اس بحث و مباحثے سے بے نیاز نازنین نے نی وی بند کر کے رائین کی طرف رخ موڑا۔

”دینیو! کیوں دو دونوں سے سب کا مغز کھا رہی ہو۔ اگر امی اس پر پوزنل یہ راضی نہیں تو خالہ کلثوم کے آگے عرضی ڈالو۔ وہ بھی کاشیہ کی ماں ہوتی ہیں کیا پتا تمہارا کام بن جائے۔“

بات کے اختتام پہ اس کے ہونٹوں پہ مزالینے جیسی مسکراہٹ ابھری۔ جہاں کاشیہ کا وجود ساکت ہوا وہیں ماں نے بھی نازنین کو ملاستی نظر سے گھورا جب کہ رائین کو بنا سوچے سمجھے اس کی تجویز پسند آئی۔ ماں کے ارے۔ ارے۔ ارے کہنے تک وہ مرکزی دروازہ پار کر چکی تھی۔

شام کی چائے نہ صرف خالہ بلکہ دونوں تایوں اور ایک چچی بمعہ اکلوتی پھوپھی۔ وہ سب کو ہال نما کمرے میں اکٹھا کر چکی تھی، تھوڑی دیر بعد گھر کے تمام مرد بھی وہیں جمع ہونے لگے۔ ماں نے رشتے کی بابت جب اس کی بھوک ہڑتال کا تذکرہ کیا تو وہاں ایک قہقہوں کا طوفان اٹھ آیا تھا۔

”ارے بھئی میری بیٹی کئی پاکستانی ہے۔ خالہ بیگم! وطن کی سرحدوں پہ تعینات فوجیوں کے لیے بھوک ہڑتال تو بنتی ہے نا۔“

ابا آنکھوں میں محبت کی چمک بھر کے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہاں موجود تمام افراد کی اتفاق رائے سے پروپونل قبول کرتے ہوئے اسی وقت لڑکے والوں کو ٹیلی فون پہ جواب قبول ہے کی صورت سنا دیا گیا۔ رائین تو صحن میں جا کر باقاعدہ بھنگڑا ڈالنے لگی تھی۔

”خالہ جی۔ مانا کہ ایبٹ آباد یہاں سے دور ہے، مگر کینڈا اجتنا نہیں پھر آپ کا چہرہ کیوں بچھ سا گیا ہے۔“ نازنین سلکتی ہوئی چنگاری کو پھونک مار کر وہاں سے اٹھ گئی تھی، مگر وہاں موجود تمام بچھے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

ساتھ تھے۔ جلد ہی بھائیوں کو پتا چل گیا کہ وہ ایک گانے والی کے چکر میں پڑ چکا ہے۔ انہوں نے یہ خبر راز داری سے ماں کے کانوں میں ڈالی۔ ماں نے سوچ بچار کے بعد قریبی رشتہ داروں میں جھٹ مٹگنی پٹ بیاہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

مشاق کے دل میں عشق کا تازہ تازہ بھوت سایا ہوا تھا۔ بھلا ان حالات میں بیوی کیسے دل پر چڑھتی۔ جدی پشتی خاندانی لوگ تھے۔ ریت رواجوں کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانے والے۔ ان کے خاندان میں دوسری شادی کا رواج قطعاً نہیں تھا۔ بے اولادی کی صورت میں بہن بھائیوں سے بچہ گود لے لیا جاتا۔ بصورت دیگر اگر کوئی اپنا بچہ دینے پر رضامند نہ ہو تا تو برادری بہ امر مجبوری دوسری شادی کی اجازت دے دیتی۔

مشاق جانتا تھا کہ بے اولادی ہی دوسری شادی کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ کلثوم جانتی تھی کہ شوہر بے ایمانی میں کمال کے درجوں پہ جا پہنچا ہے بقول گاناکا لوجسٹ کہ تم میں کوئی نقص نہیں تمہارا شوہر تم سے اولاد نہیں چاہتا۔

اسی کھینچا تانی میں تین سال گزر گئے۔ ساس اس کی چھوٹی بہن خالدہ کو حیات کے لیے بیاہ لائی۔ بیٹی نے (ناظمہ) سوا اعتراض کئے کہ ایک گھر میں دو بہنیں لکڑیوں کا گٹھ بن جاتی ہیں کوئی انہیں توڑ کر تو دکھائے۔ بیٹی کے ناک منہ چڑھانے پہ ماں بس مسکراتی رہی۔

”تو دس ماہ بعد خدا نے انہیں بیٹا دیا۔“ داوی نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے پوتا اٹھا کے کلثوم کی جھولی میں ڈال دیا۔ تمام بھائی انگشت بدنداں رہ گئے۔ جانتے تھے کہ بھائی کون سے خواب دیکھ رہا ہے سوا انہوں نے ماں کے اس فیصلے کو دل و جان سے قبول کیا۔ پورشن ایک ہی تھا بچہ اکثر خالدہ کی گود میں ہوتا۔

مشاق تازہ تازہ زخمی تھا۔ سوز خم دینے کا خوب سوچا۔ ناظمہ شروع سے ہی بھائی سے اٹھ چلا تھی۔ بہن بھائی نے سرجوڑ کے صلاح کی۔ ناظمہ نے اپنا گھر بھائی کے حوالے کیا اور خود اس کے پورشن کی مکین بن

گئی۔ کلثوم اور خالدہ صبر کے گھونٹ مینے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔ چند ماہ بچے سے لا روائی برتنے کے بعد مشاق کا دل جبران کی جانب مائل ہونے لگا۔ دوسری شادی کا جواز بھی جیسے دم توڑ چکا تھا۔ بھائی کے ہر اچھے برے راز کی واقف ناظمہ کو یہ تبدیلی کچھ خاص نہیں بھائی تھی تاہم اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

جبران چار سال کا تھا جب خالدہ حیات کے آنگن میں نازنین کی صورت رحمت نازل ہوئی۔ نازنین نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو کلثوم کو خدا نے جڑواں بیٹیوں سے نوازا۔ جب خالدہ نے دیکھا کہ بہن سے جڑواں بچیوں کی دیکھ بھال صحیح طور نہیں ہو رہی تو کاشیہ کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے گھر لے آئی، مگر وہ بچی خالدہ سے کچھ یوں اٹھیج ہوئی کہ پھر کبھی واپس کلثوم کی گود میں نہ گئی۔ دونوں بچیاں آٹھ سال کی ہوئیں تو اللہ نے رامین کو ان کی زندگی میں بھیجا۔ خالدہ کے باقی دیور بھی شادی شدہ اور بال بچوں والے ہو چکے تھے اور ساس بھی اب حیات نہیں تھیں۔

جب رامین ہونے والی تھی تو ناظمہ پھوپھو دن رات نازنین سے بھائی کی آمد کی دعائیں کرواتی تھی۔ انہوں نے ہی نازنین کو بتایا کہ تمہاری ماں بہن کو پھول دے کر بدلے میں کاشیہ کی صورت بہول لے آئیں۔

تھی نازنین کو ماں کا یہ سودا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”تیرے حصے کی محبت کے ساتھ ساتھ کاشیہ نے ہمیشہ تیرے حصے کا کھایا پیا اور پہننا۔ کاشیہ کی جڑواں بہن آسیہ تیرے بھائی سے سارا دن ناز نخرے اٹھواتی ہے۔ میرا بھائی کہتے کہتے زبان نہیں کھلتی۔“

بڑھتی عمر کے ساتھ خالہ اور اس کی بیٹیوں سے اس کا عناد بڑھتا چلا گیا۔ خدا نے بھائی کی خواہش بھی پوری نہیں کی، لٹا سوکھی سڑی رامین اس کا باقی ماندہ پیار بھی ماں سے وصول کرنے آگئی۔ سوا اس کے پیدا ہوتے ہی بہن سے اک بیر سا باندھ لیا۔ ایک نظر نہ آنے والا

ذہنی اور دلی فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا۔ خاص کر بقول پھوپھی کے بھائی کے بدلے میں آنے والی کاشیہ کو ہمیشہ اس نے نچا دکھانے کی کوشش کی۔

اس کے ذہن کے سفید کورے کپڑے یہ اکسانے والیوں نے کینہ اور نفرت کے جو رنگ پھینکے تھے وہ اتنے یکے ثابت ہوئے کہ خالدہ کی تربیت و محبت کا پانی بھی انہیں اتارنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ جب اس کے باپ نے ان کے گھر آنے والا پہلا پروپوزل کاشیہ کے کھاتے میں ڈال دیا تو نازنین کی بدگمانی کو ایک نئی راہ مل گئی۔ ایسی راہ جس میں صرف خاراگتے ہیں۔



رامن گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس پنڈی آئی تو گھر میں ایک نیا قصہ زیر بحث تھا۔ ناظمہ کا ولی عہد خالہ گلشوم کی بیٹی آسیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر بقول پھوپھی کے بسو کے روپ میں اس نے ہمیشہ نازنین کو ہی دیکھا تھا۔ فرسٹ ایر میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ گھر کے حالات اس قدر تیزاڑے تھے کہ ماں اور نازنین میں بات چیت تقریباً بند تھی۔ وہ ایک بو جھل دن تھا۔ وہ کلج سے آئی تو بہن اور ماں کو بلند آواز میں باتیں کرتے سنا۔ جھگڑے کی وجہ آسیہ کی طرف بھیجے جانے والے جبران کے گفت تھے۔

”بھائی ہے وہ اس کا۔“ امی کے لہجے میں دہلی دہلی غراہٹ تھی۔

”ایسا کبھی نہ ہوتا، امی! آج وہ ابا کا سہارا ہوتا اور ہمارے لیے کمار ہوتا۔“ وہ ماں سے دوہرہ ہو کر بولی۔

”جس کی قسمت میں جہاں کا دانہ پانی ہوتا ہے اس کا ٹھکانہ بھی وہیں ہوتا ہے۔“ امی کا لہجہ دھیما ہوا۔

”خالہ تو ہمیشہ فائدے میں رہیں۔ آپ کا بیٹا، تھیا کر کمائیاں کھا رہی ہیں اور بیٹی آپ کو سوپ کر جینز کے خرچوں سے آزاد ہو میں۔“ اب وہ خالہ اور ان کے بچوں کو باقاعدہ کوٹنے دینے لگی۔

”آپ ہر وقت امی کو ٹینشن میں کیوں مبتلا رکھتی ہیں۔“ رامن سے رہانہ گیا تو بھڑکے چہرے میں

ہاتھ دے بیٹھی۔

”چپ کرو تم۔ ابھی ہمارے معاملات میں تمہاری دخل اندازی کی عمر نہیں ہے۔“ وہ غضب ناک ہو کر بولی۔ نازنین اسے ہمیشہ دبا کر رکھتی تھی۔ اسے بڑی بہنوں والا پیار سا کاشیہ سے ملا اور وہ اسی کے ہی قریب رہی۔

”بری بات ہے بیٹا، چھوٹی بہنوں سے یوں مخاطب نہیں ہوتے۔“ اندر آتے حیات نے بیٹی کی آخری بات سنی تھی جس کے چہرے پہ لمحہ بھر کو ہوائیاں سی اڑیں۔

”وہ ابا دراصل۔۔۔ مم۔ میں وہ بے ربطی سے بولتی ادھر ادھر ہو گئی۔“

ابھی وہ کھانا کھا رہے تھے کہ ناظمہ اپنا دکھڑا لے کر آگئیں۔ نازنین کو پھوپھی زاد کزن سے کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا، مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ خالہ کی بیٹی کو اس پر ترجیح دی جائے۔ سو دروازے سے کان لگا کر اندر ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

”ناظمہ! تم اچھی طرح جانتی ہو مشتاق کو شراب کی لت نے اندر سے ختم کر دیا ہے۔ میرے لیے آسیہ اور نازنین میں کوئی فرق نہیں۔ میرا بھائی جگر کا مریض ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کی بچی اس کی آنکھوں کے سامنے رخصت ہو اور پھر کیا بھول گئیں۔ مشتاق تمہارا بھائی کم دوست زیادہ تھا۔“ ابا کی آنکھیں نم ہوئیں اور ناظمہ کا دل نم ہوا اور نرم بھی ہو گیا۔ نازنین پیر پختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے ایک ماہ کے اندر آسیہ رخصت ہو کر ان کے پورشن میں آگئی تو رامن کو کاشیہ کی کمی پوری ہوتی محسوس ہوئی۔ نازنین نے یونیورسٹی میں اپنی دوستوں کا حلقہ وسیع کر لیا تھا۔ اب گھر میں ماں سے بھی اس کی تو تکرار کم ہو گئی تھی، مگر رامن سے وہ سارے ذاتی کام کسی نوکرانی کی طرح کرواتی تھی اور وہ بھی گھر کا ماحول پرسکون رکھنے کے لیے اس کی خدمت کو ہمہ وقت تیار رہتی۔



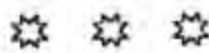
سو مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا اور
 رامن نے بھوک نہ ہونے کے باوجود اس کٹھور کے
 سامنے جس کی آنکھیں ابھی تک مسکرا رہی تھیں
 میکرونی پس ہری مرجوں کی بھری پلیٹ یہ جتانے کے
 لیے کھائی کہ سالہ نہیں بدلا تھا۔ وہ اسے کھاتا دیکھ کر
 حیران ہوتا رہا۔

”مینیو! سویٹ ڈش میں کیا بنایا ہے؟“ کاشیہ کے
 استفسار پر پندرہ منٹ بعد وہ انتہائی بیش قیمت نازک
 کپوں میں چائے لے آئی تھی۔ ان دونوں کو سرو کرنے
 کے بعد قدرے فاصلے پہ دھرا تیسرا کپ شہرام کو تھمایا۔
 کپ تھامتے ہوئے اس نے تسلی سے اس کا چہرہ دیکھا
 اور پہلا گھونٹ بھرتے ہی اسے لگا تھا کہ وہ پورے کھلے
 منہ کے ساتھ چینی کی پوری میں گرا ہے۔

”ارے بھئی وہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ سویٹ
 ڈش۔“ کیپٹن صاحب کان کھجا کر بولے۔

”یہ سے نا“ اس نے چائے کی جانب اشارہ کیا اور
 دور ماک لگا کر بیٹھ گئی کہ مجھے تاکنے والا بنا رہا اٹھائے
 رازپی جائے گا یا پھر اگلے دے گا، مگر اس وقت اس کی
 حیرانی حدود سے باہر ہوئی جب نوخیز محبت کی پہلی سطرس
 سنانے والی ان آنکھوں میں وہ تمام مٹھاس سمٹ آئی کہ
 دور بیٹھی رامن کی نگاہیں چسکنے لگیں۔ تو کیا صفحات
 محبت کی پہلی سطرس اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں
 دل۔ بے طرح دھڑکا تو؟ اس نے وہاں سے کھسکنا
 مناسب سمجھا۔ ہواؤں کے سنگ اڑنے والے اجنبی
 نے رازپی لیا تھا مگر حال دل اگل دیا تھا۔

صبح رامن نے دیکھا کہ دیوار پہ چڑھی سفید چینی کی
 تیل پہ ایک تروانہ سرخ گلاب گھلا ہوا تھا۔ جس کی
 خوشبو چینی کی مہک سے لپٹ کر دریافت کی سماعتوں
 کو تیسرا راز دار بنا رہی تھی۔



نازمین اب اٹھائیسویں برس سے نکل رہی تھی۔
 وہ ہر آنے والے رشتے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر
 مسترد کر دیتی وہ چاہتی تھی کہ اس کا چاند چہرہ صبح و شام

حسب معمول وہ سرویوں اور گرمیوں کی چھٹیاں
 ایٹ آباد کاشیہ کے گھر گزارتی تھی۔ ابا کے دوست
 بھی اکثر وہی آجاتے۔ فوجیوں کے قصے سن سن کے
 اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔ اس کی ایٹ آباد موجودگی پر
 شہرام کی چھٹیاں بھی آئے دن ہوتیں اور کیوں ہوتی
 تھیں۔ فوجیوں کی دلدادہ اٹھارہ سالہ خوب لڑکی سمجھ
 رہی تھی کہ وہ بھی ایک آرمی آفسر کی نظر میں ہے۔

کاشیہ آج عصر کے بعد سے ہی رات کے کھانے کی
 تیاریوں میں مشغول تھی کہ اتفاقاً ”مغرب کے بعد اس
 کے پاؤں میں موج آگئی اور رامن جو ابھی صرف کچن
 خواتین کی مددگار بنی ہوئی تھی۔ اب ڈنر کا اہتمام اس
 اکیلی کو کرنا تھا وہ اس افتاد پہ بوکھلائی ضرور، مگر ہمت کا
 ہاتھ نہیں چھوڑا اور ٹھیک نوبت پہ وہ ڈنر ٹیبل سیٹ
 کر چکی تھی اور اب ڈائننگ روم میں تین افراد اس کے
 خیال کے مطابق ڈنر پہ نوٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔
 صورت حال کی جانچ پڑتال کے لیے اس نے لاؤنج کا وہ
 حصہ منتخب کیا جہاں سے براہ راست کارروائی دیکھی
 جاسکتی تھی۔

”بھابھی! ذرا دیکھیں میرے سامنے خود کش فش تو
 نہیں۔“ اس نے کچھپ میں لت پت ایک پیس اٹھا
 کر کہا۔ کاشیہ کی آنکھیں مارے تحیر کے پوری کھلیں۔
 ”مینیو کی بجی! کچھپ فرائیڈ رائس میں ڈالنے کے
 لیے منگوائی تھی۔“ وہ بے ساختہ بول پڑی۔

”مجھے لگتا ہے آپ کے کک نے میکرونی اور چائینیز
 رائس کا سالہ بدل دیا ہے۔“ شہرام کے قہقہے نے اس
 کا دل اندر تک جلایا۔ سفید ایلے چاول جن میں کالی
 مرچ اور ہری مرچ کی جھلک واضح تھی۔ وہ ہنس ہنس
 کے بے حال ہو رہا تھا اور اسے بے حال کر رہا تھا۔ وہ
 بھی شرمندگی اور غصے سے۔ میکرونی کی ڈش پہ ہری
 مرجوں اور لیموں کا انبار تھا۔

”اوشٹ اب آفسر! یہ ہمارے کک کی اسپیشل
 ڈشز ہیں جو کسی بھی ایمر جنسی کے پیش نظر وہ مہارت
 سے تیار کرتا ہے۔“
 مہین کو اس کی پریشان صورت دیکھ کر ترس آگیا۔

ہے۔“ راجین اس کی بات پہ اپنے دھیان سے چونکی۔
 ”ہو سکتا ہے اس کے والدین اس کی منگنی یا شادی
 وغیرہ کے سلسلے میں آرہے ہوں۔“ اس کا دل یہ سن
 کے دھڑکا۔

کسی سوچ کے تحت اچانک کاشیہ کی آنکھیں
 چمکیں۔

”مینو! شہرام کے لیے نازنین کیسی رہے گی؟“
 کاشیہ نے اس کا دل بھاری چمکی کے نیچے دھکیلا۔

”آل۔ ہاں۔ پتا نہیں۔ وہ ذرا سے توقف سے
 بولی۔“ مطلب نازنین کے مزاج اور ہی طرح کے
 ہیں۔“ کاشیہ کی گھوری پہ اس نے بوکھلا کر وضاحت
 پیش کی۔

”دونوں کی جوڑی خوب بنے گی۔“ اس نے خیالوں
 میں رشتہ رکا کرتے ہوئے دونوں کو ایک ساتھ بٹھا کے
 دیکھا۔ وہ مطمئن سی ہو کر بولی، مگر اس کا چین و قرار
 لحوں میں غارت کیا۔

”دراصل اس کی ماما اس کی شادی اپنے میکے میں
 کرنا چاہتی ہیں۔“

بیٹھے ایک اور دریا کا سامنا کاشیہ کی ہلکی آواز پہ بھی
 دل بوجھ زور ہوا۔

”ان ماں بیٹے میں فاصلے محسوس نہیں ہوتے مگر وہ
 عورت اس کی خواہشوں کے عادتوں کے یوں متضاد
 چلتی ہے کہ وہ اگر مشرق کی طرف منہ کر کے چھٹکے گا تو
 فوری اختلاف ہو گا کہ منہ مغرب کی طرف کیوں نہیں
 تھا۔“ کاشیہ کے انداز میں شہرام کی ماں کے لیے
 ناپسندیدگی اسے بری کھلی۔

”ایسا تو سوتیلی مائیں کرتی ہیں۔“ رائے سے
 بروقت نوازا۔

”اس لیے وہ بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ مگر انکل معید
 اس پہ جان چھڑکتے ہیں، شہرام کی ہر بات ان کے لیے
 حرف آخر ہے۔“

اس نے لاہروائی سے کندھے اچکائے بات اسی
 جگہ آئی گئی ہو گئی تھی، مگر وہ جیسے ایک دم خود پہ منکشف
 ہوئی۔ ایبٹ آباد آنے کی کوئی ایک وجہ اس چہرے کی

کوئی ایسا شخص دیکھے جو خود مانند آفتاب ہو۔ راجین بی
 اے کر چکی تھی اور مزید تعلیم کے لیے ابھی یونیورسٹی
 کے انتخاب پر سوچ بچار ہو رہا تھا۔

شادی کے چار سال بعد کاشیہ کو ماں بننے کی نوید ملی
 ابھی وہ اس خبر پر ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں
 ہو پائی تھی کہ وہ نوید اس سے چھن بھی گئی۔ خاندان
 کے تمام افراد کے بعد دیگرے اس سے اظہار افسوس
 کی غرض سے آئے۔ وہ اس کی تکلیف کم نہیں کر سکتے
 تھے مگر اپنائیت و محبت کا بھرپور احساس دلا کر اس کا دکھ
 بانٹ سکتے تھے۔

نازنین نے اس کے گھر پہلی بار آکر نہ صرف اس
 کے ٹھٹھا ہاتھ دیکھے بلکہ مبین جیسے خوب مرد کو کاشیہ
 کے آگے پیچھے پھرنا دیکھ کر اسے اپنے باپ کے اس
 فیصلے سے سخت رنج ہوا۔

دوسری جانب پوتے کی آمد کے ساتھ ہی پھوپھی
 ناظمہ نے بھی آسیہ سے دوستانہ تعلقات استوار
 کر لیے تھے۔ ان دونوں بہنوں کی سسرال میں عزت و
 توقیر نازنین کو اپنی کمتری اور بے عزتی محسوس ہونے
 لگی۔ کچھ دن ٹھہر کر بانی اہل خانہ واپس چلے گئے مگر
 راجین کو خالہ امی کی منت کر کے کاشیہ نے روک
 لیا۔ جب یہ یونی جانے لگے گی تو اس کے پاس یہاں
 رہنے کے لیے کہاں وقت ہو گا۔ اماں کا اعتراض اس
 مرتبہ اس کی طبیعت کے پیش نظر کچھ ڈھیلا سا تھا کہ
 مبین لاکھ اچھا سہی باپ کی جگہ سہی مگر ہے تو غیر ہی۔
 وغیرہ وغیرہ۔

اسے آئے ایک ڈیڑھ ہفتہ ہو چکا تھا۔ جب کاشیہ کو
 اس نے شہرام سے بات کرتے سنا۔ قریب بیٹھی راجین
 کی ہتھیالیاں بھیگیں۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ بلا ارادہ زبان پھسلی۔
 ”آج کل سب مجھ سے اظہار ہمدردی ہی کرتے
 ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”اسے دیکھے چار پانچ ماہ تو ہو گئے ہوں گے۔“ اس
 نے دل ہی دل میں حساب کیا۔
 ”کہہ رہا تھا ایک دو ماہ بعد میری فیملی پاکستان آرہی

کاشیہ نے اخبار سے نظریں ہٹا کر جیسے اسے اندر تک دیکھا۔
 ”ہاں“ کہہ کر وہ دوبارہ اخبار پڑھنے لگی اس کے انداز نظر سے راین کا دل پسلیوں کی حدود و قیود بھی پھلانگ کر دھڑکا۔

”میں صبح سے سوچ رہی ہوں، یہ کمال کیسے ہو گیا۔“ اس نے اخبار پر نظریں جمائے ہی کہا۔ راین نے سیب کاٹنے کا سلسلہ روکتے ہوئے تقریباً ”ٹیرھی ہو کر اخبار پر نگاہ ڈالی۔

”یہ واقعی کمال نہیں بلکہ میکان ہے، خواہ مخواہ صبح سے داغ کھس رہی ہو۔“ وہ جیسے اسے بدحوہ سمجھ کر کھلکھلائی اور سیب کاٹنے کا سلسلہ بحال کیا۔ کاشیہ نے آنکھوں میں زانے بھر کر تیکھی مرچیں بھر کے اسے گھورا۔

”میں جانتی ہوں یہ کمال نہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔
 ”کمال یہ ہے کہ شہرام تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے اسے زور کا دھموکا جڑا، چھری سیب چھوڑ انگلی میں کھسی کاشیہ کے بتائے گئے کمال نے دو ہزار ڈالٹ کا کرنٹ اس کے جسم میں چھوڑا افسانہ اچھی۔
 ”اور مجھے دیکھو۔ میں نازنین کے ساتھ اس کی جوڑی سیٹ کر رہی تھی۔“ پھر کسی خیال کے تحت اس کی جانب گھومی۔

”اچھا سنو تو۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ نازنین کا رشتہ طے ہونے تک تمہارا پروپوزل نہیں جاسکتا۔“ وہ دو گھڑی کے لیے رکی۔

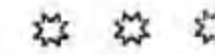
”مگر اس نے میرا کہا رہ چمکت کر دیا، کہنے لگا، ماما، بابا دوبارہ پتا نہیں کب چکر لگائیں۔“ اس نے پلٹ کر کاشیہ کو دیکھا۔ ”میں نے اسے یہ بھی کہا کہ ہمارے خاندان میں منگنی نہیں نکاح ہوتا ہے۔ کہنے لگا منظور ہے۔“ وہ ہونق کھڑی راین کو جیسے باخبر کر رہی تھی۔

”میں نے اس سے کہا سوچ لو، ہماری لک رک روز سالے بدلے گی، کہنے لگا، پھر بھی قبول ہے۔“ کاشیہ کے ان الفاظ نے اس کا دل گدگدایا تو چہرہ سرخ ہوا۔
 ”دونوں ہی بڑے گھنے ہو، ہوا تک نہیں لگنے دی کہ

طلب سے کب منسلک ہوئی بیٹے سالوں میں وہ کبھی اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ وہ محض ایک باکٹ آفسیئر کی اٹریکشن نہیں تھی کاشیہ کی گفتگو سے پہلی مرتبہ اسے کھونے کی ایک کھردری سی بے چینی نے اس کے دل میں گھر کیا تھا۔



ابتدائی ستمبر کی ایک ست زدہ دوپہر کو وہ کچھ یوں بے سدھ سوئی کہ عہر قضا ہونے پہ اٹھی وہ سوئی جاگتی حالت میں باہر آئی تو وہ عین سامنے براجمان تھا اس نے آنے والی کو آنکھوں میں دل جان، روح اور محبت رکھ کے دیکھا اور جیسے نگاہ موڑنے پہ اسے زمانے درکار تھے۔ سب کی موجودگی میں وہ اس کی اس قدر بے اختیاری پہ کٹ سی گئی۔ کچھ گلابی ہو کر جھینپ کر اس پہ سلامتی بھیجی جسے نہایت اٹھماک سے محفوظ سا ہو کر وصول کیا گیا۔ اپنے لیے چائے بنانے کی عرض سے لیکن ایریا کی جانب بڑھتے ہوئے اسے اپنی پشت پہ بھی اس کی نگاہیں محسوس ہوئیں۔ وہ بھی راین تھی اس کی بے اختیار یوں اور بے قرار یوں کا غصہ رات کو یوں نکالا کہ دیگر ڈشیز کے ساتھ اپنی سابقہ ڈشیز بھی ان ہی لوازمات کے ساتھ اس کے لیے بنائیں۔ جن میں وہ دشمن دل و جان با آواز بلند بھروں کے ساتھ کھانا کم دیکھتا زیادہ رہا۔ وہ دور بیٹھی اندازے لگاتی رہی مگر ڈنر کے بعد وہ تینوں رات گئے تک بیڈروم میں کونسی گتھیاں سلجھاتے رہے۔ راین کو اس کا اندازہ تک نہیں تھا۔



ناشتا کرتے ہوئے بھی اس نے محسوس کیا کہ کاشیہ گاہے بہ گاہے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگتی۔ ناشتے کے کچھ دیر بعد کاشیہ کو سیب کھلانا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ وہ پاس آئی تب بھی کاشیہ کے چہرے پہ وہ ڈھیٹ مسکراہٹ چمکی رہی۔
 ”آپ کا مہمان چلا گیا؟“ راین نے سیب چھیلنے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

تم دونوں میں کچھ چل رہا ہے۔“

ایا کے کلن میں ڈال دیجئے گا پھر وہ جانیں ان کا کام۔
آپ کی بے جا حسدیت پاکر وہ سیکڑوں رشتے ٹھکرا چکی
ہے۔“

”ہوا کیسے لگتی۔“ وہ اس کی بات کٹ کر روانی سے
بولی۔ ”ہم نے تو روٹیوں والی ڈلیا کے اندر۔“ کاشیہ نے
اٹھ کر اسے پشت سے جالیائوں کی کھلکھلاہٹیں
عروج پر تھیں۔

اس کی باتوں سے نازنین کے اندر اشتعال انگیز لہر
اٹھی۔

”ہر عروج کو زوال کیوں ہے؟“ چینیلی کی ڈال نے
اکلوتے گلاب سے پوچھا۔ مگر اس کے کلن محبت برد
آندھیوں کی آہٹ پر لگے تھے جو قریب تر تھیں۔

”تو پھر کیا کروں بھرا پڑا خاندان ہے ڈر اس او نچا بھی
بولوں تو آواز چاروں گھروں میں سنائی دے گی۔“ خالدہ
اپنی اس بھانجی سے جسے انہوں نے بیٹی کی طرح پالا تھا
سارے دکھ سکھ کہہ لیتی تھیں۔ اب بھی اس کی
بے بسی یہ وہ افسردہ ہوئیں۔



”خالہ امی! مبین کے دوست کی فیملی رامین کے
لیے آپ کے یہاں آنا چاہتی ہے۔“

”تو پھر میں ان لوگوں کو فی الحال منع کروں۔“ وہ
دوستانہ انداز میں دھیرے سے بولی۔

وہ شہرام کے والدین کی آمد سے چند روز قبل ہی
پنڈی چلی آئی تھی اب خالدہ کو اکیلے پا کر اپنے آنے کی
وجہ بیان کی جنہوں نے اسے یوں بدگ کر دکھا جیسے
کہہ رہی ہوں۔

”بالکل بھی نہیں۔“ خالدہ سرعت سے بولیں۔
”انہیں ضرور آنے کا کہو۔ مگر یہاں کسی کو بھٹک بھی
نہیں پڑنے دینا کہ وہ لوگ کس کے لیے آئے ہیں۔“
خالدہ کی پیشانی پر پراسرار سی شکنیں ابھریں۔
”یا اللہ! انہیں میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ رشتہ لڑکے
کی ایما ہے آ رہا ہے۔“

”رامین کے لیے ہی کیوں؟“
”معہہ انکل کو رامین بہت اچھی لگتی ہے۔“ وہ ان
کا منگوا کر انداز دیکھ کر صفائی دینے لگی۔

”اور اگر ہمسہ آئی نے سب کے سامنے رشتہ مینو
کے نام سے ڈال دیا تو؟“ کاشیہ کو خدشہ بچاؤ کا واحد راستہ
نظر آیا تو فٹ سے زبان پر لے آئی۔
”وہ بعد کی بات ہے۔ میں دیکھ لوں گی سب۔“
خالدہ اب طمانیت سے ٹھکرائیں۔

”آواز نیچی رکھ کے بات کرو کاشیہ۔“ انہوں نے
درشتی سے کہتے ہوئے بند دروازے کی جانب دیکھا۔
”شنا نہیں کہ دیواروں کے بھی کلن ہوتے ہیں۔ لہجہ ہنوز
برہم تھا۔“

کاشیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نازنین کو ماں زندگی میں
پہلی مرتبہ اس کی اپنی ماں محسوس ہوئی۔
”مڑو کا کیا کرتا ہے؟“ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھیں۔

دیواروں کے کلن تو محاورا ہوتے ہیں مگر دروازے
سے جیسی نازنین کے کلن سرگوشی بھی سن لیتے تھے۔
”لیکن خالہ امی میں ایسا کیا کہہ دیا ہے؟“ وہ
بدحواس سی ہوئی۔

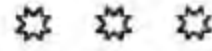
”وہ پائلٹ ہے۔ بہت اچھا خاندان ہے۔ ان کے
چلتوزے اور انجیر کے پانعات ہیں۔ مگر اب انکل
معہہ یو۔ کے میں اپنا بزنس اشارت کر چکے ہیں اس
لیے پاکستان کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ اب بھی دو
ڈھائی ماہ ہی رکیں گے۔“

”بڑی بہن منگنی شدہ بھی نہیں اور چھوٹی کا رشتہ
آگیا بے وقوف! اس بات پہ گھر میں چہ گوئیوں کا ایک
نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

وہ ان کے مزید سوالوں سے بچنے کی وجہ سے اچانک
کھڑی ہوئی۔
”مجھے لگتا ہے کچن میں دوڑھ اٹھتے ہوئے اچھل گیا

”رشتے تو بے حساب آئے اب نازنین کو کوئی پسند
نہ آئے تو اس میں رامین کا کیا قصور۔“ کاشیہ کو ان کی
اس ناانصافی پہ افسوس ہوا۔
”میں تو کہتی ہوں اب اگر اس کا رشتہ آئے تو بات

”وہ باہر کو لپکی۔ شہرام کی خواہش سے متعلق کاشیہ کے ذہن و دل میں بھی وابہ اور پریشانیاں ابلتے ہوئے اچھلنے لگی تھیں مگر وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ وہم بے جا نہیں ہیں۔“



”آپ خود سمجھ دار ہیں بسن! جب تک نازمین کا رشتہ طے نہیں ہو جاتا۔ ہم چھوٹی بیٹی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔“ خالہ کے اس قدر صاف انکار پر کاشیہ نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا جسے ہسمہ نے فوری نوٹ کیا۔ ساری کہانی کھل کر سامنے آگئی۔ ہسمہ، مونا لیزا کے انداز میں مسکرائی۔ ان کے یہاں گھر کے اندرونی حصوں میں غیر مردوں کا داخلہ نہیں تھا۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں ان تینوں خواتین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ بھائی خواتین کی آمد سے پہلے خالہ اپنی خواہش کی نہ کسی طور آنے والی معزز خاتون کو پیش کرنا چاہتی تھیں۔ ہسمہ کے تصور میں شہرام کا چہرہ لہرایا۔ جب وہ انہیں رخصت کر رہا تھا تو باپ بیٹے کے چہرے پہ خوشی دیدنی تھی۔ ”میرے بیٹے کو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا لہذا سارے اندیشے دل سے جھٹک دو۔“

معید کے قہقہے کی گونج سماعت میں ابھری۔

”جی میں سمجھ رہی ہوں۔“ ہسمہ نے پروقار طریقے سے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ چونکہ ہمارے داماد کے قریبی لوگوں میں سے ہیں۔ اور ہمیں اس پر پورا اعتماد ہے کہ وہ خاندانی لوگوں کو ہی ہمارے گھر کا راستہ بتا سکتا ہے۔“ ہسمہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ مگر وہ ان کے منہ سے سنتا چاہتی تھیں۔ جب تھوڑی دیر بعد ملازمہ چائے کی ٹالی دھکیلاتی ہوئی آئی تو ساتھ رائین اور آسیہ بھی تھیں۔

”رائین! ادھر بیٹھو۔“ کاشیہ نے اسے ہسمہ کے قریبی صوفے پر بٹھایا جس پہ خالہ کے انداز میں ایک واضح اکڑ ابھری۔ یہ صورت حال نہ صرف ہسمہ کے لیے دلچسپ تھی بلکہ اس کے اپنے ارادوں کے

مطابق جا رہی تھی۔ ہسمہ نے رائین کا جائزہ لیا وہ برکشش تھی یا اسے جاذب نظر کہا جاسکتا تھا۔ شہرام کا پاگل پن اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ چار سال کا تھا جب ہسمہ سے معید نے شادی کی اور آج تک اس نے کبھی وجہ یا بلا وجہ ہسمہ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا اور زندگی کے ہر معاملے میں اپنی پسند اس کی اولین ترجیح تھی۔

ایک دفعہ گرمیوں میں وہ اپنی خالہ کے پاس امریکہ گیا ہوا تھا۔ گھر کی آرائش اور رنگ و روغن مکمل تبدیل کر دیا گیا۔ معید اور ہسمہ کی شادی شدہ زندگی کی وہ پہلی لڑائی تھی جو اس کی آمد کے بعد ہوئی تھی۔ جب تک اس کا بیڈ روم سابقہ حالت میں نہیں آیا تھا وہ ہفتہ اس نے ایک ہوٹل میں گزارا۔

ہسمہ کے دل میں اس کے خلاف پڑنے والی وہ پہلی گہ تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی شہزاد پر جان نچھاور کرتا تھا، کبھی دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہوا کہ وہ اس کا سوتیلا بھائی ہے۔ شہزاد کی اسکولنگ سے لے کر اس کے کالج کے مضامین تک کے تمام فیصلے بھی شہرام کی پسند کو مد نظر رکھ کر ہی معید نے کیے تھے۔ ہسمہ کو اس کے اخلاق و کردار اور طرز زندگی میں۔ رتی برابر جھول نظر نہ آتا جس کی بنیاد پر معید کے دل میں اس کی محبت کم کی جاسکے۔ جب اپنے بیٹے شہزاد کے معاملے میں انہوں نے بولنا چاہا تو معید نے یہ کہہ کر اسے جھڑک دیا تھا۔

”شہرام کی چوائس تم سے کہیں بہتر ہے ابھی سے دونوں بھائی چھوٹے موٹے فیصلے مل کر کریں گے تو آگے چل کر ان کے لیے یہی جذبہ آسانیوں کا موجب بنے گا۔“

وہ چاہتی تھیں کہ شہرام کی شادی ان کی بھتیجی سے ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ بیچ میں شہزاد کو لانی تھیں۔ ”مگر میں اس کو کیوں فورس کروں کہ وہ راتمہ سے شادی کرے۔“ ان کے اٹھارہ انیس سالہ بیٹے نے جس سرد انداز میں ماں کو ٹوکا تھا وہ دنگ رہ گئیں۔

جیسے وہ شہزاد نہیں، اس کے سامنے شہرام کا بڑا بھائی بیٹھا ہو۔ یہ شہرام کے خلاف ان کے دل میں دوسری گھر تھی۔

اب اگر وہ رامین سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ دنیا کی اول و آخر لڑکی تھی جسے شہرام کی دلہن بننا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر بغور اسے شہرام کی نظر سے دیکھا۔ اس کی پسند یہ ہی تھی ایک دم نظروں کو تروتازہ کرنے والی۔ اس لڑکی میں چاندنی جیسی ٹھنڈک تھی مگر آنکھوں کو خیرہ کرنے والا حسن نازین کو دیکھ کر ہسمہ نے دیکھا۔

”آپ بھی سوچ لیجئے۔ ہمیں بھی گھر میں سب سے صلاح مشورے کا موقع ملنا چاہیے۔“ خالدہ نے سلجھے ہوئے لہجے میں متانت سے ایک ذمہ داری کی بات کی تھی۔ جسے ہسمہ کے تیز ذہن نے فوراً سمجھ لیا۔ کیونکہ خالدہ نے ہسمہ کی آنکھوں میں نازین کے لیے پسندیدگی کے رنگ بھانپ لیے تھے۔

”مجھے آپ کی بڑی بیٹی کی تصویر چاہیے۔“ کاشیہ کسی کام سے باہر گئی تو ہسمہ کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ خالدہ کی دل کی مراد برآئی۔ جب ہسمہ وہ تصویر اپنے بیگ میں رکھ رہی تھیں تو کاشیہ اندر آئی۔ وہ لفافے کی ساخت سے بھانپ گئی تھی کہ اس کے اندر کیا ہو سکتا ہے۔ وہ گنگ سی کسی پتھر کے بت میں ڈھلی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ خالدہ کو کچھ بتا سکتی تھی نہ شہرام کی محبت کا راز افشا کر سکتی تھی کیونکہ رامین ہمیشہ ابا کی ایما اور اجازت سے ہی اس کے ہاں جاتی تھی۔ اماں کو ہمیشہ اس کے گھر کے ماحول سے دھڑکا لگارتا تھا۔

”کچھ بھی ہو اس کا رشتہ نازین سے طے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“ یہ سوچ کر ہی اس کے دل کو ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔ وہ بے خبر تھی کہ پاس کھڑی تقدیر کیا کھیل کھیلنے جا رہی تھی۔



انہیں واپسی کے راستے میں ہی شہرام کی کال

موصول ہوئی۔

”انہوں نے سوچنے کی مہلت مانگی ہے۔“ ہسمہ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔ دو دن بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہسمہ نے سفید لفافے سے ایک تصویر نکال کر اسے دکھائی۔ انہیں بتا تھا ایسی ہزار تصویروں کے وہ ٹکڑے کر سکتا ہے۔ وہ اس کے رد عمل سے رامین کے لیے اس کی محبت کی حدود قیود بھانپنا چاہتی تھیں۔ تصویر دیکھتے ہی اس کی پیشانی ناگوار لکیروں سے بھر گئی۔ وہ پورے کا پورا حیرت آمیز سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

”یہ اس سے بڑی۔۔۔ نازین ہے۔ تصویر میں تو کچھ بھی نہیں۔ حقیقت میں دیکھو گے تو میری طرح مبہوت رہ جاؤ گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خوش گواریت سے مسکرائیں۔

”مجھے مبہوت نہیں ہونا۔“ اس نے تصویر سامنے دھری ٹیبل پر اچھالی۔ اس کی اس حرکت پہ ہسمہ کا رنگ اڑا۔

”رامین تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس کا تمہارے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا۔“ انہوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور نرمی سے کہہ کر اس کا سکون تہہ و بالا کیا۔

”کون ابھی چھوٹی ہے؟“ معینہ نے اندر آتے ہی شہرام کا سنجیدہ چہرہ دیکھا، پھر بیوی کی طرف دیکھا جو ان کی اچانک آمد سے گڑبڑا گئی تھیں۔ شوہر کو دیکھ کر مسکراہٹ کی صورت ہونٹ پھیلائے۔

معینہ نے بیٹھنے سے قبل وہ تصویر ٹیبل سے اٹھائی جسے وہ بیٹے کو بے دلی سے پھینکنا دیکھ چکے تھے۔

”انہوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ وہ بڑی بیٹی کی شادی سے قبل چھوٹی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“ معینہ کی نظر تصویر سے پھسل کر بیوی کی جانب اٹھی کہ یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔

”میں آپ دونوں کے ساتھ یہ بات کرنا چاہتی تھی۔“ ان کی نظروں کا مفہوم جان کر وہ اب پہلو تہی سے کام نہیں لے سکی تھیں۔

”مما! بجائے اس کے کہ آپ انہیں کنوینس

”تمہیں ہماری بہو کہنا چاہیے تھا معید احمد۔ اور
کیا خبر کبھی اس بیٹے کے حوالے سے لفظ ہو تمہارے
اس خواب کو چھو ہی نہ پائے۔“ ایک ظالمانہ فیصلہ
انہوں نے کیا اور ایسی ہی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر
چمکی تھی۔



اس نے سائڈ ٹیبل پہ اوندھی بڑی تصویر سیدھی
کی۔ اور تادیر دیکھتی رہی۔ اس کے بیٹ میں اینٹھن
ہونے لگی۔

”تو تمہارا پروپوزل راجن کے لیے آیا ہے راجن
میں ایسا کیا ہے پائلٹ صاحب۔“ اس کی سوچ میں
تلخی سی کھلی وہ اس کے دلکش نقوش نگاہوں میں بھر
کے ہی۔

”کیا خبر عمر بھر تمہیں میرا چہرہ دیکھنا پڑے۔“ ماں
اس کے لیے اگرچہ راجن ہموار کر رہی تھی مگر اسے
کاشیہ کی طرف سے دھڑکا لگا تھا۔ اس نے تصویر دراز
میں رکھ دی۔ اب وہی دھڑکا اسے ماں کے کمرے کی
طرف لے جا رہا تھا اس کی آمد یہ خالدہ نے سرسری سا
اسے دیکھا جیسے جانتی ہوں کہ وہ کیوں آئی ہے۔
”امی آپ مجھ سے پہلے راجن کی بات کیسے طے
کر سکتی ہیں؟“ وہ بنا تمہید کے بولی تو ماں نے غصیلی نگاہ
اٹھائی۔

”تمہاری چھپ کے باتیں سننے کی عادت اب
خاصی پختہ ہو چکی ہے ماشاء اللہ“ ماں کے کھلے طنز یہ وہ
کچھ جزیبہ ہوئی۔ ”لیکن تم بے فکر رہو میں ایسا کچھ
نہیں کروں گی۔“ وہ بستر کی چادر بدل رہی تھیں۔ بات
ختم کر کے دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئیں۔
”اپنی لاڈلی کو بھی سمجھا دیجئے گا ایسا ہونا بھی نہیں
چاہیے۔“ لاڈلی سے اس کا اشارہ کس کی طرف تھا وہ
اچھی طرح جانتی تھیں۔

”یاد رکھیں امی اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو میں
خود کشی کر لوں گی۔“
”ہے ہے خدا نخواستہ۔“ وہ وہل کر بولیں۔ اس کا

کرتیں ان کی باتوں میں آکر آپ کسی بھی ایکس وائے
کی تصویر اٹھالا میں۔“ وہ برہم ہو کر بولا۔

”یہ ایکس وائے ان کی بڑی بیٹی ہے اور عجیب
دقیانوسی لوگ ہیں۔ بجائے ہمارے پروپوزل پہ غور و
فکر کرنے کے مالٹا اپنا پروپوزل ہم پر ٹھونس دیا۔“
ہسمہ نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پہ آیا
غصہ کسی اور۔ جان بوجھ کے نکالا۔

”شہرام ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں تصویر نہیں لینی
چاہیے تھی۔“ وہ فکر مندی سے گویا ہوئے۔

”لوگ خاندانی اور وضع دار ہیں۔ اسی وجہ سے
حیات صاحب کی بیگم نے تصویر گھر میں دکھانے کا کما تو
میں انکار نہیں کر سکی۔“ انہوں نے بنا چکچکاہٹ کے
صفاقی سے جھوٹ بولا۔

”آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ ہم انتظار کر لیں
گے مگر راجن کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔“ اس کے دو
ٹوک اور قطعی لہجے یہ وہ دونوں ساکت رہ گئے۔ بات
کرتے ہوئے اس کالب و لہجہ مناسب تھا مگر اس کا
جھکے سے وہاں سے اٹھنا ہسمہ کو غیر مناسب لگا۔

”سچی بات ہے ان کی بڑی بیٹی تعلیم یافتہ ہونے کے
ساتھ ساتھ وضع قطع سے سلجھی ہوئی اور ہماری فیملی
ماحول کے لیے سوٹ ایبل بھی ہے۔“ اندرونی انتشار
دہاتے ہوئے انہوں نے آخری کوشش کی اور امید افزا
نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

”شادی شہرام کو کرنی ہے اور اس کی مرضی سے
ہوگی جسے اس نے پسند کیا ہے اب وہی لڑکی میری بہو
ہوگی۔“ معید کی سپاٹ آواز میں ایسا کچھ تھا کہ وہ کئی
ثانیہ پلک تک نہیں جھپک سکیں۔

”اور یہ بات مسز حیات کو بھی بتا دینا اور اگر وہ اپنا
سابقہ جواز پیش کریں تو انہیں انتظار کی بابت بھی
بتا دینا۔“

اب وہ بیٹے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔
انہوں نے متفرنگہوں سے شوہر کی پشت کو گھورا
لفظ ”میری بہو۔“ نے ان کے اندر آگ سی بھردی
تھی۔

ٹھوس لہجہ خالدہ کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھتا۔ وہ ماں کے اعصاب ہلا کر وہاں ٹھہری نہیں تھی۔
 ”مجھے کاشیہ سے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا نہ یہ سنتی نہ اس کا دماغ خراب ہوتا۔ ان کے اعصاب کچھ جو اس میں آئے تو انہوں نے خود کو کوستے ہوئے سوچا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔



سرا کی ہوا میں بدلتے موسم کے دعوت نامے بلا امتیاز، محلوں اور جھونپڑیوں تک دیتی پھر رہی تھیں۔
 فوجیوں کے بعد وہ سردیوں کی دیوانی تھی۔
 رات کو ناظمہ پھوپھی نے تسلا بھر کے مندی گھلوائی تھی کہ پھر وہ دو تین ماہ تک بالوں میں سردی کی وجہ سے مندی نہیں لگواتی تھیں۔ ملازمہ مہارت سے بالوں میں مندی لگانے لگی تو رامین بھی قریب ہی پھسکا مار کر بیٹھ گئی اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں تسلا میں گھمانے لگی۔ قریبی چاریائی پہ کاشیہ کسلمندی سے لپٹی ہوئی تھی۔ چھوٹی چچی لٹالوں کے غلاف دھلوار ہی تھیں جنہیں گائے بگا ہے کام والی کے ساتھ چھت پہ ڈلوانے آئیں، اس گھر کا سب سے چھوٹا بچہ بھی اب بارہ سال کا تھا۔ جو مونگ پھلی چھیلتا تو رامین کے اشارے پہ چند دانے اس کی دائیں ہتھیلی پہ دھرتا۔ آہستہ آہستہ ناشتے سے فارغ ہو کر تمام خواتین ایک ہی جگہ اکٹھی ہو گئیں۔

”خالد میاں! اس سال تو ہم انجیر اور چلغوزے مفت میں خوب کھائیں گے۔“ مندی لگواتے ہوئے چھوٹی چچی نے چشکلہ چھوڑا۔

”کاشیہ! لڑکے کی ماں کنجوس تو نہیں؟“ منجھلی چچی نے رخ موڑ کر پانتی سے لگی کاشیہ کو دکھا۔
 ”مجھے نہیں پتا۔“ جواب بے دلی سے آیا۔ رامین ابھی انگلیاں دھو کے آئی تھی۔ سرخ پوریں دلچسپی سے دیکھیں۔ اگلے ہاتھ سج گئے تھے۔
 ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی، نازنین صورت کی طرح قسمت کی بھی دھنی ہوگی۔“

دل کو بلا کا دکھا لگا، اس نے بدحواسی سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ شاید غلطی سے نازنین کہہ دیا ہو۔ کاشیہ نے اس کے دلنے اور چونکنے کو محسوس کرتے ہی زور سے آنکھیں بند کیں۔

”تو کیا لڑکے والوں کی طرف سے کوئی پیغام آیا ہے؟“ ملازمہ نے خالدہ سے استفسار کیا۔

”بھی ہسمہ بیگم کا فون آیا تھا۔ پرسوں وہ لوگ نکاح کی تاریخ وغیرہ رکھنے آرہے ہیں۔“

خوشی خالدہ کے ہر انگ سے عیاں تھی کہ ہسمہ نے رضامندی نازنین کے لیے دی تھی۔ سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں کاشیہ کی آنکھیں کھلیں۔
 ”ارے بھی مبارک ہو خالدہ!“ ملی جلی آوازیں جھنناہٹ میں بدلیں۔

”ارے لو، خالی خوبی خیر مبارک سے کام نہیں چلے گا شہزادوں جیسا داماد اور اعلا خاندان میں بی بی بیاہ رہی ہو، مٹھائیوں کے ٹوکے متگواؤ۔“ کلثوم اور نازنین آگے پیچھے اوپر آئیں۔

”بی بی! دھوپ میں مت بیٹھو، پندرہ بیس دن تو نکاح کے بیچ ہیں۔“ ناظمہ پھوپھی نے ہنسی کے تیر پھینکے تھے جو سارے رامین کی سمت آئے۔

اس نے گھبرا کے سرخ پوروں کو دیکھا، وہ تمام رنگ کیسے اڑے، جہاں آنکھیں خوابوں سے خالی ہوئیں وہیں وہ تمام کی تمام بے رنگ ہوئی۔ ان کی محبت میں اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی مگر وہ دونوں اندر تک جانتے تھے کہ محبت ہے پھر فیصلہ نازنین کے حق میں کیسے ہو گیا تو۔ کیا حسن جیت گیا محبت ہار گئی۔



ہسمہ آنٹی سے ہونے والی گفتگو وہ خالدہ امی سے دسیوں بار پوچھ چکی تھی۔

”خالہ امی! ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔“ وہ اندیشہ زبان تک لے آئی۔ ”مجھے شہرام سے یا معینہ انکل سے بات کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہسمہ آنٹی نے یہ فیصلہ خود کیا ہو۔“ کاشیہ کسی طور ماننے پر

تب ہی دوبارہ تیل ہوئی۔ جبران کافون تھا۔ وہ خوش ہوئی۔ بے زاری بھک سے اڑی۔ چھوٹے ہی اس نے بیٹا ہونے کی خوش خبری سنائی۔ اس کے ہاں پہلے دو بیٹیاں تھیں۔ ڈھیروں خون بڑھا کہ بھائی نے یہ خبر پہلے اسے سنائی ہے۔

”ایک سیکنڈ میں ذرا آئیہ کو تادوں۔“

”نازنین۔ سنو۔ تو۔ میں اسے بتا چکا ہوں۔“ وہ ہنسا تھا۔ اس کا ہواؤں میں اڑتا غرور دھڑام سے نیچے گرا۔ بے دلی سے خدا حافظ کہہ کر فون اس کی جگہ پہنچا۔

”تو جبران! تمہاری کسی خوشی پہ بھی پہلا حق ہمارا نہیں۔“ اس کا دل ساری دنیا سے اچاٹ ہوا۔ وہ لیوئی آن کر رہی تھی کہ دوبارہ تیل ہوئی۔

”اب کون ہے۔“ ریسیور اٹھا کر لٹھ مار انداز میں ہیلو کہا۔ دوسری جانب ”کون بات کر رہی ہیں۔“ فوراً پوچھا گیا۔

”جی میں نازنین! اجنبی لہجہ محسوس کرتے ہی وہ شائستگی سے بولی۔

”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم سے بات ہو گئی۔ میں نے فون اسی مقصد کے لیے کیا تھا۔“ ان خاتون کے لہجے میں مراد بر آنے جیسی خوشی جھلکی۔ ”میں شہرام کی والدہ بول رہی ہوں۔“

نازنین کا دل بلیوں اچھلا۔

”آپ کے انکل اور میں آپ کو ہی بہو بنانے کے خواہش مند ہیں اور شہرام کو بھی ہم نے تقریباً راضی کر لیا ہے۔“ وہ شیریں لہجے میں بولیں۔ ”مگر جانے کیوں آپ کی بہن کاشیہ ایسا نہیں چاہتی۔“

نازنین کو کرنٹ سا لگا۔

”ایسا نہ ہو کہ وہ شہرام کو پھر سے اکسا کر اپنی خواہش پہ آمادہ کرے بس آپ یہ کرنا کہ اس کی شہرام سے نکاح ہونے تک بات نہ ہوائے۔“

بنا کسی ہچکچی ہٹ کے انہوں نے نازنین سے یوں بات کی جیسے وہ دونوں رازدار مسہلہاں ہوں۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ وہ نادانی میں

تیار نہیں تھی کہ وہ نازنین کے لیے مان گیا ہو گا۔ خالدہ نے فون چرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

”مگر سہ ماہی طرف سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتی ہیں انہوں نے بیٹے کی رائے لی ہوگی تب ہی تو وہ لوگ آ رہے ہیں۔“ کاشیہ کانفی میں ہلتا سر دیکھ کر خالدہ کی خوشی جھاگ کی طرح بیٹھی اور اس نے کوئی فیصلہ کر کے اس کا ہاتھ اپنے سر پہ رکھا، کاشیہ نے کانپ کر انہیں دیکھا۔

”جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ کسی بھی حقیقت سے پردہ مت اٹھاؤ۔ میں نازنین کو زبان دے چکی ہوں، تمہیں میری قسم۔“ وہ ابدیدہ ہو کر بولیں۔ ”اگر اس بار کچھ غلط ہو گیا تو وہ نفرت کی ہر حد پار کر جائے گی۔“ ماں کے منت آمیز دکھی لہجے پہ وہ پتے کی طرح لرز کر رہ گئی۔



دوسری صبح گھر میں طلوع ہوتے سورج کی تیکھی کرنوں نے اس خود غرض لڑکی سے رحم کی اپیل کی تھی۔

”درد کی بارشوں میں تم بھی بھگو گی۔“ کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ سے اندر کھستی کرنوں نے قہر زہ سا ہو کر اس کا چہرہ چھوا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھی۔ اختتام نومبر کی دھوپ اس قدر پُر تپش باہر آئی تو ہو کا عالم تھا!!

”سب لوگ کہاں غائب ہیں؟“ پھوپھو کے پورشن میں جھانک کر آئیہ سے پوچھا۔

”کاشیہ کا شاید لی پی لو ہو گیا تھا، چکرا کے گر گئی۔“

خالہ اور راجین اس کے ساتھ اسپتال گئی ہیں۔“

”چلیں جی اب پھر اماں سے ناز خرے اٹھوانے اور خد متیں کروانے کا موقع اچھا ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی واپس آئی۔ چائے بنائی پھر لی وی کے سامنے پھیل کے بیٹھی۔

کچھ دیر بعد اسپتال سے فون آیا۔ ”کاشیہ کو ڈرپ لگی ہے، واپسی دو تین گھنٹوں بعد ہوگی۔ اماں کا لہجہ خوش باش تھا۔ مگر اس نے کچھ بھی مزید کہنے سے بنا فقط اچھا کہہ کر ریسیور کریڈل پہنچا۔

ایک ایسی آندھی کا رخ اس گھر کی طرف موڑ رہی تھی جو پھری ہوئی تھی اور آندھی کب دکھتی ہے کہ اس کی لپیٹ میں کون کون آ رہا ہے۔ اس کا بدن غصے سے کپکپایا۔ ہسمہ نے اسے چند اور نصیحتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔



”آج کا دن بہت ہی مبارک ثابت ہوا ہے۔ صبح ہی صبح خوش خبریاں سننے کو ملیں۔“ چھوٹی چچی نے مٹھائی کھاتے ہوئے کاشیہ کو ڈھیروں نصیحتیں کیں جو دوبارہ ماں بننے کی خبر پہ بھی اندر سے خوش نہیں تھی۔

”خالہ! آپ مجھے ایک بار شہرام سے فون پہ بات کرنے کی ہی اجازت دے دیں۔ کیا خبر میرے دل میں ابھرنے والے وسوسے بے کار ہوں۔ یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا ہو۔“

سب کے جانے کے بعد وہ دونوں اکیلی ہوئیں تو وہ منت سے بولی۔

”تم سو دفعہ اس سے بات کرو مگر اسے کریدنا مت۔ ایک طرف تو تم کہتی ہو اس کے والد کو رامین پسند آئی تھی دوسری جانب لڑکا لڑکا کر رہی ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ کیا چکر ہے؟“ خالدہ کی نگاہیں اس کے اندر تک اتریں۔

”چکر تو کوئی نہیں بس مجھے وہم سا ہو رہا تھا۔ اصل میں ہسمہ آئی اس کی سویلی ماں ہیں۔“

خالدہ جیسے برف ہوئیں اور اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ ”بی بی اب بھی نہ بتائیں یہ کون سی اہم بات تھی۔“

”اچھا ہوا یہ بات کھل گئی۔ ایک دو روز تک میں اور تمہارے چچا ابا ایبٹ آباد جا رہے تھے۔ تمہاری پھوپھی اور دونوں میں سے ایک چچی بھی جائیں گی۔ میرے علم میں اس بات کا ہونا ضروری تھا۔“

کاشیہ کے لیے یہ بات خوش آئند تھی۔ کیا پتا سب کے جانے سے یہ معمہ حل ہو سکے، مگر دو چار روز بعد

بھی اس کی خوش امیدیں مٹی میں ملی جب واپسی کے بعد مطمئن و مسرور خواتین نازنین کے سرال کاراگ لاپتی رہیں۔ اس کا فون جانے کیسے خراب ہو چکا تھا اور پی پی سی ایل پہ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہسمہ اور معینہ نکاح کی تاریخ بھی لے کر چلے گئے۔ بظاہر سب اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی اس کا دل سب کچھ غلط محسوس کیوں کر رہا تھا۔ اسے جاگتا دیکھ کر رامین نے اس کی جانب کروٹ بدلی۔

”تم ٹینس مت ہو۔ یہ تمہارے لیے اچھا نہیں۔ مبین بھائی بتا رہے تھے کہ وہ خوش ہے۔ پھر ہم کیوں او اس ہوں۔“

”وہ ایسا نہیں ہے مینو! ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ تم نے محسوس کیا کہ میں مبین سے بھی بات کر رہی ہوں تو نازنین ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اگر ڈاکٹر نے مجھے سفر کرنے سے روکا نہ ہوتا تو میں ایبٹ آباد کا چکر ضرور لگاتی۔“

”سب لوگ وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ شہرام سے بھی مل کر آئے ہیں۔ ہسمہ آئی سب کو تو چکھا نہیں دے سکتیں۔ تم یوں ہی پریشان ہو رہی ہو۔“

وہ کاشیہ پہ اپنی حالت ظاہر کر کے اسے مزید ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی سو اپنا ورد چھپائے اسے ڈھارس دینا زیادہ اہم تھا۔

یہ مقدر کی بات تھی۔ وہ زبردستی شہرام کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کیا کوئی بھی لاکھ تک وود کے بعد بھی کسی کو زبردستی اپنا مقدر نہیں بنا سکتا، مگر یہ بات نازنین نہیں جانتی تھی۔



زمین کی کشش آج حد سے ہوا تھی کہ قدم جمنے لگتے۔ اس گھر کی چاروں خواتین کے لیے زمین آج مقناطیسی ہو رہی تھی۔ مختلف احساسات کے ساتھ وہ ایک ہی جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔ رامین کے لیے آج کا دن انتہائی قلیل آکسیجن لے کر ابھرا تھا۔ کاش انسان اپنے اندر محبت کا وجود مٹا سکتا اس کی سانسیں

چھیننے کا اختیار رکھتا۔

”لڑکے والے آگے۔“ ایک بچے نے ہال کمرے میں آکر ہانک لگائی۔

کاشیہ کے سینے میں دل نے پلٹا کھایا۔ چار روز قبل شہرام نے لینڈ لائن پہ اس سے بات کی تھی۔ وہ خوش تھا اتنا کہ اسے لگا کہ اس کا دم ہی نکل جائے گا۔

”کیمرہ بھیجوں گا مین کے ہاتھ سواپس کرو بجھے گا“ میں خود تصویریں نکلوا لوں گا۔ مینو سے بات ہو سکتی ہے تو پلیرز صرف دو منٹ۔“

اس کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ خالہ امی کی قسم وہ توڑ بھی دیتی اگر سب کچھ طے نہ ہو چکا ہوتا۔ بس ہوں ہاں۔ کرتے کرتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”تو بس آئی آپ نے اسے زندگی کے سب سے بڑے معرکے میں ہرا دیا۔ اس کے دل کی خوشی اس سے چھین لی۔ ہم سب نے اس کی آنکھوں میں حسب بساط دھول جھونکی۔“

”کاشیہ! تم ادھر کیوں منہ لٹکا کر بیٹھی ہو۔ عورتوں کے استقبال کے لیے ہال کمرے میں آؤ۔“ کلثوم اور خالدہ ایک ساتھ اندر آئیں۔ میں کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ احساس شرمندگی و ندامت نے اسے لرزادیا۔

”تم نکاح سے پہلے باہر نہیں جاؤ گی۔“ نازنین کے ہاتھ کی زنجیر نے اسے بے حرکت کیا۔

”کون کہتا ہے کہ بلائیں نظر نہیں آتیں۔“ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے خوف سے دکھ سے مٹ گئی۔

”لڑکے والے تو جیسے پوری بارات لے کر آئے ہیں۔ دونوں طرف سے خاندان اکٹھے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں لگے ہاتھوں رخصتی بھی کر دو۔“ کوئی بزرگ خاتون خالدہ کے ساتھ اندر آئیں۔

دروازہ کھلنے پہ مختلف خوشبوئیں کمرے میں گھسیں۔ قید کی ہوئی لڑکی پہ صدیاں گزر گئیں۔ انتظار ختم ہوا۔ گواہوں کے ساتھ نکاح خواں اندر آیا۔ شہرام ولد معید احمد کو کسی نے قبول کیا۔ وہ ایک دم خالی ہوئی۔

وہ آزاد ہوئی۔ زنجیریں توڑ کر دروازے کی جانب دیوانہ وار بھاگی۔ دل کو چلتے رہنے کے لیے ذرا سا قرار درکار تھا۔ میری دیوانگی کے جتنے بھی پاتال موسم ہیں سو اس اہل جنوں کو بس تیرا دیدار جھونکا ہے۔ یہ دل آویز سا چہرہ ہی بس تازہ ہوا سا ہے۔

سامنے سفید شلوار قمیص میں تنی گردن کے ساتھ وہ شہزادوں کی سی آن بان لیے بیٹھا تھا۔

”میرے ساتھ محبت کی رشتوں کی آنکھ مچولی کیوں کھیلی شہرام؟“ ضبط کے کڑے پہرے توڑ کر آنسو آنکھوں کے در سے نکلے۔ وہ خوشی سے سنرا ہو رہا تھا۔

”مسکے رانج الوقت بعوض پانچ لاکھ نازنین حیات آپ کو قبول ہے؟“ اس کے وجود سے سنرا رنگ۔ لکھت اڑا۔ معید احمد کے وجود سے بھی جان ہوا ہوئی۔

”نام لینے میں آپ سے غلطی ہوئی ہے۔“ وہ چند لمحوں بعد سنجیدگی سے بولا۔

نکاح خواں نے گردن موڑ کر قریب بیٹھے حیات ساجد سے کچھ کہا۔ ”برخورار آپ کا نکاح حیات صاحب کی بڑی صاحبزادی نازنین سے ہی ہو رہا ہے۔“ وہ تاریک ہوا۔ سیاہ ہوا۔ گھور اندھیرا۔ روشنی کہاں گم ہوئی۔

”کیا بات ہے نکاح کی رسم ادا کیوں نہیں ہو رہی؟“ کسی بزرگ نے بارعب آواز میں پوچھا۔

”میں نازنین سے نکاح کیسے قبول کروں جب کہ میرا رشتہ رامین سے طے ہوا ہے۔“

بم پھٹا، بم بھی ایسا کہ لمحوں میں سب کے پرچے اڑے مگر اندر پچی یہ نکاح قبول کر چکی ہے۔ اس انوکھی صورت حال پہ مولانا بوکھلا کر بولے۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے مین؟“ معید نے حمایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بھی برق رفتاری سے ان تک پہنچ چکا تھا۔

”شہرام تم ہوش میں تو ہو۔ ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ وہ جیسے دھاڑے۔

”کیوں جیسا سوال تو ہمیں کرنا چاہیے بابا! آپ ان

سے پوچھیں کہ اندر نکاح خواں کس کا نکاح پڑھا کے آئے ہیں۔

اس مرتبہ وہ اپنی آواز نیچی نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ دکھ سے نیم پاگل سا ہو رہا تھا۔ صورت حال بگڑتی دیکھ کر طارق اور فاضل نے کلی محلے کے افراد سے معذرت کرتے ہوئے وہاں سے جانے کی درخواست کی۔ اب اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں دونوں خاندانوں کے افراد رہ گئے تھے۔

”بابا! آپ ماما کو بلائیں۔“ وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

رامین مفلوج ذہن کے ساتھ یہ تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد ہسمہ اور خالدہ حواس باختہ اندر آئیں۔

”ماما! کیا آپ نے میرا رشتہ یہاں رامین سے طے نہیں کیا تھا؟“ اسے دیکھتے ہی وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا۔ لرزتی کانپتی رامین کے پاؤں کے نیچے قبر کی کھدائی شروع ہوئی۔

”یہ کون سی پوچھنے والی بات ہے، آف کورس ہم رامین کا ہی پیغام لے کر آئے تھے۔“ خالدہ کے پاؤں کے نیچے آگ دہکی۔

”تو پھر ان سے پوچھیں کہ نکاح رامین کی بڑی بہن سے کیوں کر رہے ہیں؟“ صدے سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

رامین کے پاؤں قبر نما گڑھے میں دھنسا شروع ہوئے۔

حیات نے زندہ گاڑنے والی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

”ہسمہ بیگم نے مجھ سے خود نازنین کی بات کی اور اسی کے لیے رضامندی بھی دی تھی۔“ وہ بدحواسی سے بولیں۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ وہ تحمل سے اور اعتماد سے گویا ہوئی۔

سارا پنڈی آبادی سمیت الٹ پلٹ ہوا۔ پھر حیات فیملی کیونکر سالم رہتی۔

”آپ۔ ککد۔ ککد۔ اور نن۔ ناظمہ کو بلائیں حیات صاحب! جب ہم سب ایٹ آباد گئی تھیں تو ان کی زبان پہ نازنین کے سوا کوئی نام نہیں تھا۔“ قدموں کے ساتھ ان کی آواز بھی لڑکھڑاہی تھی۔

”استغفر اللہ۔ دراصل یہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی پہلے کرنا چاہتی تھیں جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ پلان کے ساتھ ہمیں بے وقوف بنایا ہے بلکہ دھوکا دیا ہے۔“ وہ سابقہ انداز میں ان کے تمام جواز تمام صفائیاں رد کرتی گئیں۔ ڈرائنگ روم میں اب دیگر خواتین نے بھی جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ وہاں موجود تمام مروجہ حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ماما کے اس دھوکے میں کاشیہ تو شریک نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے تحت اس کے نیم جاں وجود میں جیسے جان سی پڑی۔

”ہین! آپ بھابھی کو بلائیں۔“ ڈوبتے نئے تنکے کا سہارا لیتا چلا۔

”یہ سچ ہے کہ انہوں نے رشتہ رامین کے لیے دیا تھا، مگر بعد میں خود ہی ہسمہ بیگم نے ہماری بڑی بیٹی کے لیے رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم زبردستی کیسے رشتہ طے کر سکتے تھے۔“ حیات اور معینہ کی نظروں میں دونوں عورتوں کو اپنے لیے پھیندے نظر آ رہے تھے۔

کاشیہ اندر تو آئی تھی، مگر شہرام کا سامنا اس کا لو خشک کر رہا تھا۔

”بھابھی جب میری بات آپ سے ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سچ کیوں نہیں بتایا؟“ اس نے بس لہجے کی بے اعتبار نگاہوں کی تیز دھار چھریوں نے اسے ہر رخ سے کاٹا۔ اس کی گھائل آنکھیں خالدہ پہ نکلیں۔ ان آنکھوں میں مرنے والوں جیسی التجا تھی۔ پردہ پڑا رہنے کا پیغام تھا۔ کاشیہ کو اس گودی نرمی اور محبت کا اس گھر کے جھک کا پاس شہرام کی خواہش سے زیادہ عزیز تھا۔

”جو بھی ہوا کسی بہت بڑی غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ چونکہ معاملہ اب دو خاندانوں کی عزت کا ہے تو ہمارے لیے اس وقت یہ بات زیادہ اہم ہے۔“ معینہ انتہائی وقار سے بولے۔

اندھا ہوا۔ خاموشی دیدہ بیٹا تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

”ایسا مت کرنا رامین! میں اپنی تربیت کے طعنے سنتے سنتے قبر میں جاؤں گی۔ جس کی ایک بیٹی دلہن بن کر پیشی ہو اور دوسری اسی شخص کی دلہن بن کر رخصت ہو جائے۔ وہ ماں کیسے جی پائے گی۔ لوگوں سے تا عمر نگاہ ملانے کے قابل رہے گی؟“

وہ شہرام کے خاندان کو نہیں جانتی تھی، مگر اپنے خاندان کو جانتی تھی۔ وہ ان کے لیے زندہ ہی مرجائے گی۔ وہ اس گھر میں رحمت بن کر آئی تھی۔ وہ کسی بھی بیٹی کو رحمت کے عہدے سے برخاست نہیں کرے گی۔ وہ حیات ساجد کو اسی عزت اور شان کے ساتھ ان گلیوں میں سر اٹھا کر چلتا دیکھنا چاہتی تھی۔

”مولانا صاحب! نکاح شروع کیجئے۔“ ان ہی الفاظ کے ساتھ آواز دوبارہ گونجی۔ اس نے خشک بے جان ہونٹوں پہ زبان پھیر کر سب کو دیکھا۔ کاشیہ، مبین، آسیہ سب کی آنکھوں میں الفاظ گڈمڈ تھے۔ کوئی اشارہ کوئی جملہ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

”مبینو! میری طرف بھی دیکھو۔“ ان آنکھوں کی بے آواز سرگوشی اس تک پہنچی تھی۔

وہ انہیں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان آنکھوں میں کچھ بھی گڈمڈ نہیں تھا۔ اردو، عربی، فارسی ہر زبان میں محبت فلیشر کی طرح روشن تھی۔

”بابا! مجھے ان سے شادی نہیں کرنی۔“ فلیشر چکنا چور ہوا۔ وہ اک پل میں بھڑک کر راکھ ہوا۔ ”میں یہ نکاح قبول نہیں کروں گی۔“

دوسرے پل وہ راکھ اڑ کر فنا ہوئی۔ جس کی سانس جہاں تھی، وہی جم گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

”مولانا صاحب! یہاں جو بھی ہوا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔“ پھر وہ باپ کی طرف مڑا۔

”آپ مجھے ابھی اسی وقت گولی مار سکتے ہیں۔ یہاں موجود جس جس کا بھی دل چاہے جس قدر تکلیف وہ موت دینا چاہے۔ مجھے دے سکتا ہے۔ سوری بابا

”جو بچی نکاح قبول کر چکی ہے اب ایجاب و قبول کی رسم اسی سے ہوگی۔ مولانا صاحب بسم اللہ کیجئے۔“ انہوں نے جیسے فیصلہ کر کے حکم صادر کیا۔ اس سے آگے کا منظر سمجھ جانتی تھیں۔ ان کی مسکراتی نگاہیں بیٹے کی طرف اٹھیں۔ وہاں موجود ہجوم کی جھنناہٹ اچانک تھی۔

”میں رامین کے علاوہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتا۔“

اس آواز نے رامین کے جسم کی کھال ناخنوں تک کھینچی۔ اس کے پنجر کو کسی نے قبر کے اندر کھینچا۔ ”شہرام! میرے حکم کی تعمیل کرو۔“

وہ دھیمی آواز سے گرجے۔ اب اعتماد چور ہوگا، بھرم ٹوٹے گا، حکم عدولی ہوگی اور شہرام معید کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر جائے گا۔ ان کی خواہش پوری ہوئی۔ آج انہوں نے اپنی ذہانت کے بل پہ میدان مار لیا تھا۔

شہران نے بھائی کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو جو تمہارا دل چاہے وہ فیصلہ کرنا۔

”آپ میرا نکاح رامین سے پڑھائیں۔ عزت اس طرح بھی بچائی جاسکتی ہے۔“ محبت ڈٹ گئی۔ وہ قطعیت سے بولا۔ اس سے پہلے کہ معید صاحب مزید کچھ کہتے۔ حیات صاحب کی آواز نے سب کو اپنی اپنی جگہ ساکت کیا۔

”ناظمہ! رامین کو لے کر آؤ۔“

شہرام کی سانسوں میں تازہ ہوا چلی۔ پنک سوٹ میں وہ مرجھایا ہوا سوکھا ہوا گلاب لگ رہی تھی جس کے جسم میں خون کی ایک بوند تک نہ ہو۔

”مولوی صاحب! نکاح شروع کیجئے۔“ اس نے سرعت سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہاں جو تاثرات رقم تھے وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ آج کے بعد یہ چہرہ خواب ہو جائے گا۔ ہماری مینو۔ اس کی سماعتیں اس آواز کو ترسیں گی۔ میری چیزیا۔ آواز پھر ابھری۔ مگر آج یہ چیزیا اڑے گی تو اس شہر کی گلیاں دوبارہ اسے دیکھ نہیں پائیں گی۔ وقت بسرہ اور

جان! اس نے وہاں موجود افراد کو آنکھوں کی گیلی قبر میں دفنایا۔

کاشیہ اور مبین کی نگاہیں جھکیں۔ اس نے ایک پتھر میں ڈھلے تیسرے فرد کو کمرے کے کسی کونے سے کھینچ کر اپنے دل کی تازہ قبر میں دفنایا۔ اب اسے وہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ وہ انہیں چار سال کی عمر سے ماما کہہ رہا تھا۔ وہ عزت کے ساتھ ان سے محبت بھی کرتا تھا۔ وہ اس کے باپ کی بیوی اور ازحد عزیز بھائی کی ماں تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کی محبت اور اس کے ادب کا قتل کس نے کیا ہے۔ اسے تھی داماں اور نافرمان کس نے کیا ہے۔

شہرام کی نظروں سے ہسمہ کا جسم سن ہوا۔

اسے جانا تھا وہ چلا گیا۔ پھر وہ کہاں گیا۔ ایک لمبے عرصے تک معید اور شہران بھی نہیں جان پائے تھے۔ کاشیہ اور مبین نے بھی کبھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ مبین نے اپنا سفر کسی اور شہر کروالیا۔ وہ کاشیہ سے کافی عرصے تک خفا رہا۔ پھر بیٹی کی پیدائش پر ہی اس کو واپس گھر لے گئے تھے۔

اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد برسوں سے جگر کی بیماری میں مبتلا مشتاق ساجد نے یہ دنیا جیکے سے چھوڑ دی۔ اس قصے سے متعلق بے خبر لوگوں کو بھی وہاں باخبر کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ کوئی اجنبی یوں دیدہ دلیری سے کسی کا نام نہیں لیتا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ وہ سنتی تھی، مگر سہروں کی طرح ناثر دیتی کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ قبرستانوں کی خاموشی اس کی آنکھوں اور لبوں کا ٹھکانہ بن چکی تھی۔

حیات ساجد جب تک زندہ رہے، کبھی بیوی سے ہمکلام نہ ہوئے، مگر بیٹی کے سر پہ ہمیشہ عزت اور مان بھرا ہاتھ رکھا۔ اسے اپنے باپ سے یہ ہی دونوں چیزیں چاہیے تھیں۔

نازمین کے لیے وہ ایک اجنبی کی مانند تھی۔ ہسمہ نے جس طرح اسے اپنے ڈرامے کا کردار دیا تھا وہ مہینوں گم صم رہی۔ حیات صاحب نے جس سے اس کی شادی طے کی۔ وہ واجبی سی شکل و صورت کا بندہ

اس کے دل کے قریب بھی کبھی پٹنک نہ پایا۔ شہرام کی رامین سے محبت نے اس کے حسن کا غرور توڑ دیا تھا، مگر وہ آج بھی کاشیہ اور اپنی بہن سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اپنے خوابوں میں کئی بار ہسمہ کا قتل کر چکی تھی۔ وہ ہسمہ جنہیں شوہر اور سگے بیٹے کی نفرت نے زندہ درگور کر رکھا تھا۔ ان کی خوشیوں کو سولی پہ چڑھا کر بھی وہ خوش کیوں نہیں تھیں۔ شیطان کے ساتھ مل کر انہوں نے جو چال چلی تھی وہی چال ان کی زندگی کا سکون و آرام بریاد کر گئی۔ شاید انہیں اندازہ نہیں تھا کہ شہرام معید اس لڑکی کے لیے یوں ڈٹ جائے گا۔ یہ اندازہ تو نازمین کو بھی نہیں تھا۔



میں سرمئی پرندوں کے پروں پہ لکھ بھیجوں گا۔
او چھپلی رت کے ساتھی۔

اب کے برس میں تنہا ہوں۔

تو بیمار کے اس دوسرے شہر میں تمہیں آنا ہو گا۔

ان آنکھوں میں اول و آخر یہی التجا تھی۔ یہی

گزارش تھی۔

”یہ آنکھیں تو حکم صادر کرنے والی ہیں۔ ان کے

حکم پہ اہل دل نئی ریاستیں تعمیر کرنے کو تیار ہیں۔ تم

کسی کو اشارہ تو کرو۔“ وہ بلاوجہ ہی مسکرائی۔

آج وہ وادی میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ برسوں

ان کی واپسی تھی۔

”تمہیں شاخسار کی اوٹ سے دیکھنے والے بہت

ہیں۔ کسی کا ہاتھ تھام لو۔ زندگی نئے سرے سے شروع

کرو۔“ وہ پھر مسکرائی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میرا انتظار

پھر سے تمہارا وقت روک دے۔ میں تمہارے پیغام

نہیں پڑھوں گی۔ تمہیں اگلے برس تک تنہا نہیں رہنا

ہو گا۔ تم سنبل سے شادی کر لو۔“ اس نے باہمت ہو کر

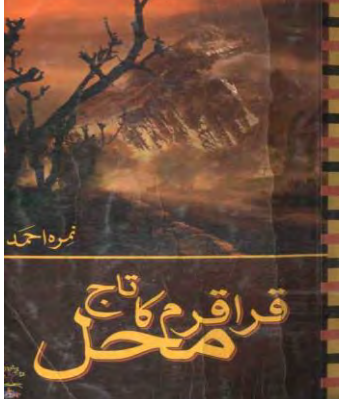
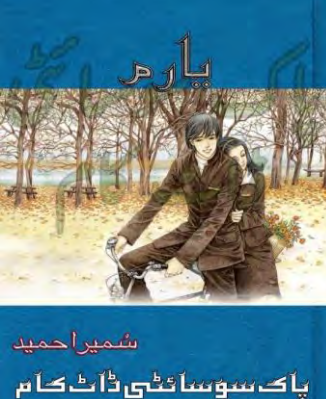
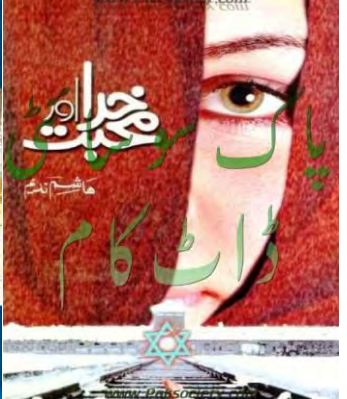
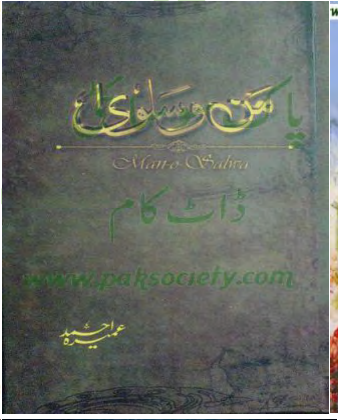
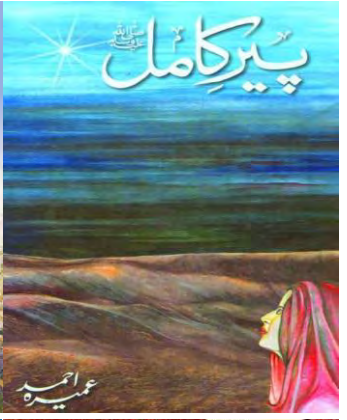
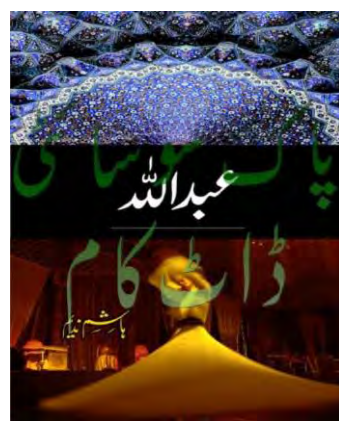
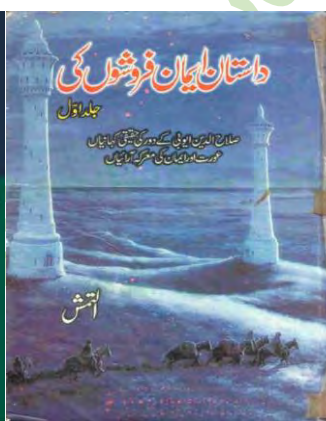
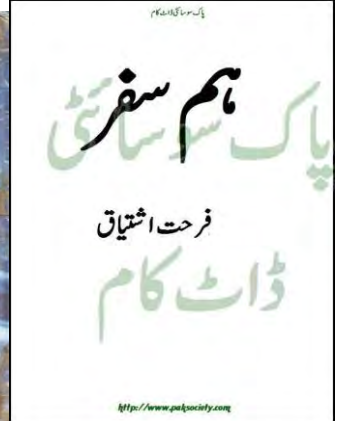
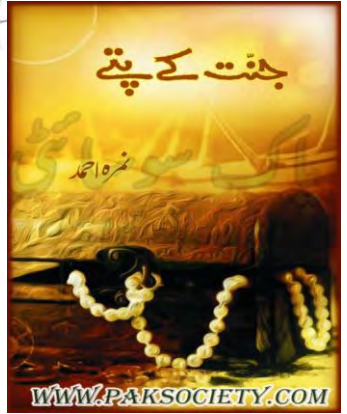
ایک دم ہی کہہ دیا۔

وہ یوں رکا جیسے اچانک راہ میں چلتا پہاڑ اس کے

عین سامنے رکا ہو۔

”میں جس دن تم سے رشتہ جوڑنے آ رہا تھا اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



طویل سفر میں خوشی میرے ہمراہ تھی۔ تمہارے گھر کی وہ بلنڈر پار کر کے میں نے خوشی کے تمام زائغے چکھ لیے تھے۔ خوشیوں کے دلفریب نقوش میری نگاہوں نے ازبر کیے تھے۔ وہ احساس اب میں دوبارہ کبھی محسوس نہیں کر سکتا۔ پھر میں کسی کو کیوں دھوکا دوں۔“

کچھ دیر کو وہ سنانے میں آگئی۔
”تم اسے دل کی نظر سے دیکھو تو سہی۔ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ اس کے خدو خال دیکھتے دیکھتے میرا چہرہ تمہیں یاد نہیں رہے گا۔ اسے قریب سے دیکھو گے تو وہ دل کے قریب آئی جائے گی۔ یہ تمہارے ہی کی ضد چھوڑو۔“

اسے سناٹا توڑنا تھا۔ آج اسے بولنا تھا سو اس نے جرات کی تھی۔
وہ اس کی جرات پر حیران ہوا تھا کہ ان جملوں نے اسے بے حرکت کیا تھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ بہت فرصت سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

”محبت خدو خال سے نہیں ہوتی۔ کسی حسین وجود کا قریب پا کر بھی نہیں ہوتی۔ کوئی دیکھتے دیکھتے دل کے قریب نہیں آتا۔ اگر محبت خدو خال سے ہوتی تو اس وادی کے تمام مرد تمہارے عشق میں مبتلا ہو چکے ہوتے۔“

وہ اس ہونق بنے وجود کو نرمی سے اپنے راستے سے ہٹاتا سامنے بڑھا۔ وہ اس کے بھاری بوٹوں کی آواز سنتی رہی۔ وہ اب میس ایئر فورس کے پل پہ آگئے تھے۔ یہ قیمتی لمحے تھے، پچھڑ گئے تو سمجھو مر گئے۔

”تم مجھے سزا دے رہے ہو شہرام!“ ضبط کی دوڑ آج اس قدر ریشمی تھی کہ اس کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

”میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔“ وہ اپ سیٹ ہوا۔ آج اس کی فرسٹریشن وہ سمجھ سکتا تھا۔
”تم مجھے احساس دلاتے ہو کہ راہ میں چھوڑ کے چلے جانا دوسرے کو کس قدر تکلیف میں مبتلا کرتا ہے۔“

”اف۔ اتنے آنسو۔“ ٹھوس دریا ایک دم ان

آنکھوں میں جا کے بننے لگا تھا۔ وہ کہہ ہی نہیں سکا کہ اس سے زیادہ آنسو میری بھی آنکھوں کی تہوں میں چھپے ہوں گے۔ وہ کہہ نہیں پایا کہ میں تو محبت یافتہ تھا۔ تمہاری خواہش کر کے سزا یافتہ ٹھہرایا گیا۔

اس کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ ارد گرد اکا دکا سیاحوں نے انہیں ٹھنک کر دیکھا۔ ونگ کمانڈر نیل نے انہیں نم آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ کتاب محبت کے صفحات ختم ہو رہے تھے۔ کہانی نے اب بھی نیا موڑ نہیں لیا تھا۔ وہ پہلے بھی جدا ہو گئے تھے اب بھی پچھڑ رہے تھے۔ اگر کچھ نیا تھا تو وہ اظہار محبت جو اس نیلے موسم میں ازیت سے نیلی پڑتی اس لڑکی نے کیا تھا۔ کچھ نیا تھا تو وہ دکھ جس کا اظہار اس نے بہ آواز بلند کیا تھا۔

بارہ سال پہلے وہ دکھ سالم نگل گئی تھی۔ تب ایک آنسو بھی رسوائی تھا۔ تشہیر محبت تھا حرف عزت تھا۔ اس جدائی پہ وہ آنسو بہا رہی تھی۔ آج وہ اپنی اور اس کی محبت کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ جدائی کا سوگ منانے کا اہتمام ابھی سے شروع کر رہی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنے اور اس شخص کے لیے اب دنیا کو چوکور کرنا تھا۔ نکونیا ت میں ڈھالنا تھا۔



”راہین ایک بات کہوں؟“
وہ کتنی ہی دیر سے گوگو کی کیفیت میں تھی۔ اپنے شوڈر بیگ میں تیزی سے کچھ چیزیں بھرتی ہوئی راہین نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

”تم شہرام سے شادی کر لو۔“
اس ایک جملے نے اس کے کئی ٹکڑے کیے۔ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ وہ الفاظ نہیں تھے۔ کاشیہ نے دنیا جہان کا بارود اس کے قدموں تلے ڈھیر کر کے آگ لگائی تھی اس کے وجود کی دو جھیلیاں اڑیں۔

”ہم واپس جا کر کہہ دیں گے وہ ڈوب گئی تھی۔ لاش تک نہیں ملی۔“ کاشیہ کے دوسرے جملے نے اسے خلا سے دھکا دیا۔ وہ کہہ ارض پر اوندھے منہ

گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے رخصت کرنے کا سوچ رہے تھے۔ انہیں شہرام کا پار پار میرا نام لینا خنجر کی طرح چبھا تھا۔ میرے ماں باپ میرے بعد ان سوالوں کے جواب کیسے دے پاتے جو آج تک مجھ سے کیے جاتے ہیں۔ اس ماں کا دل پھر کیسے دھڑکتا۔ وہ ایک اور رخصت گر کے دوسری کے گھنے گیسے اتارتی۔
وہ چند ساعت کے لیے خاموش ہوئی۔ آنسوؤں نے اس کی آواز کا راستہ روک لیا تھا۔

”میں تو! وہ تمہارے لیے ایک دنیا آباد کیے بیٹھا ہے۔“
”اگر وہ مجھے یہاں سے سیدھا جنت میں لے جانے کا بھی اختیار پالے پھر بھی میں اس کے پاس لوٹ کر جاؤں گی میری جنت جس کے قدموں میں ہے۔“ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”میں جیتے جی۔ کیسے مر جاؤں۔ مجھے اپنے آبائی قبرستان میں صرف اپنے نام کا کتبہ اپنی قبر پر نہیں چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ اس قبر کے اندر راین حیات کا وجود بھی ہو۔“
وہ ایک ایک لفظ زور دے کر بولی۔

”میں اپنی ماں کا انتظار اس شخص کے لیے فنا کروں جسے میں سترہ سالوں سے جانتی ہوں۔ اگر اپنے والدین کے گھر بیس سال گزارنے والی راین ان کی عزت کا پاس نہیں رکھ سکتی ان سے وفاداری نہیں کر سکتی تو کسی اور سے کیسے وفادار ہو سکتی ہے۔ کاشیہ! جو عورت خون کے رشتوں کی نہیں ہوتی وہ کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ وہ بے شاخ کا پتا بن جاتی ہے۔“ اس نے بیگ کی زپ جھٹکے سے بند کی۔

”جبران اور نازنین نے تمہارا حصہ بھی ہتھیالیا۔ نوکری کرتی ہو، خوار ہوتی ہو۔ فضول کی باتیں سنتی ہو۔ تم یہ زندگی جینا چاہتی ہو۔ یہ سب تمہیں پسند ہے؟“ وہ زہر خندی سے بولی۔

”ہاں میں یہ زندگی جی لوں گی، مگر میری لاچار ماں سے کوئی یہ کہے راین کو زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا یا پھر وہ اپنے پرانے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔“

گری۔
”تم میرے بارے میں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔“ دکھ سے اس کی آواز پھٹنے لگی۔ کاشیہ کے سر پر چھت گری۔
”کیا۔ کہا؟“ اس نے تاسف زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ ”شادی کرنا گھٹیا عمل کب سے ہو گیا؟“
راین کا اس طرح مشتعل ہونا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”چھپ کے شادی کرنا انتہائی گھٹیا عمل ہے۔“ وہ بے لفظوں میں چیختی۔
”میں اور مبین تمہارے ولی بنیں گے۔ وادی کے تمام بار سوخ لوگ اور یہاں کی تمام ایئر فورس شادی میں شامل ہوگی۔“ وہ انتہائی نارمل ہو کر بولی۔
”تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کیا تم مجھے جانتی نہیں ہو۔“ غم و غصے سے وہ بے ربطی سے بولی۔

”ہاں میں تمہیں نہیں جانتی۔ میں صرف شہرام معید کو جانتی ہوں جو کلثوم کی بیٹیوں کی وجہ سے تمہاری بہن کی نفرت کی بھیجٹ چڑھا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں کے ساتھ خالدہ کی لے پالک بیٹی بھی اس کی مجرم ہے۔“

وہ اس سے زیادہ بلند آواز میں چلائی۔ وہ دونوں ہی اب خاموش تھیں اور اپنا اپنا غصہ کنٹرول کر رہی تھیں۔

”میں تو! اس وقت تم چھوٹی تھیں۔ نازنین کے خوف سے یا زمانے کے ڈر سے تم سے فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔“ وہ تحمل سے اور ٹھنڈے لب و لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

”مگر اب تم میچور ہو، سمجھ دار ہو، فیصلہ کر سکتی ہو۔“ کاشیہ کی آواز نرمی کی انتہا کو چھونے لگی۔
”اگر ایسا ہے تو ہر بیٹی کو ہمیشہ خود کو چھوٹا ہی محسوس کرنا چاہیے تاکہ وہ بڑے بڑے فیصلے کر ہی نہ سکے۔ جو مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے انہیں اور ان کے والدین کو پستیوں کی نذر کریں۔ میں نے نازنین یا زمانے کے ڈر سے انکار نہیں کیا تھا۔ میں اب ابا کی پکار میں چھپا فیصلہ جان

فلتر میں گھسنے والا دشمن جان و دل، واوی سے نکلنے نہ پائے۔ ”ونگ کمانڈر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
 رامین کے تقری قہقہے نے شہرام کی اداسی میں دراڑ ڈالی۔

”یہ دو گھنٹوں سے خاموش ہیں۔ ان سے کہیں مجھ سے بات کریں۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔
 ”میں لیویہ ہوں۔ آرمی مجھے کسی بھی حکم کی سرتالی پر مجبور نہیں کر سکتی۔“ اس کے لہجے میں شرارت چمکی وہی تاثر نیبل کی آنکھوں میں بھی ابھرا۔
 ”میں کافی بھجواتا ہوں۔“ وہ مسکراتا ہوا وہاں سے غائب ہوا۔

اس کہانی میں یہ نیا پن آیا تھا کہ شہرام کے دل میں دلی محبت کی خوشبو واوی میں پھیل گئی تھی۔ اب اسے او اس دیکھ کر تسلیوں کے حروف اس کی ہتھیالیوں پہ لکھنے والے بہت سے لوگ تھے۔ وہ اس پہ عجیب سی نظر ڈالتا آگے بڑھا اور بادیانی تختے کے نوکدار کنارے پر رکا۔

وہ دنیا کا آخری کنارہ نہیں تھا مگر رامین کا دل ڈوب کے ابھرا۔ وہ اس کے عقب میں کھڑی دریا کا وہ حصہ نہیں دیکھ سکتی تھی جسے وہ دیکھ رہا تھا۔ وہاں لاوا تھا، دلیل تھی یا عذاب کا موسم۔ وہ منظر وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی جہاں اس کی نظر ٹھہری تھی۔

”بے شک ناراض رہیں مگر بات تو کریں۔“
 وہ اس کی عجیب خواہش پہ پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہوا۔ اس نے رامین کو دنیا کے آخری انسان کی طرح دیکھا جس کے بعد کہ ارض پر وہ تیارہ جاتا۔
 ”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“ وہ اس کے پاس سے گزرتا تختے کی نوک سے قریبی ایک چرمی نشست گاہ پہ بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس پل اس کے چہرے کے تاثرات سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی اس کے برابر میں براجمان ہوئی۔ وہ اسے پاس دیکھ کے مسکرایا۔

”کوئی بات کرو، نہیں بلکہ ڈھیر ساری باتیں کرو، بے معنی باتیں اتنی کہ انہیں سوچتے، سوچتے، دہراتے،

حیات ساجد کی بیٹی کا نام و نشان مٹ گیا۔ دفع کرو۔ نام نہ لو اس کا، جہاں بھی منہ کالا کرتی پھرے۔ اس عمر میں میں اپنی ماں کے لیے اپنے باپ کے نام کے لیے ذلت کا باعث نہیں بن سکتی۔ میں اس محبت کا چہرہ سیاہ نہیں کر سکتی جو شہرام نے مجھ سے کی۔“

یا ہر دروازے سے لگی سنبل آنسوؤں میں نما چکی تھی۔

”میں شام کو آؤں گی۔ میری پیکنگ بھی کرونا۔“
 وہ نروٹھے انداز میں بولی اور کھڑی ہوئی سنبل کا رخ اب باہر کی طرف تھا۔ وہ آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”آج کے دن کا تمہیں ضرور ثواب ملے گا۔“ کاشیہ کی تلملانی آواز اس نے سکون سے سنی۔

”میں مانتی ہوں کہ محبت ہوش کی دنیا کا پنچھی نہیں، مگر پنچھی ضرور ہے کھلی فضا میں آسمان تلے پرواز کرنے والا جسے پستیاں پسند نہیں۔“

وہ دروازے تک پہنچی تھی کہ عقب سے اس کی غصیلی آواز ابھری۔

”آج اس کمانڈر کو زندہ برف میں گاڑ کر اس پہ فاتحہ پڑھ کے آنا۔“

اس نے مسکرا کر دروازہ کھولا اور دھیمی چال چلتی اپنی راہ ہوئی۔ کاشیہ کا غصہ سمجھ میں آنے والی چیز تھا۔



برف باری آج اس واوی کے سب سے شاندار شخص کی طرح خاموش تھی۔ انہیں یوں ہی ساتھ چلتے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ اس کے کل کے رد عمل سے خوف زدہ ہو چکا تھا۔ وہ میس کے مشرقی حصے کی طرف دریا کے کنارے تک آئے۔ وہاں ونگ کمانڈر نیبل دو تین نوجوانوں کے ساتھ گیس لگا رہا تھا جنہوں نے اسے سیلوٹ کیا اور وہ جگہ چھوڑ دی۔

نیبل نے شہرام کی بو جھل اور اداس آنکھیں دیکھیں۔

”ہم نے ابھی سپہ سالار کو کال کی ہے۔ واوی سے لے کر گلگت بلتستان تک آرمی ہائی الرٹ ہو۔ واوی

کیا آئندہ یوں دھڑک سکتا تھا۔
 ”میں تو آیا اب بھی تمہیں پاکستان آرمی سے اتنی ہی
 محبت ہے؟“ اس نے اچانک عجیب انداز میں عجیب
 سوال پوچھا۔

”جب پاکستان سے محبت ہے تو فوج سے بھی لازماً
 ہوگی۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ کہاں ہیں۔“ وہ
 محبت سے چور لہجے میں بولی۔
 ”یہاں سال میں ایک بار پریڈ ہوتی ہے۔ اگر وہ تم
 دیکھنے آو تمہاری محبت سچ ثابت ہوگی۔“ وہ مجسم چشم
 ہوا۔

وہ مجسم نابینا ہوئی۔
 ”تم نے مجھے ہجر کے جنگل سے نکالا۔ زنجیر پا عشق
 آزاد ہو کے تمہارے ساتھ بہت انچائی تک اڑا۔ یہ
 سفر بخت جنوری بارہ سال پہلے کے زمانوں کی مہمان
 ٹھہری۔ تمہیں قریب سے دیکھنا تمہارے مقابل
 بیٹھنا وقت کا زمین کا معجزہ ٹھہرا تو سنو میرے مہمان
 محبت کو اب اور کیا چاہیے۔“

اس کی گہری خاموشی یہ وہ حد سے سوا بے قرار ہوا
 اور چہرہ موڑ کے اسے آخری سانس لینے والوں کی
 طرح دیکھا جس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔
 کوئی تو ہو جو تسلیوں کے حوف دے کر
 رگوں میں بہتی اذیتوں کا غور توڑے
 ”زندگی انتظار نہیں ہے شہرام اپنے راستوں
 میں کھڑا ہونے والوں کی ناقدری نہیں کرتے۔ وہ چہرہ
 تمہاری آنکھوں میں اگے پتھروں کو گلابوں میں بدل
 سکتا ہے۔“

وہ ملانہمت سے بولی کہ کوئی لفظ تو دل پہ اثر پذیر ہو۔
 ”جب ہمارے درمیان کوئی تیسرا ہے ہی نہیں تو پھر
 اس کا ذکر بھی کیوں۔“ اس نے ان بے حساب
 آنسوؤں کو بے چین ہو کر دیکھا۔
 ”ہمارے درمیان تیسری وہ ذات موجود ہے جس
 کے فیصلوں کو صبر کے ساتھ ماننا پڑتا ہے۔“ وہ دوبارہ
 نرمی سے بولی۔

”اس کے بعد گفتگو کے تمام پرندے کسی دوسرے

دہراتے باقی عمر تمام ہو۔“
 ان آنکھوں کی پتھریلی سطح آج مسلسل نم تھی۔
 راہین سے ان آنکھوں کی کمی دیکھی نہیں جارہی
 تھی۔

”شائینگ کہاں سے کرتے ہیں شہرام؟“ اس نے
 ایک بے تکلیبات کی وہ مسکراتے پہ مجبور ہوا۔
 ”میں ہمیشہ اس وادی میں تو نہیں ہوتا۔“ وہ سامنے
 کہیں بہت دور دیکھتے ہوئے بولا۔

”شہرام! آپ صرف اکیلے خرچ کرنے والے ہیں
 پھراتے پیسوں کا کیا کرتے ہیں؟“ اب کے وہ ہنسا۔
 ”کوئی حساب رکھنے والا نہیں۔ کوئی مجھ سے مانگنے
 والا نہیں تو سارے خرچ ہو جاتے ہیں۔“

اسی اثنا میں ان کے لیے کافی آگئی۔
 ”تم سب آرمی آفیسرز ایک دن میں کتنی کافی پیتے
 ہو۔“ وہ تلخ کڑوی کافی کا گھونٹ بھر کے بولی۔
 ”بہت بہت زیادہ۔“ آج اسے کافی سے اثرتی
 بھاپ اور خود میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔

”یہ کلر آپ کو سوٹ کرتا ہے۔“
 وہ نچلا لب دبا کے مسکرایا۔
 ”جیکٹ کا کلر؟“
 وہ کچھ گھبرائی۔

”سارے رنگ تم سے سوٹ کرتے ہیں۔“ خود ہی
 اپنی غلطی پکڑی۔ ”شہرام مجھے تمہاری خوشبو
 چاہیے۔“ پہلی غلطی چھپانے کو دوسرا جملہ پھر غلط بول
 گئی۔

کافی تک سے چھلکی۔ وہ بے یقین ہوا۔ وہ مبہوت
 ہوا۔ اس کے چہرے کے استعجابی تاثر سے وہ نروس
 ہوئی پھر گڑبڑا کر وضاحت کی۔

”مطلب وہ کلون جو تم استعمال کرتے ہو۔“ وہ اس
 کے یوں روانی سے وضاحت دینے پہ محفوظ سا ہو کے
 مسکرایا اور کتنی ہی دیر اس غلط جملے کی خوب صورتی کو
 محسوس کیا۔ اس تمام گفتگو میں اسے ان ہونٹوں کو بار
 بار چھوٹا بنا نام اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے نام لیوا ہزاروں
 ہوں گے مگر اپنا ہی نام سن کر دل جیسے اب دھڑکتا ہے

آسمان کی اوٹ تلے جا چھے تھے۔“ وہ زمین بخر نہیں ہے جس تم اپنے حصے کا پودا لگانا۔“

اسے پتا تھا کہ وہ آج مسکرا نہیں سکے گی سو اس نے ایسی کوشش بھی نہیں کی۔

”جیسا عشق شہرام نے آپ سے کیا، اگر کوئی مرد جتلانے عشق ہو تو ایسا ہی ہو۔“

سنبل کے آنسوؤں میں روانی آئی۔

”جیسی محبت آپ نے اس سے کی، ہر لڑکی کو محبت ہو تو اتنی ہی باختیار اور باوقار ہو۔“

سنبل نے ان خاموش آنکھوں کو اپنے آنسوؤں کی ذرا سی نمی دان کی۔

”اگر وہ خود کو تمہارا نہ بھی کر سکے، پھر بھی اس کا خیال رکھنا، اگر کبھی زیادہ اداس ہو تو اس سے میری میرے خدوخال کی باتیں کرنا، اس سے میری آنکھوں

وہ یوں لب بھینچے خاموش تھا کہ ایک صدی تک نہیں بول پائے گا، وہاں اب آنسوؤں کا ہلکا سا شور تھا۔

کیا وہ بیٹھے بیٹھے گہری نیند سے اٹھ چکا تھا، اس نے ہول کر نگاہیں اٹھائیں۔ وہ ان سرخ سوچی گیلی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

اس نے ان بھگے رخساروں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر پتے آنسوؤں کے آگے بند باندھا۔

”جب برف پگھلے گی تو میں کیسے جان پاؤں گا یہ پانی ہے کہ تمہارے آنسو۔“ وہ دوبارہ مسکرایا۔ اس کی ہتھیالیوں نے تمام آنسو جذب کیے۔

”بس کرو مینو!“ تمہاری دیدہ بینا کا پیش زدہ پانی اس پرف کو پانی پانی کر دے گا۔“ وہ مدہم سرگوشی مرہم نما

تھی۔

”کیا تمہیں وہ اولین گیت یاد ہیں؟“ کاٹ وار ہواؤں نے اس لڑکی کی سماعت کو چھوا۔

”ہاں!“ وہ مسکرائی۔ ”وہ سارے گیت میں نے سنا لیے ہیں۔“

”تم ہر طرف اس کے راستوں میں آنا کبھی تو اس کی نگاہ اٹھے گی۔“ سنبل نے اس عجیب لڑکی کو عجیب تر ہو کے دیکھا۔

”تمہیں اچھی لڑکی بننے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی ہر خواہش کو محبت سے منسوب کرتی رہنا۔“ اس نے کندھے سے سر کتابیک سنبھالا۔

کل وہ سارے آنسو بہا چکی تھی۔ آج اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے کہا تھا، یہاں موسم بہار میں درختوں کی کونپلوں سے پھوٹنے والی نمار زدہ خوشبو

اپنی ضرب سے دلوں کے قفل کھول دیتی ہے، تم ان دنوں اس خوشبو کا رخ اس کے دل کی جانب موڑنا

دیکھنا وہ قفل کھل جائے گا۔“ اس نے آنسو بہاتی سنبل کا ہاتھ تھاما۔

سنبل کا ہاتھ تھاما۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور جہول

دستِ کوہِ کر

فوزیہ یاسمین



قیمت - /750 روپے

شکوانے کا پتہ

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع فروری 2017 169

وصول کر کے تمہاری اور شہرام کی داستان سنایا کرے گا۔

اسے کاشیہ کی تلخ بات یاد آئی۔ اس نے چہار سو نگاہ کی وہ کہیں نہیں تھا۔ نگاہ مفلس ہو کر پلٹی، وہ اپنے قدم گنتی جیب کی طرف بڑھی۔ مڑ، مڑ کے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جیب میں سوار ہوئی، اٹھن پوری قوت سے غرایا۔

واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کے دیکھا، نگاہ غنی ہوئی، وہ دونوں ہاتھ پہلوؤں میں گرائے بے دم ساکھڑا تھا۔

”میں تمہاری نگاہ کی آس بھی نہیں توڑ سکا مینو!“ وہ بے آواز چلایا۔ جب برف پگھلے کی تو پانی میں صرف تمہارے آنسو ہی نہیں ہوں گے، اس کے رخسار بھگیے۔ (برف کی ویواروں سے بنا تھا پیار کا دوسرا شہر) جیب آگے بڑھ رہی تھی، ”میں مجھے نہیں ہنسوں گا مینو“ وہ بلند آواز سے چلایا۔ ”میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ رامین نے اس کے ہلتے لب دیکھے۔ اب وہ بہت پیچھے رہ گیا۔

تیرا عشق جاڑے کی شام تھا سو ٹھنڈا تھا سو بکھر گیا
تیرا عشق وقت غروب تھا سو وہ ڈھل گیا سو اتر گیا
تیرا ہجر ایسی نماز تھا جسے پڑھ کے کوئی نکھر گیا سو سنور گیا
اب اس نے الوداعی ہاتھ ہلایا نہ اس نے۔ اب وہ نکتے کی صورت بھی گم ہوا کہ بے رحم جیب نے موڑ کاٹ لیا تھا۔ اس کی پلکوں سے جڑیں سفید بوندوں نے آخری سانس لیا۔

تیر پیار زہرِ قدیم تھا جسے چکھتے ہی کوئی مر گیا کوئی اپنی جان سے گزر گیا



کے رنگ ڈمکنس کرنا اور ہاں اسے یہ بھی کہنا کہ اب رامین کو تمہارا کلون نہیں چاہیے۔ تم دیکھنا اس کا چہرہ مجھ سے اجائے گا، پھر اسے وہی آواز میں بتانا کہ وہ کہہ رہی تھی اب آخری سانس تک تمہاری خوشبو میرے رخساروں سے پھوٹی رہے گی۔ یہ سن کر وہ مخلوط ساہو کر مسکرائے گا۔

سنبل کی آنکھوں سے دکھ بہہ، بہہ کے نڈھال ہو چکا تھا۔

”تم اس کے سامنے مجھ سے محبت کا اظہار کرنا، وہ تمہیں چاہنے لگے گا۔ تم کہنا کہ میرے ہاتھ یہ رامین کا لمس نازہ ہے۔ وہ تمہارا ہاتھ تھا مے لے گا تم کہنا اس نے میری پلکوں کو چھوا، وہ تمہاری پلکوں پہ نثار ہو گا۔“ سنبل کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”تم کہنا مینو کہتی تھی ہم دونوں مسکراتے ہوئے ایک جیسی دکھتی ہیں۔ وہ تمہیں مسکراتا ہوا دیکھنا چاہے گا۔“

کھڑکی کے پٹ سے لگی وردہ نے اپنے۔ اچھلتے دل کو منہ پہ ہاتھ رکھ کے روکا۔

یہ کیسی لڑکی تھی جو اسے اپنا رقیب بھی بتا رہی تھی اور اپنے محبوب کو اس سے محبت کرنے کے ڈھنگ

سکھا رہی تھی۔ یہ اس شخص کو محبت کروانے کا کون سا انداز تھا۔ یہ وردہ اور سنبل دونوں نہیں جانتی تھیں مگر ان سے ہاتھ چھڑا کر رخصت ہوتی ہوئی وہ لڑکی جانتی تھی کہ ادا سیوں کے در بدر موسم میں رامین کا تذکرہ اس کی گفتگو ہی اس شخص کی محبت کے لیے پنا گاہ تھی۔

وہ سنبل کے گھر سے باہر آئی تو جیب میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ مبین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ بت بنی کاشیہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس نے نظر اٹھائی اور اس سفید عمارت کو آخری بار آنکھوں سے چوما۔

”جب یہاں آنے والے سیاح اس گھر کو بطور گیٹ ہاؤس استعمال کریں گے تو انہیں گیٹ کی پے



Downloaded From
paksociety.com

گئیں۔
عائشہ مسکرائی ضرور مگر بولی کچھ نہیں۔ اتنے میں
ثانیہ ہاتھ میں فون لیے چلی آئیں۔ ”ثانیہ کا فون ہے“
تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔“ اریشہ نے بے تابی سے
فون لیا اور شروع ہو گئی۔

”مام! آئی مس یو آلات آپ کب آئیں گی؟“
”اول اتنے دن بعد ہاں انجوائے تو کر رہی ہوں مگر
آپ کو مس بھی کر رہی ہوں نا۔“ وہ سوری۔

”اچھا زیادہ جتنی منی بننے کی ضرورت نہیں ایک تو
آئی بھی ڈھائی سال بعد ہو اور دو دن میں خالہ بھی یاد
آنے لگ گئیں۔“ عائشہ نے گھر کا۔

”سن رہی ہیں نا کیسے ڈانٹ رہی ہے زیادہ ہی بڑی
بن رہی ہے شادی کیا ہو رہی ہے بہت معتبر ہو گئی
ہے۔“ اس نے ماں سے شکایت لگائی، ابھی بات مکمل
نہیں کر پائی تھی کہ فون عائشہ لے کر کان سے لگا چکی
تھی۔

”ڈریسز تو تمہیں میری ہی مرضی کے لینے ہوں
گے۔ شادی میری ہے اس لیے میری شادی میں میری
ڈیسر کزن پلس فرینڈ میری مرضی کے نہ صرف ڈریسز
لے گی بلکہ تیار بھی اسی بیوٹی پارلر سے ہوگی جہاں سے
مس عائشہ نعمان تیار ہوں گی۔“ وہ اترائی۔

اریشہ نے اسے گھورا۔ ”میری بھی کوئی پسند سے یار“
”تمہاری پسند کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا لیکن
پرائیٹی میری چوائس ہوگی۔“

”ڈن۔“ اریشہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔
عائشہ اسے دیکھ کر کھلکھلائی۔ ”مرو نہیں رانیہ
کے بھی تو میں اپنی پسند سے ہی لاؤں گی نا اسے تو کوئی
اعتراض نہیں۔“

”اس کزن کا دیدار بھی کروادو جب سے آئی ہوں
نام ہی سن سن کر پاگل ہو رہی ہوں۔“
”دیکھ کر تو حواس بالکل ہی جاتے رہیں گے۔“
”اپنی ڈراؤنی ہیں؟“ اریشہ کی آنکھیں پھیل

ٹاؤلیٹ



Downloaded From
Paksociety.com

PAKSOCIETY.COM

”جی خالہ، کہہیے آپ تو ٹھیک ہیں نا اور کیا ہو رہا ہے۔ ہم دونوں بس اب نکلنے ہی والی ہیں، مئی بعد میں آ کر ہمیں جوائن کر لیں گی، جی جی بڑا لمبا پروگرام ہے آج کا تو، جی، اوکے اللہ حافظ۔“ فون بند کر کے —

تیز تر رکھ دیا۔
”مجھے ابھی بات کرنی تھی۔“ ایشہ نے احتجاج کیا تھا۔ ہاں تو واپس آرا اپنے فون سے کر لیتا، اب چلیں ورنہ لیٹ ہو جائیں گے۔
”لیڈیز، لیڈیز، پلیز سن ٹوی۔“ زیان تیزی سے لاؤنج میں آیا تھا۔ سفید ٹی شرٹ، سفید شارٹس اور سفید موزے اور جاگرز میں پسینے، پسینے ہوتا ہوا تینس کھیل کر آ رہا تھا۔

”جلدی سے میرے لیے انرجی ڈرنک لایا جائے ورنہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔“ وہ سامنے والے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا۔

”یہاں کون فارغ بیٹھا ہے جو تمہارے لیے یہ اہتمام کرتا پھرے۔“ عائشہ نے ناک چڑھائی۔
”ہیں! یہ دو دو جوان جہان لڑکیاں جو یہاں بیٹھی نظر آ رہی ہیں، مجھے تو وہ دونوں بالکل فارغ ہی دکھائی دے رہی ہیں۔“ اس نے آنکھیں پھاڑیں۔

”ہم کوئی نہیں فارغ وارغ، شاپنگ پر جا رہے ہیں۔“ عائشہ نے ایشہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”فریش جوس بنانے میں شاپنگ لیٹ ہو جائے گی۔“ اچھا کچن میں نازک یا شریف تو ہوں گے۔ ان سے ہی کہہ دو۔“

”وہ تم خود بھی کہہ سکتے ہو۔“ وہ بے مروتی سے کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

”مام، مائے ڈیور مام۔“ وہ ثانیہ کو کچن میں جاتے دیکھ کر لپکا، وہ دونوں مسکراتی ہوئی باہر آ گئیں۔

ڈرائیور گاڑی پورچ سے نکال کر روتھ پر لارہا تھا کہ باہر سے ایک بلیک کرولا تیزی سے اندر آئی تھی۔

دروازہ کھول کر ایک لڑکی باہر آئی تھی اور پہلی بار ایشہ کو پتا چلا کہ انسان کسی کو دیکھ کر یوں منجمد بھی ہو سکتا ہے، وہ تو سچ سچ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

اتنی ہی حسین تھی کہ اسے دیکھ کر ارد گرد سب بھلا دیا جائے۔ کم از کم ایشہ نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

اتنی گوری رنگت، نیلی آنکھیں، ستواں ناک اور بہت گلابی ہونٹ، گولڈن براؤن بال، ایک پونی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور خود وہ سیاہ پینٹ بلیو شرٹ اور سیاہ لیڈیز جیکٹ میں ملبوس تھی۔
انہیں دیکھ کر پہلے تو ٹھنکی پھر قریب آگئی ”ہیلو“ ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ہیلو۔“ ایشہ نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔
عائشہ نے تعارف کروایا۔ ”یہ میری کزن ایشہ ہے، کراچی سے آئی ہے اور یہ رانیہ ہے، یہ میری چچا زاوہ ہے۔ یعنی یہ بھی کزن ہے۔“

ایشہ خیر سگالی کے طور پر مسکرائی تو رانیہ نے مبہم سے ہونٹ پھیلائے۔ ”مجھے جلدی ہے، واپس بھی جانا ہے، ایکسکوز می۔“ وہ معذرت کرتی اندر لاؤنج میں چلی گئی اور وہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھیں۔

”اللہ، اتنی حسین لڑکی اف! ایشہ نے دونوں ہاتھ چہرے کی دونوں طرف — رکھ کر، آنکھیں موند کر جیسے کہا، عائشہ کو ہنسی آگئی۔

”میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ حواس کھو دو گی۔“
”یار! یہ گئی کس پر ہے، اتنی تباہ کن خوب صورتی۔“

”اپنی مام بران فیکٹ ہماری چچی، سنا ہے بہت خوب صورت تھیں، ایسے ہی تو نہیں شایان انکل! ان کے پیچھے سب چھوڑ چھاڑ کر سونٹزر لینڈ میں ہی رہائش پذیر ہو گئے تھے۔“

”سلم اور اسمارٹ بھی کتنی، چال کتنی خوب صورت، کس کس خوبی کی تعریف کی جائے؟“
”تعریف اس خدا کی جس نے اسے بنایا۔“ عائشہ کے کہنے پر ایشہ بھی ہنس پڑی تھی۔



”مام، کچھ رہے ہیں رات کے گیارہ بج رہے ہیں

سے آکر پوچھ لیا کرے، میں ان کی تسلی کروا دوں گا۔“
اس بار ان کے لہجے سے واضح برہمی چھلکی تھی۔
ثانیہ خائف ہو کر کمرے سے ہی نکل آئیں۔
”تو بے ہے، ان کو تو چھین کر میں بچھتاؤں، بیسی کی محبت میں
کسی کی سننے کو تیار نہیں تو نہ سہی، مجھے کیا جو ہوتا ہے
ہو۔“ جلتی کڑھتی لاؤنج میں آئیں، وہاں سامنے سے
رائیہ آتی دکھائی دی۔

”دل بھر گیا باہر سے جو گھر آنے کا خیال آ گیا بلکہ
ابھی بھی نہ آئیں، صبح آجائیں، تمہیں کون سا کسی نے
کچھ کہنا ہے، وہ تو ہمارے نصیب میں سب کی سنتا لکھا
ہے۔“

انہوں نے میاں کا غصہ بھی اس پر نکالا تھا، رائیہ
نے ایک نظر انہیں دیکھا اور دھیسے سے کہا۔

”اب بھی اگر کام مکمل نہ ہوتا تو رکنا بھی پڑ سکتا
تھا۔“

”اے ڈھٹائی تجھے سلام۔“ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
”تمہیں تو بی بی پاکستان آنا ہی نہیں چاہیے تھا، تم وہیں
ٹھیک ٹھیک بیٹاؤ رات رک جاتیں؟ ایسے گون سے کام
چل رہے ہیں، جو رات رات بھر نمٹتے ہی نہیں۔“

وہ تو شروع ہو گئی تھیں، رائیہ خاموشی سے اپنے
کمرے میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ثانیہ اسے کچھ
زیادہ پسند نہیں کرتیں، اب تو وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی
کہ وہ شایان کی شادی اپنی بہن سے کروانا چاہتی تھیں
اور انہوں نے جا کر سوئٹزر لینڈ میں بیاہ رچا لیا۔ دو سال
قبل شایان اور ماریانہ کی ناگہانی وفات کے بعد نعمان
رائیہ کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ثانیہ تو اس کا حسن دیکھ کر ہی ہول گئی تھیں۔ دو
دو جوان بیٹے تھے ان کے، ایک ہی گھر میں اتنی حسین
لڑکی کے ساتھ رہتے ہوئے جذبات میں کبھی بھی کوئی
ابل اٹھ سکتا تھا، پسندیدگی کا محبت کا اور وہ اس فرنگن
کی بیٹی کو ہرگز کسی مستقل رشتے میں قید کر کے گھر میں
رکھنے کی روادار نہیں تھیں۔

انہیں ایسی مشرقی اقدار کی حامل ہو چاہیے تھی جو
ان کی نسلوں کو بردان چڑھاتے ہوئے اپنی تہذیب و

اور رائیہ ابھی تک نہیں آئی، یہ آخر کون سی نوکری
کرتی ہے؟“

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر، آج مجھے بتا ہی
و۔ کیوں تم اس کے پیچھے بڑی رہتی ہو؟“
نعمان نے جھلا کر وہ کتاب سائیڈ ٹیبل پر پینچ دی جو وہ
پڑھ رہے تھے۔

”اس میں پیچھے پڑنے کی کیا بات ہے، جوان جہان
لڑکی ہے، اتنی اتنی رات تک باہر رہتی ہے تو تشویش تو
ہوتی ہی ہے، پرانی ذمے داری سر پر آن پڑی ہے تو
بھالی تو ہے نا کسی بھی طرح سے، اپنی بیٹی باہر ہوتی تو
تب بھی آپ پونہ بیٹے فکر بیٹھے رہتے۔“

”ہاں اگر مجھے یہ پتا ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کس کام
میں مصروف ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو پتا ہے کہ وہ کہاں
ہے اور مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“ ان کی آواز میں
گلہ تھا۔

”تم نے پوچھا کب ہے کہ میں بتاتا، تم تو پورے
وٹوق سے بات کرتی ہو کہ جیسے تمہیں کفرم ہے کہ وہ
کسی غلط کام میں ہی ملوث ہے۔“

”ہاں تو کس اچھے کام میں اس وقت تک لگی ہوئی
ہے، یہ بھی تو بتا میں نا آپ؟“ وہ چمک کر بولیں۔

وہ کتنی ہی دیر انہیں دیکھتے رہے، ان کی نظروں میں
تاسف، غصہ، دکھ کیا نہیں تھا۔ ”تمہیں اس سے
پر اہم کیا ہے، صرف یہ بتا دو؟“

”مجھے کوئی پر اہم نہیں، صرف تشویش ہے کہ جوان
بچی ہے، خدا نخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے۔“

”بس۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر آگے بات کرنے
سے روک دیا۔ ”مزید ایک لفظ بھی نہیں، وہ میرے
مرحوم بھائی کی بیٹی ہے، میری ذمے داری اور میں اپنی
ذمے داری نبھانا بخوبی جانتا ہوں، تم پریشان نہ ہوا کرو۔“

”تو دوسرے تو پوچھتے ہیں نا کہ یہ لڑکی ہوتی کہاں
ہے؟“

”تم سے آئندہ جو بھی پوچھے اس سے کہہ دو کہ مجھ

پہلے تو شاید اتنی بڑی نہیں تھیں، جتنی اب ہوتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

”تمہاری ناک ستواں ہے تو نوز پن اس پر کتنی اچھی لگ رہی ہے نا، یہ ہر کسی پر تھوڑی نا ایسی جتنی ہے۔“ ارشہ کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئی تھیں۔

اسی بل بڑی بے نیازی سے اس کے بالکل قریب سے گزر کر رانیہ کچن میں گئی تھی۔ زبان بھی جاگنگ سے ابھی لوٹا تھا اور آکر سیدھا ان کے قریب ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھا اور ارشہ نے جس جس کے دو گھونٹ بمشکل پئے تھے، اسے اٹھا کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔

”تمہارے بال کتنے گھنے اور کالے ہیں، بالوں کا تو اصل حسن ہی کالے پن میں ہے۔“ عالیان پر تو کوئی دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ مزید بھی کچھ کہتا مگر زبان نے ٹوک دیا۔

”اب بس کرو، تاکہ اس کی آنکھیں اپنے اصل سائز میں واپس آجائیں، ورنہ اب اگر تھوڑی اور پھیلیں تو خدشہ ہے ڈھلے تڑپ کر باہر آگریں گے اور مجھے تو یہ ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں والی ہی اتنی عجیب لگ رہی ہے تو بغیر ڈھیلوں کے کیسی لگے گی۔“ انہ اس نے تصور کر کے باقاعدہ جھرجھری لی تھی۔

”اور آپ پر یہ سارے انکشاف آج ہی ہوئے ہیں۔“ وہ اب بچ بچ برامان گئی تھی۔

”چائے پیو گی۔“ رانیہ دو ایلے ہوئے انڈے اور چائے کے کپ کے ساتھ وہیں آ بیٹھی تھی۔

”اتنا سناشتہ؟“

”ہوں، کافی ہے۔“ وہ نفاست سے انڈہ کھانے لگی، ساتھ ہی چائے کے گھونٹ بھی لے رہی تھی۔

سیاہ جینز، سیاہ شرٹ اور لیڈر کی کالی جیکٹ، بیحد سفید رنگت اور اس پر سیاہ آؤٹ فٹ، تباہ کن حسن تھا اس کا، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا، وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ زبان کو چٹکی بجالی پڑی۔

”آج بچو، اپنی چلی گئیں وہ حسینہ عالم۔“

روایات کو پیش نظر رکھتی تاکہ خود بھی مغربی لباس چڑھائے گاڑی میں سڑکیں ناپتی نظر آتی۔

”اب چل کر سکون سے سو جاؤ،“ آچکی ہے وہ جس کی وجہ سے تمہیں سخت بے چینی تھی۔“ نعمان نے پیچھے سے مخاطب ہو کر انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ سخت سا جواب دینا تو چاہتی تھیں مگر پھر نظر انداز کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گئیں۔ وہ بھی مسکراہٹ دباتے آ کر لیٹ گئے تھے۔

”وزیر اعظم کا عمدہ کہیں آپ ہی نے تو نہیں سنبھال لیا۔“

”خدا نخواستہ میں کیوں سنبھالنے لگا۔“

”آپ کی مصروفیات تو یہی بتاتی ہیں۔“

”یعنی طنز فرما رہی ہیں آپ مجھ ناچیز پر۔“

عالیان کے منہ لٹکانے پر ارشہ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھی۔ ”ایسی کون سی جاب ہے آپ کی، جس میں دن رات کا پتا نہیں چلتا، بندہ کسی وقت تو نظر آتا ہے گھر پر۔“

”اور یہ وہی وقت ہے،“ عالیان مسکرایا، ”ویسے تم واقعی بہت ذہین ہو، ارشہ، میں بہت متاثر ہوا ہوں تمہاری ذہانت سے۔“

ارشہ ہکا بکا رہ گئی تھی، یہ جو دو تین باتیں اس نے عالیان سے پوچھی تھیں، بہت ہی عام سی، اس کی مصروفیت کے حوالے سے، ان میں اسے ذہانت کہاں سے نظر آئی تھی؟

”عورت حسین ہو اور اوپر سے ذہین بھی تو کیا کہنے اس کمبہنیشن کے واہ۔“

جھٹکے، جھٹکا، عورت کہلوانا ایک جھٹکا (سب سے شدید جھٹکا ہی اصل میں یہی تھا) مگر حسن و ذہانت؟ وہ ابھی بحر تیر میں ڈکیاں لگا رہی تھی کہ مزید بم پھوڑے گئے۔

”تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں، گہری سیاہ اور بڑی بڑی۔“

”ایک چائے میرے لیے بھی“ رانیہ کی آواز پر
اریشہ مڑی۔

”آج آپ بے وقت کیسے؟“
”ہاں آج کچھ فرصت تھی تو گھر آگئی۔ کیا ہو رہا ہے،
کوئی آیا ہے کیا؟“ اس نے ٹرائی کا جائزہ لے کر پوچھا۔
”ہاں عائشہ کے سرالٰی ہیں“ اس نے نا آپ بھی وہیں
چل کر چائے پیتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر آفر کی۔

رانیہ کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ ”نو تو ہینکس میں
اپنے روم میں جا کر کچھ دیر آرام کروں گی۔“ وہ نازک
سے اپنا کپ لے کر چلی گئی۔

”کچھ دیر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتیں تو کیا تھا؟ اپنی
ہی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے رکھتی ہیں، زیادہ ہی غرور
ہے خود پر۔“ اریشہ نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”کیسے بیٹھ جاتیں، بیگم صاحبہ کو بالکل پسند نہیں
آتی یہ بات۔“ نازک نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
اریشہ چونک گئی۔ ”خالہ کو؟ مگر کیوں؟“

”وہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتیں نارانیہ بی بی کو اور پھر
وہ کپڑے بھی دیکھیں نا؟ ٹگریزوں والے پہنتی ہیں تو
انہیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“

”تو اس بیچاری نے ساری عمر ہی لباس پہنا ہے تو
اب کیسے وہ شلوار قمیص پہنے گی، وہ تو بالکل کھنڈر ٹیبل
فیل نہیں کرے گی۔“

”بس جی، بیگم صاحبہ نے سختی سے انہیں منع کیا ہوا
ہے کہ عائشہ بی بی کے سرالٰی والوں کے سامنے نہیں
آنا اور عالیان صاحب اور زیان صاحب سے فری ہو کر
بات چیت نہیں کرنا، نہ ہی گھر کے معاملات میں
مداخلت کرنا۔“

”اوہ، تو یہ وجہ ہے اس کے سب سے کٹے کٹے رہنے
کی۔“ اریشہ نے گہری سانس لی تھی۔

”باجی، آپ یہ سب اپنے تک رکھیے گا، بیگم
صاحبہ کو نہیں بتائے گا۔“ اس نے ہلکی لہجے میں اریشہ
سے کہا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور اس کا شانہ تھپکا۔
”تم فکر ہی نہ کرو۔“

”وہ واقعی ہے حسینہ عالم۔ نو ڈاؤنٹ۔“

”او کے گائیز پائے۔ چلتا ہوں میں بھی۔“

”ہاں آپ نے اب کرنا بھی کیا ہے یہاں۔“ زیان
برسر پایا۔

”کیا مطلب؟“ اریشہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”تم مطلب و مطلب چھوڑو، تمہارے بس کی بات
نہیں ہے یہ سب سمجھنا۔“

”کیوں میں کیوں نہیں سمجھ سکتی مثلاً؟ کیا نہیں
سمجھتی میں۔“ وہ بگڑ گئی۔

زیان نے چکارا ”خوا مخواہ اپنے ننھے منے دماغ پر
زیادہ لوڈ مت ڈالو، بس اتنا سوچو کہ پہلے تو تمہاری
تعریف میں زین آسمان کے قلابے مل رہے تھے پھر کیا
ہوا ایک دم کیوں اٹھ کر چلے گئے؟“

”ہیں واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“
”سوچو بھی مت، خوا مخواہ کمزور ہو جاؤ گی۔“
”میں جاؤں عائشہ کو اٹھاؤں بہت کام ہے۔“

”واہ، میرے آتے ہی سب اٹھنے لگے، میں اکیلا
ناشتہ کروں گا۔“ زیان نے ناراضگی دکھائی، وہ بے بس
ہو گئی۔

”میں تو۔۔ اچھا، میں بیٹھی ہوں یہیں تمہارے
پاس۔“ زیان نے مسکراتے ہوئے نازک کو ناشتے کے
لیے آواز دی تھی۔



عائشہ کی سانس اور نند آئی ہوئی تھیں۔ اریشہ پہلی
بار ان سے ملی تھی۔ بروقاری صاعقہ آئی اور ان کی
بیٹی پنہزہ بہت ہی اچھی عادت کی تھیں، وہ عائشہ کو
ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ انہیں بازار جانا تھا تو عائشہ
کے کپڑے، جوتے اور پرس وغیرہ اس کی پسند سے لینے
کے لیے وہ اسے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھیں۔
عائشہ اور رانیہ ان کے پاس بیٹھی تھیں کہ اریشہ چائے
کے لیے نازک کی مدد کروانے پگن میں چلی آئی۔

”بس باجی، سب تیار ہے۔ آپ بس ٹرائی میں لگاتی
جائیں۔“ اریشہ برتن کو ٹرائی میں رکھنے لگی۔

کے ساتھ آئی تھی۔
 ”آپ کو سونس زبان تو آتی ہوگی۔“
 ”ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔

”اف۔“ دونوں گالوں میں ہلکے ہلکے سے ڈمپل پڑتے دیکھ کر اریشہ کا دل پھر سے لٹو ہو گیا تھا۔

”آپ نے اردو کیسے سیکھی؟“
 ”ڈیڈ اردو میں ہی بات کرتے تھے۔“
 ”آپ ان کی ایک ہی اولاد ہیں؟“

”ہاں دو بھائی ہوئے تھے مگر زندہ نہ بچ پائے۔“
 ”اوہ سیڈ، سچ سچ۔“ اس نے باقاعدہ آواز نکال کر افسوس کیا تھا۔

”یہ کیا سیڈ باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ اچھی اچھی باتیں کرو، کھو رانیہ میں تمہارے لیے ایئرٹن ڈریسز لارہی سون تمہیں وہ پہننے بھی ہیں۔“

”ہاں پین لوں گی مگر پیلیز ایزی والے ڈریسز لانا، وہ مت لے آنا، کیا کہتے ہیں ان کو۔“ اس نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

”شرارے، غرارے، ہلنگے ساڑھیاں۔“
 ”ہاں وہی، جتنے مشکل نام ہیں، اتنا ہی مشکل انہیں سنبھالنا بھی ہے۔“

”تو اپنی شادی پر بھی ان مشکل لباسوں کو نہیں پہنو گی کیا؟“ عائشہ نے چھیڑا تو رانیہ کی رنگت تھمتھاسی گئی تھی۔ اریشہ کو یوں سرخ چہرے کے ساتھ وہ اتنی اچھی لگی کہ اسے دل میں چھپا لینے کو جی چاہا تھا۔

”رانیہ آپ سے ایک بات پوچھوں؟“
 ”ہاں پوچھو۔“ وہ مکمل طور پر اریشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ کہیں انگلی جھڈ ہیں؟“
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ اب تک فری کیسے ہیں؟“ اریشہ کے شرارت سے کہنے پر وہ بھی مسکرائی تھی۔

”آپ میں کیا؟“

عائشہ اور اریشہ کھانا کھانے کے لیے آئیں تو ٹھنک گئیں۔ آج تو بڑی رونق تھی ڈنر ٹیبل پر۔ نعمان، ثانیہ، عالیان اور زیان اور سب سے بڑی بات رانیہ بھی موجود تھی۔

”واؤ، آج تو سب ہی فیملی ممبرز موجود ہیں۔“ عائشہ چبکی۔

عالیان خوش دلی سے مسکرایا ”ہاں تم جب تک یہاں ہو، ہم نے سوچا تمہارے ساتھ کھاپی لیں۔“
 ”چلیں شکرے آپ کو خیال تو آیا۔“ وہ مسکرائی ہوئی اریشہ سمیت اُکریٹھ گئی۔

”اور اریشہ، کیسی ہو بیٹا، دل تو لگا ہوا ہے نا؟“
 ”جی ابھی تو لگا ہوا ہے، جب تک عائشہ ہے، اس کی شادی کے فوراً بعد میں بھی چلی جاؤں گی۔“

”کیوں، ہم تمہاری کچھ نہیں لگتے۔“ زیان تو تڑپ ہی گیا تھا۔ عالیان البتہ مسکراتا رہا تھا۔

”لگتے تو ہیں لیکن عائشہ تو میری دوست پس کزن ہے نا اور ہم دونوں لڑکیاں ہیں، تو وہ بات تو نہیں رہے گی نا۔“

”لڑکی تو یہ بھی ہے اور دوست بھی بنائی جا سکتی ہے۔“
 زیان نے رانیہ کی طرف اشارہ کیا، وہ اریشہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ اریشہ بھی مسکرانے لگی۔ ”ہاں کیوں نہیں لیکن اب میں خود بھی تو سب کو مس کر رہی ہوں۔“

”ہوں ننھی بچی، مس کر رہی ہوں، شادی کے بعد بھی صبح اٹھ کر رونے بیٹھ جانا، مجھے می یاد آرہی ہیں۔“ وہ باقاعدہ منہ بسور کر بولا، سب ہنس پڑے تھے۔

”شریر۔“ ثانیہ نے چپت لگائی۔
 کھانے کے بعد عالیان اور نعمان کہیں چلے گئے تھے اور زیان کی تونٹیٹ پر بے پناہ مصروفیات تھیں۔ رانیہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو اریشہ نے پکارا۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ آئیں نا رانیہ۔“ وہ کچھ سوچ کر گئی، پھر اثبات میں سر ہلائی لاؤنج میں ان دونوں

www.paksociety.com

www.paksociety.com

اور عائشہ، ثانیہ کے پاس آگئیں انہوں نے بلایا تھا۔
اب وہ انہیں زیورات دکھا رہی تھیں جو رات ہی
وہ نعمان کے ساتھ جا کر لائی تھیں۔

”بہت خوب صورت ڈیزائن ہے خالہ! بہت
زبردست۔“

”تمہارے لیے بھی ایسا ہی بناؤں گی، فکر مت
کرو۔“

اریشہ جھینپ گئی، اور عائشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی
معا، ”کل نیل کی آواز سنائی دی تو خالہ چونک پڑیں۔“

”اس وقت کون آگیا؟“

”جیمیل دیکھ لے گا مئی۔“

”دیکھ تو لے گا پتا نہیں ہے کون؟“

”ڈھونکی کب رکھوائیں گی خالہ؟“

”بس اب دیکھو، آئندہ جمعے کو مایوں کا ارادہ ہے اور
ہفتے کو مندی، اتوار کی بارات تو اب ایک دو دن میں
اس کی ساری دوستوں اور کزنز کو بلا کر یہ ڈھونکی کا
سلسلہ تو شروع کرواتے ہیں، ثانیہ تو جمعے کو آنے کا کہہ
رہی ہے اب دیکھو، دوسرے کب کب آتے ہیں۔“

”کل سے مجھے بھی فیشنل وغیرہ کے لیے دو تین دن
تک پارلر جانا ہے، جیمین نے کہا تھا، مینی پیڈی روز
ہوا کرے گی۔ کہہ رہی تھی بازار کے چکر اب بند کر
دو۔ دھول مٹی سے ساری اسکن خراب ہو جاتی
ہے۔“

”تو اب رہ بھی کیا گیا ہے بازار سے لانے والا، بس
کرو اب تم بھی۔“

”بس آج دیکھتی ہوں کوئی چیز نہ گئی ہو تو پھر کل
سے پابندی شروع۔“

دھاڑ سے دیروازہ کھلنے کی آواز پر اس کی باقی بات منہ
میں ہی رہ گئی تھی اور سامنے دیکھتے ہی دہشت سے
آنکھیں پھٹ گئیں۔ جیمیل کی پشت سے پستول لگائے
وہ لمبا تڑنگا اجنبی مرد، جس نے اندر آتے ہی جیمیل کو
دھکا دے کر آگے بھینکا تو وہ ثانیہ کے قدموں میں آگرا
وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہوئیں، اریشہ اور عائشہ چیخ مار کر
ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اب پستول کا رخ ان

”کیا انگیجمنٹ؟“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نہیں انگیجمنٹ تو نہیں مگر۔؟“ وہ رکی، رانیہ نے

سوالیہ ابرو اچکائے۔ اریشہ نے عائشہ کو اشارہ کیا کہ وہ
بتائے، وہ ہلکے سے کھنکھاری۔

”اسے مئی نے خالہ سے مانگ رکھا ہے؟“

”کس کے لیے؟“ اس نے دونوں کو باری باری
دیکھا۔

”عالیان بھائی کے لیے۔“ عائشہ نے جواب دیا۔

رانیہ جھک کر ٹیبل پر کب رکھ رہی تھی، کچھ لمحوں
کے لیے ساکت رہ گئی تھی، پھر سنبھل کر سیدھی ہو
بیٹھی، ”تاکس۔“

”کیسا پبل ہے دونوں کا؟ آپ کے خیال میں؟“

”کننگ وائر تو بہت اچھا۔ مزید تو ان دونوں کو ہی
ایک دوسرے کے خیالات اور پسند، ناپسند کا علم ہو
گا۔“

”مطلب میں سمجھی نہیں؟“ اریشہ نے ابرو اونچا
کر کے پوچھا۔

”میرا مطلب، آپ دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ سے
ہے۔“

”وہ تو الحمد للہ بہت اچھی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے، اب میں چلوں۔“ وہ
اٹھ گئی۔

”کچھ دیر تو اور بیٹھیں نا۔“

”ضرور بیٹھتی مگر بہت ضروری کام نمٹانے ہیں۔“

”چلیں پھر گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ اینڈ سویٹ ڈریمز۔“



”ارے رانیہ! آپ اتنی جلدی آگئیں۔“ اریشہ

نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں طبیعت کافی خراب ہو رہی ہے تو آئی، کچھ دیر
آرام کروں گی۔“ اس کی آواز بھی بھاری ہو رہی تھی

اور چہرہ سرخ، ٹیبلٹ لے کر وہ لیٹ گئی تھی۔ اریشہ

کی طرف تھا۔

”ہینڈ زاپ۔“

تینوں نے انتہائی خوفزدہ ہونے کے باوجود پہلے اپنے دوڑنے صحیح کیے پھر دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے تھے ہینڈ پر کھلے ہوئے سونے کے سیٹھ الماری کے پٹ کھلے ہوئے عائنہ اور اریشہ بیڈ پر بیٹھی ہوئیں اور ثانیہ بیڈ کے پاس کھڑی تھیں اور ان کے قدموں میں گرا جھیل اب اٹھ کر بیٹھ جانے کے بعد ہاتھ اوپر کیے ہوئے تھا۔

”چاروں یہاں ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔“

کاچنی ناگنوں کے ساتھ چاروں لائن میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے جیب سے فون نکال کر کان سے لگایا۔

”ہو گیا کام سب کو کر دیا نا انا غفیل ہاں تو اب آجا یہاں ہاں میں بتاتا ہوں بس تو آجا۔“

اور چند لمحوں میں اسی کے ڈیل ڈول کا ایک اور آدمی اندر آچکا تھا۔ ”چل اب ذرا انہیں بھی کچھ دیر کے لیے سلا دے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آئے اور پستول کا دستہ ان کی کھوپڑیوں کو سہلانا گیا اور وہ چاروں زمین پر گرتے چلے گئے۔

اریشہ کو ہوش آیا تو سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو یہ محسوس کر کے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں کہ وہ بندھی ہوئی ہے۔ اس نے دیکھا کہ اسے کرسی کے ساتھ کس کر رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اتنی مضبوطی سے کہ وہ حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے نظریں گھمائیں تو یہ دیکھ کر اس کے لب بھنج گئے کہ عائنہ اور ثانیہ بھی پاس ہی موجود دو دوسری کرسیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

جھیل نہیں تھا۔ نہ معلوم اسے کہاں رکھا تھا انہوں نے اور رانیہ؟ وہ چونک گئی۔ رانیہ بھی تو تھی گھر پر ابھی وہ ان کے ساتھ نہیں تھی تو پھر وہ کہاں تھی

معا” روزانہ کھلا اور وہی آدمی اندر آیا اس کے

پیچھے آنے والے کے کندھے پر رانیہ تھی۔ وہ یقیناً بے ہوش تھی اور اگر اریشہ کے دل میں ایک پل کے لیے بھی یہ خیال آیا تھا کہ رانیہ چونکہ ان کے ساتھ نہیں ہے تو وہ لازماً ان کے لیے کچھ کرے گی تو وہ خیال اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ وہ آدمی رانیہ کو کرسی پر بٹھا کر ہٹنے لگا کہ وہ نیچے پھسل گئی۔

”ارے ویڈیو تو بھی آ یہ بے ہوش ہونے کی وجہ سے ٹھہر نہیں رہی میں پکڑتا ہوں تو باندھ۔“ وہ جیسے ہی جھکا۔

”اوغ“ کی آواز کے ساتھ پلٹ کر پیچھے گرا تھا ویڈیو جو آگے آ رہا تھا حیرت سے ٹھٹکا ہی تھا کہ رانیہ کھلتے اسپرنگ کی طرح اچھلی اور سر کی ٹکر اس کے سینے میں دے ماری وہ اتنی آسانی سے ہرگز شکار نہ ہوتا مگر حیران ہونے کی وجہ سے رانیہ نے فائدہ اٹھا لیا اور بے درپے چومیں لگا کر اسے بے ہوش کر دیا مگر وہ ویڈیو کو بھول گئی جو پیچھے سے اس پر جھپٹا تھا۔

اس نے کپڑے کی گڑیا کی طرح رانیہ کو اٹھا کر منہ کے بل زمین پر دے مارا۔ رانیہ نے بروقت اپنے ہاتھ آگے رکھ کر منہ کو بچا لیا ورنہ تو اس کا منہ بچک جاتا۔ ویڈیو نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑی ہی تھیں کہ رانیہ کا اوپر کا جسم یوں بل کھا کر مڑا جیسے وہ پلاسٹک کی تھی ہو۔ اس نے زوردار مکا اس کے پیٹ میں مارا تھا وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اوندھا ہوا ہی تھا کہ رانیہ اس پر جھپٹی مگر یہیں وہ غلطی کر گئی۔ اس کے نزدیک آتے ہی وہ اچھلا اور اسے اپنے ساتھ رگدتا ہوا دور لے گیا۔ جب کھڑا ہوا تو ایک ہاتھ رانیہ کی گردن میں اور دوسرا اس کے پیٹ کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

”ایک جھٹکے میں تمہاری گردن ٹوٹ سکتی ہے اس لیے اب بہتر ہے کہ ساکت ہو جاؤ۔“ وہ غرایا تھا۔

اریشہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یا اللہ سارے ملازمین کہاں ہیں کہ یہ ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں خواہ خواہ کوئی نقصان نہیں یا اللہ! رحم فرما۔ ہم چاروں عورتیں ہی عورتیں۔ اتنی دیر میں ویڈیو نے اس کے پیٹ کے گرد بازو ہٹا کر پستول نکال کر رانیہ کی

کنپٹی برر رکھ دی۔

”تم ہمیں بے وقوف سمجھ رہی تھیں۔“

رانیہ بالکل ساکت ہو گئی تھی۔

اریشہ چیخ پڑی ”پلیز اسے کچھ مت کہنا پلیز“ تمہیں

جو چاہیے وہ لے جاؤ۔“

”اس کے لیے ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت

نہیں ہے۔“

”دیکھو تمہیں اللہ کا۔“

”مجھے کسی کا واسطہ دینے کی ضرورت نہیں۔“ وہ

سفاکی سے جواب دے رہا تھا اتنی دیر میں اس کا ساتھی

بھی کراہتا ہوا ہوش میں آگیا۔

”اٹھ جا اب بہت ہو گیا آرام سارا سونا اور کیش

لے آ پھر ان کا فیصلہ کریں۔“

”ہائے میری بچی کا زیور۔“ ثانیہ رو پڑیں۔

”تو پھر بچی بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ تیری ساری

فکر ہی ختم کر دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔“

”ثانیہ تو کانپ گئیں۔“ بند کرو بکواس۔“

”بکواس تو تو بند کر۔“ اس نے رانیہ کو دھکا دے کر

ایک طرف کیا اور ثانیہ کو کھینچ کر پستول دے مارا ان

کے گال پر پستول کی فولادی ضرب نے زخم ڈال دیا تھا۔

وہ اذیت سے چلا اٹھیں۔ اس نے ایک اور ضرب

لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر وہ رانیہ کو چھوڑنے کی

غلطی کر چکا تھا سوزا تو بھگتنی تھی۔

اس نے ایک زوردار لالت اس کے پہلو میں جمائی

تھی۔ سیرو ویڈیو کی ہدایت کے بموجب سامان اکٹھا

کرنے ثانیہ کے بیڈ روم جا چکا تھا وہ سب لاؤنج میں

تھے۔ ویڈیو کراہ کر پیچھے ہوا تو رانیہ نے اسے لاتوں کی زد

میں رکھ لیا تھا۔ مگر بس ایک لمحے کی دیر ہوئی اور ویڈیو

کے ہاتھ میں موجود پستول چل گئی۔

ایک گولی رانیہ کے بازو میں لگی اور دوسری پاؤں

کے نچنے پر وہ جیسے ہی گری ویڈیو ہمت کر کے اٹھا

پستول کا رخ سیدھا رانیہ کے سینے کی طرف کر کے ٹریگر

دبانا چاہتا تھا کہ پیچھے سے لگنے والے دھکے نے اسے منہ

کے بل گرادیا پھر اس کی کنپٹی پر لگنے والی ٹھوکروں نے

اسے اندھیروں کے غار میں پھینک دیا تھا۔

”بھائی پلیز اسے اسپتال لے جائیں اسے اٹھائیں

جلدی کریں۔“ عائشہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”زیان تم ان کی رسیاں کاٹو میں اسے دکھتا

ہوں۔“ وہ خون میں ڈوبی رانیہ کی طرف لڑکھاتا تھا۔

گٹے سے ٹائی کھول کر اس کے بازو پر گس کر باندھی

اتنی دیر میں زیان کرسی کے پیچھے جا کر عائشہ کی رسیاں

کھول چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی ٹائی عالیان کی طرف

پھینکی جسے جھپٹ کر اس نے رانیہ کے نچنے پر باندھ دیا

اور جھک کر اسے بانسوں میں اٹھالیا۔ اتنے میں زیان

ثانیہ کو اور عائشہ اریشہ کو کھول چکے تھے۔

”زیان امی کے بیڈ روم میں بھی ایک آدمی ہے۔“

”ہاں اسے بھی پکڑ لیا ہے۔“ وہ تیزی سے باہر لڑکا

پھر کچھ یاد آنے پر مڑا ”مئی! آپ لوگ عائشہ کے

کمرے میں چلیں فی الحال کچھ لوگوں کو بلوا کر انہیں

لے جانا ہے۔“ اس نے ویڈیو کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تینوں گرتی پڑتی عائشہ کے کمرے میں آگئیں۔

”ہائے میرے اللہ آج کچھ ہو جاتا تو میں تو کسی کو

منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں

میں منہ چھپا کر رو پڑیں۔ عائشہ اور اریشہ تو پہلے ہی رو

رہی تھیں کہ زیان کمرے میں آیا۔

”مئی پلیز! حوصلہ کریں کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے۔

آپ انہیں چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھا دوں اور

رانیہ کا بھی پتا کر لیں۔“

”اسے تو گولیاں لگی ہیں زیان اس کا بہت خون بہہ

گیا ہے اسے تو بہت مارا ہے انہوں نے۔“ وہ اور زیادہ

رونے لگیں زیان کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا اس

نے ماں کا سراپے ساتھ لگایا ”مئی پلیز۔“ بمشکل

انہیں چپ کروایا اور اپنے ساتھ اسپتال لے آیا۔ ان

کے چہرے کا معائنہ کروایا اور عالیان سے پوچھ کر وہ

انہیں وہیں لے آیا۔

وہاں عالیان کے ساتھ نعمان بھی موجود تھے۔ سٹے

ہوئے چہرے کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے دونوں

گم صم کھڑے تھے۔ ثانیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

”کیا ہوا خیریت تو ہے۔“

”جی می خیریت ہے، آپ آئیں، بیٹھیں۔“

وہ ایک طرف رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے۔ ”کیسی

ہے رانیہ؟“

”گولیاں نکال دی ہیں ڈاکٹرز نے، خطرے سے تو

باہر ہے بس کچھ کمپلیکیشنز ہیں۔“

”کیا کمپلیکیشنز ہے؟“ وہ ہول گئیں۔

”نخنہ متاثر ہوا ہے، بڑی چور چور ہو گئی ہے تو۔“

”تو؟“ یہ تم بار بار رک کیوں جاتے ہو؟

”شاید وہ کبھی ٹھیک سے نہیں چل پائے گی۔“

”ہائے!“ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھا۔ ”اتنا بڑا

نقص نہیں اللہ نہ کرے۔“

”ابھی تو وہ بے ہوش ہے، روم میں بھی شفقت

نہیں کی گئی، جب ہوش آئے گا اسے پتا چلے گا تب پتا

نہیں وہ کیساری ایکٹ کرے گی؟“

”وہ بہت بہادر ہے اور بہادری سے ہی فیس کرے

گی اس اتنی کڑوی حقیقت کو۔“ زیان نے عزم سے

کہا۔

بعد میں ثانیہ کو پتا چلا تھا کہ سارے ملازمین کو

انہوں نے بے ہوش کر کے کچن میں بند کر دیا تھا،

چوکیدار کو اس کے کیبن میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت تو

زیان انہیں گھر لے آیا، اریشہ اور عائشہ کی بھی فکر تھی

اسے دوسرے دن جب وہ انہیں لے کر گیا تو رانیہ نہ

صرف کمرے میں منتقل ہو چکی تھی بلکہ ہوش میں بھی

تھی۔ وہ سیدھی ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

”ہیلو رانیہ!“ عائشہ نے قریب جا کر پکارا۔

اس نے صرف آنکھوں کو حرکت دی اور اسے

دیکھا۔ ”ہیلو۔“

آواز میں نقاہت تھی تو آنکھوں میں ایسی ویرانی

جیسے صحرا میں اڑتی خاک اور ویران بیابان عائشہ نے

آگے بڑھ کر اس کے گال چومے، اریشہ نے بھی یہی

عمل دہرایا۔

پھر ثانیہ آگے بڑھیں۔ ”کیسی ہے میری بیٹی“

انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کی جذبات

سے عاری آنکھوں میں حیرت لہرائی۔ وہ سمجھ کر

شرمسار ہو گئیں۔ اس بیٹی سے انہوں نے بلاوجہ کی

دشمنی پالے رکھی اور وہی انہیں، ان کی عزت، ان کی

دولت کو بچانے کے لیے اپنا اتنا بڑا نقصان کروا بیٹھی

بلکہ وہ تو اسے جان سے مار دیتا اگر بروقت عالیان اور

زیان نہ آجینتے، یہ تو انہیں زیان نے بتایا کہ رانیہ نے

عالیان کو فون کر کے بتایا کہ گھر میں گڑبڑ محسوس ہو رہی

ہے، پھر ان کا کوئی رابطہ نہیں ہو پایا مگر وہ دونوں بھائی

جلد از جلد گھر پہنچے تھے۔

اریشہ اور عائشہ نے رانیہ کو کھانا کھلایا اور چائے

پلائی، وہ خود بھی کوشش کر رہی تھی کہ نارمل نظر آئے

مگر بہت مشکل تھا اپنے اتنے بڑے دکھ کو بھلا کر نارمل

نظر آنا، ڈاکٹرز نے اپنی ساری کوششیں کر لینے کے بعد

یہ اعلان کیا تھا کہ اب نہ نخنہ کی وہ ساخت برقرار رہی

ہے۔ نہ اب وہ پہلے کی طرح چل سکے گی۔ ایک

لنگڑا ہٹ اس کی چال کا حصہ بن چکی تھی۔ بازو والی گولی

البتہ گوشت پھاڑنی ہوئی نکل گئی تھی۔

وہ بتدریج ٹھیک ہو رہی تھی، گھر آچکی تھی مگر پہلے

سے بہت زیادہ خاموش رہنے لگی تھی۔ عائشہ کی شادی

پورے ایک ماہ کے لیے آگے بڑھا دی گئی تھی، نواد

عائشہ کا ہونے والا دو لہا۔ خود اپنے والدین کے ساتھ

آیا تھا، ڈکیتی کا افسوس کرنے اور رانیہ کی عیادت کے

لیے۔ اب تو اس واقعے کو بھی بیس دن ہو چکے تھے، سو

اب پھر سے شادی کی باپچل شروع ہو گئی تھی مگر اس بار

وہ چونچال نہیں تھا، سب کچھ قدرے خاموشی سے ہو

رہا تھا۔ اریشہ جو ایک ماہ کے لیے آئی تھی، اب دوسرا

مہینہ ہو رہا تھا اور ابھی تک یہیں تھی۔

”اب بس خیر خیریت سے تمہاری شادی ہو جائے تو

میں بھی گھر جاؤں۔“ وہ دونوں رانیہ کے کمرے میں

بیٹھی ہوئی تھیں۔

”ہاں یار، ایسا خوفناک حادثہ ہوا ہے کہ ابھی تک

دل سے خوف نہیں جاتا۔“

”بس شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، خیر ہوا

تو مال بھی نہیں ہے، ہر طرح سے بچت ہی ہوئی ہے۔“

میں بھی کل آرہی ہیں کہہ رہی تھیں اتنا کچھ ہو گیا“
میں نہیں کی نہیں رہ گئی۔“
”ہاں تو وریشہ کی سپرز جو تھے ورنہ خالہ کہاں رکنے والی تھیں۔“

”ازین اتنا بے چین ہو رہا ہے کہ کب پہنچے اور زیان کے ساتھ ہنگامہ مچائے۔“
”ہاں مزہ بھی تو ان دونوں کے مل جانے کے بعد ہی آئے گا۔“

”کتنے بہن بھائی ہو تم لوگ؟“ رانیہ نے پوچھا۔
”چار بڑے فرزین بھائی ہیں، وہ میریڈ ہیں، ابو ظہبی میں ہوتے ہیں، پھر ازین ہے، اس کے بعد میں اور آخر میں وریشہ میری چھوٹی بہن۔“ اریشہ نے مسکرا کر بتایا۔

”ازین کی فرینڈ شپ زیان کے ساتھ ہے؟“
”شروع سے، بچپن سے، رشتہ تو ہمارا بعد میں طے ہوا۔“

”رشتہ طے ہوا۔“ رانیہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا ”تمہارا رشتہ عالیان کے۔“

”میری بات بچپن ہی سے زیان کے ساتھ طے ہے یہ تو ہم دونوں نے آپ کے تاثرات دیکھنے کے لیے آپ سے یہ بے ضرر سا جھوٹ بولا تھا، آپ کی اور عالیان کی چھپن چھپائی والی اسٹوری تو ہم کب کی سمجھ چکے تھے۔“

رانیہ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ ”آئی مجھے پسند نہیں کرتیں۔“

”اب بہت زیادہ پسند کرنے لگی ہیں، بے جواز نفرت بے ستون چھت کی طرح ہوتی ہے، کمزور اور بودی، ایک ہی جھٹکے سے ختم ہو جانے والی اور آپ کو سب سے زیادہ عالیان بھائی پر بھروسہ ہونا چاہیے تھا، ان پر اعتماد رکھیں وہ آپ کا اعتماد کبھی نہیں ٹوڑیں گے۔“

”وہ اعتماد دلائے تب تا، وہ تو مجھے ایک کھلونے کی طرح ٹریٹ کرتا ہے، جب اپنے خشک کام سے آتا جاتا ہے تو مجھ سے ہلکا پھلکا ہنسی مذاق سلیتا ہے اور بس۔“

میری اہمیت یہی کچھ ہے اس کے نزدیک۔“
عائشہ تڑپ اٹھی۔ ”ایسا تو نہ کہو رانیہ بھائی کی بے کلمی تو ہم نے دیکھی ہے، جب آپ کو گولیاں لگیں اور آپ بے ہوش تھیں، ان کی بے چینی، بے قراری ان کا حال دل کھول کر بیان کر رہی تھی۔ جب سے آپ کی چال میں فرق آیا ہے، وہ تو گم صم ہی ہو گئے ہیں۔“
کرب کی ایک لہر رانیہ کے چہرے سے گزری تھی۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑائی بھی تھی۔



نعمان نے رانیہ کو چھوٹی سی عمر میں دکھا تھا اور تب ہی شایان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے ان کی بہو بنا میں گے۔ پھر وہ عالیان کو ساتھ لے کر سوئٹزرلینڈ شایان کے پاس گئے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف عالیان کو ان سے ملوالات میں بلکہ عالیان اور رانیہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں۔ رانیہ کو دیکھ کر عالیان کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی، پھر یہ سن کر کہ رانیہ کرائے کی بلیک ہیلٹ ہو لڈر ہے اور مارشل آرٹ میں بھی بہت کچھ سیکھ چکی ہے، یہ چمک تیز ہو گئی تھی۔

بعد میں ان کی بہت لمبی بات ہوئی تھی شایان کے ساتھ جس کے بعد انہوں نے رانیہ کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماریانہ اکلوتی اولاد کو اتنی دور بھیجنے کے لیے تذبذب کا شکار تھیں۔ شایان نے انہیں منا کر رانیہ کو نعمان اور عالیان کے ساتھ ہی پاکستان بھیج دیا تھا۔ خود ماریانہ کے ساتھ ملائیشیا کی سیر کے لیے گئے تو پلین کریش میں ایک ساتھ یہ دنیا ہی چھوڑ گئے۔ اس صدمے کو قبول کرنا آسان نہ تھا، نہ صرف رانیہ کے لیے بلکہ نعمان کے لیے بھی۔

عالیان نے نہ صرف باپ کی دلجوئی کی بلکہ رانیہ کا ذہن موڑنے میں بھی عالیان کا بہت بڑا کردار تھا۔ وہ ہمہ وقت اسے اپنے ساتھ مصروف رکھتا تھا۔ کسی کی نگرانی کرنی ہوتی یا دوسرے شہر حتیٰ کہ دوسرے ملک بھی جانا پڑتا رانیہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

عالیان ذہین ترین ایٹ تھا، انٹیلیجنس کو جس کام

کے یورپین ہونے کی وجہ سے الجھ گئے تھے۔ تم میں بے قصور ہوں مجھے کیوں پکڑا ہے آپ نے میں تو نورسٹ ہوں۔“

”جو پوچھا ہے اس کا جواب دو، تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟“

”میں یہاں گھومنے آئی تھی۔ یہ مجھے کل ہی تو ملا ہے، بہت خوب صورت باتیں کرتا ہے، اتنی کہ میں اس کی گرویدہ ہی ہو گئی، اس نے مجھے بتایا کہ یہ جزیرہ جہاں ہم کھڑے ہیں، یہاں جگہ جگہ قیمتی موتی پائے جاتے ہیں، یہ موتی اس قدر قیمتی ہیں کہ اگر انہیں مارکیٹ میں فروخت کیا جائے تو بانی کی ساری زندگی عیش و آرام سے گزار سکتی ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ اب میرے بغیر نہیں رہ سکتا، کل سے جتنا وقت بھی میرے ساتھ گزارا ہے، وہ اتنا خوب صورت اور یادگار ہے کہ وہ اس کے لیے مجھے یہ موتی گفٹ کرے گا، میں تو بس اس لیے اس کے ساتھ آئی ہوں۔“

وہ کچھ دیر کھڑا سے گھورتا رہا پھر سر ہلایا ”ابھی تمہارے جھوٹے سچ کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یہاں ایک طرف کھڑی ہو جاؤ۔“ رانیہ تیزی سے عالیان کو پھلانگ کر ان کی طرف بڑھی، وہ لمبا تڑنگا بندہ جو اپنے ساتھی سے مشورہ کرنے میں مصروف تھا اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر چلایا۔

”اے، وہیں رکو، آگے کہاں آرہی ہو؟“
”دیکھو میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں، مجھے یہاں سے جانے دو۔“ وہ اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔
”اے رکو وہیں۔“

مگر رانیہ کو اتنا ہی قریب آنا تھا، وہ کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی ان دونوں کے اوپر جا گری، وہ تو اچانک حملے کی وجہ سے گر پڑے مگر ایک نے سنبھل کر رانیہ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی، جو اس کے دوسرے ساتھی کی ناک پر ٹکریں مار مار کر اسے ادھ موا کر چکی تھی، ایک دم ٹانگ کھینچنے سے پلٹی کہ پسلیوں میں اس بندے کی زور دار لات کھا کر اس کی آواز نکالتی اونٹنی ہو گئی۔

کے لیے کسی پر اعتماد نہ ہوتا وہاں وہ بلا جھجک بھیجا جاتا تھا نعمان کے دوست ان کی خوش نصیبی پر رشک کرتے تھے کہ وہ عالیان جیسے ہونہار سپوت کے والد تھے۔ وہ خود بھی انٹیلی جنس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر عالیان کا کام فیلڈ کا تھا، اسے ہر دم ہر آن یا خبر اور متحرک رہنا ہوتا تھا۔ رانیہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ نعمان نے دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کی خواہش کی تھی، وہ یوں بھی تو پوری ہو رہی تھی، وہ خوش تھے اس کے باوجود وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عالیان ان کا کتنا ہی فرماں بردار سہی مگر ماں سے اس کی محبت اور فرماں برداری بے مثال تھی اور اگر وہ رانیہ کو ناپسند کرتی ہیں تو وہ بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دے گا۔

ان کا انتہائی خوب صورت اور قابل بیٹا، جس کے ساتھ سچ سچ رانیہ ہی سبھی مگر رانیہ کی نفرت سچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور عالیان اس دیوار کو گرانے کی کوئی کوشش نہیں کر پاتا تھا۔ اگرچہ وہ اچھی طرح نعمان کی خود سے اور رانیہ سے متعلق خواہش کو جانتا تھا، نہ صرف یہ بلکہ نعمان کی شایان کو دی گئی زبان کی پاس داری کا بھی اسے احساس تھا مگر ماں کی محبت، ان کا احترام ہر جذبے پر حاوی ہو جاتا تھا۔

گھر میں ماں کو دل آزاری سے بچانے کے لیے وہ رانیہ سے یوں لا تعلق ہو جاتا، جیسے ان کے درمیان کبھی بات تک نہ ہوتی ہو۔ جو اب ”رانیہ بھی بالکل اجنبی بن جاتی تھی، ایک بار دونوں کو انتہائی حساس علاقے میں بھجوایا گیا، وہ بیرون ملک ایک جزیرہ تھا۔ جہاں سے انہیں اہم معلومات ملتی تھیں، وہ دونوں اس جگہ کے قریب پہنچ چکے تھے کہ انہیں چھاپ لیا گیا۔ انہیں فوری بے ہوش کر کے کھلی جگہ لے جایا گیا اور پہلے رانیہ کو ہوش میں لایا گیا۔
”تم تو فارنر ہو پھر اس پاکستانی کے ساتھ کیا کر رہی تھیں؟“

”اوہ تو اس لیے اسے ہوش میں لائے ہیں کہ وہ اس

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

لیے بلا لایا۔ عالیان وہاں سے گزرا تو ان دونوں کو دیکھ کر اندر آ گیا۔ انہیں اس کے آنے کا علم نہیں ہو پایا، رانیہ نے اپنی طرف سے بڑے سرسری لہجے میں زیان سے پوچھا تھا۔

”یہ اریشہ کب واپس جائیں گی؟“

”کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ زیان تو چونکا ہی پیچھے آتا عالیان بھی ٹھنک گیا تھا۔

”ایسے ہی، ابکچھولی اور تو کوئی نہیں آیا عائشہ کی شادی کے لیے اور یہ اتنے دن سے آئی ہوئی ہے۔“

”ہاں تو اس کی اور عائشہ کی دوستی بھی تو بہت ہے۔“

”ہاں بتا رہی تھیں دونوں اور۔“ وہ رکی، زیان نے سوالیہ ابرو اچکائے ”عائشہ بتا رہی تھی کہ آنٹی نے اسے بچپن سے ریزرو کیا ہوا ہے عالیان کے لیے۔“

”عالیان کے لیے؟“ زیان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

عالیان نے آنکھ سے اشارہ کر کے اسے بات جاری رکھنے کو کہا۔ ”ہاں ہاں وہ صحیح کہہ رہی تھی۔“

رانیہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ عالیان وہیں سے پلٹ گیا۔ دوسرے دن صبح نائشے پر اس نے رانیہ کو آتے دیکھ کر ہی اریشہ کی اتنی تعریف کی تھی۔ وہ اوپر سے تو بے نیاز نظر آنے کی بہت کوشش کر رہی تھی، مگر اس کے ہاتھوں کی کیکپا ہٹ عالیان سے چھپی ہوئی تو نہیں تھی۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں وہ زیان کے پاس چلی آئی۔

”اگر میں بالوں کو بلیک ڈائمی کروالوں تو کیسے لگیں گے۔“ زیان کے دماغ میں کوندا سا پکا تھا، سچ سچ مسکراہٹ روکنے میں اسے بڑی ہی دقت ہوئی تھی۔

”بالکل سوٹ نہیں کریں گے آپ پر۔“

”اوہ۔“ وہ مایوس ہو گئی۔

”تو تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا ہے، تم پر تمہارے یہی بل بہت سوٹ کرتے ہیں۔“

”مگر اسے تو۔“ وہ بات بدل گئی ”وہ لے ہی میں اپنا لک چھینج کر ناچا رہی تھی۔“ وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اتنے میں وہ نیچے والا بھی کھڑا ہو کر جیب سے گن نکال چکا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، کوئی چیز اس کے ہاتھ سے نکلرائی اور گن نیچے جا گری۔ اس کی آنکھیں یہ دیکھ کر پھیل گئی تھیں کہ وہ نوجوان جو بے ہوش پڑا تھا، وہ اب مکمل ہوش و حواس میں ان دونوں پر پل پڑا تھا۔

رانیہ اتنی دیر میں گن اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ”ہینڈز اپ۔“ پھر وہ اسی طرح گن تان کر کھڑی رہی اور عالیان نے انہیں باندھ کر ساری معلومات لے کر انہیں لے ہوش کر دیا اور ان معلومات کی روشنی میں مطلوبہ فائلز بھی لے لیں۔

واپسی میں جب وہ آفس کی طرف سے بھجوائی گئی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے تو عالیان نے ایک چھوٹا سا لقاہ اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر رانیہ کی طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرت سے دیکھا اور تھام لیا۔

”یہ وہی قیمتی موتی ہیں جو تمہارے ساتھ گزارے ہوئے خوب صورت وقت کا تحفہ ہیں، یہی وعدہ کیا تھا نا میں نے تم سے۔“ وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

رانیہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا، یعنی وہ اس وقت ہی ہوش میں آچکا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے غصے سے وہ لقاہ زور سے اسے دے مارا اور منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، البتہ اس کے ہنسنے کی آواز بخوبی سنائی دی تھی۔

ایک شرمیلی سی مسکان اس کے لبوں پر بھی بکھر گئی تھی۔



زیان نے بھی ان کا محکمہ جوائن کر لیا تھا مگر ابھی وہ فیلڈ میں نہیں اتارا گیا تھا، ان دنوں ایک مجرم کا پتا چلانے کے لیے اس کے سیرا اس سے متعلق ساری معلومات اکٹھا کرنے کا کام کیا گیا تو وہ رانیہ کو اپنی مدد کے

”عالیان یار! بہت ستارے ہو تم اس معصوم لڑکی کو۔“ اس نے تاسف سے سوچا تھا۔



زیان پی سی پر ڈیٹا بنا رہا تھا۔ جب عالیان تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ”جلدی کرو گھر چلیں وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“ وہ چونکا اور کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرنے لگا۔

”یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا“ رانیہ نے بتایا ہے کہ وہ کمرے میں ہے مگر ہر معاملات ٹھیک نہیں لگ رہے وہ بات کر رہی تھی کہ اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تو اس نے فون بند کر دیا۔ ”زیان پھرتی سے اٹھ گیا۔ دونوں بھائی نعمان کو مطلع کر کے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے آئے تھے اور بروقت پہنچ جانے کے باعث ہی رانیہ محفوظ رہی تھی ورنہ تو وہ غنڈہ سیدھا اس کے سینے میں گولی مارنے لگا تھا، صورت حال تو ان کے اندازے سے زیادہ خراب تھی۔

ماں، بہنیں بندھی ہوئی، ملازم بے ہوش اور بندھے ہوئے، سارا زیور اور روپیہ جو گھر میں موجود تھا ایک بیگ میں بھرا ہوا، عالیان تو رانیہ کو اسپتال پہنچا کر صرف ایک بار زیان سے فون پر بات کر پایا تھا تو اس نے یہ سب بتایا تھا، پھر جب ڈاکٹر نے اس کا سٹنہ ناقابل علاج ہونے کی خبر دی تو اسے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ رہا۔

رانیہ کا سٹنہ ٹوٹ گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا کر چلے گی، یعنی اپنی سروس سے بھی فارغ کر دی جائے گی۔ دکھ، صدمہ، اس نے نعمان کی طرف دیکھا، وہ تو صدمے سے نڈھال ہو گئے تھے۔

زیان بھی نہایت افسردہ تھا۔ وہ تو اپنی کزن کو صرف بھا بھیجے کے روپ میں ہی نہیں بلکہ محب وطن پاکستانی، آرمی انٹیلیجنس آفیسر کے طور پر بھی، بہت زیادہ پسند کرتا تھا مگر اب وہ جاب سے تو فوری طور پر بسکدوش کر دی جائے گی اور ان کی والدہ جو اتنی حسین لڑکی کو بہو

کے روپ میں نہ دیکھنے کے لیے ہی اسے اتنا ناپسند کرتی تھیں تو اب تو اس میں جسمانی نقص بھی آ گیا تھا تو اب؟

بڑی مشکل ہوئی تھی اس کا سامنا کرنے میں، ’ممی‘ عائشہ اور اریشہ کے چلے جانے کے بعد وہ کمرے میں آیا تھا۔

”ہیلو گڈ گرل۔“ وہ مسکرایا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟ درو وغیرہ تو نہیں ہو رہا نا؟“

”میرا ایک کام کر دو زیان۔“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے اس نے کہا تھا۔

”ہاں یولو، کیا کام۔“ وہ آگے آ گیا۔

”مجھے انکل سے واپسی کی اجازت لے دو۔“ اس نے تو زیان کے اعصاب پر ہم دے مارا تھا۔

”کیا؟ کیا کہا تم نے؟ واپس جاؤ گی مگر کہاں؟ وہاں کون؟“

”سب ہیں وہاں، میرے انکلز اور آفٹیز تم بس مجھے اجازت لے دو۔“

”مگر تم کیوں جانا چاہتی ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔“

چوٹ پاؤں پر آئی ہے، کھسک دماغ گیا ہے۔ یہاں کیا ہوا ہے کہ تمہیں واپس جانے کی سوجھی ہے۔“

”انکل مجھے جس مقصد کے لیے لائے تھے، وہ تو اب میں پورا کر نہیں سکتی، تو اب یہاں رہ کر کیا کروں؟“

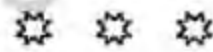
”وہ تمہیں صرف اس لیے یہاں لائے تھے۔“

زیان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں عالیان نے بھی پایا سے یہی کہا تھا کہ رانیہ ہماری ٹیم کی ضرورت ہے مگر اب میں وہ ضرورت پوری نہیں کر سکتی، اس لیے یہاں رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا۔“

”تو تم خود ڈیڈ سے بات کر لو، میں تو یہ سب نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے صاف جواب دیا۔

رانیہ نے ہونٹ بھیج کر منہ پھیر لیا تھا۔ اظہار



خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا
اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا
کس جرم میں چھینی گئی مجھ سے میری ہنسی
میں نے تو کسی کا دل دکھایا بھی نہیں تھا
وہ کب سے ٹیرس پر کھڑی تھی 'خلاؤں میں دیکھتی'
جانے کیا کیا سوچتی 'عالیان کمرے میں آیا پھر اسے
ڈھونڈتا ہوا ٹیرس میں اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
"ہیلو گڈ ایوننگ۔"

اس نے ایک نظر عالیان پر ڈالی اور پھر سے آسمان کو
دیکھنے لگی۔
"کیا دیکھ رہی ہوتے انہماک سے مجھے بھی تو
دکھاؤ۔"

اس نے جواب دینا تو درکنار گردن بھی نہیں گھمائی
وہ ہلکا سا مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے کس کر
بندھے بالوں میں سے پونی نکال لی۔ سنہرے سلکی بال
کھل کر شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے ناگواری سے اسے
گھورا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" عالیان نے جواب دیے بغیر
اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ رانیہ نے غصے سے اس
کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کیا بد تمیزی ہے یہ؟"

"دل بہلا رہا ہوں یا۔"

"واٹ۔" وہ چیخی۔ عالیان کچھ اور قریب ہوا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میرا کھلونا ہو جس سے
میں دل بہلاتا ہوں، تو اب بھی دل بہلا رہا ہوں تو تم
کیوں ناراض ہو رہی ہو۔" اتنی گری ہوئی بات اور
عالیان کے منہ سے، وہ ششدر کھڑی اسے دیکھ رہی
تھی۔

"کیوں، کیا کچھ غلط کہہ دیا ہے میں نے؟"

اس نے رانیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا،

"یہ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے وہ کہہ رہی
ہے، تم نے اس بچی سے بلاوجہ کا عناد پالے رکھا، اتنا
روکھا رویہ رکھا کہ وہ خود کو بے کار جان کر واپس جانے
کی تیاری کر رہی ہے۔ میں اگر اسے جانے دے دوں تو
روز قیامت اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا، جس سے
بڑے مان سے میں نے اسے مانگا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا،
اتنی پیاری بچی، تمہارے سامنے رہے گی تو تم بھی رفتہ
رفتہ اس سے محبت کرنے لگو گی مگر۔"

"میں اس سے محبت کیوں نہیں کروں گی، جو
میرے بچوں کے لیے میرے گھر کے لیے اپنی جان بھی
داؤ پر لگا دے۔ جس نے ہمارے لیے گولیاں کھائیں،
اتنی زخمی ہوئی کہ عمر بھر کی معذوری مقدر کرنی، میں
اس سے اب بھی محبت نہیں کروں گی کیا؟" ان کی
آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

نعمان کتنی ہی دیر کچھ بولنے کے قابل نہ رہے
تھے، کایا یوں بھی پلٹتی ہے، وقت یوں بھی بدلتا ہے
انہیں تانیہ کو رانیہ کے لیے روتے دیکھ کر یقین آ گیا
تھا۔

"یہ آپ ہی کے محکمے میں کام کرتی تھی نا، عالیان
کے ساتھ؟"

"ہاں یہ جاسوس تھی پاکستان کی، ہماری خفیہ سروسز
کا قیمتی سرمایہ تھی لیکن۔" ان کی آواز میں بھی نمی آ
گئی "اب یہ ان کے لیے کارآمد نہیں رہی، اب آئندہ
یہ اپنی ڈیوٹی نہیں دے پائے گی۔"

"ہاں نہیں دے گی یہ وہاں ڈیوٹی کیونکہ اب یہ
دوسری ڈیوٹی دے گی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی
تھیں۔

"کون سی دوسری ڈیوٹی؟" نعمان نے حیرت سے
انہیں دیکھا تھا۔

"گھر سنبھالنے کی ڈیوٹی عالیان کی بیوی بننے کی
ڈیوٹی۔" وہ مسکرا کر عزم سے بولیں اور نعمان کی حیرت

جہاں بے یقینی اور دکھ، اضطراب کے مدد بزرگ تھے۔

”نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں نے یہ کہا تھا کہ تم مجھے کھلونا سمجھتے ہو، یہ تو نہیں کہا کہ میں بھی خود کو کھلونا سمجھ کر تمہیں ہر طرح کی آزادی دے دیتی ہوں۔“ وہ چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی پھنکاری تھی۔ شہزادی پال، گلابی چہرے کے ارد گرد پھیل گئے تھے۔ بلاشبہ وہ کسی کو بھی مسحور کر سکتی تھی۔ بمشکل عالیان نے نظروں کا زاویہ تبدیل کیا تھا۔

دورانق میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سرخی کناروں پر چھا رہی تھی۔

”کیا دیکھ رہی تھیں اس ڈوبتے ہوئے سورج میں؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، ہلکا سا لنگراتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

وہ بھی پیچھے آگیا۔ ”کتنی اچھی لگ رہی ہوتیوں چلتی ہوئی، تمہارے اس بے پناہ حسن نے بہت قیامت مچائی ہوئی تھی، اچھا ہے یہ ہلکا سا لنگ بھی آیا تو۔“

”اتنا بے رحم تبصرہ رانیہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔“ بہت دکھ ہوا ہے چال میں فرق آنے سے چیخ چیخ وہ افسوس سے کہتا اس کے پاس آبیٹھا۔ ”تم لڑکیاں اپنے حسن کے بارے میں اتنی کانٹنسی کیوں ہوتی ہو؟“

”نہیں مجھے اس چیز کا کوئی دکھ نہیں، یہ پوری ٹانگ ضائع ہو جاتی، مجھے دکھ نہ ہوتا، مجھے اپنے ملک کی مزید خدمت نہ کرنے کا دکھ ہے، پیانے بچپن سے مجھے یہی سکھایا تھا کہ تم پاکستان کی خدمت کرو گی، تمہیں بہت بہادر بننا ہے، بہت سے علوم حاصل کرنے ہیں، بہت سارے فنون سیکھنے ہیں اور میں تو آغاز میں ہی فیل ہو گئی، بے کار ہو گئی، میں اب کیسے پاکستان کی خدمت کر سکتی ہوں۔“ بہت سے آنسو ایک ساتھ جھلکے تھے۔

”تم میری اور میرے بچوں کی خدمت کر لینا، یہی سمجھنا ملک و قوم کی خدمت کر لی ہے۔“ عالیان نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا مگر وہ تو بھڑک اٹھی تھی۔

”لعلت بھیجتی ہوں میں تم پر اور تمہاری خدمت کرنے پر۔“ اس کی سانس کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ ”کیا سمجھ کر تم نے یہ آفر کی ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی ہوں تمہارے خیال میں کہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی نوکریں جاؤں گی۔“

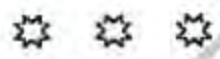
”جو یہ سب کرتی ہیں نا، وہ عموماً بیویاں کہلاتی ہیں، نوکرائی نہیں۔“

وہ تو رونا بھی بھول گئی ”کیا؟“

وہ اس کے بالکل قریب ہو کر دھیس مگر گہرے لہجے میں بولا ”بیوی تو بنو گی نامیری؟“ رانیہ کی پلکیں جھک گئیں۔

آٹنی مان جائیں گی؟“ ”یقیناً۔“

”اوه تب ہی تم یہاں آئے ہو ماازووائے۔“ رانیہ نے چڑ کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔



”اگر می نہ مانتیں تو کیا تم واقعی رانیہ سے شادی کے لیے نہیں مانتے؟“ زیان نے عالیان سے پوچھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”کیا مجھ سے کسی نے پوچھا اور میں نے انکار کر دیا تھا؟“

”نہیں مگر تم نے اقرار بھی نہیں کیا تھا۔“

”میں می کی خوشی سے اسے اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش رکھتا تھا اور بس۔“

”اور اگر یہ حادثہ نہ ہوتا اور می ابھی بھی راضی نہ ہوتیں تو۔“

”میں انتظار کرتا ان کی رضامندی کا، کبھی نہ کبھی تو انہوں نے مان ہی جانا تھا۔“ وہ قیص کے ٹن کھول رہا تھا۔

”اٹس مین۔“ وہ چکر آگیا ”تم انتظار کرتے رہتے، جب می ہر طرف سے مایوس ہو کر رانیہ کے لیے ہی مان جانتیں۔“

عالیان مسکراتے ہوئے واش روم چلا گیا اور زیان نے اپنا سر تھام لیا۔ حد تھی عالیان کی فرمانبرداری اور محبت کی، یعنی ماں کو بھی ناراض نہیں کرنا اور رانیہ کے

وہ آپ پر حق جاتا۔“ ساتھ ہی گردن مسلی۔
 اریشہ نے الگ افسوس کیا۔ ”میں نے بھی رانیہ کو
 دیکھ کر یہی کہا تھا کہ کاش ازین چھوٹا نہ ہوتا۔“
 وہ تو سن کر تڑپ گیا۔ ”چھوٹا کہاں ہوں ان سے تو
 بڑا ہی ہوں۔“

”اب کچھ ہو نہیں سکتا، کیونکہ عائشہ کے ساتھ
 ہی ان کی شادی بھی طے پا گئی ہے۔“
 زیان نے صحیح معنوں میں اس کے ارمانوں پر اوس
 ڈالی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر۔ ”روتے ہیں چھم
 چھم نین لٹا مور اچھن رے۔“ گانے لگے۔
 ”شکر ہے ان کی گاڑی کھسکی تو اب ہماری باری بھی
 ان شاء اللہ جلدی ہی آجائے گی۔“ زیان نے اریشہ سے
 سرگوشی کی۔

اس نے جھینپ کر اسے پیچھے دھکیلا ”بد تمیز۔“
 ”اب عالیان کا دلغ دیکھو، کتا ہے ہنی مون کسی
 جزیرے پر مناؤں گا تو بتاؤ، جزیرے پر ہو گا کیا دیکھنے کو،
 انجوائے کرنے کو۔“
 تانیہ (اریشہ کی امی) نے بد مزگی سے کہا تو رانیہ کو
 اچھو لگ گیا۔
 ”ارے ارے آرام سے۔“ انہوں نے اس کی
 پیٹھ تھکی۔

”اور میں نے کہا منہ دکھائی کے لیے کچھ خریدنا ہے
 تو بتا دو تو کہنے لگا وہ تو میں نے سوچ لیا ہے۔ میں نے کہا
 اگر کانفیڈنشل نہیں ہے تو بتا دو تو بتا ہے کیا بتایا؟“
 تانیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، تانیہ نے گہری
 سانس لی ”قیمتی پتھر، اب پتھر دیے جائیں گے منہ
 دکھائی میں۔“
 رانیہ انہیں سر کھپاتے چھوڑ کر خود باہر آگئی تھی،
 شام ڈھل رہی تھی اور شام ڈھل ہی جایا کرتی ہے۔ وہ
 کبھی ٹھہرتی نہیں۔
 ایک حسین مسکان اس کے ہونٹوں پر رقص کر
 رہی تھی۔

علاوہ کسی سے شادی بھی نہیں کرنا، واہ سبحان اللہ، یا
 اللہ! تیرا شکر ہے کام بن گیا ورنہ ان کے چکر میں تو میں
 بھی کتوارہ بڈھا ہو جاتا۔“ وہ پھر ریری لے کر اٹھ گیا تھا۔



”یار زیان! یہ تو پورا پورا ہاؤس تمہارے گھر میں
 موجود تھا، تم ان کے کرنٹ سے بچے کیسے؟“
 ازین تو بالکل ہو گیا تھا رانیہ کو دیکھ کر اتنا حسن؟
 ”پاپا نے اس کرنٹ کو ایک سپلائی لائن میں محفوظ کر
 دیا تھا، اس لیے میں بچ گیا۔“ زیان کے اطمینان سے
 کہنے پر وہ اٹھا اور رانیہ کے پاس جا پہنچا۔
 ”آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”جی؟“ وہ اچھسے سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”میرا مطلب ہے، میں اور آپ ایک ساتھ
 کیسے۔“

”آ۔ آ۔۔۔“ پیچھے سے عالیان نے اس کی گردن
 ٹکجنے میں کسی تھی ”میرے ہوتے ہوئے تمہاری یہ
 جرات؟“
 ”اچھی چیز سب کو اچھی لگتی ہے اور یہ تو بہت زیادہ
 اچھی ہیں۔“ اس بار تو ٹکجنے اتنا سخت ہوا کہ اس کی
 آنکھیں ابل آئیں۔
 ”کون اچھی ہے؟“
 ”نہ۔ رانیہ بھابھی۔“
 ”شاباش۔“ عالیان نے اس کی گردن چھوڑ دی۔
 ”آئندہ احترام سے پکارنا اور دکھنا تو نظر جھکا کر احترام
 سے۔“

وہ اتنی دیر چپ رہا جب تک عالیان موجود رہا اس
 کے جاتے ہی وہ لپک کر رانیہ کے نزدیک آگیا۔ ”آپ
 اپنی رائے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں، یہی عالیان سے
 شادی پر۔“ رانیہ نے مسکراہٹ جوابی۔
 ”نہیں اب تو بالکل نہیں۔“

اس نے منہ لٹکایا ”دو سال سے آپ یہاں تھیں
 اور مجھے کسی نے بھنگ نہیں پڑنے دی۔ قسم سے میں
 پہلے آپ کو دیکھ لیتا تو کسی عالیان کی مجال نہیں تھی کہ



ام ایمان قاضی

زندگی کے رنگ

لو نہیں گے۔ لڈو اور کیرم کھیلیں گے، پر تیسرا دن ہے مجھے ہاسٹل سے آئے ہوئے، لگتا ہے کسی پرائے گھر میں آگیا ہوں۔ بی بی اور خالہ تو ویسے ہی چپ چاپ اپنے کام میں مگن رہتی تھیں، ایک تم ہی تھیں جس نے مجھے کبھی کسی دوست کی کمی نہیں محسوس ہونے دی اور اب پہلی بار مجھے گھر آنے پر لگ رہا ہے کہ جیسے میں بہت اکیلا ہوں، کوئی دوست ہی نہیں ہے میرا۔“ وہ بھی پیڑھی کھینچ کے اس کے پاس بچن میں بیٹھ گیا۔

”ہا۔“ راکھ میں تنکے سے کچھ ڈھونڈتی عائشہ کو مصطفیٰ نے ڈرانے کی ناکام کوشش کی، لیکن اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ مصطفیٰ کامنہ بن گیا۔
”کیا سے عائشہ بالکل ٹھس ہو رہی ہو۔ ذرا بھی مزا نہیں آ رہا۔ کتنے دنوں بعد تو پیپرز کی ٹینشن سے چھٹکارا ملا ہے، کیا کیا پروگرام تھے دل میں کہ عائشہ کے ساتھ خوب پگھیں لڑاؤں گا۔ چھت پر جا کے خوب گڈیاں

ناولٹ

”تنگ مت کرو مصطفیٰ! بس دل نہیں کر رہا کچھ کرنے کو۔ لازمی تو نہیں ہر وقت ٹھیل کود میں لگے رہو تب ہی موڈ ٹھیک ہو۔ کبھی دل نہیں بھی چاہتا کسی کام کو۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔
”اس کا مطلب واقعی کوئی بات ہوئی ہے۔ پھر تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے۔“ مصطفیٰ نے اس کے ہاتھ سے تنکالے کر دور پھینک دیا اور وجہ جاننے کو بھند ہوا۔

”کوئی خاص نہیں مصطفیٰ! لیکن کبھی کبھی خالق کائنات کی اس تقسیم پر بہت الجھن ہوتی ہے ایک وہ ہیں جن سے دولت سنبھالے نہیں سنبھلتی اور وہ ہے کہ دیے چلا جاتا ہے اور ایک ہم ہیں، ساری زندگی کو لوہے کے بیل کی طرح دو اور دو چارگی جمع تفریق میں گزار دیتے ہیں۔ ایک ایک پیسہ دانٹوں سے پکڑ کر خرچ کرتے ہیں۔ بی بی اس عمر میں بھی اتنی محنت کرتی





Downloaded From
Paksociety.com

یار ایہ تم لڑکیوں کی نیچر بھی عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔ خوش ہونے پر آئیں تو چھوٹی سے چھوٹی بات ان کو بہت بڑی خوشی سے ہم کنار کر دیتی ہے اور کبھی کوئی جو بات دوسرے لوگوں کے نزدیک بے حد معمولی ہوتی ہے ان کے لیے بہت بڑی ہوتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

"تمہارے نزدیک یہ چھوٹی بات ہوگی، میری تو دنیا میں بس ایک ہی دوست ہے۔ بس اس سے میں وعدہ کر چکی ہوں، اس یار ورنہ میں کہاں کہیں جاتی ہوں اور بائے داؤنے تم کتنی لڑکیوں کو جانتے ہو؟" نروٹھے پن سے کہتے اس نے آخر میں مشکوک ہو کر پوچھا۔

"پہلے تو بندہ دوستی کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لے کہ وہ اس کے تقاضے پورے کر سکتا ہے کہ نہیں۔ بلکہ دوستی ہی کیا ہر رشتہ ہی کچھ نہ کچھ تقاضوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ کیونکہ رشتے بنا لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا، جتنا ان کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے تو میں ایسے کسی جھنجھٹ میں ہی نہیں پڑا اور بے وفا لڑکی تم تو کہتی ہو کہ صرف میں ہی تمہارا دوست ہوں، تمہاری سہیلی ہوں یہ رقیب کون آگئی ہے درمیان میں۔"

اس نے ڈپٹنے والے انداز میں پوچھا۔
 "وہ تو میں اب بھی کہتی ہوں، لیکن فرحین سے میری دوستی چھ ماہ پہلے ہوئی ہے بہت اچھی اور مخلص لڑکی ہے، خود ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اتنی امیر ہے پر غرور نام کو نہیں اور جب کوئی اتنی محبت سے آپ کی طرف قدم بڑھا رہا ہو تو آپ کا بھی فرض بننا ہے نا جواب محبت سے دیں۔" اس نے کہا تو مصطفیٰ بے اختیار مسکرا دیا۔"

کائن کے زرد سوٹ میں دوپٹا سر پر نکلے وہ عام سی لڑکی اس پل بہت خاص لگی تھی اسے۔ "یہ ہی بات تو میں تمہیں بتا رہا ہوں عاشرہ بی بی کہ محبت کا یہ کلیہ ہم پر تو بھی اپلائی نہیں کیا آپ نے۔" فرحین دن سے اپنی نزل

قسم کی پریشانی میں تمہیں یاد ہی نہیں کہ میری چھٹیوں صرف ایک ہفتہ کی ہیں اور تیسرا دن ہے میں تو تمہاری

ہیں۔ اماں کا سارا دن لینٹین کی چیزیں تیار کرنے میں گزار جاتا ہے۔ تم اور میں میٹرک کے بعد سے یوشنڈ کر کے اپنی پڑھائی کے خرچے پورے کرتے ہیں۔ اماں اور بی بی کی اتنی کوششوں سے گھر کا بمشکل خرچ پورا ہوتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی اضافی خرچا نکل آئے تو دونوں کے چروں پر نظر کے سائے مجھے ہولا دیتے ہیں۔" اس سے اپنی سوچیں بانٹتے ہوئے پل بھر کو آنکھوں میں کی بھی چمکی تھی۔

اس جیسی من موچی لڑکی کے منہ سے مصطفیٰ کو یہ سب کچھ سن کر عجیب سی حیرت ہوئی۔ "عائشہ! یہ سب کچھ تو شروع سے ہماری زندگی کا حصہ ہے مالک کی اس تقسیم کی مصلحتیں وہی بہتر جانتا ہے لیکن تم یہ بھی تو دیکھو ناں اس نے جسے کا کچھ نہ کچھ سامان تو کر رکھا ہے نا۔ محنت کی ہی سہی کھاتے تو ہیں نا۔"

تم مجھ سے زیادہ جانتی اور سمجھتی ہو، پھر بھی مجھے حیرت ہے کہ یہ مجھے تمہیں کیوں جانا پڑ رہا ہے؟" سنجیدگی سے کہتے کہتے وہ آخر میں حیرت سے بولا تو عائشہ بھی طویل سانس لیتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"بہت دنوں سے فرحین کی سالگرہ کا گفٹ لینے کے لیے پیسے بچا رہی تھی پر پچھلے ہفتے کی پارٹیز جو برتنا شروع ہو میں۔ انہوں نے ساری چھت کا کباڑا کر دیا ہے، اماں اور خالہ کی ساری جمع پونجی ملا کے بھی کچھ روپے کم پڑے تو مجھ سے ان کی پریشانی دیکھی نہیں گئی، میں نے وہ سارے پیسے لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیے، جس کا مجھے کوئی ملال نہیں ہے، لیکن اب اس کا اصرار بڑھ رہا ہے اور میرے پاس اسے دینے کو چھوڑ تقریب میں پہننے کو پکڑے۔ نہیں ہیں۔ یوشن فیس بھی دس کے بعد ملتی ہے۔ منیر بیج کے دو بچوں کو پڑھانے جاتی ہوں، وہ کیم کو ہی فیس تمہا تو دیتی ہیں پر فرحین کی سالگرہ تین دن بعد ہے جو بیس تاریخ کو۔ اس کے بے حد اصرار پر آخر کار عائشہ کو اپنے سٹنڈے کی اصل نوچہ بتانی ہی پڑی۔

"بس اتنی سی وجہ ہے، میں سمجھا جاتا نہیں کیا ہو گیا۔"

کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو دستک دے کر مصطفیٰ بھی چلا آیا۔

”نہیں، کیوں کوئی کام تھا کیا؟“ بستر جھاڑتے جھاڑتے وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”ہاں کام تھا بہت ضروری، یہ لویہ کچھ پیسے رکھو تم اپنی دوست کی سالگرہ میں جانے کے لیے سوٹ بنالینا اور اس کو گفٹ بھی دے دینا۔“ ہزار ہزار کے چار نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا تاہوا وہ بالکل عام سے لہجے میں گویا ہوا۔

”ممہ۔ مگر مصطفیٰ اس طرح یہ میں کیسے۔ تم خود بھی تو ٹیوشنز کر کے اپنے اخراجات پورے کرتے ہو۔ نہیں یہ تم رکھو۔ تمہارے کام آئیں گے۔“ اس نے روپے اسے واپس کرنا چاہے۔

”میں کہہ رہا ہوں ناز رکھو۔ خالہ آرہی ہیں اس طرف، ان کے آنے سے پہلے تم یہ سنبھال لو ورنہ انہوں نے بھی تمہاری طرح کی باتیں شروع کر دینی ہیں۔“ وہ عجلت میں کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا تو عائشہ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔



”اماں۔“ اس نے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اماں کو آواز دی تو وہ چونک اٹھیں۔

”بول گیتی آرا۔ کیا بات ہے؟“ انہوں نے شفقت سے گیتی آرا سے دریافت کیا۔

”تم نے اور اپا نے میرا یہ نام کیوں رکھا گیتی آرا۔ خوب صورت لوگوں جیسا۔ ایسے نام یا تو بہت خوب صورت لوگوں کو سجتے ہیں یا شہزادیوں کو۔ شہزادیوں کا تو دور ہی نہیں رہا اور نہ میں شہزادی ہوں نا ہی خوب صورت، اس لیے تو اپنے نام سے نفرت ہو گئی ہے

مجھے۔ جب تم یا کوئی اور مجھے اس نام سے بلاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تم سب میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ اس کا لہجہ اور اس کی بات دونوں ہی کڑواہٹ لیے ہوئے تھے۔ اماں حیرت سے بس اسے دیکھے گئیں۔ ”کیا ہو گیا

مصروفیات کا عالم ہی دیکھے جا رہا ہوں، صبح کالج کے لیے نکل جاتی ہو۔ وہیں سے ٹیوشنز دینے۔ واپسی پر بھی تمہارے کچھ جینتے اسٹوڈنٹس تمہارے منتظر ہوتے ہیں، ان سے فارغ ہوتے ہوتے تمہیں مغرب ہو جاتی ہے۔ مغرب کی نماز بڑھ کے تم انشا عقیل۔ آج کہیں جا کر ہاتھ لگی ہو تو، جھی فضول سے موڈ میں، میں تو پچھتا رہا ہوں چھٹی پہ آکر۔“ وہ تو جیسے بورت کی انتہا پر تھا۔

عائشہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ”ارے ارے اتنا بھی مایوس نہیں ہوتے بھی۔ کل کالڈن میں تمہارے اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ میں چھٹی کروں گی۔ اماں کے ہاتھ کے مزے دار کھانے پکوا کر کھا میں گے۔ لڈو کھیلیں گے۔ پر ایک تو ٹیوشنز سے چھٹی نہیں کر سکتی، مجبوری ہے دوسرا اماں نے گڈیاں اڑانے نہیں دینا، زیادہ ہے پچھلی دفعہ میرے بازو فریکچر ہوتے ہوتے بیچ گیا تھا اور باقی چوٹیں بھی مہینہ بھر بعد جا کے ٹھیک ہوئی تھیں۔ اب تو مجھے خود بھی خوف آنے لگا۔ ہے ایسا لگتا ہے ابھی میں نے پتنگ کے تعاقب میں اوپر دیکھا اور ادھر میں دھڑام سے نیچے۔ اف تو بہ کیا منظر تھا وہ بھی۔“

اس نے جھرجھری لے کر چھ ماہ پہلے کا وہ منظر یاد کیا، جب حسب معمول مصطفیٰ ہاسٹل سے گھر آیا ہوا تھا اور وہ دونوں سہ پہر میں اوپر چھت پر آگئے۔ ساتھ والوں کے ساتھ بوکانا کے چکر میں جوش میں ڈور کو ڈھیلا کرتی وہ پیچھے مڑی ہی تھی کہ ایک دم پیروں کے نیچے سے زمین ختم ہو گئی اور خلا کے محسوس ہوتے ہی قلقل شکاف چیخ کے ہمراہ وہ سامنے کی منڈیر سے کچے صحن میں آگرتی۔ بازو پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آئی تھی، جبکہ باقی جسم میں چوٹیں تو آئی تھیں، لیکن شدید نوعیت کی کوئی چوٹ نہ تھی۔ جسم اور ہڈیوں کے درد نے البتہ مہینہ بھر ساتھ نہ چھوڑا، ساتھ ہی ساتھ بسنت کے موسم میں کسی کی نہ سننے والی عائشہ نے خود بخود ہی پتنگ بازی سے توبہ کر لی تھی۔

”مس عائشہ! سو تو نہیں گئیں۔“ رات کے

لیکن کیتی آرا جیسی بلا سے شادی نہیں کر سکتا، بھلے وہ کتنی ہی دولت مند کیوں نہیں ہو۔

ساجد اصل میں ابا کے دور پرے کا رشتہ دار تھا جس سے اس کی بات بچپن سے طے تھی کہ اچانک ہی اس کی خالہ زاد نے اپنی سنہری آنکھوں کے جال میں جکڑا تھا کہ قبول صورت کیتی آرا اس کو بلا لگنے لگی تھی۔ کیتی آرا کا صرف رنگ دیتا ہوا تھا، لیکن ساجد نے اس کو اس کا عیب بنا دیا تھا۔ ساجد کے بعد بھی بہت سے رشتے آئے، پر ذات برادری کے تار عنکبوت میں پھنسی اماں کسی کو ہاں نہ کہہ پائیں کہ ایسا کرنے سے اپنے مرحوم شوہر کو کیا جواب دیں گی۔ یہ نہیں سوچا کہ ہر معقول رشتے کو اس فضول سی وجہ کے باعث انکار کرنے سے وہ اپنی بیٹی کے عمر کے سنہری سال بھی ضائع کر رہی ہیں اور اسے ایک ان دیکھے برنچ میں دھکیل رہی ہیں۔

مالی بریشالی کوئی نہ تھی کہ ابا تر کے میں میر، بازار میں تین چلٹی دکانیں چھوڑ کر مرے تھے، جن کا کام پہلے وہ خود سنبھالتے تھے، مگر اب وہ کرائے پر تھیں۔ ذاتی مکان تھا جو اچھے وقتوں کا بنا ہوا تھا۔ کیتی آرا نے ایف اے کالج سے کیا تھا، پھر ابا کی وفات کے بعد اس نے پرائیویٹ بی اے، پھر بی ایڈ کیا اور گورنمنٹ کی ٹیچرز آسامی کے لیے ایلای کر تے ہی دو ماہ کے اندر اندر اس کی ایک گریجویٹ اسکول میں نوکری ہو گئی تھی۔

خود اعتمادی شروع سے تھی، اس کی اس خود اعتمادی کو اسکول کی نوکری نے مزید بڑھایا تھا، اگرچہ اماں اس کے حق میں نہیں تھیں، وہ جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ کیتی آرا کی خود اعتمادی میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی، جب اس کے منگیتر نے اسے ٹھکرا کر اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔ کچھ دن تک اسے صدمہ رہا۔ وہ روئی بھی۔ افسردہ بھی ہوئی، پر جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن گزرے پانچ سال میں جس طرح کچھ لوگوں نے اس کی قبول صورت شکل کو محض

ہے کیتی آرا۔ ایسا نہیں بولتے میری جان۔ کس نے کہا تم خوب صورت نہیں ہو؟“ وہ آگے بڑھ آئیں۔ ”ہونہ۔۔۔ خوب صورت ہوتی تو آج آپ کی جان کا وبال نہ بنی بیٹھی ہوتی۔ ساجد یہ کہہ کر ٹھوکر نہ مار جاتا کہ اس بلا سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں خود کشی کر لوں۔“ استہزائیہ انداز میں اماں کا ہاتھ جھٹک کر اس نے جیسے اپنا مذاق اڑایا۔ اماں اس کا یہ انداز دیکھ کر دھک سے رہ گئیں، جس بات کو انہوں نے اس سے بہت چھپا کر رکھا تھا، اس نے اس کی سماعت تک رسائی حاصل کر کے اپنی ملخنی کا گھونٹ اس کے اندر اتار دیا تھا۔

”وہ اس کی بدنصیبی تھی جو تجھ جیسے ہیرے کو ٹھکرا دیا اس نے۔ دیکھنا ایک دن ضرور پچھتائے گا جب تجھے اپنے گھر میں ہنسا بتا دیکھے گا۔“ اماں گلو گری لہجے میں بولیں۔

”ہیرا مت کہو اماں! کوئلہ کوئلہ، ہیرے کو لوگ اپنے تاج میں سجاتے ہیں۔ کوئلے کو ہاتھ لگانے سے ایسا ڈرتے ہیں جیسے لوگ مجھ سے رشتہ جوڑنے سے۔“ اس کی خود ترسی آج عروج پر تھی۔

”بس کرو کیتی آرا! ایسی باتیں کر کے مجھے دکھ مت دو، بچے گھر کا بسنا نہ بسنا یہ سب نصیب کے کھیل ہیں، بالکل ایسے ہی کسی بھی مخلوق کی کم روئی کا مذاق اڑانے کا حق ہمیں نہیں ہے، حتیٰ کہ اپنا بھی۔ یہ رب کے کام ہیں، اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ جس کے نزدیک یہ سب ثانوی باتیں ہیں، سب سے بڑی چیز ہے آپ کا دل اور آپ کے اعمال خوب صورت ہوں اور میری بیٹی کے دل کی اچھائی کا عکس اس کے چہرے پر جھلکتا ہے۔ کیتی دفعہ کہا ہے فضول باتیں مت سوچا کرو۔“

اماں نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس کرتے اس سے کہا تو وہ سر جھٹک کر چپ ہو گئی، پتا تھا کہ اس کی ایسی باتیں اماں کو بے حد دکھی کرتی ہیں، ایسا گزشتہ پانچ سالوں سے تھا، جب سے اس کے منگیتر ساجد نے اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ خود کشی تو کر سکتا ہے،

رنگ کی بنیاد پر مسترد کیا تھا، کچھ کو اماں نے ذات برادری کے زعم میں ٹھکرایا تھا، ان دونوں عوامل نے مل کر اس کی ذات میں پیدا ہونے والی دراڑوں کو ایک بہت بڑے خلا میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس کی ہم عمر سب بیانی گئی تھیں اور اب ایک ایک دو دو بچوں کی ماں تھیں۔ ہستی کھیلتی گیتی آراجو تبھی ابا کی بہت چہیتی۔ اماں کی دلاری تھی وقت اور معاشرے کی اس ٹھوکر سے بکھر گئی تھی۔ اسکول میں بھی ساتھی بچرز کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھریار بچوں کے تذکرے اس کا جی جلاتے، اسے لگتا وہ سب اسے چڑانے کے لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ یوں وہ سب سے الگ تھلگ ہوتی چلی گئی۔



”مما مجھے کچھ نہیں پتا۔ مجھے بس بائیک چاہیے، ورنہ کل سے میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گا۔“ اسفر نے چائے کا کپ ٹیبل پر پٹا تو انہوں نے اپنے خود سر بیٹے کو گھور کر دیکھا۔

”تم دن بہ دن کچھ زیادہ ہی بد تمیز نہیں ہوتے جا رہے ہو؟ دیکھ بھی رہے ہو اپنے پاپا کی بیماری۔ ان کی بیماری پر ہی کتنا خرچ اٹھ جاتا ہے۔ کاروبار آج کل مندا ہے، جس کی وجہ سے اس مہینے تو بالکل منجائش نہیں ہے بائیک لے کر دینے کی۔ پچھلے ہفتے ہی پینتالیس ہزار کالیپ ٹاپ لے کر دیا ہے تمہارے پاپا نے۔ کتنی دفعہ کہا ہے ان کے ساتھ اسٹور کو ہی دیکھ لیا کرو۔ ملازم ہی سب کام سنبھالتے ہیں، لیکن تمہیں احساس ہی کہاں ہے۔“ انہوں نے تیوریاں چڑھائے بیٹھے کی کلاس کی تو وہ مزید بگڑ گیا۔

”لیپ ٹاپ لے کر دیا ہے تو کون سا احسان کیا ہے مجھ پر۔ میرے فرینڈز کے پاس دیکھیں نیو برانڈ لیپ ٹاپ ہیں جن کی قیمتیں لاکھ سے بھی اوپر ہیں۔ پھر سب کے پیرس کرتے ہیں ایبا، آپ لوگ انوکھا تو نہیں کر رہے اور جہاں تک اسٹور کی بات ہے تو ساری

زندگی پاپا ہی دیکھتے آئے ہیں۔ مجھنے تو یہ حساب کتاب کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں نہ میں کئے کئے کے گاؤں کی فضول بکواس سن سکتا ہوں۔ مجھے اگلے ہفتے تک ہر صورت بائیک چاہیے، من لیں آپ اور اپنے شوہر نامراد کو بھی بتا دیجئے گا جن کو صرف گھوریاں ڈالنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنی آتی ہے۔ یہ بھی خیال نہیں کہ اکلوتی اولاد ہوں ان کی اتنا۔ کچھ ہے ان کے پاس پر اپنی پینک بیلنس سب کچھ میرا ہی ہے، تو آرام سے پتا نہیں کیوں نہیں دے دیتے مجھے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی مجھے ہی سنبھالنا ہے تو ابھی کیوں نہیں۔“ درستی سے کتا وہ ان کا دل دہلا گیا۔

”خدا کے لیے جب کرو اسفر، ہوش کے ناخن لو۔ تمہارے پاپا سن لیں گے تو کتنا برا لگے گا انہیں۔ اچھا تم اٹھو یونی جاؤ، میں کچھ کرتی ہوں۔“ انہوں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور آخری بات قدرے بد افغانہ لہجے میں کی، پتا تھا کہ اس کا غصہ اگر سوانیزے پر آیا تو سنبھالنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔

”سوچتا نہیں ہے، عمل بھی کرنا ہے۔ پاپا سے کہیں پینک بیلنس کو ہوا لگا میں بڑے بڑے گل سڑ جائے گا۔“ استنزا ایہ انداز میں ان کو وارننگ دے کر وہ باہر نکل گیا تو وہ سر تھا م کر بیٹھ گئیں۔

بیٹے کے بعد شوہر کا نزلہ بھی ان پر ہی گرنا تھا، یہ انہیں معلوم تھا اور ہوا بھی یہ ہی شام کو جب وہ اسٹور سے ٹھکے مارے گھر آئے تو انہیں کھانا اور چائے دینے کے بعد ان کی دوامی دی۔ کچھ عرصے سے وہ شوگر اور بلڈ پریشر کا شکار تھے۔ ابھی حال ہی میں شوگر لیول بڑھنے کی وجہ سے انہیں اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

”وہ اسفر یونیورسٹی جانے میں بہت پریشان ہوتا ہے۔ دو دو بیس بد لٹا پڑتی ہیں۔ بائیک کے لیے ضد کر رہا ہے، اگر آپ اسے۔“ ابھی ان کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ چیخ اٹھے۔

”تو کہاں سے لاؤں اتنے پیسے چوری کروں، ڈاکے ڈالوں، پتاؤ کہاں سے لا کر دوں۔ پانچ لاکھ اسپتال والوں نے بل بنا دیا۔ ابھی اسٹور میں پچھلے ماہ ہی نیا مال ڈالا

چکے تھے۔ جب اسفر گھر میں داخل ہوا تھا، ورنہ باپ، بیٹے کی مڈ بھڑ جب بھی ہوتی ایک نیا معرکہ ضرور ہوتا تھا۔ مگر آج خیر یہ ہوئی کہ صبح جس بگڑے موڈ کے ساتھ اسفر گیا تھا اب اس کا موڈ اتنا ہی خوش گوار تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اب وہ صوفے میں دھنسا کوئی میوزک چینل لگائے ہوئے خود بھی ساتھ ہی گنگنا رہا تھا۔ اس کا موڈ خوش گوار دیکھ کر انہوں نے سکون کی سانس لی اور خود یکن کی طرف برہہ گئیں۔



”میں نہیں کھیل رہی مصطفیٰ۔ مجھے پتا ہے تم جان بوجھ کر بار گئے ہو مجھ سے۔“ منہ بنا کر اس نے ساری گوشیں بکھیر دیں۔

”کیا کروں یار! تم سے ہارنے میں بڑا اچھا لگتا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”ورنہ تم یقین نہیں کرو گی عائشہ! ہاسٹل میں ان دو سالوں میں مجھ سے کوئی جیت نہیں پایا۔“ بازی سمیٹتے اس نے کہا۔

”اچھا اٹھو، آج دھوپ زبردست سی نکلی ہے۔ کیا خیال ہے چاچا کر مو کے مالٹوں کے باغ کا جائزہ نہ لیا جائے۔“ اس نے کہا تو عائشہ خوشی سے کھل گئی۔

”بہت ہی نیک خیال ہے۔ پر اماں۔“ وہ جوش سے اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

”خالہ سے میں پوچھ لیتا ہوں۔ تم اٹھو تو سہی، پھر میں نے دو ماہ بعد آنا ہے تو سوچا ہے آج کا دن ذرا بھر پور انداز سے گزار کے جاؤں۔ تم چادر لے کر باہر آ جاؤ، میں خالہ جی سے پوچھ لیتا ہوں۔ آج تو وہ دونوں بہنیں بھی صبح سے لگی ہیں کدو، مولیٰ کے باغ کو ٹھیک کرنے میں۔“ کہتا ہوا وہ باہر صحن میں نکل آیا، جہاں واقعی خالہ نے کیاریوں میں سے تازہ نکالی ہوئی گاجروں کو دھو دیا تھا، جبکہ بی بی ابھی بھی اپنے چھوٹے سے کھیت کی ناز برداریوں میں مصروف تھیں۔

”خالہ! میں اور عائشہ ذرا چاچا کر مو کے باغ تک جا رہے ہیں، کل مجھے ملے تھے تو دعوت دی تھی کہ مالٹے تیار ہیں، جاتے جاتے وہاں کا چکر لگاتا جاؤں۔“

ہے۔ جانتی ہو ہاتھ کتنا تنگ ہے، پر تمہیں میری پریشانیوں اور مسائل سے کیا لیتا رہتا۔ تمہیں تو بس اپنے لاڈلے کی بے جا فرمائشیں پوری کرنی ہیں۔ کبھی بیٹھ کے اس کے رزلٹ کارڈ دیکھے، گریڈ زوہ ہمیشہ سی اور ڈی ہی لایا ہے۔ مجھے بتاؤ ایسی پڑھائی اس کے کس کام کی ہے۔ یونیورسٹی کے بہانے صبح جاتا ہے، شام ڈھلے گھر آتا ہے۔ روز کا جیب خرچ اسے کھلا مل جاتا ہے، آوارہ قسم کے دوستوں کا ہر وقت کا ساتھ ہے۔ جس اولاد کو ماں، باپ سے بات کرنے کی تمیز ہی نہ ہو ارے ایسی اولاد کس کام کی۔“ بولتے بولتے انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ”اس سے میں بے اولاد ہی بھلا تھا۔“ کھانتے کھانتے انہوں نے کہا تو وہ آگے برہہ کران کی کمر سہلانے لگیں۔

”آپ بھی ذرا نرمی سے بات کیا کریں۔ جوان اولاد پر اتنی سختی بھی ان کو خود سہی پر مجبور کر دیتی ہے۔“ کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے بولیں۔

”نرمی کا ہی تو نتیجہ ہے جو اتنا بگڑ گیا ہے۔ ارے دوسروں کی اولاد تو باپ کے کندھے برابر پہنچتے ہی گھریا رہ سنبھال لیتی ہے، یہاں ہمارے صاحب زاوے ہیں، تیسرا سال ہے یونیورسٹی میں ہی انک گئے ہیں۔ اس سے کہو بس چھوڑے یہ پڑھائی وڑھائی، میرے ساتھ اسٹور پر جایا کرے۔ جو چاند اس نے کلج میں جا کر چڑھائے ہیں وہی یونیورسٹی میں بھی چڑھائے گا۔ یونی تو بہانا ہے آوارہ گردی کا۔“ وہ بھی اسفر کی طرف سے اچھا خاصا جلے بیٹھے تھے۔

”اچھا اچھا۔ بچہ ہے، میں سمجھا دوں گی۔ آپ غصہ مت کریں، پہلے ہی طبیعت خراب ہے آپ کی۔“ انہوں نے شوہر کو دھیما کرنا چاہا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غلط فہمیوں اور بے رخی کی جو دیوار ان باپ، بیٹے کے درمیان میں کھڑی ہو رہی ہے اسے کیسے دور کریں۔ اس کھینچا تالی میں ان کے گھر کا پر سکون ماحول خراب ہو کر رہ گیا تھا۔ بیٹا مشرق تھا تو باپ مغرب۔ وہ تو شکر ہے دوائیوں کے زیر اثر وہ سو

اس نے گاجروں کے ساتھ نبرد آزما خالہ کو مخاطب کیا۔
 ”ٹھیک ہے، جاؤ، لیکن جلدی آنا۔ تازہ مولیاں
 ہیں، ان کے برائے بنا رہی ہوں ابھی۔ پھر شام کو
 تمہارے لیے گاجر کا حلوہ بنا کر دوں گی، ساتھ لے
 جانے کے لیے۔ دیکھ لو ہمارے جس کھیت کا تم اور
 عاشی مذاق اڑاتے ہو۔ اس نے کتنے فائدے دیے
 ہیں۔“ خالہ نے تازہ اور سرخ گاجروں کے ڈھیر کو خوش
 ہو کر دیکھا تو مصطفیٰ سے کہا۔

”میں نے مذاق کبھی نہیں اڑایا خالہ! میں تو بس یہ
 کہتا ہوں کہ سارا دن کام میں مصروف رہتی ہیں۔ بی بی
 اور آپ۔ پہلے کینٹین کے لیے اتنا سب کچھ بنانا، پھر بچا
 کھچا وقت بھی آرام کے بجائے اس کھیت کو دیتی ہیں تو
 میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آرام کرنا بھی آپ کا حق بننا
 ہے۔“ وہ ان کی تصحیح کرتے ہوئے بولا۔

”بس بیٹا! یوں سمجھو کہ ان سے کچھ ولی لگاؤ ہو گیا
 ہے۔ اپنی اولاد کی طرح لگتے ہیں یہ پھل پودے
 انسانوں سے تو قسمت والا انسان ہی فیض پاتا ہے ان
 کو اگر لگن، توجہ اور پیار دو تو آپ کو گنا لوٹاتے ہیں۔ پر
 ہمیں تھکاتے نہیں، اتنا سکون ہی دیتے ہیں اور کئی
 ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں ان سے۔“ گاجروں کو
 چھیلنے انہوں نے مصطفیٰ کو تفصیل بتائی اور تسلی کرائی،
 اتنے میں عائشہ بھی چادر اوڑھ کر آگئی تھی۔ دونوں نے
 بی بی اور اماں کو سلام کیا اور باہر آگئے۔

تھوڑے سے فاصلے پر ہی مالٹے کا باغ تھا، ڈرا دیر بعد
 وہ دونوں وہاں پر تھے۔

”اچھے دن کتنی جلدی گزرتے ہیں نا مصطفیٰ۔“
 عائشہ نے درخت سے ایک مالٹا توڑا۔ ”کل تم چلے جاؤ
 گے میری بھی پھر سے وہی تھکا دینے والی روئین
 شروع ہو جائے گی، سنز شیخ کے بچوں کا رزلٹ بہت
 اچھا آیا ہے۔ انہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر دو
 چھٹیاں دے دی ہیں، ورنہ اتنا سخت رویہ رکھنے والی
 خاتون ہیں مصطفیٰ! کہہ کبھی کبھی مجھے بے حد غصہ آتا
 ہے ان پر۔ بچوں کو یوشن پڑھوا کر گویا انہوں نے میری
 سات پستوں پر ہی احسان کر دیا ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ

چھوڑ چھاڑ کے آجاؤں سب، لیکن جتنی فیس وہ دیتی
 ہیں۔ یہاں قبضے میں سب بچوں کی ملا کر بھی نہیں
 ہوتی۔ پھر اگلے سمسٹر کی فیس بھی منہ چرا رہی ہے۔
 اگلے ماہ۔ پچھلے سال سے ہی میری کوشش ہے کہ اماں
 اور بی بی کو تنگ نہ کروں، تو اچھا ہے۔“ اس نے مالٹا
 چھیل کر مصطفیٰ کی طرف بڑھایا۔

”بس عائشہ یہ کچھ عرصے کی مشکل ہے، پھر دیکھنا ان
 شاء اللہ جب میری جا ب ہو جائے گی تو ہمیں بھی سکون
 ہو گا۔ ہمارے بھی دن پھر س گے۔“ اس نے اس کے
 قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتے کہا۔

”میں اپنے حال پر راضی اور شاکر ہوں مصطفیٰ پر
 کبھی کبھی سنز شیخ اور ان کے گھروں کے ساتھ بنے بے
 شاریے اور خوب صورت گھر دیکھ کر دل میں خواہش
 اٹھ آتی ہے کہ کیا ہوتا جو کوئی ایسا ایک اچھا گھر ہمارے
 نصیب میں ہوتا۔ اماں اور بی بی کے چہرے بھی ویسے ہی
 مالی آسودگی کی چمک لیے ہوتے جیسے ان بیگمات کے
 تمہیں اور مجھے پل پل اپنی فیس پڑھائی اور دیگر
 اخراجات کی فکر نہ ہوتی۔ کیسی قسمت لے کر پیدا
 ہوئے ہیں ہم دونوں۔ تمہارے والد کو بچپن میں اللہ
 تعالیٰ نے پاس بلا لیا اور میرے والدیتا نہیں دنیا کے کن
 جمیلوں میں الجھ گئے، جو کبھی پلٹ کر ہماری خبر ہی نہ
 لی۔

میری ہر بات اور ہر سوال کا جواب فوراً دے دینے
 والی اماں اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتیں۔ ایک
 دفعہ بہت اصرار کرنے پر ان کی طبیعت بگڑ گئی کہ مجھے
 آج تک دوبارہ یہ سوال دہرانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔
 قانون فطرت ہے نا مصطفیٰ کہ جو چیز آپ کے پاس
 نہیں ہوتی، اس کو حاصل کرنے کو آپ کا من چل جاتا
 ہے اور جن چیزوں یا باتوں کو چھپایا جائے ان کے بارے
 میں جاننے کی ہڑک انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔“
 مالٹا اس کے ہاتھ میں ویسے ہی رہ گیا تھا۔

اپنے دل کی تمام باتیں وہ مصطفیٰ سے ہی بانٹا کرتی
 تھی۔ سو اس وقت بھی اپنی بہت سی الجھنوں اور
 خواہشوں کو بیان کر گئی۔

گھٹھار کی شوقین چنچل سی لڑکی ہوتی تھی تب ہی تو ایسا
کے رشتے داروں نے اس کو دیکھ کر اماں سے اس کا ہاتھ
مانگا تھا۔

”میں تو حیران ہی رہ گیا آپ کو دیکھ کر اس عمر میں
کوئی بھی اتنا آدم بے زار نہیں ہوتا جتنا آپ ہو گئی
ہیں۔“ اب وہ موڑھا کھسکا کر تخت کے سامنے ہی بیٹھ
گیا۔

وہ یقیناً ”باتوں سے دلوں کو جیتنے کا فن جانتا تھا جو
جاتے جاتے لیتی آرا کے ماتھے کی سلوٹیں منا کے
ہی گیا تھا، اگلی بار آنے کا وعدہ کر کے۔ اور محض چار دن
بعد وہ ان کے گھر پر حاضر تھا اس نے آنے کے لیے
وقت ہی ایسا چننا کیا تھا جب لیتی آرا چھٹی کے بعد گھر
میں تھی۔ اس بار لیتی آرا نے خود آگے برہ کر اسے
سلام کیا تھا۔

”آج لگ رہی ہیں آپ اپنے نام کی مکمل تفسیر
کیتی آرا۔ کہہیے کیسے مزاج ہیں؟ کون سی کلاس کو
پڑھاتی ہیں؟“ باتوں سے باتیں نکال کر وہ اس کو شریک
مخاطب کرنا چلا گیا۔ اماں، بیٹی کا خوش گوار موڈ دیکھ کر
بہت خوش تھیں۔

”گیتی جی یہ دنیا ہے نا دکھے دلوں کو مزید دکھانے کا
فریضہ بخوبی انجام دیتی ہے، سو اس کو ایسا موقع ہی نہیں
دینا چاہیے نہ ہی خود ترسی کا لیبل خود پر چسپاں کرنا
چاہیے۔ مجھے دیکھیں

میں اپنے دکھوں کو چھپا کر اتنا ہنستا ہوتا ہوں کہ خود ہی
فریب میں آجاتا ہوں۔ یقین جانیں یہ خود فریبی بھی
بڑی پیاری چیز ہے، لمحوں میں آپ کو دکھوں کے
سمندر سے نکال کر سکھ کے خوابوں میں لاکھڑا کرتی
ہے۔ بچپن میں اماں ابا گزر گئے۔ تایا کے گھر میں پلا
بڑھا۔ تائی کے بھاری بھر کم ہاتھوں کی مار کی چھین آج
بھی اپنے توانا بدن پر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے بڑھنے کا شوق تھا اور تائی کو میرے اسی شوق
سے بیر تھا۔ میرے اسکول جانے کے ٹائم ان کو ہزاروں
کام یاد آجاتے۔ تایا بس اتنا ہی دم مار سکے تھے۔ تائی
کے آگے مجھے اس گھٹھ تک لے آئے تھے آگے

”بہت سال پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں، جیسی
اب ہو گئی ہیں؟“ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا وہ خورہ
نوجوان اماں کی کسی دور پار کزن کا بیٹا تھا۔ جو دو تین ماہ
پہلے اماں سے برادری کی کسی شادی میں ملا تھا، اس کی
ماں اور باپ اس کے بہت بچپن میں انتقال کر گئے
تھے۔ چچا نے اسے پالا تھا، جب چھوٹا تھا تو اماں نے اپنی
خالہ زاد بہن کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب تو اسے ایک
بھر پور جوان کی صورت دیکھ آیدہ ہو گئیں اور انہیں
اپنی خالہ زاد بہن بے حد یاد آئی تھیں۔ اماں بصد اصرار
اسے اپنے گھر ہی لے آئی تھیں۔

پہلی بار لیتی آرا اسکول میں تھی۔ جب وہ آیا تھا۔
دوسری بار وہ گھر پر تو تھی، لیکن ایساں کے بار بار بلانے پر
بھی کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ آج میری بار وہ
کسی کام سے شہر آیا تو اماں سے ملنے چلا آیا۔ چھٹی کا
دن تھا اماں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں، جبکہ
کیتی آرا تخت پر بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو تنکے جا رہی
تھی، جب اس شخص نے اسے مخاطب کیا۔ کتنا بدل گیا ہے
آپ، لیتی آرا نے سنا نہیں تھا یا اپنی بے زار طبیعت کے
باعث خود ہی جواب نہیں دیا تھا۔ جو اس نے اس سے
یہ سوال پوچھا۔

”کیسی ہوں اب؟ اور پہلے کیسی تھی؟“ اس نے
کرختگی سے سوال کیا۔

”بہت سال پہلے ہمارے گاؤں میں خالہ کے ساتھ
آپ آئی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ شادی کی رونق بھی
آپ نے لگائی تھی۔ اپنی خوب صورت آواز میں
گانے، نئے گانے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد بہت
دنوں تک آپ کا چرچا رہا کہ بانو (اماں) کی بیٹی میں شہری
ہونے کے باوجود مزاج میں خرا نہیں اور آواز بھی کتنی
خوب صورت ہے؟“

اس نے سادہ سے انداز میں بتایا تو کیتی آرا کو یاد آیا
واقعی تقریباً ”دس سال قبل وہ جب اماں کے ساتھ ان
کے شریکوں کی شادی میں گئی تھی تو کیسی پر اعتماد بناؤ

کراہیے لیں گی مجھ سے۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔
 ”اچھا اچھا تم آتو جاؤ کراہیے بھی دیکھ لیں گے۔“ اماں
 نے کہا تو خاور اثبات میں سر ہلا گیا۔



کالج سے وہ سیدھی مسز شیخ کے گھر آئی تھی بچوں کو
 پڑھا کر گھر جانے کا ارادہ کیا تو پتا چلا کہ صبح سے ابر آلود
 موسم پورے زور و شور سے برس رہا ہے۔ آسمان پر
 چمکتی بجلی اور موسلا دھار بارش کو دیکھ کر وہ بہت پریشان
 ہو گئی۔ اٹنے قدموں وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی
 جہاں بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ عامر اور ماریہ کھیل
 رہے تھے۔

”عامر آپ بیٹا ذرا اپنی ماما کو بلا کے لاؤ۔“ اس نے
 گھڑی کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ مسز شیخ کے
 آجانے پر اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”بارش رکنے کے تو واقعی آثار نہیں نظر آ رہے۔
 ڈرائیور بھی نہیں ہے۔ اچھا تم رکو، میں کچھ کرتی
 ہوں۔ وہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں تھوڑی دیر بعد
 آئیں تو ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔

”عائشہ! یہ اسفر سے میرے بیٹے کا دوست ہے۔
 تمہاری اچھی قسمت کہ یہ بھی عدیل (بیٹے) کے پاس
 کسی کام سے آیا تھا۔ بارش کی وجہ سے رک گیا۔
 عدیل تو گھر میں ہے، اسفر تمہیں اشاپ پر چھوڑ آتا
 ہے، نہیں تو پھر بارش رکنے کا انتظار کر لو۔“ مسز شیخ نے
 اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر قدرے بے
 رخی سے کہا۔

”نہ۔ نہ۔ نہیں میں چلی جاتی ہوں۔“ اسے
 امی اور بی بی کی پریشانی کا خیال آیا تو وہ جھٹ جانے کو
 تیار ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد تیز برستی بارش میں وہ بظاہر بے نیاز
 بنے اس نوجوان کے ساتھ بس اشاپ کی طرف جا رہی
 تھی۔ حالانکہ ان کا قصبہ یہاں شہر سے محض پچیس
 منٹ کی ڈرائیو پر تھا اور اپنی گاڑی وغیرہ ہو تو محض پندرہ
 منٹ کا۔ اشاپ سے ہر ادا گھنٹہ بعد وین نکلتی تھی،

ان کی بیوی کا کام تھا، جو اس نے بخوبی کیا۔ بمشکل
 پانچ سو پاس کی تھی کہ تیار کا ہاتھ گھاس نکلنے کی مشین
 میں آکر بے کار ہو گیا، تب سے ان کے حصے کا کام بھی
 مجھ پر آن پڑا، یوں پڑھائی تو ایک خواب ہوئی، سال دو
 سال ایسے ہی گزرے تھے کہ پڑھائی کا شوق ایک بار پھر
 انگڑائی لے کر بے دار ہوا۔

یہاں وہاں سے کتابیں ادھار لے کر کبھی کسی
 بہانے اسکول یا سٹر سے کبھی کسی لڑکے سے اپنے علم
 کے حصول کی تسکین کر لیتا تھا۔ ایسی ہی صورت حال
 میں آٹھویں کا امتحان دیا۔ تائی اب میرا قد کاٹھ دیکھ کر
 ڈرنے لگی تھیں۔ سو ہاتھ چلانے سے ذرا گریز کرنے
 پر زبان پر پھر بھی کنٹرول نہ رہا میں اگر نکا ہوا تھا تو
 صرف اپنے تائی کے لیے پچھلے سال ان کے انتقال
 کے بعد تائی اپنے بھائی کے گھر چلی گئی، مجھے گھر سے
 نکال دیا۔ اب نہ ٹھکانا ہے، نہ زاد راہ۔ پرائیویٹ
 میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں۔ ایک ورکشاپ میں کام
 بھی جاری ہے۔ بس زندگی کا سفر جاری و ساری ہے۔“
 ہنستا مسکراتا خاور سے اندر کتنا دکھی تھا آج پتا چلا تھا۔

”اے بیٹا ٹھکانا ہے نا۔ خالہ کے ہوتے ہوئے
 در بدر پھر رہا ہے میرا بچہ۔“ اماں کے کانوں میں خاور
 کی گفتگو کے کچھ آخری جملے پڑے تھے، تو اس کی
 در بدری کا سن کر وہ تڑپ گئیں۔

”نہیں خالہ! میرا ارادہ اس وجہ سے بتانے کا نہیں
 تھا کہ میں آپ پر بوجھ بن جاؤں، بلکہ گیتی جی کو بتا رہا تھا
 کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو مکمل خوش ہو،
 آسودہ ہو، کوئی نہ کوئی دکھ ہر جان کو لگا ہوا ہے، پر اس کا یہ
 مطلب تھوڑی ہے کہ ہم جینا ہی چھوڑ دیں۔ دکھوں
 سے سرنڈر کرنے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے میں
 ہی زندگی کا مزا پوشیدہ ہے۔“ اس کی باتیں ان کی بیٹی
 کے دل میں ہی اتر گئیں۔

”اے بیٹا بوجھ کیوں خدا نخواستہ۔ ماں کی جگہ
 ہوں تمہاری اور حکم دے رہی ہوں تمہیں کہ آج ہی
 اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔“ اماں نے دھونس سے کہا۔
 ”ٹھیک ہے خالہ! پر ایک شرط پر آؤں گا کہ آپ

اگلے اشاپ کے لیے اور ان کا قصبہ درمیان میں آتا تھا، سو اس کو کبھی کلج جانے آنے کے لیے مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

صبح اماں نفن ساتھ دے دیتیں، جو وہ کلج میں کھالتی، چھٹی کے فوراً بعد مسز شیخ کے گھر پیدل ہی آجاتی کہ کلج سے محض پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن مسز شیخ کے بچوں کو ایک گھنٹہ پڑھانے کے بعد اسے بس اشاپ کے لیے رکشہ کرنا پڑتا تھا اور کبھی کبھار مسز شیخ مہربانی کرتے ہوئے ڈرائیور کے ہمراہ اسے گاڑی میں اشاپ تک بھجوا دیتیں۔ گرمیوں میں تو وہ چار بجے تک گھر بھی پہنچ جاتی اور محلے کے بچوں کو بھی تھوڑا سا آرام کر کے چائے پی کے تازہ دم ہونے کے بعد پڑھا دیتی، بلکہ اکثر تو اماں بھی ان کو پڑھا چکی ہوتیں، لیکن سردیوں میں اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتی، گھر پہنچتے پہنچتے مغرب کی اذانیں شروع ہو جاتی تھیں اور آج تو موسم کی خرابی کے باعث ابھی سے شام کا سماں محسوس ہو رہا تھا۔

”جی مس۔! آگیا اشاپ، یہاں تو کسی وین یا گاڑی کا نام و نشان نہیں ہے۔“ اسفر نے گاڑی روکتے ہوئے اسے خیالات سے باہر نکالا، وہ خود بھی ہر اسماں نظروں سے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

”اب۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟“ اس نے بے حد پریشانی میں اس سے پوچھا۔ حالانکہ وہ اچھی خاصی برا اعتماد تھی، پر اس وقت حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”آئی (مسز شیخ) بتا رہی تھیں کہ فضل نگر کی حدود میں ہے آپ کا گھر۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں تک ڈراپ کر سکتا ہوں، کیونکہ بارش کا بھی یہی حال اگلے دو گھنٹے رہنے کا لگ رہا ہے اور کوئی لوکل سواری موجود نہیں ہے، ہوتی بھی تو میرا ضمیر مطمئن نہ ہوتا، آپ کو اس موسم میں لوکل وین میں بھیج کر جبکہ آپ کا قصبہ کوئی خاص دور بھی نہیں ہے۔“ اس نے کہا تو عائشہ ممنون نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اسفر نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس سے

چھوٹی چھوٹی باتیں شروع کر دیں۔ عائشہ جو پہلے اس کے ساتھ آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اب اس کی مہربانی کی وجہ سے مطمئن ہو گئی تھی۔

”جی میں بی ایس سی پارٹ ٹو کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مسز شیخ کے بچوں کو ٹیوشن دیتی ہوں۔ روزانہ ہی لوکل سفر کرتی ہوں یا یوں کہیں کہ عادی ہو گئی ہوں اب تو، لیکن ان گزرے دو سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا ہے اس لیے آپ کو زحمت دینا پڑی۔“ اپنے متعلق پوچھتے گئے سوال کے جواب میں عائشہ نے اسے تفصیل بتائی۔

”ارے نہیں زحمت کیسی۔ میں عدیل کے پاس آتا رہتا ہوں اکثر۔ ایک دو بار دیکھا ہے آپ کو وہاں اور یقین مانیں تو میں بہت امپریس ہوا ہوں آپ کی اسٹڈیز کے لیے اتنی اسٹرنگل کو دیکھ کر۔ روزانہ سفر کر کے آنا پھر تھکے ہونے کے باوجود ٹیوشن، جبکہ آپ کی اپنی پڑھائی بھی خاصی ٹف ہے تو ویل ڈن، مجھے تو بہت اچھا لگا۔ میں لڑکا ہوں، پر یقین مانیں اتنی اسٹرنگل مجھے کرنی پڑتی تو شاید میں بھی تھک جاتا۔ گھبرا جاتا۔“ اس کی زبان سے ادا ہوئے تعریفی الفاظ عائشہ کو جھینپنے پر مجبور کر گئے۔

”ارے نہیں اسفر صاحب۔ زندگی کا زاویہ نظر ہر انسان کے لیے ایک جیسا نہیں ہوتا، پھر زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے، کچھ بننے کے لیے کوشش تو شرط ہے نا۔“ عائشہ نے اسے کہا تو اسفر کو سنجیدہ نظر آنے والی وہ سٹی سٹائلی لڑکی اس وقت بہت متاثر کر گئی۔

”فادر کیا کرتے ہیں عائشہ آپ کے؟ کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ۔“ اسفر نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔ بارش اب ہلکی ہو گئی تھی۔

”میں اکلوتی ہوں اور میرے فادر۔“ وہ بتاتے بتاتے رک گئی۔ ”میرے پیرنس کی علیحدگی ہو چکی ہے۔“ آہستہ سے کہا گیا وہ جملہ اسفر کو بمشکل سٹائی دیا تو اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور معذرت کرنے لگا۔

”سوری، مس عائشہ! مجھے اس طرح آپ کے پرسنل میں انٹرفیر نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ سچ سچ

شرمندہ ہو کر بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“ عائشہ نے کہا۔

”اب آپ بتادیں کہ کس طرف موڑوں۔“ فضل نگر کے سائن بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے کہا تو عائشہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ ایک کھلی گلی میں اس نے گاڑی روکادی۔

”بس اس فر صاحب! ہمیں روک دیں۔ میرا گھر وہ گلیاں چھوڑ کر ہے اور معذرت کے ساتھ کہ آپ کو نہ تو وہاں تک لے جاسکتی ہوں نہ ہی کسی چائے یا تواضح کی آفر کر سکتی ہوں۔ میں روز لوکل سے آتی ہوں یہ یہاں سب جانتے ہیں اور مصطفیٰ میرا کزن یہاں ہوتا تو یقین مائینے مجھے آپ کو گھر بلا کر بہت خوشی ہوتی، اب کسی مرد کی غیر موجودگی میں۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی تو شرمندہ شرمندہ سی عائشہ کی بات سمجھتا اس فر تیزی سے بول اٹھا۔

”اٹس اوکے، مس عائشہ میں آپ کی پرابلم سمجھ گیا ہوں۔“ اس نے نرمی سے کہا تو عائشہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی نیچے اترتی۔

جب کہ اس فر کافی دیر گاڑی میں بیٹھا اس لڑکی کو اس وقت تک دیکھے گیا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

پارش اب ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی پھر بھی گھر آتے آتے اس کی چادر اچھی خاصی بھیک گئی۔

”بس عائشہ! اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی، تمہیں کالج جانے سے منع نہیں کرتی، لیکن یہ ٹیوشن وغیرہ چھوڑ دو اب بیٹا۔ صبح سے ہول ہول کر برا حال ہو گیا ہے میرا بی بی الگ گلی میں جا کر دیکھ دیکھ کر آتی رہیں، اوپر سے تمہارا موبائل بند۔ اف میرے اللہ مت پوچھو، کتنا برا حال ہوا ہے میرا۔“ ماں تو جب وہ کپڑے بدل کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھی، تب ہی شروع ہو گئیں۔

”موبائل۔ ہاں وہ رات میں چارج کرنا بھول گئی تھی اور ماں میں نے آپ کو پہلے بھی کہا ہے، میری اپنی پڑھائی کلاسٹ سمسٹر ہے، تو کافی ٹف ہے سب کچھ“

لیکن مسز شیخ کے بچے کسی اور ٹیوٹر سے پڑھنے کو تیار ہی نہیں، پھر اچھا خاصا پے کرتی ہیں، مجھے تو بس اسی لیے رک جاتی ہوں۔“ اس نے کھانا کھاتے ہوئے تفصیل بتائی۔ ”پھر ماں یہ بھی تو دیکھیں نابی بی کی ساری تنخواہ مصطفیٰ کی پڑھائی پر لگ جاتی ہے۔ آپ کی پنشن سے گھر کا گزارا بھی کھینچ مان کر ہوتا ہے۔ وہ تو آپ کی محنت کام آجاتی ہے، ورنہ سبزیوں کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ میں تو بی ایس سی کے فوراً بعد بی ایڈ کر لوں گی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے۔ آج کل تو ہر سال ہی نیچرز کی اچھی خاصی اسامیاں نکال رہی ہے حکومت۔ جب ہو گئی تو آگے پرائیویٹ پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھوں گی۔ ورنہ ایک دو کمپنیز میں جاب کے لیے اپلائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب ہی تجربہ مانگتے ہیں۔ لو بھلا بتاؤ نوکری دو گے پہلے تو ہی تجربہ حاصل ہو گا۔ نا۔“ چائے کے کپے لے لے گھونٹ بھرتے وہ کہے گئی تو ماں خاموشی سے اس کی بات سننے لگیں۔

”بس بول لیا جتنا تمہیں بولنا تھا۔“ ماں نے رساں سے پوچھا۔

”اب میری بھی سنو۔ میں نے ساری زندگی نہ تو تم سے پڑھائی کروانی ہے اور نہ نوکری کے لیے دھکے کھانا دیکھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔ مصطفیٰ کے امتحان ہو رہے ہیں۔ ان شاء اللہ اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔ تمہارے پیپرز ہوتے ہی ہم نے تم لوگوں کی شادی کا سوچا ہے۔ پھر مصطفیٰ کی اجازت ہو تو آگے پڑھتی رہنا، نہیں تو اتنی ہی پڑھائی کافی ہے، ویسے بھی میں نے بڑھ کر نوکری کر کے کیا پالیا تھا جو تم پانا چاہتی ہو۔“ دونوں انداز میں اپنی بات اس سے کہتے کہتے آخر میں بی بی کالج یا سیت بھرا ہو گیا۔ پر عائشہ نے بی بی کی آخری بات سنی ہی کہاں گئی۔ وہ تو جیسے صدے میں تھی۔

”مصطفیٰ سے شادی۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

وہ اس کا کزن تھا۔ دوست تھا، پر دل کا مکین ہرگز

نہیں تھا، نہ ہی اپنے مستقبل میں کہیں اس کا گمان
کر لی تھی۔

”آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں مصطفیٰ سے
شادی کروں گی۔ زندگی کے جس محدود تنگ اور مفلس
بھنور سے ابھرنے کی کوشش میں کئی سالوں سے
ہوں۔ آپ مجھے دھکا دے کر دوبارہ اسی گرداب کی
جانب دھکیل دینا چاہتی ہیں۔ میرے خوابوں میں نہ تو
ایسی زندگی ہے، نہ یہ چھتیں ٹپکتا گھر اور نہ مصطفیٰ، یہ
میری زندگی ہے اور میں اسے زندگی کی طرح گزارنا
چاہتی ہوں۔ سک سک کر نہیں جینا۔ اللہ تعالیٰ
نصیب بناتا ہے، پر کوشش کرنے کا حکم بھی دیتا
ہے۔ اس گھر میں پیدا ہونا میرا نصیب ٹھہرا، پر کوشش
ہو سکتا ہے میرا نصیب بدل ڈالے۔ مجھے میری
ترجیحات کے مطابق میری زندگی کا یقین کر لینے
دیں۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی اور اماں بے چاری حیران
پریشان رہ گئیں، اس کے ایسے سخت رد عمل پر۔

وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ مصطفیٰ کے ساتھ کاسنتے ہی
وہ خوش ہو جائے گی تو کیا ان کا خیال غلط تھا۔ مصطفیٰ کی
مرضی جان کر ہی بی بی نے اماں سے بات کی تھی تو کیا
مصطفیٰ نے اکیلے ہی خواب بن ڈالے، خوابوں کے اس
سفر میں عائشہ اس کے ہمراہ نہیں تھی۔

”کیا بات ہے عائشہ! کیوں اتنا تیز تیز بول رہی ہے؟
ماں باپ کی ڈانٹ بھی فائدے کے لیے ہوتی ہے۔
پر بچہ اس بات کا فہم نہیں رکھتا۔“ بھیکے کپڑوں میں
بلبوس بی بی جو کہ اوپر چھتوں کا جائزہ لینے گئی تھیں، اندر
آئیں۔ وہ سمجھیں کہ عائشہ کو ماں نے در سے آنے پر
ڈانٹا تھا اور عائشہ اس لیے خفا ہو رہی تھی۔ اصل
صورت حال سے وہ لاعلم تھیں۔

”کچھ نہیں بی بی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔“
عائشہ نے بی بی سے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔
وہی کمرے تھے جس میں پہلے ایک میں وہ تینوں
اور دوسرے میں مصطفیٰ کی رہائش تھی۔ پر اب جب
سے مصطفیٰ ہاسٹل چلا گیا تھا، اس کا کمرہ عائشہ کے
تصرف میں تھا۔ کچھلے دنوں ہی ایک اور چھوٹا سا کمرہ بنا

کر اسے بیٹھک کا نام دیا گیا تھا۔ جن دنوں مصطفیٰ گھر
ہوتا، وہیں ٹھہرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اماں نے
جب بی بی کو عائشہ کے رد عمل کے بارے میں بتایا تو
ایک لمحے کو وہ چپ ہو گئیں، لیکن پھر خود ہی انہیں
تسلی دی۔

”کوئی بات نہیں، تم نے اچانک بات کی ہے نا تو بچی
پریشان ہو گئی ہے، تم پریشان نہ ہو۔“ انہوں نے اماں کا
گندھا تھپک کر انہیں تسلی دی تو وہ محض سر ہلا کر رہ
گئیں۔



”میں تو حیران ہوں اس سفر کی کاپی لپٹ پر۔ کہاں تو اس
نے اپنی حرکتوں سے ہمارا ٹاک میں دم کر رکھا تھا؟
کہاں اس ایک ماہ میں اس میں اتنی تبدیلی آئی ہے کہ
ریگولر یونیورسٹی جا رہا ہے۔ وہاں سے جہی آنے کے
بعد آوارہ گردی کرنے کے بجائے اسٹور کی دیکھ بھال
کے لیے آجاتا ہے میرے پاس۔ سچ پوچھو تو مجھے اب پتا
چل رہا ہے کہ جوان بننے کی خوشی کیا چیز ہوتی ہے۔
اپنے آپ کو توانا محسوس کرنے لگا ہوں میں جیسے۔“
کافی عرصہ بعد آسودگی اور علمانیت کا احساس انہوں
نے اپنے اندر محسوس کیا تھا۔

”میں تو اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے
میرے بچے کو ہدایت دے دی ہے۔“ وہ ایسے سرشار
تھیں جیسے اس کے سدھر جانے میں ان کا کوئی عمل
داخل ہو۔ پر شام کو کھانے پر اس نے نئی فرمائش کر کے
ماں کو حیران کر دیا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی بھی پسند کر لی
ہے۔ آپ دونوں نے رشتہ لے کر جانا ہے۔“ بریانی
کھاتے اس نے ایسے فرمائش کی جیسے نئی شرٹ پسند
کر چکا ہوں، جلدی سے دلا دیں۔ جبکہ ان دونوں نے
کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا، پر کون لڑکی ہے؟ کیسی ہے؟
لوگ کیسے ہیں۔“

”آپ کے لیے اہم بات یہ ہونی چاہیے کہ آپ

لڑکی آپ کیوں نہیں ہو سکتیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر خاور نے کہا تو گیتی آرا کی ہتھیاسیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔

”جلدی سے ہاں میں عندیہ دیں تو میں خالہ سے بات کروں گا کہ مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیں۔ ورکشاپ کے مالک نے بھی اب مجھے ترقی دے کر ورکشاپ کا سارا حساب کتاب میرے حوالے کر کے منشی بنا دیا ہے۔ ابا کا خالی پڑا مکان ہماری راہ تک رہا ہے جسے ہم گھر بنائیں گے اور خالہ کو بھی میں ہاں بنا کے اپنے ساتھ رکھوں گا۔“

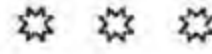
وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے خوابوں کو نہ کہہ کر توڑ دینا چاہتی تھی پر اس کے چہرے پر سب سے رنگ اور خود اس کا دل بھی بغاوت پر آمادہ ہو گیا تو وہ سارے خدشے جھٹک کر مسکرا دی اس کے بعد جب خاور نے اماں سے بات کی تو ان کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ ان کی بیٹی کے نصیب کھل گئے تھے۔

دو ماہ کے اندر اندر وہ خاور کی دلہن بن کر اس کے ہمراہ اس کے گھر سدھا رہ گئی۔ خاور خالہ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ گیتی آرا نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ گیتی آرا نے اماں کے مشورے سے خاور کی ورکشاپ کی نوکری چھوڑ دی تھی اور تینوں دکانوں کی چابیاں اس کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا کہ اس سمیت اب اس کی ہر چیز اس کی ہے۔ خاور پہلے تو ذرا ہچکچایا پھر محبت بھرا اصرار سے آمادہ کر گیا۔

گیتی آرا اس کے ہمراہ بہت خوش تھی۔ اگرچہ وہ ایک نو آباد قصبے سے گاؤں آئی تھی پر خاور نے اسے اتنا پیار دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہر جگہ رہ سکتی تھی۔ خاور اسٹور کے کام میں بہت مصروف ہو گیا۔ گیتی آرا کی قبل از وقت ملنے والی ریٹائرمنٹ کا پیسہ بھی اس نے خاور کو دے دیا کہ اپنے کام کو مزید بڑھالے۔

اماں ایک رات معمول کے مطابق سوئیں تو سوتی رہ گئیں اس صدمے کو جھیلنے میں اس کا خاور نے بہت ساتھ دیا تھا پھر جب وہ امید سے ہوئی تو اس نے خاور کو اس خوش خبری کا بتایا اس کا رد عمل اسے کچھ عجیب سا

کے بیٹے کی پسند ہے وہ ایک دو روز میں ایڈریس بھی بتا دوں گا۔ اس نے ماں کی طرف سے کیے گئے سوالوں کا دو ٹوک جواب دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔



خالہ کے بہت زیادہ اصرار پر خاور کو اپنا سارا سامان لے کر ان کے گھر آنا پڑا تھا۔ اس کے آنے سے گیتی آرا کے اندر بہت بڑی تبدیلی آئی تھی وہ خوش رہنے لگی تھی۔ روزانہ شام کو اسے انگلش اور میتھ کی ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ محض دو ماہ کی محنت کے بعد اس نے اللہ کا نام لے کر میٹرک کا امتحان دے دیا تھا۔

”آپ کچھ کرنے رہی ہوں تو میں اندر آ جاؤں۔“

دروازے سے جھانک کر اس نے کتاب پڑھتی گیتی آرا کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر مسکرا دی۔

”کچھ کر بھی رہی ہوں تب بھی آپ اندر آ سکتے ہیں۔“ کتاب بند کر کے اس نے ایک طرف رکھ دی۔ وہ اس کے بیڈ کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”گیتی آرا! میں ہمیشہ سیدھی اور صاف بات کرنے کا عادی ہوا ابھی باتیں اچھی رویے اور بڑے بڑے دعوے کرنا مجھے پسند نہیں سیدھی سی درخواست ہے کہ میں آپ سے شادی کا خواہاں ہوں۔ میری زندگی میں خود سب کچھ آئینے کی طرح آپ کے سامنے ہے انکار مت کیجئے گا کہ میری طرح میرا غافل دل پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھ کر سگنل دینے لگا ہے اور وہ لڑکی آپ ہیں۔ یقین کیجئے کہ میں آپ کی خوشیوں کی ضمانت تو نہیں دیتا لیکن اپنی سی بھرپور کوشش ضرور کروں گا۔“

اس نے آہستہ مگر دو ٹوک انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

”دل۔ لیکن خاور ایسے کیسے تم مجھ سے پورے آٹھ سال چھوٹے ہو۔ جوان ہو خوب صورت ہو زندگی میں آگے بڑھنے کی لگن رکھتے ہو کوئی بہت اچھی لڑکی تمہیں مل جائے گی۔“ وہ سنبھل کر بولی تو خاور مسکرا دیا۔

”بہت خوبیاں آپ میں بھی ہیں تو بس وہ اچھی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

چادر ٹھیک کی اور باہر کی طرف قدم بڑھادیے۔
 سفر کا انداز، اس کے برآمد ڈکپڑے، جوتے، گاڑی
 سب چیخ چیخ کر اس کی امارت کو بیان کرتے تھے۔ مسز
 شیخ کے بیٹے کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں یونیورسٹی کے بعد
 آج کل فارغ تھے۔ ایک دن مسز شیخ نے اس سفر سے پوچھا
 تھا کہ عدل تو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہ رہا ہے اس
 کا کیا پروگرام ہے؟ تو اس نے لاہر والی سے کہا تھا، کچھ
 دن انجوائے کرنے کے بعد اپنے والد کا بزنس سنبھالے
 گا۔ تب تو وہ ان کی بات کا نوٹس لیے بغیر بچوں کی طرف
 متوجہ رہی تھی، جبکہ مسز شیخ باتیں کرتے ہوئے اسے
 اندر لے کر گئی تھیں۔

اب یہ بات اسے یاد آئی تو وہ چونک اٹھی۔ کیا اسی
 کا، اسی رشتے کا انتظار تھا جس کو میٹرھی بنا کر وہ اس
 ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔

”یہ سب کیوں سوچ رہی ہو تم؟ جب تم نے مصطفیٰ
 کے رشتے سے فوراً انکار کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری
 ترجیحات میں ابھی شادی نہیں ہے۔ گویا تمہاری
 ترجیحات میں مصطفیٰ سے شادی شامل نہیں تھی۔
 ایک امیر کبیر لڑکا دیکھ کر تمہاری ترجیحات بدل گئیں۔“
 ”ہاں تو زندگی کی ترجیحات کو اپنی سہولت کے مطابق
 سیٹ کرنا ہر انسان کا حق ہے، میں اگر ایسا سوچ رہی
 ہوں تو کوئی غلط نہیں کر رہی ہوں، ضمیر کی لتاڑ پر اس
 کے دماغ نے تاویل پیش کی۔“

”اور مصطفیٰ جس کی آنکھیں تمہیں دیکھ کر چمک
 اٹھی ہیں اور چہرہ کھل اٹھا ہے؟“

”ہاں تو مصطفیٰ کی اچھائی اور محبت کے رنگوں سے
 بھلا کب نا واقف ہوں، لیکن زندگی صرف محبت کے
 سہارے نہیں گزرتی ہے۔ مصطفیٰ کو اس مقام تک
 پہنچنے میں دس سال لگیں گے یا اس سے بھی لمبا عرصہ،
 جہاں اب سفر ہے تو زندگی کا اتنا لمبا سفر محرومیوں میں
 گزار دوں۔ گھر کی ٹپکتی چھتوں کی فکر کرتے ہوئے،
 دماغ اور ضمیر کی اس جنگ میں وہ گم تھی، جب کنڈیکٹر
 کی تیز آواز نے اسے چونکایا۔“

”اوی بی جی اترو، تمہارا اسٹاپ آگیا ہے۔“ وہ

لگا، جیسے اسے یہ بات پسند نہ آئی ہو، حالانکہ کہتی آرا کا
 خیال تھا کہ خاور یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا
 اور اس سے اگلے دن کہتی آرا کے لیے جو تاریک منظر
 نمودار ہوا اس کی تاریکی اس کی ساری زندگی پر چھا گئی۔



عائشہ نے اماں سے سب کچھ کہہ کر اپنے دل کی
 بھڑاس تو نکال لی تھی، پر بعد میں ان کا رد عمل اس کے
 لیے بہت پریشان کر دینے والا تھا۔ وہ اس سے بہت کم
 بات کرتی، بس اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ بی بی تو
 اسکول چلی جاتیں، عائشہ کالج، وہ سارا دن اپنے کھیت
 کی آبیاری میں لگی رہتیں۔ مصطفیٰ کے فائنل امتحان
 تھے، ورنہ اس سے ہی بات چیت کر لیتی، حیرت انگیز
 طور پر وہ اس کی تمام برائیاں کا منٹوں میں حل نکال دیا
 کرتا تھا۔ اگر بات مصطفیٰ کی ذات کے متعلق نہ ہوتی تو
 وہ ضرور اس کے امتحانات کے باوجود اسے سنا چکی ہوتی
 کہ وہ اماں کو سمجھائے، کیونکہ بی بی سے زیادہ اماں کا
 لاڈلا تھا۔

”ہیلو مس عائشہ! کن سوچوں میں گم ہیں؟“ اس
 نے چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اپنے خیالوں
 سے چونک کر اس نے سامنے بیٹھے سفر کو چونک کر
 دیکھا۔

”مس عائشہ! کیا آپ کہیں اٹکے ہیں؟“ اس
 سے ایک دو باتوں کے بعد جب سفر کو لگا کہ وہ اب
 جانے کے لیے پر تزلزل رہی ہے تو اس نے جلدی سے
 پوچھ لیا، جبکہ عائشہ نے ”نہیں“ کہتے ہوئے استفہامیہ
 نظروں سے اسے دیکھا۔

”اصل میں آپ مجھے پہلی نظر میں ہی لے حد اچھی
 لگی تھیں اور میں اپنے پیرنس کو آپ کے گھر بھیجنا
 چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنے مخصوص بے خوف انداز
 میں کہا، جبکہ عائشہ گھبرا کر گھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر
 دیکھا، جیسے کسی اور نے تو یہ بات نہیں سن لی، وہ اپنی
 ذات اور کردار کے حوالے سے بہت محتاط تھی۔

”میں سوچ کر جواب دوں گی۔“ کہہ کر اس نے اپنی

جبکہ اماں کے ساتھ بیماریاں چمٹی ہوئی ہیں۔ اس نے سوچا اتنے میں بی بی واپس آئیں۔ جلدی سے دہکتے انگاروں پر دو سوکھی لکڑیاں رکھ کر ایک دو پھونکیں ماریں۔ لکڑیوں نے آگ پکڑ لی تو انہوں نے توار رکھ دیا۔ ”تجھے اس لیے نہیں دیا کہ خالی پیٹ درد ہی نہ کرے۔ تھوڑی دیر بعد تازہ بھون دوں گی اپنی بچی کو۔“ بی بی اس کی خاموشی کو پتا نہیں کیا سمجھیں کہ پراٹھے کے لیے پیڑے کے بل بناتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”بی بی۔ ایک بات پوچھوں، سچ جو اب دیں گی۔“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں بھڑکتی آگ پر نظر جمائے پوچھا۔

”ہاں ہاں عائشہ پوچھو کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا۔“ بی بی۔ پراٹھے پر کٹھی لگا کر اسے چمٹے سے پلٹ کر لیں۔

ان کی ساری توجہ پراٹھے کی طرف تھی، کٹوری میں وہی۔ پلٹ میں سالن اس کے سامنے رکھا اور پراٹھا اتار کر چٹیلیر میں رکھ کر اس کے سامنے رکھا، خود تو اتار کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

”ہاں اب بتا تو کیا کہہ رہی تھی۔ چائے رکھوں تیرے لیے، ہم تو بہت دیر ہوئی بی چکے۔“ بی بی نے ایک ساتھ دو سوال کیے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ ایک دیہاتی طرز کا کھلا سا کچن تھا، جس میں درمیان میں مٹی کا بنا چولہا موجود تھا۔ شدید سردیوں میں تو سارا دن ہی چولہے میں بی بی یا اماں انگاروں کا اہتمام کیے رکھتیں، ارد گرد پلاسٹک کی دو چٹائیاں بچھا کر اہل خانہ حرارت کا مزہ لیتے ہوئے آگ کے ارد گرد ہی موجود رہتے۔ صرف یہاں نہیں تقریباً گھروں میں یہی طریقہ تھا، گیس ابھی یہاں نہیں پہنچی تھی۔ اہل علاقہ نے اپنی سہولت کے لیے گیس کے سلنڈر لے رکھے تھے، بوقت ضرورت استعمال کے لیے ورنہ عام طور پر لکڑیاں ہی استعمال کی جاتیں۔ ایک طرف لکڑی کے ریک میں ضرورت کا سامان اور برتن وغیرہ رکھے تھے۔

چونکہ کر تیزی سے چادر اور بیگ سنبھالتی نیچے اتر آئی۔

گھر آنے پر اس کی حیرت کی حد نہ رہی کہ مصطفیٰ اس سے پہلے ہی موجود تھا زندگی میں پہلی بار اس کے والہانہ گرم جوش سلام اور حال چال کا ویسا جواب نہ دے پائی جیسا کہ دیا کرتی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ پیپر کیسے ہوئے؟“
”اے ون جناب!“ وہ خوش دلی سے بولا تو عائشہ سے مسکرایا بھی نہ جاسکا۔

کچن سے اشتہا انگیز خوشبوئیں بتا رہی تھیں کہ دونوں خانہ داری میں باہر خواتین اپنی قابلیت کے سارے جوہر آزمایا رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی جانب چلی آئی۔

مصطفیٰ تھکا ہوا آیا تھا، سو جلد ہی سو گیا تھا۔ وہ بھی کھانا کھا کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ برزہن کسی ایک نقطے پر یکسو نہ پارا تھا۔ نو سے گیارہ کا ٹائم اس نے اپنے بڑھنے کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ کی بیشی وہ صبح نماز کے بعد پوری کرتی تھی، پروس بچ جانے کے باوجود کچھ خاص نہ پڑھ سکی تو دعاؤ کو آزاد چھوڑ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اگلے روز چونکہ چھٹی تھی، سو نماز پڑھ کر دوبارہ جو سوئی تو بارہ بجے کے قریب ہی اس کی آنکھ کھلی مٹی بھنے کی سوندھی خوشبو ناک سے لکرائی، باہر آنے پر بتا چلا کہ مصطفیٰ نے اماں کے کھیت سے کافی سارے مٹی کے بھٹے نکالے تھے، اب بی بی انہیں انگاروں پر بھون رہی تھیں۔ وہ وہیں کچن میں ہی چلی آئی۔

”آؤ عائشہ بہت دیر سوئیں۔“ بی بی نے شفقت سے کہا ساتھ ہی چمٹے سے بھٹوں کو الٹ پلٹ کرنے لگیں۔ ”تمہاری اماں اور مصطفیٰ تو لگے ہیں زمین کو سدھارنے اور فالٹو بٹیاں نکالنے میں۔ تم بیٹھو، میں مصطفیٰ کو یہ دے آؤں۔ پھر تمہیں ناشتا بنا کر دیتی ہوں۔“ بی بی نے خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھی عائشہ کو مخاطب کیا اور خود گرم گرم بھٹے اٹھا کر چلتی بنیں۔

اس عمر میں بھی بی بی کی صحت قابل رشک سے

نقطے کو جھٹکتے ہوئے یا دونوں کے خزانے سے ایک ایک کر کے راز کے موتی عائشہ کے ہاتھ پکڑانے لگیں اور وہ دم بخود بیٹھی غور سے سنتی چلی گئی۔



وہ خاور کے پیدلے رویتے کے بارے میں سوچ کر حیرت میں مبتلا تھی کہ اپنی اولاد کے ہونے کی خوش خبری پر خاور جیسے بندے کا رد عمل کتنا عجیب تھا۔ خاور نے آج دیر سے شہر جانا تھا۔ گاؤں میں اسے کسی سے ملنا تھا سو وہیں گیا ہوا تھا۔ خاور کا گھر گاؤں کی حدود میں تو تھا پر آبادی سے ذرا ہٹ کر سو گیتی آرا کسی سے واقف نہ تھی۔ ویسے بھی اسے آئے ابھی کچھ ماہ ہی ہوئے تھے اور اپنی نئی زندگی کو سیٹ کرنے پھر اماں کی وفات ان سب نے اسے کبھی ارد گرد جانے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

اماں کی وفات کے بعد ان کی میت بھی وہ اپنے آبائی گھر لے گئے تھے جہاں کے محلے دار اس کے رشتے داروں جیسے تھے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونے والے اماں کو دفن بھی وہیں کیا گیا تھا۔ ابھی اسے گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتی آرا نے دروازہ کھولا تو تیکھے اور جارحانہ تیور لیے ایک خوب صورت سی لڑکی اور اس سے کچھ بڑا خاور کی عمر کا ایک مرد اندر داخل ہو گئے۔ وہ ارے ارے کرتی رہ گئی۔

”کون ہیں آپ اور اس طرح اندر کیسے آ گئے۔“

”کیا خیال ہے ادا ریاض! اس کو بتا دوں کہ میں کون ہوں یا خاورے کو آنے دیں۔“ گیتی آرا کو مسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جس انداز میں اس آدمی سے کہا، گیتی آرا کا دل دھک سے رہ گیا۔

کچھ انجانے خدشوں نے گیتی آرا کے دل کو سما دیا۔ وہ چپ سی کھڑی رہ گئی۔

”ویسے تو نے کبھی سوچنا بھی گوارا نہیں کیا کہ تجھ سے آٹھ سال چھوٹے خوب صورت بھروسہ جو ان خاورے کو کیا پڑی تھی جو تجھ جیسی بچی عمر کی عورت کو

بی بی نے بیٹھے بیٹھے ہی کیتلی میں ایک کپ دو دوہ میں پتی اور ایک چمچہ چینی ڈال کر انگاروں پر اس کی چائے بننے کے لیے رکھ دی۔ پتا تھا کہ عائشہ کو پانی ملی چائے پسند نہیں۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نوالے توڑتی عائشہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئیں۔

”اماں کی اور میرے والد کی علیحدگی کیوں ہوئی؟ وہ کون تھے؟ کہاں ہیں؟ اماں اس بارے میں مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں؟“ ادھ کھایا ہوا ایک طرف رکھ کر اس نے لجاجت سے بی بی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ کچھ دیر بغور اسے دیکھتی رہیں۔

”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں عائشہ! جنہیں پوشیدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے جان لینے میں تکلیف تو ہوتی ہی ہے اور بھرم ٹوٹ جانے کا خدشہ الگ۔“ انہوں نے مبہم سی بات کی۔

”بی بی! نہ جاننے سے بھی تو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے تو کیوں نہ جان کر ہی تکلیف اٹھالی جائے۔“ دل و دماغ میں جو ابہام اور شکوک کی دیواریں ہیں وہ تو ٹوٹ جائیں گی نا۔“ اس نے اصرار کیا تو بی بی کچھ دیر چپ رہیں پھر بولیں۔

”میں تمہاری امی کی ہمسائی تھی ہمارے گھرانے کے کافی اچھے تعلقات تھے، تمہاری نانی اللہ بخشے بہت نیک عورت تھی۔ تمہارے نانا اور نانی نے تمہاری ماں کو بڑے شوق سے بڑھایا لکھایا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ تمہارے نانا کے گزر جانے کے بعد تمہاری نانی نے بڑی ہمت سے زندگی گزاری، میں تمہاری اماں کی چھ سات سال بڑی تھی، جب تمہاری ماں کی نوکری لگی تھی ان دنوں میں بیاہ کر شہر چلی گئی۔ تمہارے نانا اپنے رشتے کے کسی نتیجے سے تمہاری ماں کا رشتہ جوڑ گئے تھے۔ ان دنوں تمہاری ماں جیسے آڑی پھرتی تھی، متوقع تھا کہ جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جائے گی، پھر جب شادی کے پیغام کے بجائے انکار کا سندیہ آیا تو گیتی آرا ٹوٹ گئی، بچھ گئی۔“ بی بی غیر مرئی

صرف میں بنوں گی۔ تجھے خاور اب نہیں چھوڑنا چاہتا۔ تو اس کی خاطر تجھے اس گھر میں بھی برواشت کر لوں گی۔ پر اس بچے کا سلسلہ تجھے ختم ہو گا۔ تنہیں تو اپنا بوریا بستر اٹھا اور نکل یہاں سے۔ اس سفاک لڑکی نے پانچ منٹ میں ایسا زہر گیتی آرا کی سماعتوں میں اندیلا جو اس کی نس میں زہر بھر گیا۔

اسی پل دروازہ کھول کر خاور اندر داخل ہوا، پر سامنے کی صورت حال دیکھ کر ٹھنک گیا۔ چارپائی پر بیٹھا اس کا سالاریا ض۔ زمین پر فرعونیت کے سے تاثرات لیے اس کی سرچڑھی بیوی اور اس کے سامنے زمین پر لٹے نٹے انداز میں بیٹھی گیتی آرا۔

”کیا بات ہے گیتی؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے گیتی آرا کے پاس بچوں کے بل بیٹھتے ہوئے پوچھا، ساتھ ہی خشکیوں نگاہوں سے گھور کر تن کر کھڑی نازو سے سوال کیا۔

”خاور۔۔۔ کیا یہ عورت سچ کہہ رہی ہے؟“ لفظ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

”میں نے تجھے منع کیا تھا تا کہ تو ابھی یہاں مت آنا۔ کچھ مت کہنا۔“ غصے میں مڑ کر اس نے نازو سے کہا تو گیتی آرا جس کے دل میں ابھی بھی یقین کا اک سرا گڑا تھا۔ نکل کر دوڑ جاڑا۔ اس نے سخت اذیت کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔

”اکھو گیتی، میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔“

اس کا ہاتھ پکڑ کر خاور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

”میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی اب صرف

ایک بات بتا دو کہ یہ عورت سچ کہہ رہی ہے۔ یہ

تمہاری بیوی ہے اور تم نے مجھ سے شادی میری محبت

میں نہیں بلکہ میری جائیداد کی وجہ سے کی۔“ اس نے

اپنی آنکھیں پونچھ کر دو ٹوک انداز میں خاور سے پوچھا تو

وہ نظر چرا گیا۔ گیتی آرا کھڑی ہو گئی۔

”یہ سچ ہے گیتی، پر یقین کرو میں تمہیں چھوڑنا

نہیں چاہتا۔“

اس نے تیزی سے کہا۔ ”تم نے میرا سودا کیا تھا

خاور، پر میں نے تم سے محبت کی تھی اور اسی کے

صدقے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا۔ میرے

بیوی بنا کے لے آیا۔ الٹی سیدھی باتیں کر کے۔“ اس لڑکی کا اب کی بار کا وار زیادہ کاری تھا جو گیتی آرا کی آنکھیں ایک دم نمکین پانیوں سے بھر گئیں، پھر بھی اس نے خود پر قابو پایا اس لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

”تم لوگ جو کوئی بھی ہو۔ میرے گھر سے ابھی اور

اسی وقت نکل جاؤ۔“ اس کی بھرائی آواز پر وہ لڑکی تہمتہ

لگا کر ہنس پڑی، جبکہ وہ آدمی جسے اس لڑکی ادا ریاض کہہ

کر مخاطب کیا تھا۔ دھوپ میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر ان

کی باتیں سن رہا تھا۔

”تیرا گھر۔۔۔؟“ ہنستے ہنستے اس لڑکی کی آنکھوں میں

پانی آ گیا۔ ”اوبی بی۔ یہ میرا گھر ہے میرا۔ میں

خاور کے کی بیوی ہوں۔ اس کی چچا زاد اور اس کی

محبوب۔“ ایک دم ساتوں آسمان گیتی آرا کے سر پر گر

پڑے۔ اس نے سہارے کے لیے کسی چیز کو تھامنا چاہا،

پر کچھ نہ ملنے پر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

”تیری ماں اور میری سس (ساس) دور پرے کی

رشتے دار تھیں۔ میری خاور کے کی شادی کو چار ورے

(سال) گزر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں فضل نگر کسی شادی

میں خاور کے کو تیری ماں مل گئی اور اپنے گھر لے گئی۔

بے روزگاری اور غربت سے تنگ خاور کے کو جب

تیری ماں نے اپنی جائیداد کی تفصیل بتائی، ساتھ ہی

باتوں باتوں میں ذکر کر دیا کہ سب کچھ اس کی اک واک

بیٹی کا ہے اور وہ اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان

ہے تو خاور کے کا تو ذہن منصوبے بنانے کا بہت ماہر

ہے، اس نے تم ماں بیٹی کو شیشے میں اتارا اور تم لوگوں

سے شادی کی بات کر کے آ گیا۔ پھر اس نے مجھے سب

بتایا، پہلے مجھے اعتراض ہوا پھر اس نے مجھے کہا کہ وہ جلد

ہی تجھے چھوڑ دے گا۔

میں کچھ دنوں کے لیے اپنے بھاریا ض کے گھر چلی

گئی تھی۔ اب تیرا سب کچھ خاور کے کا ہے۔ اس نے

میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ سب کچھ مل جانے کے بعد

وہ تجھے چھوڑ دے گا، پر اب وہ تجھے چھوڑنے میں بہانے

بنا رہا ہے، کل اس نے مجھے بتایا کہ تو اس کے بچے کی

ماں بننے والی ہے۔ اس سے زیادہ برواشت کا حوصلہ

میرے اندر نہیں ہے۔ خاور کے کے بچے کی ماں

پیچھے آنے کی کوشش مت کرنا، میرا اب تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جیسے کھڑی تھی ویسے ہی کسی ریلوے کی طرح چلتی بیرونی دروازے کی طرف چل پڑی۔
 ”گیتی۔ گیتی آرا رکو۔“ اپنے پیچھے اس نے خاور کی آواز سنی۔

”بس کروے خاورے، بہت برداشت کر لیا میں نے تیرا اس عورت کی منت تر لے کرنا۔ کہاں جانا ہے اس نے۔ کون ہے اس کا۔ جانے دے خود ہی دھکے کھا کھو کے مڑ آئے گی۔“ خاور کی بیوی نازو نے خاور کا بازو پکڑ کر اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا۔

تو وہ کمزور مرد کھڑا اس کو دروازے کی چوکھٹ پار کرتے دکھاتا رہا۔ گیتی کے چہرے پر ایک بے مسکراہٹ آئی۔ دل میں اک موہوم سی خواہش تھی کہ وہ بازو سے پکڑ کر اسے زبردستی روک لے گا۔ اندر لے آئے گا۔ معافی مانگے گا، پر اس کی ساری خواہشیں ہوا ہو گئیں۔ گاؤں کی حدود سے باہر نکلنے سے اپنے ننگے سر کا احساس ہوا تو اس نے دوپٹا بھینچ کر پھیلایا اور ہلکا سا نقاب رک کے ذیلی سڑک تک آئی، یہاں سے ایک نیل گاڑی پر چڑھ کر پکی سڑک پر آئی اور دین میں بیٹھ کر اسے فصل نگر کا پتا بتایا۔ کرایہ مانگنے پر گیتی آرا نے پہلے خالی نظروں سے کنڈیکٹر کو دیکھا، پھر اپنی انگوٹھی اتار کر اسے دی۔ اس نے حیرت سے سامنے بیٹھی واحد سواری جو۔۔۔ عورت تھی کو دیکھا اور پھر اسے وہ واپس کر دی۔

”کوئی بات نہیں باجی۔ آپ یہ انگوٹھی رکھ لو۔“ مجبور سمجھ کر اس نے وہ انگوٹھی گیتی آرا کے حوالے کر دی۔

میں اس وقت بیوہ ہو کر ایک بیٹے کے ساتھ اپنے اماں ا۔ بے کے گھر تھی۔ اماں گزر گئی تھی، پر اب زندہ تھے، جب وہ لٹی پی سی گیتی آرا اپنے گھر واپس آئی، دیوار

سے دیوار ملی تھی ہماری۔ ا۔ بے نے اسے اپنے گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تو سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ یہاں آکر تیری ماں بے

ہوش ہو گئی تھی۔ دو دن تو اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ بی بی کی گلو گیر آواز اس کی سماعتوں میں جیسے کوئی گرم گرم سیدہ اندیل رہی تھی۔ پھر ابابھی گزر گیا تو تو پیدا ہوئی۔ تیری ماں میرے ساتھ پھر اپنے اسکول گئی، بر سرکاری نوکری ایسے کیسے دوبارہ مل سکتی ہے۔ چھوٹی بچی کا ساتھ تھا۔ میڈم جی ہمدرد اور خدا ترس عورت تھی مجھے کینٹین کا ٹھیکا دے دیا۔ درمیان کی دیوار گرا کر ہم دونوں نے تیرے گھر کو اپنی سہولت کے لیے ایک چھوٹے سے کھیت کی صورت دے دی۔ گیتی آرا نے بھاگ دوڑ کر کے اپنی پینشن جاری کروائی۔ ریشا منٹ سے ملنے والا پیسہ تو وہ تیرے باپ کے حوالے کر ہی چکی تھی۔ پھر چھ ماہ بعد اسے طلاق کے پلے کاغذ بھی مل گئے اسی پتے پر تو یہ قصہ بھی تمام ہوا۔

وہ دن اور آج کا دن گیتی آرا کے لیے خاور نام کا وہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اب اس کی کل کائنات تم ہو۔“

بی بی کی بات ختم ہوتے ہی عائشہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا کلیجہ اپنی ماں کے دکھ پر پھٹ رہا تھا۔
 ”اب مجھے پتا چلا کہ ہر بار ابا کے بارے میں پوچھنے پر اماں کی حالت غیر کیوں ہو جاتی تھی۔“



اسفر کی دنوں میں ہی حالت بدل گئی تھی، وہ جلد از جلد عائشہ کا جواب جاننے کو بے چین تھا، جو دو دن سے چھٹیوں پر تھی۔ عدل کو اس کے بارے میں سب کچھ پتا تھا، سو اس کی مدد کے خیال سے اس نے اپنی ماما مسز شیخ کے سیل فون سے عائشہ کا نمبر اسے لا کر دیا تھا، وہ بھی اس شرط پر کہ نہ تو مسز شیخ کو اس بات کا پتا چلے، نہ ہی عائشہ کو۔ اسفر نے فوراً وعدہ کر لیا اور پہلی فرصت میں ہی فون بھی کر دیا۔

”آپ کو احساس ہے کہ انتظار کا احساس کتنا جان

لیا ہوتا ہے۔ شاید نہیں ہے، ورنہ آپ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر غائب نہ ہوتیں۔“ اس کے لہجے میں ہزار شکوے تھے۔

”اسفر؟“ عائشہ کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔
 ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”دیکھ لیجئے جناب! ڈھونڈنے کی چاہ رکھتا ہوں تو انسان دنیا بھی کھنگال ڈالتا ہے، آپ تو پھر تھوڑا ہی دور تھیں۔“ اس نے کہا تو وہ چپ رہ گئی۔

”اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی تو اس لیے دو دن نہ تو کالج جاسکی ہوں نہ ہی مسز شیخ کے ہاں۔“ اس نے آہستگی سے بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا خیر تو بے نا اور ہاں کل آسکیں گی؟“ بے قراری سے پوچھے گئے دونوں سوال نہ جانے کیوں عائشہ کو ایک سرشاری میں مبتلا کر گئے۔

”صرف اتنا بتا دیں عائشہ کہ میں اپنے پیرٹس کو کب بھیجوں؟“ یقین کریں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایسا کون سا جادو کر دیا ہے آپ نے مجھ پر کہ نہ تو کسی کام اور بزنس میں دل لگتا ہے نہ گھر پر۔ میں جلد از جلد آپ کو اپنی لائف میں اپنے بہت قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں جو چاہت اور شدت تھی اس نے عائشہ کو جیسے مغرور سا کر ڈالا۔

اسفر نے اپنے ماں باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ ان کو اس کے بارے میں بتا چکا ہے اور وہ اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں جس نے ان کے بیٹے کو اس قدر بدل ڈالا ہے وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا اور عائشہ نے اسے یہ ہی بتایا کہ۔۔۔ ”اس کے والد حیات نہیں ہیں، صرف والدہ، ایک خالہ اور ایک کزن ہے۔ والد کے بارے میں جانتے ہوئے پتھروں کی سی سختی اس کے لہجے میں در آئی تھی۔

”میں گھر میں بات کر کے پھر آپ کو انفارم کر دوں گی، آپ کب اپنے پیرٹس کو لے کر آئیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا تو اسفر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

”اور۔۔۔ اور تم کب آؤ گی۔ میرا تم سے ملنے کو تمہیں دیکھنے کو بہت دل کر رہا ہے۔“ اس کے اس طرح کہنے پر عائشہ کی بولتی بند ہو گئی۔

”میں نے فی الحال دو ماہ کے لیے مسز شیخ سے

معذرت کرنی ہے، یہ عرصہ میں اپنی اسٹڈیز کو دینا چاہتی ہوں۔ ہاں کالج آؤں گی برلن۔ اسفر میں اس طرح کے ملنے کو پسند نہیں کرتی۔“ کچھ ہچکچا کر اس نے کہا تو کچھ لمحے کو اسفر چپ ہو گیا۔

”اچھا۔۔۔ فون پر بات تو ہو سکتی ہے نا۔۔۔ وہ بے تالی سے بولا تو عائشہ جو فوراً اسے منع کر دینا چاہتی تھی، نجانے کیوں نہ کر سکی۔

”ٹھیک ہے، مگر کبھی کبھار۔۔۔“
 ”اوقوہ یار! کیسی لڑکی ہو تم عائشہ۔ فون پر میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔“ اسفر جو نہ سننے کا کبھی عادی نہیں تھا، بگڑ گیا۔

”میں بہت چھوٹی عمر سے ہی باہر کی دنیا میں نکل کر سروا سٹو کر رہی ہوں اسفر۔ یہ میری ماں کی تربیت اور ان کا دیا گیا اعتماد ہے اور ایسا کوئی بھی کام جو ان کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائے، مجھے کرنا اچھا نہیں لگتا۔“ اب کے اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی اس کا دو ٹوک انداز سن کر کچھ نرم پڑ گیا۔

”میں بھی سوچ رہا تھا کہ عائشہ کو ضرور کوئی دوست مل گئی ہے جو اس نے مجھ سے کچھ شیئر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ مصطفیٰ پتا نہیں کب سے اسے سامنے سے دیکھ رہا تھا، جو فون بند کرتے ہی چھوٹی سی بازو پھلانگ کر اس کے پاس چلا آیا۔

”کیا شیئر نہیں کیا تم سے میں نے۔“ اس نے چونک کر پوچھا۔ ذہن میں یہ خیال فوراً آیا کہ اماں نے اس کے خیالات تو مصطفیٰ تک نہیں پہنچا دیے، پر اس کا جواب اسے مطمئن کر گیا۔

”آج کل چھٹی پر ہونے کے باوجود نہ کسی گیم میں حصہ لے رہی ہو، نہ باہر لے جانے کی ضد، چپ چپ سی عائشہ تو وہ عائشہ لگتی ہی نہیں۔“ ہر وقت تو بندہ ایک ہی موڈ میں نہیں رہ سکتا نا۔“ اس کے فلسفیانہ انداز پر وہ دھم سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”پھر فلسفہ۔ اس کا مطلب ہے کوئی الجھن سوار ہے محترمہ کے دماغ پر۔ بول چکلیں، بندہ حاضر ہے آپ کی سیشن دور کرنے کو۔“ وہ واقعی اس کا مزاج

شہناز تھا۔

”مصطفیٰ دہری زندگی کے سب سے بڑے اور اہم معاملے میں کبھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو تو تم میرا کتنا ساتھ دے پاؤ گے؟“

”اس۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہی ہو اور اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو، لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا عائشہ! کسی ایک معاملے میں تو کیا زندگی کے ہر معاملے میں، میں تمہارے ساتھ کسی اور کے تو کیا اپنے خلاف بھی جاسکتا ہوں۔ اب اگر تسلی ہو گئی ہو تو پوری بات بھی بتا دو کہ کیوں پریشان ہو؟“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بغور اس کو دیکھا تو عائشہ نے تشکر بھری نظروں سے اس کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”بتا دوں گی مصطفیٰ۔۔۔ صرف تمہیں ہی بتاؤں گی۔ کیا خیال ہے، ایک ٹیم کیرم کی نہ ہو جائے۔“ اس نے کہا تو مصطفیٰ بھی اس کا گریز محسوس کر کے صرف مسکرا کر اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

”چلو۔۔۔“ اور دونوں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

آگلے روز مصطفیٰ پھر شہر چلا گیا کہ اس نے ہاسٹل چھوڑنے سے پہلے کچھ معاملات نمٹائے تھے۔ یونیورسٹی میں ایک دو کام کرنے والے رہ گئے وہ نپٹانے تھے ایک آدھ ہفتہ لگ ہی جاتا تھا۔



اس روز بی بی محلے میں کسی کے گھر درس میں گئی تھیں۔ عائشہ کالج کے بعد سیدھی گھر آ جاتی تھی۔ اب بھی وہ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد اٹھی اور بی بی کی عدم موجودگی محسوس کرتے ہی اماں اور بی بی کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ پلنگ سے نیک لگائے اماں آنکھیں موندے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی اور لب مسلسل ہل رہے تھے۔ وہ بغیر کوئی چاپ پیداکے دھیرے سے آکر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

گیتی آر آنے آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا اور دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔ عائشہ کا اعتماد دم توڑنے لگا۔ لیکن اسفر کا مسلسل اصرار اسے بچے سے

بات کرنے کی ہمت دلا گیا۔

”اماں ایک بات کرنی تھی آپ سے۔“ دل کڑا کر کے اس نے کہا۔

”ہوں۔۔۔ کہو، میں سن رہی ہوں۔“ انہوں نے انداز میں تبدیلی لائے بغیر جواب دیا۔

”مسز شیخ کے جاننے والے لوگ ہیں۔ کافی ویل آف ہیں۔ ان کا بیٹا مسز شیخ کے بیٹے کا دوست ہے ایم بی اے کیا ہوا ہے، آج کل اپنے والد کا بزنس سنبھالتا ہے، تو وہ رشتے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بات مکمل کی اور ایک گہری سانس لی۔ بہر حال پہلا مرحلہ اماں سے بات کرنے کا تو اس نے سر کر ہی لیا تھا۔

”میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ تربیت اچھی ہو تو خون کا اثر بے اثر ہو جاتا ہے، پر میری سوچ غلط تھی۔ میری تربیت بارگئی، تم بھی اپنے باپ کی طرح نکلیں۔ محبت پر دولت کو ترجیح دینے والی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا عائشہ! ہر انسان کو اس کے نصیب کا لکھا ہر صورت اور حالت میں ملنا ہے، تمہاری قسمت میں جو کچھ ہے مصطفیٰ کے ساتھ کبھی تمہیں مل ہی جاتا۔ نہیں ہے تو اس ویل آف فیملی سے بھی نہیں ملے گا۔ انہیں بلاؤ، جب چاہو میری دعا میں تو شاید اثر ہی نہیں رہا، دعا کرنا کہ تمہارا نصیب بھی اپنی ماں جیسا نہ ہو۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی تھیں اور اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔

”اب جاؤ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کرتی جانا۔“ انہوں نے مزید کہا اور اپنی پہلی والی حالت میں چلی گئیں۔

نہ جانے کیوں عائشہ کو اماں کے اتنی جلدی مان لینے کی اتنی خوشی نہیں ہو رہی تھی، جتنی ہونی چاہیے تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور ایک نظر ان پر ڈالتی

دروازہ بند کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسی وقت اس نے اسفر کو مسیج کر دیا تھا کہ وہ جب چاہے اپنے والدین کو لے کر آسکتا ہے، لیکن آنے سے پہلے اطلاع ضرور کر دے۔

میں دیکھ کر خوش ہوئیں۔ دوسرے وہ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی سے بھی واقف تھیں، پتا نہیں کیوں، صرف عائشہ ہی انجان رہ گئی تھی یا جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ بہر حال انہوں نے عائشہ سے اس بابت کچھ نہیں کہا تھا۔

عائشہ جیسی رُ اعتماد لڑکی بھی بہت گھبرا رہی تھی، اس نے گھر کی صفائی تو کر لی تھی، تاہم کچن میں وہ دونوں ہی لگی رہی تھیں، عائشہ پتا نہیں کیوں آج دونوں سے آنکھیں نہ ملا پارہی تھی۔ سوائے کمرے تک ہی محدود رہی۔ کچھ دیر بعد ہچل پر اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو سامنے بیرونی دروازے سے ہی بی بی کے ہمراہ ایک بہت خوب صورت اور سوہری خاتون اندر آئی دکھائی دیں وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔



انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر گھر کی محلے سے تصدیق کی اور خود گاڑی سے اتر آئیں۔ ویسا ہی گھر تھا جیسا عام طور پر دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی کھلا سا آنگن، دائیں طرف پرچھوٹا سا سرسبز قطعہ کچھ پیڑ پودے اس کے ساتھ ہی ایک پکا کمرہ۔ سامنے کی طرف سے دوپٹے کمرے پائیں طرف لگا ہینڈ پمپ۔ اس سے ذرا آگے ہی دھوئیں سے سیاہ ہونا ایک باورچی خانہ تھا۔

ایک سادہ اور چہرے مہرے سے دیہاتی نظر آنے والی عورت نے ان کا اہمانہ استقبال کیا اور انہیں لے کر اس کمرے کی جانب بڑھیں۔ کمرے میں قالین بچھا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے علاوہ ایک کتابوں سے بھرا ہوا ریک، کھائی دیا۔ صوفے کے

سامنے جو میز پڑی تھی اس پر سجے گل وان میں تازہ گلابوں کا گلدستہ موجود تھا، تنقیدی نظر سے جائزہ لینے کے بعد جو پہلی سوچ ان کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اس گھر کی دیہاتی پس منظر رکھنے والی لڑکی سے آخر اس سفر کہاں ملا ہوگا۔

دفعتا "کمرے میں جو ہستی داخل ہوئی اسے دیکھ کر

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے کل ہی عائشہ کے گھر جانا ہے، ہر صورت اور ہاں کروا کے آئی ہے۔" وہ ماں کے کھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولا، جبکہ پیلا سامنے بیٹھے غصے سے اسے گھور رہے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا اور وہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح من مانی پہ اڑا ہوا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم لوگ رشتہ لے جانے کو تیار ہیں، لیکن اگر لڑکی ہمیں پسند نہ آئی تو پھر تمہیں ہماری مانتی پڑے گی۔" پیلا نے کہا تو وہ ان کی جانب مڑا۔

"جب ذہن میں یہ ہی سوچ لے کر جائیں گے کہ نہیں پسند کرنی تو کوئی کیسے پسند آسکتا ہے۔ پھر جب زندگی میری ہے تو پسند بھی تو میری ہونی چاہیے، آپ کو کیا اعتراض ہے۔" وہ بد تمیزی سے بولا، "تو پیلا ایک جتنائی نظر ہو ہی پڑا ال کر رہ گئے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے، کل ہمیں لے چلو تم۔" ممانے حتمی انداز میں کہا تو اس نے گریٹ ماما کہا اور ان کے گلے لگ گیا۔

"ٹھیک ہے، اس نے ماننا تو ویسے نہیں ہے، تم کل جا کر لڑکی دیکھ آؤ، پھر آگے دیکھتے ہیں کیا کریں؟" پیلا نے ماما سے کہا۔

"آپ نہیں چلیں گے؟" انہوں نے پوچھا۔ "نہیں۔ ابھی کوئی باضابطہ رشتہ تھوڑی طے کرنے جارے ہیں جو سب ہی اٹھ کر چل پڑیں۔ تم کل ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ، پھر دیکھیں گے۔" پیلا نے حتمی انداز میں بات حتم کی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس سفر نے بہت کہا کہ وہ ساتھ چلے گا، لیکن ممانے سمجھایا کہ پہلی بار شاید ان لوگوں کو لڑکے کا ساتھ آنا مناسب نہ لگے، لیکن میں پوری کوشش کروں گی کہ ان لوگوں سے ہاں کروا کے آؤں۔ انہوں نے نسلی دی تو وہ رک گیا۔

بی بی، گیتی آرا کے کہنے پر اسکول سے جلدی واپس آگئی تھیں۔ تاہم ان کا چہرہ بے حد اتر ہوا تھا۔ عائشہ کو بہت بچپن سے ہی وہ اپنے مصطفیٰ کی دلہن کے روپ

ان کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے یہ ہی حال سامنے کھڑی ہستی کا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔
 ”عائشہ تم دونوں میں سے کس کی بیٹی ہے؟“ تیز لہجے میں کیا گیا سوال گیتی آرا کو تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ کیوں کیا گیا ہے۔ پر بی بی فوراً بول اٹھیں۔
 ”کیوں؟ ہماری بیٹی ہے آپ بیٹھیں تو سہی۔“ انہوں نے بوکھلا کر جواب دیا تو گیتی آرا وقتی صدمے سے نکل کر دو قدم آگے بڑھ آئیں۔

”اس لیے بی بی کہ محترمہ! ایک بھائی کا اس کی بہن کے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔“ انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تو بی بی حق دق رہ گئیں۔ جبکہ باہر کھڑی عائشہ سن رہ گئی۔

”آج وقت نے تمہارے سامنے لاکھڑا کیا ہے، تو سن لو گیتی بیگم! اسفر میرے بھائی ریاض کا بیٹا ہے، جسے ہم نے گود لے لیا تھا اور تمہاری اس اولاد کے لیے تو میں نے اپنے گھر میں تمہارا وجود گوارا نہیں کیا، اب کیسے عمر بھر کے لیے اس کو اپنے سر پر مسلط کر لوں۔ اپنے ادا میں دکھانے والے گریبی کو بھی سکھا دے نا، گیتی تم نے جو میرا بیٹا تمہاری بیٹی کا نام لیتے تھیں تھکتا۔ پوچھنا ضرور کہ کہاں اس سے اتنی ملاقاتیں کیں کہ ماں باپ کے منہ کو ہی آگیا میرا قرباں بردار بیٹا۔ کہتا ہے جب لڑکی والے لڑکی خود راضی ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔“ وہ چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ اس عورت کی زبان اور انداز میں آج بھی اتنا ہی زہر تھا جتنا اٹھارہ سال پہلے، بس لب و لہجہ اور لباس بدل گیا تھا، کل ایک دہائی ان پڑھ نے اس کی روح کو نکلا تھا۔ آج ایک شہری فیشن ایبل امیر عورت نے ان کی تربیت پر انگلی اٹھا کر انہیں بے بس کر دیا تھا۔

باہر کھڑی عائشہ کو لگا کہ گرم انگارے کسی نے اس کی سماعتوں سے گزار کر دل پر گرا دیے ہوں۔ ”زبان کو لگام دیں اپنی اور فوراً“ سے پیشتر چلی جائیں آپ یہاں سے۔“ اذیت کے صحرا کو پار کرنے کے بعد وہ فوراً اندر آئی اور تمسخرانہ نظروں سے اپنی ساکت کھڑی ماں کو دیکھتی اس عورت کو مخاطب کیا۔

”آپ کی یہاں موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ سوالی بن کر آپ یہاں آئی تھیں، ہم نہیں اور مجھے آپ کے بیٹے سے شادی نہیں کرنی۔ آپ جیسی عورت کے گھر کا حصہ بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔“ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اونچی آواز میں اس عورت کو مخاطب کیا جو ہونہ کہہ کر چلتی بنی۔ عائشہ کے ہاتھ سے ماں کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ کھڑے قدم سے نیچے آگری تھیں۔ عائشہ اور بی بی فوراً ان کی طرف بھاگئیں۔

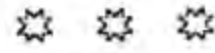


”واٹ۔۔۔ اسفر تو ان سے ساری صورت حال سن کر ششدر ہی رہ گیا۔“ آپ لوگ اتنے گھٹیا بھی ہو سکتے ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کل آپ دونوں نے مظلوم عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے اور آج جب قسمت نے کفارے کا ایک موقع دے ہی دیا تو بجائے اس کا حق اسے دینے کے آپ اس لڑکی کو دھتکار کر آگئیں۔ ماما اور بابا کل جو ظلم آپ نے جب رہ کر کیا، آج اس کا پورا انہیں تو کچھ تو ازالہ کر ہی سکتے ہیں۔“ اس نے کسی بت کی طرح جب بیٹھے پایا کو کہا تو وہ ایک زخمی نظر سے ناز کی طرف ڈال کر گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

”ہرگز نہیں، میں اس عورت کی بیٹی کو کبھی بہو نہیں بناؤں گی۔“ نازو جو آج نازیہ بیگم تھی، آج بھی خاور پر حاوی تھی۔ سر کو نفی میں ہلایا۔ ”تو پھر آپ کو اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا تو خاور تڑپ اٹھے۔
 ”اب تو میں اسے طلاق دے چکا ہوں نازو۔ اب

تمہیں کس بات کا ڈر ہے۔ انصاف سے سوچو تو مجھے تو اپنی بے اولادی کا سبب بھی گیتی کے ساتھ کیا گیا ظلم ہی لگتا ہے۔ وہ تین دکانیں، گیتی کی ریشاڑ منٹ سے ملنے والا پیسہ، اس کا زیور، یہ سب ہی تو تھا جس کو آگے بڑھا کر آج ہم ایک پلازہ کے مالک ہیں۔ اسفر ٹھیک کہہ رہا ہے کہ قدرت ہمیں تلافی کا ایک موقع دے رہی

ہے۔“ وہ شکستہ سے بولے تو نازیہ بیگم بھڑک اٹھیں۔
 ”آپ نے ایسا سوچا بھی تو میرا مرام نہ دیکھیں گے۔“
 کہہ کر اٹھ کر اندر چلی گئیں، خاور کو تنہا پچھتاوے اور
 احساس جرم کے سمندر میں دھکیل کر۔



ایک موت کی سی خاموشی تھی، جس نے ان سب
 کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ گیتی آرا ہوش میں آنے کے
 بعد کسی مورتی کی مانند ساکت اور چپ تھیں۔ عائشہ
 کارو رو کر اور معافیاں مانگ کر برا حال تھا۔
 ”مجھے معاف کر دیں اماں، ہر بار نہ چاہتے ہوئے
 بھی آپ کے لیے مصیبت اور دکھ کا سبب بن جاتی
 ہوں میں۔“

”جاؤ عائشہ! مجھے تنگ مت کرو۔“ کسی روٹ
 کے سے انداز میں ان کے منہ سے نکلا تو بی بی نے
 اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ ہچکیاں لیتی شکستگی کے
 احساس کے ساتھ وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

آج اس بات کو چوتھا روز تھا، گیتی آرا کی طبیعت
 کچھ بہتر تھی، بی بی انہیں باہر دھوپ میں لے آئیں۔
 دسمبر کی نرم اور گرم دھوپ بھلی لگ رہی تھی۔ عائشہ
 وہیں چارپائی پر آنکھوں پر بازو رکھے سو رہی تھی یا ویسے
 لیتی تھی۔

”دیکھو تو گیتی! تمہارے پیڑ اور پودے تمہارے بغیر
 اداں ہی ہو گئے تھے۔ میرا لمس انہیں اجنبی لگتا، ہر
 پودا ایسے لگتا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو ہماری مالکن کو بلاؤ۔“
 بی بی نے انہیں تخت پر بٹھایا اور گیتی آرا سے کہا تو
 پھیلی سی مسکراہٹ لبوں تک لے ہی آئیں۔
 دفعتاً دروازہ کھلنے پر جو عورت اندر آئی اسے دیکھ

کر گیتی آرا نے بی بی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، ان کا
 رنگ زرد پڑ گیا۔ کوئی نیا الزام کوئی اور دکھ کہ۔ ان
 کے ذہن میں ابھرا۔ عائشہ بھی آہٹ پر اٹھ بیٹھی۔
 نودارد کو دیکھ کر وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

”جی فرمائیے۔ اب کیا لینے آئی ہیں آپ، کوئی
 الزام رہ گیا تھا کیا؟“ وہ ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے

سامنے جا کھڑی ہوئی، تو وہ اس کو ہٹاتے ہوئے اماں کے
 پاس آگئیں۔
 ”گیتی۔ گیتی آرا۔ میری بہن! میرا بیٹا مر رہا
 ہے۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ عائشہ۔
 عائشہ کو میری بیٹی بناؤ۔ وہ مرجائے گا۔ میں اپنے
 سارے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں۔ تمہارا دل
 دکھانے کی معافی مانگتی ہوں۔ وہ۔ وہ مرجائے گا۔“ وہ
 سنگ دل عورت اس وقت نہ تو نازو تھی، نہ نازیہ بیگم
 اور نہ خاور کی بیگم۔ وہ صرف اسفر کی ماں تھی۔

”تو مرجائے ہماری بلا سے۔ آپ اور آپ کا بیٹا
 سونے کے بن کے آجا میں تب بھی ہماری طرف سے
 انکار ہے۔ ہمارا آپ کا کوئی لینا دینا نہیں۔ یہاں سے
 چلی جائیے اور برائے مہربانی آئندہ یہاں تشریف مت
 لائیں گے۔“ وہ لہجے میں کاٹ لیے بولی اور انگلی سے
 انہیں دروازے کا رخ دکھا دیا۔

نازیہ بیگم نے ماتحتی نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا،
 انہوں نے اپنی نظروں کا رخ دوسری طرف کر لیا، جبکہ
 گیتی آرا کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں پھڑپھڑا کر رہ
 گئے۔

”آپ جاتی ہیں یا میں آپ کو دھکے دے کر
 نکالوں۔“ عائشہ نے اپنا پورا زور لگا کر کہا کہ اس کی
 سانس پھول گئی۔ واپس جاتے ہوئے انکار کی دھول
 اس عورت کے ہر قدم سے پلٹتی چلی گئی۔



مسٹر خاور اینڈ مسز خاور۔

آپ لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں آپ کو
 ایسے کیوں مخاطب کر رہا ہوں، وہ اس لیے کہ ماں اور

پاپ دو ایسے مقدس لفظ ہیں جن کے قابل آپ کو جب
 تخلیق کرنے والے نے ہمیں سمجھا تو میں تو پھر اس کا
 حقیر سا بندہ ہوں۔ مالک کی مصلحتیں بھی دیر سے سمجھ
 میں آتی ہیں۔ میری بھی بہت دیر سے میں آیا کہ آپ کو
 بے اولاد کیوں رکھا گیا۔

عائشہ میرا زندگی میں دیکھا جانے والا پہلا خواب

تھی جسے آپ میاں بیوی کے اعمالوں کے سبب مجھے اپنی آنکھوں سے نوچنا پڑا۔ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ رہتے مجھے ڈر ہے کہ عذاب الہی کے اس قہر کی زد میں میں بھی نہ آجاؤں جو جلد ہی آپ پر ٹوٹنے والا ہے، میں اپنے حقیقی ماں باپ کے پاس سعودیہ عرب جا رہا ہوں، کبھی واپس نہ لوٹنے کے لیے۔

اسفر

خط ان کے ہاتھ میں پھر پھڑپھڑا رہا تھا اور وہ سفید چہرہ لیے دل پر ہاتھ رکھ کرینچے کرتے چلے گئے۔

”ویسے یار! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سچے دل سے مانگی جانے والی دعائیں اتنی جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔“ عائشہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھتے اور محسوس کرنے کے بعد وہ ایک جذب سے بولا۔ ”میں لگتا ہے کہ ایک حسین خواب دیکھ رہا ہوں جو جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔ کوئی یقین بھی دلائے حقیقت کا تو کیسے دلائے۔“ اس کی پلکوں کو انگلی سے چھو کر مصطفیٰ نے کہا تو عائشہ نے شرارت سے اسی انگلی کو پکڑ کر دانتوں سے کاٹ ڈالا۔

”اب آیا یقین۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ جبکہ مصطفیٰ سی کر کے برا سامنے بنا کر رہ گیا۔

”کیا ہے یار بیوی! کبھی تو رومانس کا موڈ دیر تک رہنے دیا کرو۔“ آج ان کی شادی کو آٹھواں روز تھا۔ بلدی نے مصطفیٰ کو فوراً ”بلوا کر ہی شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ ان کو جماندیدہ نظریں عائشہ کی شرمندگی بھانت چکی تھیں۔

پھر ایک دن مصطفیٰ نے کسی کال کے آنے کے بعد عائشہ اور گیتی آرا کو فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور ٹیکسی کروا کر دونوں کو شہر کے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے آیا۔ وہ دونوں پوچھتی ہی رہ گئیں پر خاور کے بیڈ کے پاس پہنچ کر ان دونوں کو چپ لگ گئی۔ نجیف و نزار ساوہ وجود ماضی کا خاور نہ تھا۔ گیتی آرا کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ تاہم عائشہ ویسے ہی سیاٹ چہرے لے کھڑی رہی۔ انہوں نے اشارے سے

اتھیں اپنے پاس بلایا اور آسجین ہاسک کو اشارے سے اتارنے کا کہا۔ نرس نے ڈاکٹر کے اشارے پر وہ اتار دیا تو انہوں نے معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ گیتی آرا نے روتے روتے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عائشہ کو بھی مصطفیٰ نے ان کے اشارے پر ذرا سا جھکایا تو انہوں نے اس کے سر پر اپنا کپکپا ہاتھ رکھا، ساتھ ہی لمحوں میں ان کی طبیعت بگڑ گئی اور کچھ ہی دیر بعد ان کا جسم ساکت ہو گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد عائشہ کو بھاری رجسٹری کے ساتھ ایک خط موصول ہوا، جس میں ان کے پلازہ کی ملکیت کے کاغذات موجود تھے۔ اس نے یہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔

عائشہ میری پیاری سی بیٹی! دنیا کی وہ پیاری سی نعمت جس کے لیے میں تڑپتا رہا، پر اظہار نہ کر سکا۔ ساری عمر جو تم نے باپ کے ہوتے ہوئے محرومی میں گزاری، اس پر تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میری بہن نازو کی بھابھی یعنی اسفر کی ماں بھی اور نازو کا ہمیشہ ڈراوا کہہ اگر گیتی یا اس کی اولاد سے تعلق رکھا تو وہ اس کو طلاق دلوادے گی۔ اس ڈر نے مجھے چاہتے ہوئے بھی کبھی تمہارے پاس نہ آنے دیا۔

تمہیں خود سے محروم رکھا تو اللہ نے مجھے بھی محرومی کی سزا دی۔ تم سے معافی کی گزارش بھی نہیں کہ یہ میری سزا ہے اور مجھے بھگتنی ہے۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے معاف کر دے۔ اس عورت سے تو میں نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں۔ تمہارا حق تمہیں دینے کی کوشش کی ہے قبول کرنا۔ ہو سکتا ہے اس چھوٹے سے عمل سے میری سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے۔

تمہارا بد نصیب باپ۔
نم آنکھوں کے ساتھ اس نے کاغذ یہ کیا اور دراز میں رکھ دیا۔ اماں نے کہا تھا جو تمہارا نصیب ہے وہ تمہیں مصطفیٰ کے ساتھ بھی ضرور ملے گا اور بیٹوں کی باتیں یقیناً حکمت اور دانائی رکھتی ہیں۔ بس چھوٹے ہی اپنی نادانی میں ان کا فہم نہیں رکھتے۔

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابتداء شجاع فروری 2017 214



شہر زاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میرپور میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بے ہوئے تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی



پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نیرہ کولنگائی بھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انیس پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

طوبی کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرورویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔
ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوادیا تھا۔ رومیصد چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکیٹل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خود کسی کی دھمکی دے کر شہزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبی اور در شہوار غلطی سے برابر اے لے گھر میں داخل ہو گئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محترم علی کا بیٹا وہاں شادی شدہ ہے، لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصد نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبی محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

ٹینا بیگم، شہزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گھر کے کلمے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شوہر ہارون رضایتا ہے کہ رومیصد نے پھر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ تیب دکھاتے ہیں تو ٹینا بیگم کا سر گھوم جاتا ہے۔

دوسری قسط



Downloaded From
Paksociety.com

بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گھن میں دیوتاؤں کا سا غضب تھا۔ لگتا تھا موسلا دھار بارش آج اپنے ساتھ ہر چیز کو ہی بہا کر لے جائے گی۔ شہر زاد کے دل نے شدت سے تمنائی کہ یہ طوفان اپنے ساتھ اس ساری دولت اور رسوائی کو بھی بہا کر لے جائے جو اس کے خاندان کا مقدر بننے والی تھی۔

وہ سر اٹھائے شیشے کی دیوار کے پار بارش شور مچاتے درختوں اور جھومتی ہوئی شاخوں کو دیکھ رہی تھی اس کی نگاہیں باہر کے مناظر پر اور ذہن کہیں اور اڑا نکا ہوا تھا۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

کمرے میں موت کا سانسنا تھا۔ ہر طرف خوف کے نا دیدہ سائے رقصاں تھے۔ شہر زاد اور ٹینا بیگم کے وجود کو آنے والے لحوں کا خوف کسی دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ دونوں کبھی بے چین انداز سے شملنے لگتیں اور کبھی سر تھام کر صوفے پر بیٹھ جاتیں۔

دیوار گیر گھڑی کی ٹنگ ٹنگ ان کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی، شام کے سات بجنے والے تھے اور رومی کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ عموماً اس کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ زیادہ تر گھر میں ہی پائی جاتی تھی اور آج تو اس نے اپنا سیل فون بھی بند کر رکھا تھا۔

”کہاں رہ گئی ہے وہ؟“ شہر زاد بے چین ہوئی۔
”کس بیٹھ کر پھر کوئی اور نیا بے ہودہ کارنامہ سر انجام دے رہی ہوگی۔“ ٹینا بیگم کا تلخ لہجہ اس کی کنپٹیوں میں گرم سیال مادہ دوڑا گیا۔

”میں سمجھاؤں گی اسے۔“ انہیں رومی کے متعلق ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔
اسی وقت ٹینا بیگم کے سیل فون کی مترنم گھنٹی بجی وہ دونوں خوف سے ایسے اچھلے جیسے کمرے میں کسی نے بم کی موجودگی کی اطلاع دے دی ہو۔

”ہیلو۔“ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی مرے مرے انداز میں کال اینڈ کی۔
”ٹینا کہاں ہو تم؟ دو سری جانب مسز افتخار کے بے چین انداز پر ان کا دم بری طرح دھڑکا۔
”یہیں ہوں خیریت۔“ انہوں نے روانہ محتاط انداز اپنایا۔

”سماول تو بہت ہی عجیب بات بتا رہی ہے مجھے رومی کے متعلق سوچ پوچھو مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ ونیا کا منہ کھل چکا تھا اور مسز افتخار کی کال اس بات کا پہلا ثبوت تھی۔ ان کی بیٹی سماول رومی کے کلاس فیلو تھی اور دونوں گھرانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔

”کیا۔“ ازیت سے ٹینا بیگم کا چہرہ تاریک ہوا اس کا مطلب تھا کہ یہ بات ان کے حلقہ احباب میں پھیل چکی تھی۔
”کیا تمہیں نہیں پتا۔؟“ دو سری طرف وہ حیران ہوئیں۔
”نہیں۔“ انہوں نے بری طرح دھڑکتے دل پر قابو پا کر بمشکل کہا۔

”یہی کہ رومی نے فیس بک پر ”رومی سہگل“ کے نام سے کوئی بیج بنایا ہے اور۔“ وہ ہلکا سا جھجک کر رکھیں۔

”اوہ اچھا مجھے علم نہیں۔ کیا ہوا؟“ وہ صاف مکر گئیں۔
”تمہیں فوراً دیکھنا چاہیے ٹینا وہ تو لگتا ہے اس لڑکی سے بہت انسہار ہے کیا نام تھا اس کا بھلا سا جس کا اس کے بھائیوں نے مڑور کر دیا تھا وہ جو سوشل میڈیا کو مین بنی رہی تھی بہت عرصے۔“ مسز افتخار جس کا نام لینا چاہ رہی تھیں ٹینا بیگم جانتے ہوئے بھی وہ نام اپنے لبوں پر لانا نہیں چاہتی تھیں۔

”اوکے میں دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کرنی چاہی۔

”تمہیں لازمی دیکھنا چاہیے، سہگل فیملی کا ایک نام ہے شہر میں، رومی کی اس حرکت سے بہت برا امپریشن جائے گا۔“ مسز افتخار نے اس واقعہ کھل کر کہا۔

”تمہیں بتا تو ہے، وہ ہمیشہ سے پرائیم چائلڈن رہی ہے میرے لیے، اتنا کی ضدی ہے۔“ وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئیں۔

”اپنی ہاؤس وہ اگر شوپز میں آنا چاہتی ہے تو اس کو کسی اچھے پراجیکٹ کے ذریعے لالچ کرو، تمہارے لیے تو یہ پائیں ہاتھ کا کام ہے، لیکن اس طرح کی بولڈ ویڈیوز کے ذریعے دوسروں کی توجہ حاصل کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں اور ویسے بھی شہر میں تمہارا ایک نام ہے، بلکہ تم تو ایک برینڈ نیم بن چکی ہو۔“

ان کی بات سن کر ٹینا بیگم کو یوں لگا جیسے کسی نے ان کے وجود میں چنگاریاں بھری ہوں۔

”جی جی مسز افتخار۔ دیکھتی ہوں، کیا معاملہ ہے، اس وقت ایک ضروری میٹنگ کے لیے نکلنا ہے مجھے، کل کلب میں ملاقات ہوگی۔“ انہوں نے بمشکل جان چھڑا کر فون بند کیا، لیکن ان کا دھواں دھواں چہرہ شہزاد کو ساری ان کہی کہانیاں سنا گیا تھا۔

”نام کیا ہوا۔؟“ وہ فوراً اٹھ کر ان کے قریب آن بیٹھی۔

”مائی گاڈ۔ کیسے فیس کروں گی میں دنیا کو۔؟“ اسے لگا جیسے وہ ابھی اپنے بال نوچنے لگیں گی۔

”ٹیک اسٹ ایزی مام۔“ شہزاد ان کے منہ پر ہاتھوں کو اپنے نرم گداز ہاتھوں میں لے کر سسلانے لگی۔

”اس قدر ڈی گریڈ کر لے گی وہ خود کو، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ ٹینا بیگم کے لبوں سے ایک سلتی ہوئی سانس نکل کر دم توڑ گئی۔

”میں نے کہا تھا نا اسے کسی سائیکالرسٹ کی ضرورت ہے۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”اور مجھے لگتا ہے اب اس سے زیادہ مجھے ضرورت ہے، دفاع چھما دیا ہے میرا اللہ جانے کس گناہ کی سزا ہے۔“

شہزاد کو بے ساختہ ان پر رحم آیا۔

”باپ تو مر گیا اس کا اور عذاب ڈال گیا میرے سر پر۔“ وہ سر پکڑے ایک دفعہ پھریشے کی دیوار کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

”لیکن مام اب طریقے سے ہینڈل کرنا ہو گا۔“

”ایسا ہینڈل کروں گی کہ یاد رکھے گی ساری زندگی۔“ وہ تلخ لہجے میں مزید گویا ہوئیں۔ ”میری وی گئی ڈھیل کا ہی نتیجہ ہے یہ سب، جی چاہتا ہے نا تمہیں توڑ کر بستر ڈال دوں اسے، تاکہ ایسی حرکتیں کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔“

”مام پلیز۔“ ان کے لہجے سے پھلکتی سفاکی شہزاد کو ہلا گئی۔

اسی وقت ٹینا ہاؤس کے گیٹ پر رومی کی گاڑی کا ہارن تیز آواز میں بجا اور بچتا ہی چلا گیا، اس کی پارہ صفت طبیعت کسی کام میں تاخیر پروا نہ تھی۔ چوکیدار نے بڑی مستعدی سے گیٹ کھولا اور رومی کی ہینڈا سوک میزائل کی طرح اڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بڑی قوت سے بریک لگایا اور فضاؤں میں ٹائروں کے چرچرانے کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔

”لو کی چچی۔“ ٹینا بیگم غصے میں وہ سارے آداب بھول جاتی تھیں جو وہ اکثر ویڈیو شہزاد کو یاد کروانے کی کوشش کرتی تھیں۔

”مام پلیز ڈونٹ لوز یور ٹیمپو۔“ شہزاد کی سرگوشی ابھری۔

”شٹ اپ۔“ وہ اسی پر برس پڑیں۔ ”وہاں خراب کر کے رکھ دیا ہے اس پائل لڑکی نے میرا اور تم کہہ رہی ہو میں نارمل رہوں ہاؤ ازاں پائبل؟“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئیں۔

”چویشن مزید خراب ہو جائے گی۔“ وہ حتی الامکان انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سواٹ؟“ ان کے لہجے میں بیزاری در آئی۔

لاؤنج کا دروازہ کھلا، رومی اندر داخل ہوئی، ایک لمحے کو تو دونوں کو لگا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ متورم آنکھیں، ملبھی۔ شرٹ کے ساتھ اس نے کئی دن پرانی جینز پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں قیمتی غیر ملکی برانڈ کا سگریٹ تھا۔

شہزاد کو اس کا حلیہ دیکھ کر دھچکا لگا جبکہ ٹینا بیگم کا دل چاہا کہ اسے رومی کی طرح دھنک کر رکھ دیں۔ اس نے سوئی سوئی آنکھوں سے اپنی ماں اور بہن کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی کی چین سامنے صوفے پر اچھال دی۔ ٹینا بیگم کے تو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”کہاں سے آرہی ہو؟“ ان کا لہجہ درشت اور جھنجھلا یا ہوا تھا۔

”جہنم سے۔“ اس نے ایک گراٹش لے کر حواں بد تمیزی سے ٹینا بیگم کے چہرے پر پھینکا۔

”شٹ اپ۔“ وہ اتنی زور سے دھاڑیں کہ ایک دفعہ تو شہزاد کا دل بھی دہل گیا۔ جب کہ رومی بے خوفی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے اس طرح شواٹ کر کے آپ دالیس گی؟“ اس کا انداز سراسر چڑانے والا تھا۔

”جو اس بند کرو اپنی۔“ غصے کی شدت ان کے پورے جسم کو جھلسا رہی تھی۔

”چچ چچ۔“ ایسے غصہ کریں گی تو وقت سے پہلے بوڑھی ہو جائیں گی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور ٹینا بیگم کی ضبط کی طنائیں ٹوٹ گئیں۔ وہ تیرکی طرح رومی کی طرف بڑھیں اور ایک زوردار پھٹر گھما کر اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ شہزاد نے خوف زدہ انداز سے اپنا ہاتھ لبوں پر رکھ لیا۔

جب کہ رومی پر اس پھٹر کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طنطنے کے ساتھ انہیں نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے پھٹر اس کے نہیں سامنے والی دیوار پر مارا گیا ہو، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔

”بس۔ یا کچھ اور۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”تم۔“ ان کے لب خفیف سے کانے اور لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

”کوئی حسرت رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر لیں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ٹینا بیگم کو ایک دم یوں لگا جیسے کسی نے ان پر سرد پانی اندیل دیا ہو۔ وہ سن ہو کر رہ گئیں۔ ان کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات اور پتچھے ہوئے لبوں کو دیکھ کر رومی کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔“ وہ پورا زور لگا کر صدے بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔

”میری مرضی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں اس طرح بولی کہ شہزاد کو اس پر سرد خانے میں رکھی کسی بے جان اور بے حس و حرکت لاش کا گمان ہوا، وہ اسے ہلکے جھکے بغیر دیکھنے لگیں۔

”تم شوہر میں آنا چاہتی ہو تو مجھے بتاؤ، میں تمہیں اچھے اور باوقار طریقے سے کسی مووی یا سیریل میں لے آؤں گی۔“ انہوں نے اسے لالچ دیا۔

”یہ باوقار طریقہ کیا ہوتا ہے۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں تہقہ لگایا۔

”کم از کم وہ نہیں ہوتا، جو تم اپنی ولکر ویڈیوز کے ذریعے دکھانا چاہتی ہو دنیا کو۔“ وہ خود پر قابو پا کر دانستہ تحمل بھرے انداز میں بولیں، اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں اور لہجے سے چھلکتی بغاوت کو غصے کی چھٹری سے قابو نہیں کیا جاسکتا۔

”فرق کیا ہے، اما وہی حرکتیں آپ اپنے سوشل سرکل میں کرتی ہیں، جو میں نے ساری دنیا کے سامنے کر دیں، میں آپ کی طرح ڈبل اسٹینڈرڈ لائف نہیں گزار سکتی، مجھے جو اچھا لگے گا وہی کروں گی، اگر زیادہ پر اہم ہے آپ کو تو تادیں، میں یہ گھر چھوڑ دیتی ہوں۔“

یٹنا بیگم نے ایک دفعہ پھر خود کو ضبط کے پل صراط سے گزارا، لیکن شہزاد کے اعصاب آج جواب دے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ اس نے رومیہ کی گاڑی کی چابی صوفے سے اٹھائی اور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کا بہت اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے تم نے، کیپ اٹ اپ۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولتی ہوئی ملامت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر لاؤنج سے نکل گئی۔ رومیہ بری طرح سے گڑبڑا گئی۔ اسے شہزاد سے اس رد عمل کی ہرگز توقع نہیں تھی۔



نیلا آسمان، سرمئی بادلوں کی اما جگاہ بنا ہوا تھا۔ مغرب سے آنے والی سیاہ گھٹاؤں کو ایک دم ہی جوش آیا اور کالی سیاہ بولیاں کھل کر برسنے لگیں۔ بارش کی جلت رنگ، مری کی فضاؤں میں کانٹوں میں رس گھولتی موسیقی کی صورت محسوس ہو رہی تھی۔

ہادی اور سعد موسم کی دل فریبی سے لطف اٹھانے کے بجائے پچھلے ایک گھنٹے سے ایک راجیکٹ پر مغز ماری کرنے میں مصروف تھے۔ سعد کی انگلیاں لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر بڑی سرعت سے چل رہی تھیں اور محمد ہادی اپنی ڈائری پر کچھ نوٹس اتارنے میں مصروف تھا۔

”گھوڑے جیسی چال، ہاتھی جیسی دم۔“ میر ہاؤس کی جانب سے ایک دم میوزک بجا، اور دونوں نے کوفت بھرے انداز میں بے ساختہ کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

”یار روتھو بند کرو۔ لگ رہا ہے کسی سنی پلیکس سینما میں بیٹھے ہیں۔“ ہادی کے چہرے سے بے زاری ہٹکی سعد نے فوراً اٹھ کر کھڑکیاں بند کیں، لیکن دوسری طرف سے ساؤنڈ سسٹم کی آواز فل کر دی گئی تھی۔

”واٹ دا ہیل ہار۔“ محمد ہادی نے ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ پاس رکھی ڈائری پر پٹخا۔ گانے کے بول اس کے اعصاب پر کسی چابک کی طرح برس رہے تھے اور اس سے بھی زیادہ جنجیلا ہٹا سے اس وقت ہوئی جب ایک ہی گانا دوسری سے تیسری دفعہ پھر فضاؤں میں گونجنے لگا۔

گھوڑے جیسی چال، ہاتھی جیسی دم
اوساون راجا، کہاں سے آئے تم؟

چک دھم دھم۔ چک دھم دھم۔

”یار، کیا مصیبت ہے۔“ ہادی نے جنجیلا کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”لگتا ہے ان آفتوں نے پھر لان پر یلغار کر دی ہے۔“ سعد کونہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”چک دھم دھم، چک دھم دھم۔“ گانے کے بولوں نے ہادی کا دل غمزید خراب کیا۔

”تم مانو نہ مانو، چوٹھی دفعہ ایک ہی گانا لگانے کے پیچھے ان لڑکیوں کی کوئی نہ کوئی شرارت ہے۔“ سعد نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”یہ شرارت نہیں، خباثت ہے اس گینگ کی، قسم سے ایک سے بڑھ کر ایک، چھپھوری لڑکیوں سے بھرا ہوا ہے میرا ہاؤس۔“ محمد ہادی ضرورت سے زیادہ ہی تپا ہوا تھا لڑکیوں کی اس فوج پر۔

”اس نثار خانے میں کام تو ہونا نہیں، ذرا دیکھیں تو سہی، آخر کس ساون راجا کو بلا رہی ہیں میراؤس کی شہزادیاں۔“ سعد منہ ہونے اٹھا اور کھڑکیوں کے پردے پیچھے سرکائے۔

”یہاں تو باقاعدہ فلم کا شوٹ چل رہا ہے، ذرا آکر دیکھو۔“ سعد منہ پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار ہنسا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں۔“ اس نے اٹھ کر الیکٹرک کھیل جلائی، گرین لی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔

”کم آن یا۔“ سعد نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کھڑکی کے پاس کھیٹا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ میراؤس کی لڑکیوں کو کشمیر پوائنٹ پر کھڑا کر کے زور سے نیچے دھکا دے دے، تاکہ وہ ساری لولی لنگڑی ہو کر اپنے کمروں تک محدود ہو جائیں۔

در شہوار اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلائے، آسمان کی برستی بوندوں کے نیچے گول گول دائرے میں گھومتی ہوئی خود کو کسی ہیروئن سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ بارش کے قطرے ایک تو اتر کے ساتھ اس کے شفاف چہرے پر سفید موتیوں کی صورت میں برس رہے تھے۔ اس کی کزن طوبی اپنے سیل فون کے ذریعے اس کی ویڈیو بنا رہی تھی اور میمو چھتری کھولے، ایک اسٹول پر بیٹھی تھی اور برآمدے میں چھوٹی میز پر ساؤنڈ سسٹم رکھا ہوا تھا، نضاؤں میں بلند آواز میں بجنے والے گانے کو گویا اس ویڈیو میں بس منظر کی موسیقی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

کوئی لڑکی ہے، جب وہ ہنستی ہے۔
بارش ہوتی ہے، چھٹک چھٹک چھم چھم۔

”کیا چیزیں ہیں یہ۔۔۔“ محمد ہادی کی شریانوں میں خون کھولنے لگا۔
”قل نام انثر نمنا۔“ سعد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”اور ان کے دادا کے بکواسی بیانات سنا کرو۔ ٹی وی پر جیسے شرافت اور عزت کے سارے پیمانے ان کے خاندان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو جاتے ہوں۔“ محمد ہادی جل کر بولا۔

”خیر ایسا بھی کوئی حاجیوں کا خاندان نہیں، میرا خاقان کی عشق و عاشقی کی داستانیں اکثر ہی میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایمرٹس ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس کی زلفوں کے اسیر ہو گئے تھے موصوف۔“ سعد نے اسے تازہ ترین معلومات سے آگاہ کیا۔

”تہ ایف 16 ان کی کیا لگتی ہے؟“ ہادی نے بے زاری سے در شہوار کی طرف اشارہ کیا، جو اس وقت اپنا سیاہ رنگ کا گھیر دار فرائگ لہرا کر خود کو مادھوری ڈکٹ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوڑی کا زور لگا رہی تھی۔

”اللہ ہی جانتا ہے یا۔۔۔“ سعد نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔ دوسری طرف میمو نے اٹھ کر گانے کی آواز مزید بلند کر دی۔

کوئی لڑکا ہے، جب وہ گاتا ہے۔
ساون آتا ہے، گھم گھم گھم گھم۔

چک دھوم دھوم، چک دھوم دھوم۔

نیچے لان میں در شہوار کی پرفارمنس میں تیزی آگئی۔ وہ سب آج واجی اور میر مختشم کے ملتان جانے کی خوشی میں پچھلے لان میں جشن منا رہی تھیں۔ اس وقت گھر میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا، اس لیے راوی چین، ہی چین لکھ رہا تھا۔

”دل تو کر رہا ہے ویڈیو بنا کر اس کے دادا حضور کو واٹس ایپ کر دوں۔“ سعد کو شرارت سو جھی اور اس نے واقعی

کیسرو آن کر لیا۔

”لیواٹ یار اچھی بات نہیں ہے یہ۔“ ہادی کو برا لگا۔

”بے فکر رہو، نہیں بھجواتا انہیں، اب میرے کون سے والی وارث تمہارے پیرٹس جیسے ٹھکڑی پوشش پر بیٹھے ہیں، جو ان سے بغیر سوچے سمجھے پننگ لے لوں۔“ وہ بادو؛ کے منع کرنے کے باوجود ڈیوینا نے لگا جب کہ ہادی اکتا کر گرین لی بنانے لگا۔

سعد کی بد قسمتی کہ گینگ ہیڈ در شہوار کی اس پر نظر پڑ گئی۔ جس کی نظروں سے ہی سکس یا سکس تھی، سونے پہ ساگہ وہ سعد کے ہاتھ میں سیل فون بھی دیکھ چکی تھی۔

”شیم آن یو۔“ وہ نیچے سے چینی تو سعد کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

”مارے گئے یا۔“ سعد اس کے دھمکی آمیز لہجے پر بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔

”ان کی تو ایسی کی تیسی میں کر کے آتی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ طوبی اور نیروا سے منع کرتیں، اس نے کسی چھلاوے کی طرح مشترکہ منڈیر عبور کی اور کسی میزائل کی طرح اثرتی ہوئی ہادی کے سٹنگ روم تک پہنچ گئی۔

”شرافت سے وہ سیل فون دیں مجھے، جس میں تصویریں یا ویڈیو بنا رہے تھے ہماری۔“ وہ کہہ رہا تھا رکھے کیونکہ توڑ لگا ہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی، جو اس وقت لاؤنج کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو کال سن رہا تھا وہاں کھڑے ہو کر۔“ سعد فوراً مکر گیا۔

”شرم آئی چاہیے آپ لوگوں کو، شریف گھرانوں میں مانگ جھانک کرتے ہوئے۔“ اس کا ٹیلا سا جملہ سن کر ہادی کا دماغ گھوم گیا۔

”محترمہ! شریف گھرانے کی لڑکیاں کھلے آسمان کے نیچے فل میوزک کے ساتھ پرفارمنس نہیں دیتیں۔“ ہادی کون سا کسی سے کم تھا۔

بے تحاشا غصہ، ضبط، اشتعال اور غصہ پینے کی کوشش میں در شہوار کی آنکھوں میں لاوا اتر آیا۔ ”ہم اپنے گھر میں اچھلیں گودیں، ٹاپس، گائیں، آپ سے مطلب۔؟“ وہ بے باکی سے گویا ہوئی۔

”اور ہم بھی اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑے ہوں یا ٹیرس پر، آپ سے مطلب۔؟“ ہادی سیڑھیاں اتر کر بالکل اس کے مد مقابل آن کھڑا ہوا۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہیے گا، یہ مانگ جھانک مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔“ اس کے دھمکی آمیز انداز پر ہادی کے کان کی لو میں سرخ ہوئیں۔

”محترمہ، یہ دھمکیاں کسی اور کو جا کر دیتے ہیں، ہمارا ٹائم ویسٹ مت کریں، باہر کا راستہ سامنے ہے۔“ ہادی کا سرد انداز در شہوار کو سلگا گیا۔

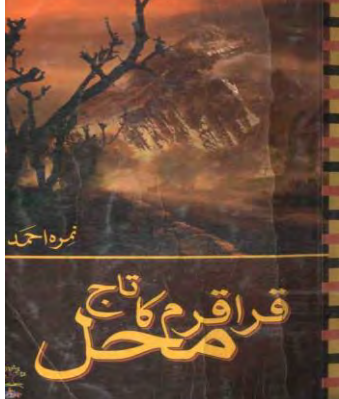
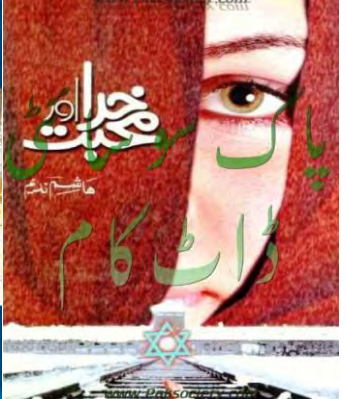
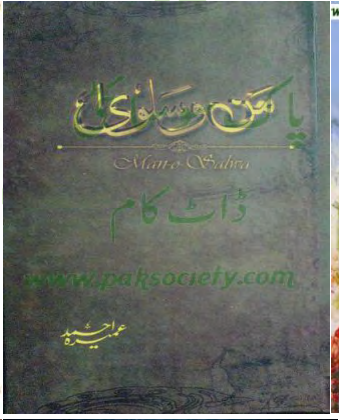
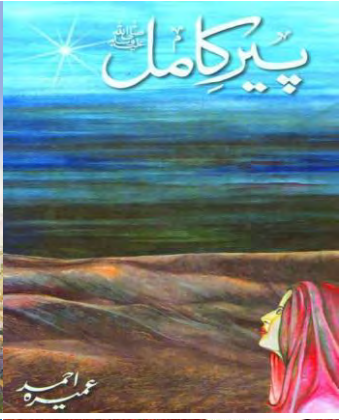
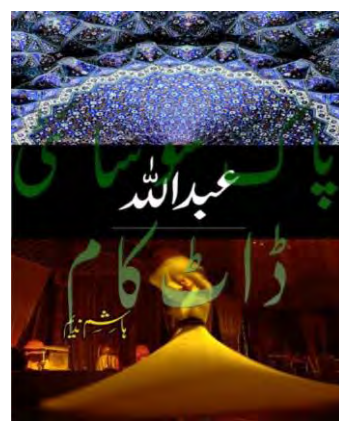
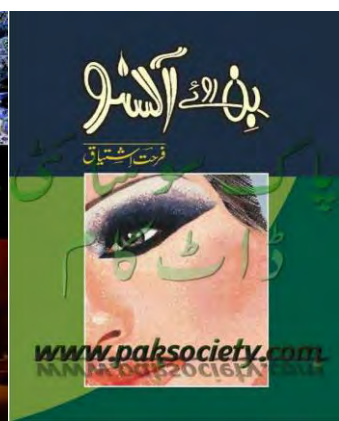
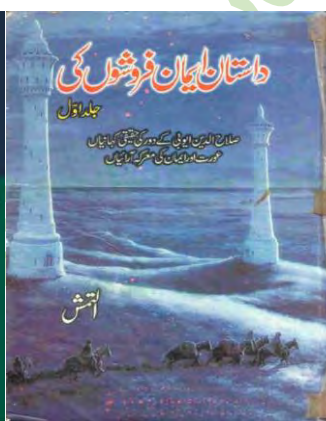
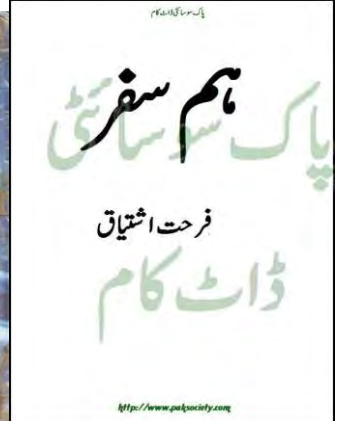
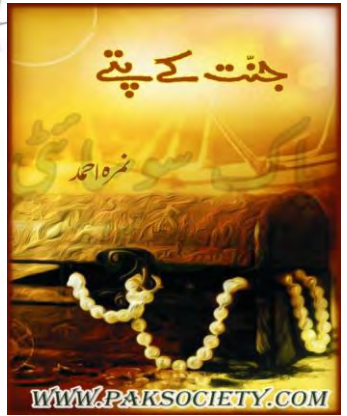
”دوبارہ یہ شکلیں مجھے اپنی سائیڈ پر نظر آئیں تو داہنی سے کہہ کر یوریا بستر ہی گول کروادوں گی مری سے۔“ وہ انگلی اٹھا کر دھمکی کے انداز میں بولی۔

”مری آپ کے دادا کی جاگیر نہیں ہے۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”لگتا ہے اس شہر میں نئے آئے ہیں آپ، ورنہ ایسی بات کرنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچتے۔“ وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”اور لگتا ہے آپ بھی جانتی نہیں ہیں مجھے دوبارہ میرے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے انٹورنس کروالینے کا پھر اپنے ہمراہ کوئی وہیل چیئر لے آئے گا، کیونکہ میں بھی زیادہ دیر تک لحاظ کرنے کا قائل نہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر سٹنگ روم کا دروازہ کھولا اور انتہائی بے رخی سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تو بہن کے گہرے احساس سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



در شہوار کا چہرہ مسخ ہوا۔
 ”در شہوار دوستی نبھائے نہ نبھائے دشمنی بہت اچھی طرح نبھاتی ہے۔“ وہ جاتے جاتے پلٹی اور مختصر لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”یار ایہ اچھی بات نہیں ہوئی“ سعدی صبح پریشان ہو گیا۔
 ”تو تمہیں بھی وہ فضول حرکت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ ہادی نے اس کی کلاس لی۔
 ”مجھے کیا پتا تھا اس کی اتنی عقابلی نگاہیں ہیں۔“ وہ خفت زدہ انداز میں کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”اس کی نگاہیں ہی عقابلی نہیں بلکہ زبان کی دھار بھی وزیر آباد کی چھریوں کو مات دیتی ہے۔“ ہادی نے مزید اضافہ کیا۔

”اگر اس نے اپنے دادا جی کو بتا دیا تو؟“ اس کو ایک نئی فکر لاحق ہو گئی۔
 ”اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہے وہ جو پہلے انہیں بتائے کہ وہ لان میں کیا کارنامہ سرانجام دے رہی تھی اور بڑوس کے لڑکے اس وجہ سے ٹانگ جھانک کر رہے تھے بے فکر ہو کچھ نہیں پھوٹے گی وہ۔“ ہادی کی بات اس کے دل کو لگی تھی، پہلی دفعہ اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔
 ”پانی واوے تم اتنے خلاف کیوں ہو اس کے۔“ سعدی مسکرایا۔

”مجھے ایسی مرد بار لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں جو خواہ مخواہ دوسروں کے حواسوں پر سوار ہونے کی کوشش کریں۔“ اس نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو سعدی نے شرارتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”خیر تم تو لڑکوں کے معاملے میں بھی ایسے ہی ہو۔“ اس نے کشن اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں اپنا تو ایک ہی نظریہ ہے۔“ ہادی نے ہاتھ میں پکڑا کپ میز پر رکھا۔
 ”وہ کیا ہے؟“

”ہو حلقہ یاراں تو مریشم کی طرح نرم۔“ اس کے ہلکے پھلکے لہجے پر سعدی بے ساختہ ہنسا۔

”اور تمہارا تو حلقہ یاراں ہی مختصر ترین ہے۔“ سعدی نے اسے چھیڑا۔

”ہاں کتنی کے صرف تین یا چار لوگ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کوفت ہوتی ہے مجھے۔“ ہادی نے سنجیدگی سے جواب دیا وہ واقعی محدود حلقہ احباب رکھتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسے کم گو اپنے آپ میں مگن اور کسی حد تک مغرور سمجھتے تھے۔ جب کہ حقیقتاً وہ ایسا نہیں تھا۔

”ویسے تم کچھ بھی کہو لڑکی مزے کی ہے۔“ سعدی کے چہرے کی معنی خیز مسکراہٹ پر محمد ہادی کے اندر خطرے کی گھنٹی بہت تیزی سے بجی اور جیتی ہی چلی گئی کیونکہ سعدی سیل فون پر بنانی ہوئی وڈیو بڑے ذوق و شوق سے دیکھنے میں مگن تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی قوس قزح اس کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔



رات سرد اور سانپ کی طرح تیل کھاتی سڑک بالکل ویران تھی۔

شہر زاد کی ایشیئرنگ پر جمی گرفت خاصی مضبوط تھی لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک حشر پاتا تھا۔ گھر میں ٹینا بیگم اور رومیہ کے زور دار معرکے کے بعد اس کا دل ایک دم ہی اچاٹ ہو گیا۔ وحشت اور بے چینی کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ دو گھنٹے بے مقصد مختلف سڑکوں پر گاڑی گھماتے کسی ذیلی سڑک سے بالکل انجان راستے پر نکل آئی اور اسے

چاہی نہیں چلا کہ ریزو پیٹرول کا اشارہ دینے والی گاڑی اس فیول ختم ہونے کے بعد احتیاجاً رک گئی تھی۔
شہزاد کی نظر جیسے ہی فیول کی سوئی پر پڑی اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ وہ گاڑی کے رکنے کی اصل وجہ سمجھ چکی تھی اور اس سڑک پر کوئی پیٹرول پمپ تو دور کی بات کوئی چرند پرند بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
سردیوں کی رات کا گہرا سناٹا اور خاموشی اس ویران راستے پر کسی آسیب کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے خوفزدہ انداز سے دائیں بائیں دیکھا۔ سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا قبرستان اور بائیں طرف گھنا جھل تھا اور شرفکسہ ہونے کے برابر۔

فضا میں چھائی ہوئی چاندنی میں ہر چیز پر اسرار لگ رہی تھی اور دور دور تک نظر آتی قبریں شہزاد کے مضبوط اعصاب کے لیے ایک کڑا امتحان بنی ہوئی تھیں۔

”اوہ مائی گاڈ! کیا ہو گا۔؟“ وہ گھبرا گئی کیونکہ گاڑی کی فرنٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی نظر ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر پڑ گئی۔ جنگلی گھاس اور خود رو بوڑوں کے درمیان گہرے قبرستان میں جھینگروں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں عجیب سا دہلا دینے والا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ سناٹا اس جگہ کی ہر چیز کو اپنے پنجوں میں دبائے ہوئے تھا۔
اس نے گھبرا کر اپنا سیل فون اٹھایا اور نینا بیگم کا نمبر ڈائل کیا وہ بند جا رہا تھا۔ اس نے تیزی سے روٹی کو کال ملائی۔ اس کا سیل فون فی الوقت جواب موصول نہیں ہو رہا کی ریکارڈنگ سنا رہا تھا اس کے رابطے میں کتنی کے صرف دو چار نمبر تھے وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔

سیاہ رات کے اندھیرے میں اس کی نظر ایک ہولے پر پڑی۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ دیکھ سکتی تھی کہ سادھوؤں کے سے حلے والا ایک شخص لائین اٹھائے اسی کی گاڑی کی طرف آ رہا تھا وہ متوحش لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے سرد موسم میں اس نے دھوٹی باندھ رکھی تھی اور اس کا اوپر والا دھڑنگا اور گلے میں ریشموں والی کالا تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبوترے چہرے کی ابھری ہوئی نوکیل ہڈیاں اس کے چہرے کو عجیب سا تاثر بخش رہی تھیں۔ جبکہ سر گنجا اور آنکھوں میں بڑی پر اسرار سی چمک تھی۔

وہ چلتا چلتا شہزاد کی گاڑی کے بالکل پاس آ کر رکا اور اپنے گلے میں اپنی ہوتی مالا میں سے ایک ریشمے کو ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانے لگا۔ شہزاد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا چاند کی پر اسرار چاندنی میں یہ منظر خاصا دہلا دینے والا تھا۔

شہزاد کو پہلی دفعہ یہاں کا اندھیرا اور خاموشی غیر فطری محسوس ہوئی۔ اس سادھو نے انگشت شہادت سے گاڑی کا شیشہ بجاتے ہوئے اس خاموشی کی چادر میں شکاف ڈالا۔ وہشت کی لہریں شہزاد کے وجود میں سرایت کر گئیں اس نے چیخا چاہا مگر آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی۔

وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا مگر گاڑی کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے وہ اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ شہزاد نے کن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی میں اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئیں۔

فضا کے گھمبیرا بوجھل ستارے میں آئی فون کی گھنٹی کی آواز اسے کسی مسیحا کی مانند اپنی سماعت میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کانٹے ہوئے ہاتھوں سے فوراً ہی کال اٹینڈ کی وہ شخص اب اس کی گاڑی کے شیشے پر جھکا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شہزاد کو اپنے دل کے بری طرح سے دھڑکنے کی آوازیں اپنی کپٹیوں میں محسوس ہو رہی تھیں۔

”شہزاد۔۔۔!!!“ دوسری طرف وہی دل خرا تا لہجہ تھا جو آج اسے زندگی بخش گیا تھا۔

”ہم زاد۔“ اس کے منہ سے نکلنے والا یہ نام دوسری جانب موجود شخص کو ڈھیروں تو اتائی بخش گیا۔
”کیسی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

”میں گھر سے باہر راستہ بھول چکی ہوں اور کوئی شخص خوف زدہ کر رہا ہے مجھے۔“ اس کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر نکلے۔

”کہاں ہو تم لوکیشن بتاؤ مجھے کون ہے تمہارے ساتھ۔“ اس کی نرم آواز میں ایک فطری سی پریشانی تھی۔
”آئی ڈونٹ نو“ میری گاڑی کا فیول بھی ختم ہو چکا ہے اور وہ مسلسل میری گاڑی کا شیشہ ناک کر رہا ہے۔“ خوف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”بی بیو۔ دروازہ مت کھولنا۔“ وہ دوسری طرف اب ذرا بلند آواز میں بولا۔ ”تم ہو کہاں؟“
”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کون سا راستہ ہے۔“ شہر زاد کا چہرہ دہشت سے لٹھے کی طرح سپید پڑتا جا رہا تھا۔

دوسری طرف وہ اس کی کیفیت سمجھ چکا تھا۔ ”ڈونٹ وری وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“ اپنی گاڑی کا دروازہ کسی قیمت پر مت کھولنا میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس نے دلا سا دیا۔

”پلیز ہیلپ می۔“ اس کی لہجے میں خوف ہی خوف تھا۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“
”اپنے سیل فون کا نیوی گیشن سسٹم آن کرو، ہری اپ۔ اسے دیکھ کر لوکیشن بتاؤ اپنی اور پلیز گاڑی کا دروازہ نہیں کھولنا۔“ وہ فکر مند انداز میں بولا۔ اس نے بڑی تیزی سے گوگل میپ آن کیا اور سامنے ہی اس کی لوکیشن ”گیانی روڈ کوٹ، تھیلیالی کے طور پر آ رہی تھی۔

”اوہ! تو تم لنک روڈ پر ہو، ڈونٹ وری میں رسک کروا تا ہوں تمہیں۔“ وہ سیکنڈوں میں اس کی لوکیشن سمجھا تھا۔

”فون مت بند کرنا پلیز۔“ شہر زاد کے التجائیہ لہجے پر اس کا اپنا فون منقطع کر تا ہاتھ رک گیا۔ وہ اب شاید بیٹی سی ایل فون پر انگلش میں کسی کو عجلت بھرے انداز میں ساری صورت حال بتا رہا تھا۔ دوسری طرف شہر زاد پر ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔

”شہر زاد، ڈونٹ وری، میرا ایک فرینڈ پولیس موبائل بھیج رہا ہے، جسٹ ٹین منٹ لگیں گے۔“ وہ اب اسے تسلی دے رہا تھا۔

”ٹین منٹ!!“ شہر زاد نے خوف زدہ نگاہوں سے باہر کھڑے شخص پر نظر ڈالی، جو اس وقت انتہائی بے چین انداز میں ایک دفعہ پھر اس کی گاڑی کے شیشے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔ شہر زاد کی دھڑکتوں میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔

”ڈونٹ ڈسٹرب می۔“ اس نے ہمت کر کے چیخ کر کہا، گاڑی کے باہر کھڑا شخص چونک گیا، جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔

”کیا ہوا شہر زاد؟“ وہ ریسور کے دوسری جانب پریشان ہوا۔
”کچھ نہیں، یہ شخص خواجخواہ۔ میرے سر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“ وہ کھڑکی کی طرف سے تھوڑا سا رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

”ڈونٹ وری، پولیس آئی ہی ہوگی بی بیو۔“ وہ فکر مند لہجے میں اسے حوصلہ دے رہا تھا۔
جب کہ شہر زاد کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی، اس کا سارا دھیان باہر کھڑے شخص کی جانب تھا۔ جسے نظر انداز کر کے وہ خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔ اچانک بجلی کے کڑکنے کی آواز پر اس نے دل کر دو بارہ

شیشے کی طرف دیکھا اور اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ شخص جاچکا تھا۔

”چلا گیا وہ“ شہر زاد کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

”جہاں ہم زاد“ آجائے وہاں کوئی دوسرا کتنی دیر ٹھہر سکتا ہے۔“ اتنے اعصاب شکن لہجے میں یہ بات وہی کر سکتا تھا۔

”وہ لوگ آکیوں نہیں رہے؟“ اس نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے پوچھا ویسے بھی اسے قبرستان اور ارد گرد کے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی۔

”اتنے کمزور نرود کی حامل تو نہیں تھیں تم۔“ اس کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوئی۔

”تم کیسے جانتے ہو مجھے؟“ یہ سوال بے ساختہ اس کے ذہن میں ابھرا اور اس سے پہلے کہ وہ اس سے استفسار

کرتی۔ پولیس موبائل کے تیز مارن کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنی۔

اس نے لاشعوری طور پر کال منقطع کی اور اپنی گاڑی کی طرف آنے والے پولیس آفیسر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جو اس کی گاڑی کا شیشہ نیچے کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن سے گھر سے بیڈروم تک پہنچنے کے دوران اس

کے اعصاب اچھے خاصے تفصیل ہو چکے تھے۔ گھر میں طوفان گزرنے کے بعد کی بو جھل خاموشی کا راج تھا۔ رومی

کے بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی اور ایک دروازے کی گولی کھانے

کے بعد اس نے اسٹرائیک سی کافی بنائی اور اپنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر دن بھر کی روداد کو ذہن میں دہرانے لگی۔

”مجھے کم از کم اس کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے۔“ اس نے جلدی سے اپنا سیل فون اٹھایا اور ریسیو کالز میں اس کا

نمبر تلاش کرنے لگی۔

آج کی تاریخ میں مطلوبہ وقت پر آنے والی کال دیکھ کر اسے جھٹکا لگا اس وقت تو وہ سخت پریشانی میں یہ دیکھ نہیں

سکتی تھی لیکن اب ریسیو کالز میں ”ہم زاد“ کے نمبر کی جگہ نامعلوم لکھا ہوا تھا اور اس بات نے اسے اچھی خاصی

ابھن میں مبتلا کر دیا تھا۔



”کوئی دیکھے نہ دیکھے شاہ میر تو دیکھے گا۔“ طوبی نے ہاتھ میں پکڑا کیلا مزے سے کھاتے ہوئے عوام الناس کو

آگاہ کیا۔

اس وقت در شہوار کے کمرے میں انتقامی ایجنڈے پر ایک گول میز کانفرنس جاری تھی جس میں ایک فول

پروف پلان ترتیب دیا گیا تھا اور اس وقت اس پر بحث جاری تھی کہ طوبی کے بیان کردہ خدشے کے بعد ایک لمحے کو

کمرے میں مایوسی میں لپٹی ہوئی خاموشی پھیل گئی۔

”ہاں میرو بھیا کی طرف سے تو مجھے بھی خطر ہے۔“ در شہوار نے کافی کا آخری کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے پریشانی

سے کہا۔

”اس کو تو آج چائے میں کوئی ٹرینکولا نرڈ ڈال کر دے آؤ۔“ میرو نے مونگ پھلی سے انصاف کرتے ہوئے

مفت مشورہ دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں وہ نیند میں بھی اٹھ کر چل پڑے گا کینہ۔“ طوبی نے برا سامنے بتایا۔

”ارل ہوں۔“ در شہوار کے ہنوں والے جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہوئے۔

”نانا کہ میرا بھائی واقعی بہت کینہ ہے لیکن پلیز اس کے بارے میں منفی رائے کا اظہار یوں منہ پھاڑ کر سرعام نہ

کیا جائے تاکہ ان کی اکلوتی بسن کے جذبات مجروح نہ ہوں۔“ سیاہ کارڈیگن کے ساتھ میرو ن شال اوڑھے

www.paksociety.com
در شہوار شرارتی لہجے میں گویا ہوئی۔

”زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں تم اچھی طرح جانتی ہو ہم تمہارے بھائی کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ روز ازل کی طرح روشن اور کسی بھی قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔“ نیرو کے طنزیہ لہجے پر در شہوار کے جذباتی غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔

”اس کی کمینگیوں پر تو پی ایچ ڈی کا پورا تھمسس لکھا جاسکتا ہے۔“ طوبی کے بھی سارے پرانے زخم ایک ساتھ جاگ اٹھے۔

”وہ تو بالکل ٹھیک ہے پیاری بہنو۔ لیکن تم لوگ بھی ذرا ہاتھ ہولار کھو میں بھی بندہ بشر ہوں اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن والی میری گم شدہ غیرت جاگ اٹھی تو نقصان تو ہم تینوں کا ہی ہو گا نا۔“ در شہوار کی بات پر ان دونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”تین سے مجھے یاد آیا، کیا آپی کہاں غائب ہیں صبح سے؟“ نیرو نے کسی چالاک لومڑی کی طرح آنکھیں گھما کر طوبی کی طرف دیکھا۔

”وہ دواجی سے تازہ ترین بے عزتی کروانے کے بعد تین روزہ سوگ رہیں، صبح ہی یہ پریس ریلیز جاری کیا تھا انہوں نے۔“ طوبی نے پھلوں کی ٹوکری سے چن کر ایک موٹا تازہ کینو چھپتے ہوئے اطلاع دی۔

”فی الحال تم یہاں سے نکلو اور جا کر میو بھیا کے بارے میں تازہ ترین اپ ڈیٹ لے کر آؤ، تاکہ مشن زیرو زیرو سیون پر کام شروع کیا جاسکے۔“ در شہوار نے اس کے ہاتھ سے مالٹا چھینا اور واپس پھلوں کی ٹوکری میں رکھ دیا۔

”کیوں تمہیں جاتے ہوئے موت پڑتی ہے کیا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”مجھے تو اس وقت دیکھتے ہی وہ سمجھ جائیں گے کہ آج پھر کسی خفیہ مشن پر ہوں کیونکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ مجھے نیند کتنی پیاری ہے اور میں وہ صرف اسی صورت میں قربان کرتی ہوں جب میرے اندر کوئی کھلی پیٹی ہوئی ہو۔“ در شہوار اپنی ننھی سی خوب صورت ناک سکڑ کر بولی۔

”ہاں تو میرا چہرہ مبارک دیکھ کر کون سا انہیں لگے گا کہ میں تجھ کے نفل پڑھنے کے لیے اٹھی ہوں۔“ طوبی کون سا کسی سے کم تھی۔

”نیرو تم چلی جاؤ پلیز۔“ در شہوار نے دنیا جہاں کی معصومیت اپنے لہجے میں سمو کر اپنی کزن کی طرف دیکھا، جو ہنوز مونگ پھلی کے لفافے میں اس امید پر ہاتھ مار رہی تھی کہ شاید کچھ ہاتھ لگ ہی جائے۔

”توبہ کرو، ندرت امی کی نظر پڑ گئی تو اپنے گھٹنوں کی مالش کا آرڈر دے دیں گی ویسے بھی آدھی رات کو ان کے سارے نامعلوم درو جاگ اٹھتے ہیں۔“ نیرو کے صاف انکار پر در شہوار کا منہ بن گیا۔

”اب یہ کسی میٹیم خانے کے ٹیبلر جیسی شکل مت بناؤ، جاتی ہوں میں اور یاد رکھنا فیکسٹ ٹائم میں ہرگز نہیں جاؤں گی سیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے۔“ طوبی کو اس پر ترس آ گیا اور اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر در شہوار مسکرا دی۔

”شباباش میری بہن! تم ”میراؤس“ کا ٹر ہو، آنے والی نسلوں کے لیے ”بہادری“، ”بہمت“ اور ”جرات“ کا سمبل ہو۔“ در شہوار نے لہک لہک کر اس کے گن گانے شروع ہی کیے تھے کہ نیرو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے زبردستی روکا۔

”بس بس بہن، آدھی رات کو اتنے جھوٹ بولنے پر کہیں کوئی زلزلہ نہ آجائے مری میں باقی تقریر پھر کسی اور دن کر لیتا۔“

”تم سب لوگ انسانوں کی طرح بیٹھ کر آیت کریمہ کا ورد کرو، میں ذرا نیچے کے حالات کا جائزہ لے کر آتی ہوں

اور خبردار تم میں سے کسی نے میری پھلوں کی ٹوکری پر ہاتھ صاف کیا۔“ طے شدہ پروگرام کے مطابق طوبی نے پہلے سر نکال کر باہر جھانکا اور پھر بے پناؤں در شہوار کے بیڈ روم سے نکلی۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دل ہی دل میں آل تو جلال تو پڑھتی ہوئی پہلی منزل کی میڑھیاں اترنے لگی اور آج تو ویسے بھی واجی اور تایا ابا کی غیر موجودگی میں امن سکون کا دور دورہ چل رہا تھا۔

”اف۔۔۔“ چلتے چلتے اس کا پاؤں میڑھیوں میں رکھے آرائشی کلمے سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا گئی تو گرل کو پکڑ کر اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔

”اف یہ کم بخت در شہوار کی انٹریئر ڈیزائننگ۔“ اس نے غصے میں کلمے کو ٹھوکری جو خاصی مہنگی پڑی۔ اس کے پیر کا ناخن ہلکا سا ٹوٹ گیا۔

”یہ تم کیا آدمی رات کو گملوں اور دیواروں سے ٹکراتی پھر رہی ہو۔“ شاہ میر کی آواز نے گویا صورِ اسرائیل پھونک دیا تھا۔

ایک ہاتھ میں کافی کاکہ اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں فرینچ فرائز کا پہاڑ بنا دیا وہ کچن سے نکلتے ہوئے اس کی یہ حرکت نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اس کے چہرے پر وہی دل جلائی مسکراہٹ تھی جس سے طوبی سخت خار کھاتی تھی۔

”خبیث ابھی تک الووں کی طرح جاگ رہا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں شاہ میر کو کوسا۔

”یہ دل ہی دل میں کون سا ڈھائی کا پہاڑا دہرا رہی ہو۔“ وہ اس کی خاموشی پر آکٹا کر بولا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے۔۔۔“ طوبی کے سارے موڈ کا ستانا س ہو گیا۔

”تکلیف مجھے نہیں، تمہیں ہو رہی ہے جو اس طرح لنگڑا لنگڑا کر چل رہی ہو۔“ حال ”تو خیر پہلے ہی خراب تھا تمہارا اب تو ”چال“ کی بھی بری حالت ہو گئی ہے، اف کیا بنے گا تمہارا۔“ شاہ میر کی زبان پھسل۔

”آج تک کالا باغ ڈیم کا کچھ بنا ہے پاکستان میں۔“ طوبی نے کھا جانے والی نگاہوں سے اپنے تایا زاد کی طرف دیکھا جس کی بولتی نگاہیں اور شرارتی لہجہ اسے سلگا کر رکھ دیتا تھا۔

”ایک دفعہ مجھے حکم کرو، کالا باغ ڈیم کیا، طوبی ڈیم بھی بنا دوں گا۔“ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا کپ سائیڈ میز پر رکھ کر خود مزے سے فرینچ فرائز کھانے لگا، گرما گرم فرینچ فرائز پر کھچپ کے نقش و نگار دیکھ کر طوبی کے منہ میں بھی پانی آ گیا۔

”اے طائر لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی۔“ اس نے دل ہی دل میں یہ مصرع یاد کر کے اپنی ہمت خود بندھائی اور منہ میں آئے پانی پر بمشکل بند باندھ ہی لیا، اگرچہ یہ انتہائی مشکل کام تھا۔

”ویسے آج کیا جنگل میں اکیلے چل قدمی کا ارادہ ہے تمہارا، اگر تم کہو تو میں ساتھ دینے کو تیار ہوں۔“ شاہ میر کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ کھیل رہی تھی جبکہ طوبی کی نظریں ہال کمرے میں لگے وال کلاک پر تھیں، وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا ہی جا رہا تھا۔

”تمہاری یونٹ والے بلا تے کیوں نہیں ہیں تمہیں، عورتوں کی طرح آکر بیٹھ گئے ہو گھر میں۔“ وہ تیکھے لہجے میں ابھڑ چڑھا کر بولی تو شاہ میر کے حلق سے نکلنے والا تہقہ خاصا بلند تھا۔

”اللہ کے فضل سے میرا تو آئی سی بہت مہمان ہے مجھ پر۔ سوچ رہا ہوں جو اننگ دے کر پھر کسی بہانے آجاؤں واپس۔“ وہ اسے چڑانے کو بولا۔

”پتا نہیں کون سے پاک فوج کے جوان ہوتے ہیں جنہیں محاذ پر جانے کا شوق ہوتا ہے، ادھر ایک ہی نمونہ ہے ہمارے گھر میں، جو ہر وقت یہیں محاذ آرائی کھولے بیٹھا رہتا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی میڑھیوں کی طرف واپس مڑی

اور شاہ میر اس کا ارادہ بھانپ کر بڑی تیزی سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
 ”کیا کہا تم نے۔“ اس نے لاشعوری انداز میں طوبی کا بازو پکڑا، وہ سٹپٹا گئی۔
 ”بازو چھوڑو میرا۔“ اس کے بوکھلانے اور نظریں چرانے پر وہ ہلکی سی خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔
 ”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“ اس کے لہجے کی پیش پر ایک پل کو طوبی کا دل بھی جیسے حضور کھا کر رہ گیا۔
 ”بولتی کیوں نہیں ہو اب۔“ شاہ میر کے گیسر لہجے پر طوبی کے صبح چہرے کی رنگت ایک پل کو متغیر ہوئی۔
 ”ہاں بولو، میں نے کون سا قرضہ لے رکھا ہے تم سے۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر اب اس کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈالے اس کے ضبط کا کڑا امتحان لے رہی تھی۔ شاہ میر کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا۔
 ”کیا واقعی چلا جاؤں واپس۔“ شاہ میر نے سرگوشی کی۔

”میری بلا سے۔“ اس نے بیزارگی سے کندھے اچکا کر کہا۔ ”پہلے کون سا میں نے دعوت دے کر بلوایا تھا۔“
 اس کے انداز میں آگاہی تھی۔
 ”ایک وقت آئے گا کہ تم خود متیں کیا کرو گی میری کہ واپس آ جاؤ اور میں نہیں آؤں گا۔“ وہ گہری نظروں سے
 اسے تکتا ہوا سنجیدہ ہوا۔
 ”اور یہ وقت ان شاء اللہ کبھی نہیں آئے گا۔“ طوبی جبرا ”مسکرائی تو اس کے گالوں پر بڑے گہرے ڈمھل بنے
 اور شاہ میر کو اپنا دل ان گڑھوں میں ڈھکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تیز تیز میڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکی تھی اور شاہ میر کا میز
 پر رکھا کافی کا کپ ٹھنڈا ہو کر بد ذائقہ ہو چکا تھا۔



سر موسم کی شدت سے زیادہ اس دن کی تلخی نے شہزاد کو تھکا دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آئے والے لمحوں کا
 خوف کسی زہر لے سانپ کی صورت میں کنڈلی مار کر اس کے کمرے میں آن بیٹھا ہو۔ وہ ہبہہ کے کارنامے کے
 اثرات پوری سہگل فیملی کو بھگتتے تھے۔
 اس کے اندر جس اور گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار اٹھ کر کھڑکیوں کے بلا منڈز
 ہٹا کر شیشہ پیچھے کر دیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی کن من کے ساتھ موسم سرما کی ٹھنڈی ہوا آؤں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ
 کچھ دیر آسمان کی تاریکیوں میں اپنی قسمت کے روشن ستارے کو کھوجنے کے بعد تھک ہار کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور
 اس کے کراؤں سے ٹیک لگائی۔

سائڈ میز پر رکھا آئی بیڈ اٹھا کر اس نے اپنی فیس بک آئی ڈی آن کی اور رومی سہگل کے نام سے بنے پیج کو سرچ
 کیا، جو تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے مل گیا تھا۔ اس پر رومی کی پوسٹ کردہ خرافات، جوں کی توں موجود تھیں،
 جس کے لیے وہ دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں کر چکی تھی کہ کاش رومی خود اسے ڈیلیٹ کر دے۔ چند گھنٹوں میں
 اس پیج پر ہزاروں کی تعداد میں لائیکس اور بے شمار فضول کمنٹس کی بھرمار تھی۔

”ہم بھی بیمار ذہنیت کے لوگ ہیں جن چیزوں کو اخلاقیات کے دائرے سے باہر دیکھتے ہیں اس پر غیر اخلاقی
 کمنٹس کرنا بھی اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔“ شہزاد نے بیزارگی سے وہ پیج بند کر کے اپنی پروفاٹل کھولی۔
 اچانک اس کی نظر اپنی فرینڈ لسٹ پر پڑی، اس لسٹ میں ہم زاد کا نام دیکھ کر اسے شاک لگا۔ وہ رک گئی۔ یہ آئی
 ڈی اس نے مری کانوینٹ کے زمانے میں بنائی تھی اور لندن جانے کے بعد بند کر دی تھی پیج میں وہ کبھی کبھار اسے
 اوپن کر کے سرسری نظر ڈال لیتی لیکن اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس نے ہم زاد نام کی کسی آئی ڈی کو اپنے پاس
 ایڈ نہیں کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، پہلے اپنے اصل نام سے اس کی فرینڈ لسٹ میں ایڈ ہوا تھا اور

پھر اس نے اپنی پروفائل کا نام تبدیل کر دیا تھا۔
 اس نے جلدی سے اس کی وال چیک کی وہ کبھی کبھار سوشل ایڈوز اور ملکی حالات پر انتہائی دلچسپ اسٹیشن
 لگاتا تھا اور اس کے پاس تقریباً "سات سال پہلے ایڈ ہوا تھا۔ اسی فرینڈ لسٹ میں اس کے اسکول کے زمانے کے کئی
 کلاس فیلوز موجود تھے۔ جن کے نام اس کے ذہن سے نکل چکے تھے لیکن کسی کسی کی شکل تھوڑی بہت یاد تھی۔
 "کیا یہ لوگ جانتے ہیں کہ "ہم زاد" نام کے پیچھے کون ہے۔؟" اس کے ذہن کی سلیٹ پر ایک سوال ابھرا۔
 "یقیناً جانتے ہوں گے۔" اس سوچ نے اس کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر دیا۔

اس نے کچھ سوچ کر اپنی مری کانویسٹ کے زمانے کی فرینڈ رودابہ کا نمبر ملایا، جس سے اس کی کسی زمانے میں
 اچھی دوستی تھی اور لندن جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ سوشل میڈیا پر رابطہ رہا اور پھر دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں
 لگن ہو گئیں۔

"شیری! تم زندہ ہو ابھی۔؟" دوسری طرف رودابہ اس کی آواز سن کر خوش گوار حیرت کا شکار ہوئی۔
 "زندہ ہوں تو بات کر رہی ہوں نا۔" وہ اس کے والہانہ انداز پر مسکرائی۔
 "کب آئیں پاکستان اور بے وقوف لڑکی، آکر رابطہ کیوں نہیں کیا؟" وہ اپنے انہی بے تکلفانہ انداز میں گویا
 تھی۔

"ابھی آئے ہوئے ٹوٹل تین چار دن ہی تو ہوئے ہیں مجھے۔" وہ چاہ کر بھی ویسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر
 پائی۔ ریزرو تو وہ شروع ہی سے تھی لیکن اب ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔
 "چلو پھر کل کالج میری طرف بیٹھ کر کہیں کانویسٹ دور کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔" رودابہ نے فوراً ہی اسے
 دعوت دی جو اس نے کچھ سوچ کر قبول کر لی۔ دس پندرہ منٹ پرانی یادیں دہرانے کے بعد شہر زاد نے اچانک وہ
 سوال پوچھ ہی لیا جس کے لیے اس نے اسے کال کی تھی۔
 "یہ قیس بک کے میچوئل فرینڈز میں "ہم زاد" کے نام کی آئی ڈی کس کی ہے؟"
 "شیطان کی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
 "مطلب۔؟" وہ الجھ گئی۔

"آئی ڈونٹ نو یار، کوئی کلاس فیلو لگتا ہے سب ہی کے بارے میں جانتا ہے، لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں
 جانتا بہت مزے مزے کی پوسٹس لگاتا ہے اس لیے ابھی تک ان فرینڈز نہیں کیا۔" رودابہ بڑی لاپرواہی سے بتا رہی
 تھی۔

"لیکن اس طرح اپنی شناخت چھپانے کا فائدہ؟" شہر زاد کو مایوسی ہوئی۔
 "ہو سکتا ہے اسے ہو ویسے بھی ہر کسی کو اپنی لائف اپنے طریقے سے گزارنے کا حق ہے، ہم کسی کو اپنی رولز
 اینڈ ریگولیشنز کے پابند تو نہیں کر سکتے تم بتاؤ کب پریکٹس اشارٹ کر رہی ہو۔" رودابہ نے اپنے مخصوص لاپرواہ
 انداز میں بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

"ہاں سوچ رہی ہوں کوئی فرم جوائن کر لوں۔" شیری نے سنجیدگی سے بتایا۔
 "اگر ایسا کوئی پروگرام بن رہا ہے تو مجھے بتانا، ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ ہیلپ کر سکوں۔" رودابہ کے خلوص پر
 اسے کبھی کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت شہر زاد کے کمرے کا دروازہ ہلکا سا بجا، روم بھدھکے تھکے سے انداز
 سے اندر داخل ہوئی۔

"شیور، وائے ناٹ، اوکے رودابہ، کل ملتے ہیں، پھر بات ہو گئی، ٹیک کیئر بائے۔" اس نے جلدی سے فون بند
 کیا۔

”کیسے آتا ہو۔؟“ شہرزاد نے دانستہ سیٹ نظروں سے رومیہ صہ کی طرف دیکھا۔

”تم خفا ہو مجھ سے۔“ رومی نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹختے ہوئے پوچھا۔

”کیوں۔“ شہرزاد کا پُرسکون انداز اسے مزید اضطراب کا شکار کر گیا۔

”اسی بات پر جس پر مام خفا ہیں۔“ وہ ہلکا سا ہنچک کر بولی۔

”تمہیں پتا ہے رومی میں کسی کی پرسئل لائف میں اس وقت تک انٹرفیئر نہیں کرتی جب تک وہ چیز کم از کم

میری لائف پر ایکٹ (اثر انداز) نہ کرے، تمہاری زندگی ہے، تم اگر ایسی ہی گزارنا چاہتی ہو تو ایز یوش میں

تمہیں منع نہیں کروں گی، جیسے میں مام کو نہیں کرتی۔“ شہرزاد نے اس دفعہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا اس کا وہ

ٹوک انداز اور سنجیدہ لہجہ رومیہ صہ کے لیے خاصی مایوسی کا باعث بنا۔

”تمہاں کی چیپ حرکتوں پر ہرٹ نہیں ہوتی ہو؟ کیا انہیں یہ سب سوٹ کرتا ہے؟“ وہ متنفر لہجے میں گویا ہوئی۔

”کیا تمہیں سوٹ کرتا ہے وہ سب جو تم کر رہی ہو؟“ شیریں کے التماس والے سوال کرنے پر وہ سٹپٹا گئی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ برامان گئی۔

”انہوں نے بھی ایسا کچھ نہیں کیا۔“ شیریں نے ان کا دفاع کیا۔

”اس آج میں آئے دن کے اسکیڈلز اور شادیاں تمہارے نزدیک کچھ نہیں ہیں۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلائی۔

”لائف پارٹنر کی ضرورت تو انسان کو ہر عمر میں رہتی ہے اور ان کی بد قسمتی کہ ان کی پہلی اور دوسری شادی

کامیاب نہیں ہو سکی، دنیا میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، تو کیا اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ وہ دنیا

سے کنارہ کشی کر کے ساری خوشیوں کو اپنے اوپر حرام کر لیں۔“

”وہ جان بوجھ کر ایسے کرپٹ لوگوں کا انتخاب کرتی ہیں۔“ رومی تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔

”کوئی بے وقوف انسان ہی جان بوجھ کر اپنے لیے کوئی برا انتخاب کر سکتا ہے اور کم از کم مام جیسی پریکٹیکل اور

پروفیشنل وومن سے میں اس چیز کی توقع نہیں کرتی، یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے میں ان کی قسمت ان کا ساتھ

نہیں دیتی۔“ شہرزاد نے اس دفعہ کھل کر کہا۔

”مہم کو ڈی فینڈ (دفاع) کر رہی ہو۔“ وہ بیزار ہوئی۔

”نہیں میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔“ وہ اپنے انہی پُرسکون انداز میں گویا ہوئی۔

”تمہیں نہیں پتا ان کے یہ فیصلہ کتنے برے رہے ہیں میرے لیے۔“ وہ ان سے حد درجہ خفا تھی۔

”انسان کے اپنے فیصلے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اپنے لیے۔“ شیریں نے اس کی تصحیح کی۔

”مام نے اپنی جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر تمہیں بھی اپنی طرف مائل کر لیا ہے، میں اچھی طرح جانتی ہوں، انہیں

دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا فن آتا ہے۔“ وہ اب شہرزاد کی طرف سے بھی بدگمان ہوئی۔

”تم بھی مجھ سے شیئر کر سکتی ہو ٹرسٹ می میں تمہیں بھی برا نہیں کہوں گی۔“ شہرزاد نے اسے اب نرمی

سے گھیرنا چاہا۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ناراضی سے پاؤں پٹختی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی، لیکن شہرزاد کو اس

احساس نے طمانیت بخشی تھی کہ کم از کم اس کے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود تھا۔ وہ اب رومیہ صہ کو

اپنے طریقے سے سمجھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔



ڈانسنگ فلور تیز جلتی جھکتی تپوں کے حصار میں تھا۔

انگلش میوزک کا تیز اور بے جگم شور، سماعتوں میں پہنچ کر نوجوان نسل کے جوش و جنون اور ولولے میں اضافہ کر رہا تھا۔

فلور پر تھرتی، نامناسب لباس میں موجود لڑکیاں، دیکھنے والوں کے صبر کا امتحان بن رہی تھیں۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کو اپنے اندر ایک ہیجان سا برپا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں سکون کی تلاش میں آئی تھی۔ شہزاد کا نام کی حمایت کرنا اسے بری طرح سے چبھاتا تھا اس کا خیال تھا کہ اس کی بہن کو بھی اس معاملے میں اسی کا ساتھ دینا چاہیے، لیکن اس کے رویے نے اسے نہ صرف مایوس کیا تھا بلکہ اچھا خاصا ڈپریشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ جی بھی وہ رات کے اس پہر اپنی دوست کنزہ کے ساتھ اس کلب میں موجود تھی۔ یہاں آکر بھی وہ انتہائی ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔

اسکن ٹائیٹ جینز پر پنک شرٹ کے ساتھ اس نے ایک چھوٹا سا مفلر گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پوٹے سوچے ہوئے تھے، وہ پچھلے دو دن سے بالکل نہیں سو سکی تھی اور اس وقت کنزہ اسے چھوڑ کر مکمل تفریح کے موڈ میں تھی، تبھی اسے ایک کونے میں اکیلے بیٹھنا پڑا۔

”ہائے ہئی۔“ ایک چوبیس پچیس سال کا لڑکا لڑکھاتا ہوا اس کے بالکل پاس آن کھڑا ہوا اور اس کے چہرے پر گری لٹ کو چھو کر بد تمیزی سے بولا۔

”ہائے۔“ رومی نے ہزاری سے اسے دیکھا، وہ یقیناً ”نشے میں تھا۔“

”او، جوائن کرو مجھے۔“ وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر ڈانسنگ فلور پر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔“ رومی صدمہ کا چہرہ سرخ ہوا اور وہ جھنجھلا کر اپنا بازو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے لگی۔

”تو پھر یہاں کیا جھک مارنے آئی ہو۔“ اس کا طنزیہ لہجہ رومی صدمہ کو آؤٹ کر گیا، اس نے تمہارا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

”یونچ (Bitch)۔“ وہ لڑکا مشتعل ہوا۔ ”آئی ول کل یو۔“ وہ خطرناک ارادوں کے ساتھ رومی صدمہ کی طرف بڑھا، لیکن اس سے پہلے ہی اس کے دو ساتھی درمیان میں آگئے۔

”روحیل ڈونٹ لوز یور ٹیمپور۔“ اس کے ایک ساتھی نے زبردستی اسے پکڑا۔

”اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، جسٹس محمود کے بیٹے پر اوقات کیا ہے اس کی۔“ اس کا لہجہ درشت اور جھنجھلایا ہوا تھا، سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔

”آپ پلیز جائیں یہاں سے۔“ اس کے اسی دوست نے التجائیہ لہجے میں رومی صدمہ سے کہا۔

”نہیں جاتی، کیا کر لیں گے آپ۔“ اس نے بھی ہٹ دھرمی دکھائی، لیکن اسی وقت کنزہ کو ساری صورتحال سمجھ میں آچکی تھی۔

”آریو میڈ۔؟“ رومی صدمہ کی دوست کنزہ اسٹیج سے بوکھلا کر اتری اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔

”جانتی ہو وہ جسٹس محمود کا بیٹا ہے، روحیل محمود۔“ کنزہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جسٹس کا بیٹا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ہر بے ہودہ حرکت کرنے کا پرمٹ ہے۔“ رومی صدمہ کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے اس کی دماغی کھولن کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تیز بارش میں بغیر کسی سوٹیریا کوٹ کے پارکنگ میں کھڑی تھی۔

”میں گھر جا رہی ہوں۔“ اس کا دل ایک دم ہی یہاں کے ماحول سے بھی اجاٹ ہو گیا۔

”اُدھر دو گاڑی کی چابی، اُدھی رات کو مار دو گی کہیں۔ ویسے بھی موسم اتنا خراب ہے۔“ کنزہ نے اسے اگلی نشست کی طرف دھکیلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور برق رفتاری سے گاڑی مین روڈ پر لے آئی۔ تیز بارش کے تسلسل میں کچھ کمی آگئی تھی، لیکن اب ڈالہ باری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ رات کی تیرگی میں اس موسم میں گاڑی چلانا واقعی مشکل تھا، لیکن کنزہ بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہی تھی۔ موسم سرما کی سخت اور کھرجا دینے والی سردی کا لطف لینے کے لیے چند منچلے بھی میدان میں اتر آئے۔ اسلام آباد ایکسپریس وے پر ون ویٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا، رات کے اس پہران منچلوں نے پٹرولنگ پر موجود پولیس والوں کو ایک دم ہی پریشان کر دیا تھا، یہ سب بڑے گھرانوں کی بگڑی ہوئی اولادیں تھیں جن کو منع کرنا بھی ایک درد سہی تھی۔

رومیہ بیگ سے لائٹرنکال کر سگریٹ سلگانے لگی۔ اس کے اندر اپنی ہی سوچوں کا ایک جہنم آباد تھا، جس نے اسے باہر کے موسموں سے لائق کر دیا تھا۔ اس نے ایک دم ہی گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کنزہ کو کپکپی میں مبتلا ہو گئے۔

”باگل تو نہیں ہو گئی ہو۔“ کنزہ نے اپنی طرف لگے ٹین سے گاڑی کا شیشہ اوپر کر کے دیکھ لیا۔

”مجھے suffocation (گھٹن) ٹیل ہو رہی ہے۔“ اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

”کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ رومیہ، جو چاہتی ہو، کرتی ہو، پھر بھی ریلیکس نہیں ہوتی ہو۔“ وہ حیران ہوئی۔

کنزہ کے ساتھ اس کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ویسے بھی رومیہ لمبے عرصے کے تعلق پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ وہ چیزوں کے ساتھ ساتھ بہت جلد لوگوں اور رشتوں سے بے زار ہو کر انہیں چھوڑتی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خامی تھی۔ جو چیزا سے بہت زیادہ متاثر کرتی، وہ کچھ ہی دن کے بعد بے قدری سے اس کے کمرے میں بُل رہی ہوتی۔

”تو نہیں کچھ کمی ہے کچھ نہ ہونے کا احساس ہے، جو مجھے کھل کر خوش ہونے نہیں دیتا۔“ اس نے پہلی دفعہ بے تکلفی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”مثلاً۔۔۔؟“ کنزہ نے جیسے ہی گرون موڈ کر رومیہ کی طرف دیکھا، اسے جھٹکا لگا، کیوں کہ اس کی نظر رومیہ کی طرف کے کھڑکی کے شیشے سے ہوتی ہوئی باہر سڑک پر جسٹس محمود کے بیٹے کی ہیوی ہائیٹ پر پڑی۔ وہ نہ جانے کب سے ان کے تعاقب میں تھا۔ اس نے رومیہ کو تائے بغیر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم۔“ کنزہ نے خود کو نارمل ظاہر کے لیے یوں ہی پوچھا۔ وہ پچھلے شیشے سے روٹیل کو دیکھ رہی تھی جو تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا۔

”تقدیر کا ہاتھ بہت بے رحم ہوتا ہے، وہ جن لوگوں پر بے دریغ دونوں ہاتھوں سے لٹاتی ہے، ان کو بھی مکمل خوش ہونے نہیں دیتی، ان کی زندگیوں کا بھی کوئی نہ کوئی ایک کونہ تشنہ رکھتی ہے تاکہ لوگ بھکاریوں کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے گڑ گڑاتے رہیں، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس سے مانگتے رہیں، لیکن پھر بھی خواہشوں کی تکمیل کے زم زم ہر کسی کے لیے جاری نہیں ہوتے۔“ کنزہ گاڑی چلاتے ہوئے اس کی بھڑاس سن رہی تھی۔

روٹیل محمود اپنی ہائیٹ کو دوبارہ اس کی گاڑی کے عین برابر لے آیا تھا، کنزہ نے کن اکھیوں سے دیکھا، وہ اپنی لیدر کی جیکٹ سے ایک چھوٹا اور جدید قسم کا پمپل نکال رہا تھا۔

”وہ مائی گاڈ، یہ باسٹو تو وہی ہے اور اس کے ہاتھ میں پمپل ہے۔“ رومیہ کی بھی اچانک اس پر نظر پڑی اور

”ٹیک ایزی۔“ کزنہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے تسلی دینا چاہی۔

”گاڑی روکو۔“ رو حیل بلند آواز میں چیخا۔ وہ اپنا ہینڈل والا ہاتھ فضا میں لہرا رہا تھا۔

کزنہ نے ایک دم خوف زدہ ہو کر بریک لگائی اور رو حیل جو اچانک ہی اپنی بائیک ان کے سامنے لے آیا تھا تیز بارش اور پھسلن زدہ سڑک پر اس کی بائیک قابو سے باہر۔ ہو کر ان کی گاڑی سے ٹکرائی اور وہ اچھل کر بری طرح سڑک پر جا گرا۔

بارش سے زیادہ تیز اس کے سر سے نکلنے والا خون کا فوارہ تھا۔ اس کا سر بہت بری طرح زمین سے ٹکرایا تھا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد اس کا جسم بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کی ہیوی بائیک بھی دور جا گری تھی۔

کزنہ اور رومیہ صدمہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی اور ان کی بد قسمتی تھی کہ پولیس کی پٹرولنگ پر موجود گاڑی لٹک روڈ سے اچانک ہی مین روڈ پر آن نکلی اور انہوں نے رو حیل محمود کو اپنی آنکھوں سے ان کی گاڑی سے ٹکرا کر بہت بری طرح سڑک پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔

دو پولیس آفیسرز جلدی سے گاڑی سے اترے اور بڑی سرعت سے رو حیل کی طرف پہنچے کزنہ اور رومیہ صدمہ بھی گاڑی سے باہر نکل چکی تھیں۔ ٹھنڈا بخ موسم ان کی رگوں میں خون جما رہا تھا، لیکن وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

”آئی تھنک ہی از نو مور۔“ پولیس آفیسر کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر ان دونوں کو لگا جیسے مار گلہ کی ساری پہاڑیاں ان کے وجود سے ٹکرا کر ان کے پرچے اڑا گئی ہوں اور وہ دونوں منہ پر ہاتھ رکھے سخت صدمے سے رو حیل کے تیز بارش میں زمین پر پڑے۔ مردہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے تھا اور موت اس کے تعاقب میں تھی اور جیت اجل ہی کی ہوئی تھی۔



مری کے بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں رقص کرنے والے اولے اب روٹی کے گالوں کی صورت میں ہر چیز پر سفید چادر بچھا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پورے شہر نے چاندی کا لباس زیب تن کر لیا ہو۔ سڑکوں، عمارتوں، درختوں اور ہر چیز پر برف ہی برف تھی۔

میراؤس کا پچھلا دروازہ کھلا اور برساتیاں اپنے وہ تینوں لڑکیاں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے باہر نکلیں، موسم کی شدت بھی ان کے آہنی ارادوں میں کوئی دراڑ نہیں ڈال سکی۔ وہ زمین پر پچھے برف کے فرش پر احتیاط سے چل رہی تھیں۔

در شہوار کے ہاتھ میں چھاتا جب کہ طوبی نے ہاتھ میں ایک نارنجی اٹھار کھی تھی اور نیمیو کے پاس ایک شاپر تھا جس میں اس مشن کی تکمیل کا سامان موجود تھا۔ ان تینوں نے بڑی احتیاط سے محمد ہادی کے گھر کی چھوٹی سی دیوار پھلانگی وہ تینوں اب اس کے گھر میں موجود تھیں۔

”جلدی کرو۔“ سروی کی شدت سے طوبی کے دانت بچ رہے تھے۔

”اب کیا اڑنا شروع کر دیں۔“ در شہوار جھنجھلا گئی۔

”بکو مت۔ جلدی لاک لگاؤ۔“ طوبی نے غصے سے در شہوار کی طرف دیکھا جو بڑی احتیاط سے محمد ہادی کے گھر کے داخلی دروازے کی کنڈی چڑھا رہی تھی اور منصوبے کے تحت اب اسے باہر اپنا قفل لگانا تھا۔ ہادی کے گھر میں داخل ہونے کا واحد ہی دروازہ تھا جس پر لگا بھاری بھر کم قفل اب گھر میں موجود کیمنوں کو اندر قید کر چکا تھا۔

”پوسٹر نکالو۔“ در شہوار نے مشن کی کمانڈ سنبھالتے ہوئے اگلا حکم جاری کیا۔
 طوبی نے شار سے ایک درمیانی سائز کا پوسٹر نکالا اور دروازے پر چسپاں کر دیا۔ جس پر بڑے بڑے حروف میں
 ”گوانتا ناموبے“ لکھا ہوا تھا۔
 ”نیمرو باہر کے گیٹ پر لگے تالے میں اہلفی ڈال کر آؤ جلدی سے۔“ در شہوار نے سرگوشی میں اگلا حکم جاری
 کیا۔

”یار“ سنو فالنگ ”بہت زیادہ ہے۔“ ہادی کے برآمدے میں کھڑی نیمرو جھجک کر بولی۔
 ”بے فکر ہو، یہ برف تمہارے بھاری بھر کم جسم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہم لوگ اپنا کام کر چکے ہیں۔“ طوبی نے
 غصے سے کہا۔

”بکو اس مت کرو جاتی ہوں تم دونوں سب سے اوکھا کام مجھے دیتی ہو۔“ رات کے اندھیرے میں برف کے
 فرش پر احتیاط سے قدم رکھتی ہوئی نیمرو بڑی مشکل سے ہادی کے گیٹ تک پہنچی اور اندر کی طرف لگے تالے میں
 اہلفی ڈال کر جیسے ہی پلٹی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بڑی سرعت سے لان کے نچلے حصے میں جاگری در شہوار اور طوبی
 نے اپنے حلق سے نکلنے والے تھنوں کو بمشکل لبوں پر ہاتھ رکھ کر اندر ہی دیا۔

”ہائے منحوسو تم لوگوں کی انتقامی کارروائیاں موانع نہیں مجھے۔“ وہ زمین پر لیٹی دہائیاں دے رہی تھی۔
 ”ہمت کرو ورنہ برف کی قبر میں دفن ہو جاؤ گی۔“ طوبی اور در شہوار نے بمشکل اسے اٹھایا اور کمرے تک پہنچا
 کر ان کی اپنی حالت بری ہو گئی، لیکن وہ منظر یاد کرتے ہی ان دونوں کے منہ سے دوبارہ ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا جو نیمرو
 کو سخت ناگوار گزارا۔

”اللہ کرے تم دونوں کی داڑھ میں درد ہو۔“ آتش دان کے عین سامنے بیٹھی نیمرو بلند آواز میں انہیں
 بددعا میں دے رہی تھی۔

”ایک تو اتنی بڑی لاش کو ہم اتنی مشکل سے گھسیٹ کر کمرے تک لائے ہیں، اوپر سے تم ہمیں ہی بددعا میں
 دے رہی ہو۔“ طوبی نے اپنے بازو دباتے ہوئے اپنی کزن کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ جو دو کبل لے بھی
 ابھی تک کانپ رہی تھی۔

”ہاں تو تم دونوں کے انتقام کی جھلستی بھٹی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کون سا تھ دیتا ہے تمہارا۔“ نیمرو غصے سے
 بولی۔

”پچلو اس خوشی میں یہ گرما گرم چائے پیو۔“ در شہوار نے الیکٹرک کھٹل سے بنائی چائے کا بھاپ اڑاتا کپ
 اس کے سامنے رکھا۔

”میں ساتھ تین بوائے لے بھی کھاؤں گی۔“ نیمرو کی اگلی فرمائش پر در شہوار کا دماغ گھوما۔
 ”میں نے کون سی مرغیاں پال رکھی ہیں کمرے میں۔“ وہ تشریح کر بولی۔

”تھوڑا انتظار کر لو، رزلٹ آنے والا ہے بہت ایلڈے مل جائیں گے فری میں۔“ طوبی نے چائے کی بلند آواز
 میں چسکی لی۔

”دوبارہ چائے پیتے ہوئے یہ شوں کی آواز نکالی تو گلابا دلوں کی تمہارا۔“ در شہوار جھٹلا کر طوبی کی طرف پلٹی۔
 ”گلا تو تمہارا صبح وہ ہیرو دباے گا جب ”گوانتا ناموبے“ جیل کا دروازہ توڑ کر باہر نکلے گا۔“ طوبی نے مسکرا کر یاد
 دلایا۔

”ہاں تو پتہ لگا کس سے لیا تھا اس نے۔“ در شہوار اب چائے میں رس بھگو بھگو کر مزے سے کھا رہی تھی۔
 ”گوانتا ناموبے، دنیا کی خطرناک جیل۔“ طوبی یاد کر کے بلند آواز میں ہنسی۔

”یہ انتقامی منصوبے تمہارے ذہن میں خود سے آجاتے ہیں یا کوئی اسپیشل آن لائن کورس کیا ہے تم نے۔“ نیرو نے اپنی کہنی پر لگی رگڑ پر کرم لگاتے ہوئے یوں ہی پوچھا۔ اس سے پہلے کہ در شہوار اس کی بات کا کوئی ٹکٹھا سا جواب دیتی۔ اس کے کمرے کا دروازہ بجائے تینوں کی روح خفا ہو گئی، دیوار گیر گھڑی رات کے ڈھائی بج رہی تھی۔

”کون۔؟“ در شہوار نے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نیند بھری آواز نکالی۔

”ارسل۔“ نیرو کے بڑے بھائی کی سنجیدہ آواز سن کر تینوں نے سکون کا سانس لیا۔

”توبہ ہے ڈرائیو دیا، آپ کب آئے اسلام آباد سے۔؟“ در شہوار نے منہ ہناتے ہوئے دروازہ کھولا، اندر داخل ہوتے ہی وہ سامنے کا منظر دیکھ کر حیران ہوا، نیرو، قایلین پر کبل اوڑھے نیم دراز تھی اور اس کے ساتھ فلور کشن پر طوبی برجمان تھی۔

”شام میں ہی آ گیا تھا، یہ بتاؤ، میری یو ایس بی تھی تمہارے پاس۔“ ارسل قائد اعظم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس کر رہا تھا اور زیادہ تر نور محل میں وہاں بھائی اور فارحہ بھابھی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دوستانہ مزاج کا حامل ارسل اپنی بہن نیرو کے برعکس بہت نرم فطرت کا حامل تھا۔

”ہاں ہاں میرے ہی پاس ہے، لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ جاگ رہے ہیں۔“ در شہوار حیران ہوئی۔

”تم لوگوں کے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر اندازہ ہو گیا تھا، ساری فوجیں ہیڈ کوارٹر میں اکٹھی ہیں۔“

ارسل نے در شہوار کے کمرے کو ہیڈ کوارٹر کا نام دے رکھا تھا، کیوں کہ شرارتوں کے سارے منصوبے یہیں بیٹھ کر بنتے تھے۔

”آجائیں آپ بھی، چائے پیسے گے۔“ نیرو نے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے اپنے بھائی کو دعوت دی۔

”نہیں، تم لوگ انجوائے کرو، مجھے اپنی ایک اسائنمنٹ مکمل کرنی ہے، در شہوار کہاں ہے میری یو ایس بی۔“

ارسل کو یاد آیا کہ وہ کس کام سے آیا تھا۔

”اس کے لیے تمہیں میو بھیا سے کنٹیکٹ کرنا ہو گا کیوں کہ ان ہی کے لیپ ٹاپ پورٹ میں لگی ہوئی ہے۔“ در شہوار نے مسکرا کر بتایا۔

”اوہ، نو لیپ ٹاپ تو لے گیا وہ کھاریاں۔“ ارسل ہلکا سا ہوس ہوا۔

”کھاریاں، کیا مطلب۔؟ ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے تو نیچے ملاقات ہوئی ہے ان کی طوبی سے، کیوں طوبی؟“

در شہوار کے ایک دم پوچھنے پر وہ ہلکا سا گڑبڑا گئی۔

”ہاں ہاں بالکل۔“ طوبی نے حث اثبات میں سر ہلایا۔

”آئی ڈونٹ نو، میرے ساتھ بھی اس کی دو گھنٹے پہلے ہی بات ہوئی تھی اور تب وہ مری سے نکل رہا تھا۔“ ارسل نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”لیکن اس طرح اچانک کیوں؟ انہوں نے تو سنڈے کو جانا تھا۔“ در شہوار پریشان ہوئی اور جسے اصل میں فکر مند ہونا چاہیے تھا وہ مزے سے بیٹھی خشک میوے کھا رہی تھی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔“ ارسل نے اپنا دامن بچایا۔

”یہ کیسے ممکن ہے، آپ کو نہ بتایا ہو۔“ در شہوار کو بالکل یقین نہیں آیا کیوں کہ وہ جانتی تھی شاہ میر اور ارسل ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے اور ایک دوسرے کے گہرے راز دان بھی۔

”بھئی، میں اس کا پرستل اسٹنٹ تھوڑی ہوں۔ طوبی سے پوچھو، شاید اسے کچھ بتایا ہو۔“ ارسل کے

شرارتی انداز پر طوبی بوکھلا گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی چلتوزوں کی پلیٹ چھوٹ کر نیچے قایلین پر جا گری۔ ارسل

www.paksociety.com

اور در شہوار کے ساتھ ساتھ نمبروں نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایسے ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے وہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔



مری میں محمد ہادی کی صبح کا آغاز بڑے ہنگامہ خیز انداز سے ہوا تھا۔ ملازم گل خان نے انہیں بتایا کہ باہر کا دروازہ کسی نے لاک کر رکھا ہے۔ کچن کی کھڑکی کی سلاخ توڑ کر گل خان باہر نکلا تو ایک موٹا تازہ تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا اور جب اس نے گھر کے گیٹ کو کھول کر باہر جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے اندر لگے لاک کے ساتھ بھی کوئی کارستانی ہو چکی ہے۔ اس برقی موسم میں دو دو تالوں کو توڑنا اور پھر تالا توڑنے سے گیٹ کی کنڈی ہی اکھڑ گئی تھی، گل خان بڑی مشکل سے کسی ہندے کو ڈھونڈ کر لایا تھا جس نے گیٹ کی کنڈی کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں جوڑا تھا۔ دو سراسر گل خان رات کو گیزر جلانا بھی بھول گیا تھا اور اس سارے چکر میں دن کے بارہ بج چکے تھے اور اس وقت آفس جانا خود اپنے پیروں پر کھڑی مارنے کے مترادف تھا کیوں کہ ڈی ایف او کے دورے کی اطلاع انہیں مل چکی تھی۔

”تم مانویا نہ مانو ساری بے ہودگی اسی ”در شہوار گینگ“ کی ہے۔“ محمد ہادی نے غصے میں بالکل درست انداز لگایا۔

”ظاہر ہے اور کون کر سکتا ہے ہمارے ساتھ یہ حرکت؟“ سعد کبیل میں بگل مارے دونوں پاؤں صوفے پر رکھے بیٹھا ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خواخخواہ آفس سے بھی چھٹی کرنا پڑ گئی“ اب سنڈے کو اس ڈی ایف او کی جھاڑ سننا پڑے گی مفت میں۔“ ہادی بے زاری سے گویا ہوا۔

”ویسے بڑے ہی شیطانی دماغ ہیں ان لڑکیوں کے۔“ سعد نے مسکراتے ہوئے تھریاس سے گرم گرم چائے کپ میں اینڈر پلی۔

”یہ تو کھلی غنڈہ گردی ہے۔“ ہادی کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہوا۔

”غنڈا گردی نہیں دادا گیری۔“ سعد نے ہنس کر لقمہ دیا۔

”ان کو ذرا بھی کسی کا خوف نہیں۔“ ہادی نے غصے میں گرم گرم چائے کا کپ منہ سے لگایا۔

”ویسے گھر کو نام بہت مزے کا دیا ہے گوانا نامو بے۔“ سعد کو ایک دم ہی یاد کر کے ہنسی آ گئی۔

”میں آج ہی میرا حاکم علی کو تیار کر آتا ہوں ان کے گھر کی عورتوں کی کارستانیوں۔“ ہادی کا دوران خون ایک دفعہ پھر بلند ہوا۔

”ٹیواٹ یار، خواخخواہ۔ بات بڑھ جائے گی۔“ سعد نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی، وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

”اگر اس سلسلے کو ہمیں نہ روکا گیا تو ان کی بے ہودگیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔“ ہادی نے ناشتے کی ٹرے کو اپنی طرف کیا۔ اس سارے ہنگامے میں صبح کا ناشتا بھی خاصا لیٹ ہو گیا تھا۔

”ڈونٹ ووری، میں ارسل سے بات کروں گا“ اس سے اچھی گپ شپ ہے میری۔“ سعد نے اسے تسلی دی۔

”اب یہ ارسل صاحب کون ہیں۔؟“ ہادی نے بے زاری سے ٹوسٹ پر جیم لگایا۔

”میرا حاکم علی کا نواسا اور میرا محترم کا بھانجا“ اسی گھر میں رہتا ہے اور اکثر واک پر اس کے ساتھ گپ شپ رہتی ہے میری۔“ اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”ضروریات کرنا اور نہ میں زیادہ دیر تک لحاظ نہیں کروں گا۔“ ہادی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔
 ”چھاپچھوٹو ذرائعی وی اسکرین پر دیکھو، عالیہ آئی، کتنی گریس فل لگ رہی ہیں۔“ سعد کے ہلکے ہلکے انداز پر
 اس نے نی وی پر نظریں دوڑائیں اور اپنے والدین کو سامنے دیکھ کر اس کا سارا اشتعال اور غصہ جھاگ بن کر
 فضا میں تحلیل ہو گیا۔

بیر شریعالیہ قریشی، سرمئی رنگ کے سوٹ کے ساتھ نیلی شال میں ڈانس پر کھڑی انتہائی پروقار لگ رہی تھیں۔
 اسلام آباد کریڈنٹ لائنز کلب میں یہی نار کی فونج چل رہی تھی۔ عالیہ قریشی کے بعد کہہ کر عبد اللہ قریشی صاحب کو
 بھی خطاب کرتے ہوئے دکھا رہا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے لگے بینر پر آج کے یہی نار کا موضوع تحریر تھا۔

”بد عنوانی کے خاتمے میں نوجوان طبقے کا کردار“ یہی نار کے اختتام کے بعد بھی بے شمار نی وی کیمروں کی روشنیوں
 نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ دونوں ہی بڑی متاثر کن شخصیت کے حامل تھے۔ عالیہ
 قریشی خود تو بیہ سٹر تھیں اور ان کے شوہر قومی احتساب بیورو میں ڈائریکٹر جنرل کے اہم عہدے پر فائز تھے اور دونوں
 ہی کئی انسانی حقوق کی تنظیموں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔

کہہ رہے تھے کہ اب عبد اللہ قریشی کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ سیاہ سوٹ میں ان کی کپڑی سے جھانکتی سفیدی ان کے وقار میں
 کئی گنا اضافہ کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو کا انداز اور لہجہ متاثر کن تھا اور ان کے دلائل میں جتنے دریا کی سی روانی
 ہوتی تھی، اس کی بڑی وجہ ان کا وسیع مطالعہ اور متاثر کن تعلیمی ریکارڈ تھا۔ ہادی نے جلدی سے نی وی کی آواز کو
 بڑھایا۔ اپنے والدین کو ہمیشہ ایک ساتھ دیکھنا اس کو بڑی فطری سی خوشی کا احساس بخشتا تھا۔

”میم اینٹی کریپشن ڈے پر کیا آپ ہمارے ناظرین کو ساہ اور آسان الفاظ میں بتائیں گی کہ اصل میں کریپشن ہے
 کیا؟“ ایک نیوز چینل کی رپورٹر کے سوال پر مسز عالیہ قریشی کے ہونٹوں پر بڑی دوہمی سی مسکراہٹ ابھری۔
 ”ایک مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے آپ کا ہر وہ عمل جو قانونی، اخلاقی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی حدود
 سے تجاوز کر جائے، کریپشن کے زمرے میں آتا ہے۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں۔
 ”ہم اپنی سوسائٹی سے آخر کیسے کریپشن کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔؟“ ایک اور نیوز رپورٹر نے ان کے شوہر عبد اللہ
 قریشی کو گھیرا۔

”دیکھیں کریپشن کا خاتمہ کسی ٹارگٹ سے نہیں بلکہ ایک مسلسل عمل سے ہونا چاہیے۔“ عبد اللہ قریشی کا
 انداز خاصا بارعب تھا شاید اس کی وجہ وہ پوسٹ تھی جس پر وہ کافی عرصے تعینات تھے۔
 ”وہ کیسے۔ آپ اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟“

”کریپشن کبھی بھی چند سیاست دانوں یا کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے کرپٹ لوگوں کو جیل کی سلاخوں میں
 ڈالنے سے ختم نہیں ہوگی، اس کے لیے ہمیں اپنی اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہوگا۔ معاشرتی تفریق کو ختم کرنا ہوگا اور
 لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کو سب کے لیے یکساں کرنا ہوگا۔“ اس سوال کا جواب بیر شریعالیہ قریشی کی طرف سے
 بڑے تحمل اور متانت بھرے انداز میں آیا تھا۔

”یہ بات تو طے ہے کہ آئی عالیہ جہاں بھی ہوں، پورے ماحول پر چھا جاتی ہیں۔“ سعد نے کھلے دل سے انہیں
 سراہتے ہوئے ریہوٹ کنٹرول سے نی وی کی آواز کم کی۔

”ماشاء اللہ بہت کمپوزڈ اور اسٹونگ نروز کی حامل ہیں تمہاری مدد۔“
 ”یہ اپنی پروفیشنل لائف میں جتنی کمپوزڈ اور اسٹونگ نروز کی حامل نظر آتی ہیں، اپنی پرسنل لائف میں اتنی ہی
 ایموشنل ہیں۔“ ہادی نے ہنس کر تصحیح کی۔

”لیکن صرف تمہارے معاملے میں۔“ سعد نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں میرے معاملے میں تو بہت پوزے ہو ہیں۔“ وہ بڑے دل سے مسکرایا۔

”تمہیں پتا ہے، میں پری میچور ڈی لے لی تھا اور ایک ماہ مجھے نرسری میں رکھنا پڑا اور وہ ایک مہینہ ماما نے برا پر کھانا نہیں کھایا تھا اور میری پیدائش میری سگی پھپھو کے ہاتھوں ہوئی تھی جو بہترین گائناکولوجسٹ تھیں، لیکن جب تک میری کنڈیشن اسٹیبل نہیں ہوئی ماما روزانہ پھپھو سے لڑتی تھیں کہ تم نے میرا کیس خراب کر دیا۔“ ہادی نے ماضی کی چند چیزوں کو پہلی دفعہ سعد سے بانٹا۔

”ہاں اتنا تو پتا ہے مجھے پورے تیرہ سال بعد قدم رنجہ فرمایا تھا تم نے دنیا میں۔“ سعد نے مسکراتے ہوئے ٹوسٹ پر جیم لگایا۔

”ماما نے میرے ایک ایک دن کی تصویروں کا ایک پورا ریکارڈ مرتب کر رکھا ہے۔“ ہادی کی بات پر وہ خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔ اسی وقت ہادی کے سیل فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف منال تھی اس کی پھوپھی زاد کزن۔

”ہاں بھئی منو، پہنچ گئی ہو گھر۔“ ہادی نے اس کی کال اینڈ کرتے ہی اسے چھیڑا۔ سعد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کم لوگوں کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔

”جی جناب میں تو پہنچ گئی ہوں تم اپنی خیر مناؤ۔“ منال کھلکھلا کر ہنسی۔

”کیا مطلب؟“ وہ اس کی شرارت بھری ہنسی پر الجھا۔

”عالیہ ممانی کا موڈ سخت آف ہے، پتا ہے ناں آج ویڈیونگ اینورسری ہے ماموں ممانی کی۔“ منال کی بات پر وہ ہلکا سا بوکھلایا۔

”اوہ مائی گاڈ، میرے تو ذہن ہی سے نکل گیا تھا، ابھی پہنچتا ہوں میں گھر تمہاں کو ذرا ریلیکس کرو۔“

”میں تو کر لوں گی، لیکن تم ان کے لیے گفت لیڈنا مت بھولنا۔“ اس کی اگلی بات پر وہ ہلکا سا پریشان ہوا۔

”تمہیں پتا ہے ناں، مجھے لیڈیز شاپنگ کا کوئی ایکسپریٹس نہیں، گھر پہنچ کر میں تمہیں تیل دوں گا فوراً“ باہر نکل آتا، سیر مارکیٹ سے کچھ لے آئیں گے۔“ اس نے جلدی جلدی پلان بنایا۔

”اوکے، جلدی پہنچو میں نے ٹیک بیک کر لیا ہے۔“ منال نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ سعد نے پریشانی سے پوچھا۔

”یار ماما، پاپا کی ویڈیونگ اینورسری تھی اور میرے ذہن ہی سے نکل گیا، اب بھی منونہ بتاتی تو ماں تو مجھے صحیح صحیح قتل کر دیتیں۔“

”منو؟ یہ کون ہے، پہلی دفعہ سنا ہے یہ نام۔“ سعد نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”میری کویٹ والی پھپھو کی بیٹی ہے، آگنا مکس میں ماسٹرز کر رہی ہے اور بچپن سے ہمارے ہی گھر میں رہ رہی تھی، لیکن اب کچھ عرصے سے ہاسٹل شفٹ ہو گئی ہے، لیکن آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ ہادی کی اطلاع پر وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”خاصی فرینک لگتی ہے تمہارے ساتھ۔“ اس نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ ”کوئی چکر و کر تو نہیں۔۔۔؟“

”گدھے، رضاعی بہن ہے میری۔“ ہادی نے اس کے سر پر ہم پھوڑا۔

”رضاعی بہن، وہ کیسے؟“

”میری پیدائش پر ماما بہت بیمار ہو گئی تھیں اور باہر کا دودھ سوٹ نہیں کر رہا تھا مجھے تو میری پھپھو نے پورے دو ماہ اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی فیڈ کروایا تھا اپنا۔“ ہادی نے اس بار ذرا تفصیل سے بتایا۔

”اوہ سوری بابا۔“ سعد ایک دم شرمندہ ہوا۔

”اب تم بیٹھ کر شرمندہ ہوتے رہو، مجھے فوراً نکلتا ہے، ورنہ ماما کا پارہ منگائی کی طرح بڑھتا جائے گا۔“ وہ تیزی سے بیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا، اس کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور دوسری طرف در شہوار کے کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ ساؤنڈ سسٹم پر بلند آواز میں پھر وہی منحوس گانا گونج رہا تھا۔ جس سے ہادی کوچہ ہو گئی تھی۔

گھوڑے جیسی چال، ہاتھی جیسی دم۔

اوساون راجا کہاں سے آئے تم؟

مجھے کمرہ تبدیل کر لینا چاہیے۔ اس نے بے زاری سے کھڑکی بند کرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا اور واپسی پر اس پر عمل درآمد کرنے کا بھی تہیہ کر لیا کیوں کہ در شہوار کے کمرے کی کھڑکی سے اسے بہت سی ان گنی کہانیوں کی سرگوشیاں آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ ایسی کسی داستان کا مرکزی کردار نہیں بننا چاہتا تھا۔



ایف ایٹ سیکڑ میں واقع نور محل کے اندر کا موسم آج باہر کے موسم سے زیادہ سرد تھا۔ وہاں کا موڈ انتہائی بگڑا ہوا تھا اور فارحہ سہمے ہوئے انداز میں اپنی الماری کے اندر سے ان کی جامنی رنگ کی شرٹ ڈھونڈ رہی تھی جس کی آج اس کے مجازی خدا کو اچانک ہی یاد ستانے لگی تھی۔

”آج کی تاریخ میں طے کی شرٹ یا فاتحہ پڑھ لوں اس پر۔“ ان کا تلخ لہجہ فارحہ کے ہاتھ پر پھلارہا تھا۔

”یہیں رکھی تھی میں نے۔“ وہ خوف زدہ انداز میں گویا ہوئی۔

”بیچھے ہٹو، تم سے کوئی کام ڈھنگ سے ہوتا ہے بھلا، عجیب نحوست پھیلا رکھی ہے میری زندگی میں پچھلے چار سال سے۔“ وہاں نے غصے سے اپنی بیوی کا بازو پکڑ کر پیچھے دھکیلا اور خود اوڈروپ میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔

”میں نے بھی ملازموں کی ساری فوج اکٹھی کر رکھی ہے مری میں یہ نہیں ہونا کہ دو چار ڈھنگ کے نوکر یہاں بھی بھجوادیں، بہو تو ان کی دنیا جہان کی ست اور بیمار روح ہے اس سے تو اپنا آپ نہیں سنبھالا جاتا، مجھے اور گھر کو کیا خاک سنبھالے گی۔“ وہاں کا فشار خون بلند ہوتا جا رہا تھا۔

”آپ دوسری شرٹ پہن لیں۔“ فارحہ نے ہلکا سا جھجک کر مشورہ دیا۔

”بیکو اس بند کرو اپنی ورنہ منہ توڑوں گا تمہارا۔“ انہوں نے پلٹ کر غضب ناک نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس پر آج کل انہیں کچھ زیادہ ہی غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

فارحہ ظہیر کو چار سال پہلے جاننے والا کوئی بھی شخص اب دیکھتا تو حیران رہ جاتا، پنجاب یونیورسٹی کے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی گولڈ میڈلسٹ لڑکی کا سارا اعتماد اس کے شوہر وہاں نے شادی کے پہلے چار مہینوں میں ہی ختم کر دیا تھا۔ بات بے بات لڑائی جھگڑے، طنزیہ لہجہ اور چار لوگوں میں بیٹھ کر اس کی عزت نفس کو مجروح کرنا اس کے شوہر کا مرغوب مشغلہ تھا۔

شادی کے چھ ماہ بعد ہی فارحہ کو پتا چل گیا تھا کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہونے کی اصل وجہ وہ خود نہیں اس کے شوہر کی میڈیکل رپورٹس تھیں، اس بات کے بعد تو وہاں نے اسے اس قدر دیا دیا تھا کہ میرٹھیلی کی سب سے خواتین اس کی ذمے دار فارحہ کو ہی بھراتی تھیں، کیوں کہ اس کے بولنے سے پہلے ہی وہاں ایک ایک بندے کو پکڑ کر اپنی بیوی کو میورد الزام بھڑاچکا تھا اور فارحہ کے ہونٹوں پر جمی خاموشی نے خود بخود اس بات کی سچائی پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔

فارحہ کی کمزوری اور خاموشی کی ایک وجہ اس کے میکے کے حالات تھے اس کے والد نے بڑھاپے کی ولینیر

پہنچی اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی ایک اریٹھ عمر ایکٹریس سے کر لی تھی اور وہ خاتون اپنے تین بچوں کے ساتھ اس کے گھر پر قبضہ جما چکی تھی چنانچہ اس کے والد نے افراتفری میں اپنی دونوں بیٹیوں کو کسی بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا اور بیٹے کو باہر پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ اس کی دوسری بہن بھی اپنے گھر میں خوش نہیں تھی لیکن دونوں کو گلے میں پڑا ڈھول ہر حال میں بجانا تھا کیوں کہ میکے میں واپسی کا کوئی رستہ نہیں تھا اور یہ بات وہاں بہت اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسی کا فائدہ اٹھاتا تھا۔

”جاہل عورت یہ ہے وہ شرٹ جو تم گولا بنا کر وارڈروب میں پھینک چکی تھیں۔“ وہ اپنی مطلوبہ شرٹ نکال کر سامنے لے آیا فارحہ نے شرمنگی سے سر جھکا لیا۔

”کرنا ہوں تمہارا بھی علاج۔“ اس نے سیل فون پر اپنی والدہ ماجدہ اریٹھم کا نمبر ملایا۔
 ”امی یا تو اپنی اس پھوٹ اور دنیا جمان کی ست بہو کو مری بلو الیس اپنے پاس یا پھر صندوق کو شام سے پہلے بھجوا دیں یہاں۔“ وہ اپنے منصوبے کی راہ کامیابی سے ہموار کر چکا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا، کیا پھر کوئی جھگڑا ہو گیا تمہارا فارحہ سے۔“ دوسری طرف وہ گھبرا گئیں۔
 ”اس سے پہلے کہ کوئی لبا پنگا ہو جائے اور واپسی کی کوئی راہ نہ بنے اس منحوس عورت کو سمجھا دیں اپنی زبان میں اگر اس سے گھر نہیں نکھلتا تو چلی جائے اپنے باپ کے گھر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہاں کا کھٹسل لہجہ ماجدہ اریٹھم کے ہاتھ پر پھلا گیا۔

”آخر ہوا کیا ہے، کچھ بتا بھی تو چلے۔“
 ”اس عورت سے میری چیزیں تک سنبھال کر نہیں رکھی جاتیں ہر تیسرے دن کوئی نہ کوئی چیز گم کر دیتی ہے، سارا دن اسے کیبل اور ٹی وی دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی اور آخر کام ہی کیا ہے اسے۔“ وہ متفرکے میں مزید گویا ہوا۔

”شکر نہیں کرتی کہ میرا وہاں علی کی بیوی ہے یہ پیر و ہودھو کر بھی ہے تو تب بھی کم ہے ابھی تین حرف بھیج کر اس کے باپ کے گھر بھجوا دوں تو اس کی ایکٹریس ماں تین دن میں باغ درست کر دے گی اس کا۔“ اس کا زہر آلود لہجہ فارحہ کے دل کو آری کی طرح کاٹ رہا تھا۔

”چھا اچھا تم بھی تھوڑا تحمل سے کام لیا کرو۔ بھجواتی ہوں صندوق کو شام تک بہت پھرتی لڑکی ہے، سارا کام سنبھال لے گی۔“ اریٹھم کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے وہاں کی روح کو اندر تک سرشار کر دیا تھا، لیکن یہ موقع نرمی دکھانے کا نہیں تھا۔

”اس صندوق کو بھی اپنی زبان میں سمجھا کر بھجوائے گا، ذرا سی کوتاہی بھی برداشت نہیں کروں گا میں۔“ وہاں نے ابھی بھی اپنی ٹانگ اوپر ہی رکھی تھی۔

”تم خود بھی تھوڑا سمجھ جاؤ تو بہتر ہے۔ ہر وقت اپنے واجبی کی طرح توپ کے دہانے پر بیٹھے رہتے ہو۔“ اریٹھم بیگم اپنی اولاد کی زیادہ طرف داری کی قائل نہیں تھیں۔ ”فارحہ کہاں ہے، فون دو اسے۔“
 ”بات کرو امی سے۔“ اس نے بد تمیزی سے اپنا سیل فون بیڈر اس کی طرف پھینکا۔

”جی پھپھو۔“ فارحہ نے گرم گرم آنسوؤں کے گولے کو بمشکل نگلا۔ دوسری طرف ہمیشہ کی طرح ماجدہ اریٹھم نے اسے نرمی سے سمجھانا شروع کر دیا تھا اور یہ وہی باتیں تھیں جو وہ پچھلے چار سال سے سنتی آرہی تھی۔ ان میں کچھ بھی نیا پن نہیں تھا۔



قریبی ولا، بوگن ویلیا کی گلابی بیلیوں سے ڈھکا ایک خوب صورت جگہ تھا۔ جو اسلام آباد کی بارگاہ کی پہاڑیوں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کے عین سامنے واقع تھا۔ اس گھر کے وسیع و عریض لان کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا سونگ پول تھا۔ اس گھر میں مقیم تین افراد، محبت کی ایک مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے یہاں آنے والا کوئی بھی نیا بندہ ان کی آپس کی ذہنی ہم آہنگی اور بے تکلفی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

سیاہ گیٹ سے باہر عبداللہ قریشی کی ہنڈا اکارڈ گاڑی کا ہارن بجا چوکیدار نے بڑی مستعدی سے گیٹ کے دونوں پٹ واکیے۔ گاڑی سبک رفتاری سے سرمئی تارکول کی سڑک پر گویا بہتی ہوئی پوریج تک پہنچی اور وہاں پہلے سے موجود ہنڈا سوک کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بڑی پدرانہ شفقت بھری مسکراہٹ دوڑی تھی۔ ان کا پی اے جلدی سے ان کا بریف کیس اور فائلیں گاڑی سے نکالتے لگا۔

”خاور گاڑی کی بیک سیٹ پر رکھا فولڈر بھی میری اسٹڈی میں رکھ دینا۔“ انہوں نے بغیر مڑے اپنے پی اے سے کہا اور شاہ بلوط کی لکڑی کا ہتادروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے ان کی بھانجی منال، ملازمہ سے کھانے کی میز لگوا رہی تھی۔

”السلام علیکم ہاموں۔“ وہ بڑے پر جوش انداز میں ان کی طرف بڑھی۔

”وعلیکم السلام، کیسی ہے میری منو۔؟“ انہوں نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”فائن، آپ کو پتا ہے محمد ہادی صاحب بھی تشریف لائے ہیں۔“ اس نے اپنی طرف سے انہیں اطلاع دی۔ ”دیکھ چکا ہوں اس نالائق کی گاڑی، بمپر تھوڑا ٹوٹا ہوا ہے، لگتا ہے پھر کہیں سے ٹھکوا لایا ہے۔“ ان کے لہجے میں بیٹے کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ وہ تیز تیز جلتے ہوئے لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے اور جیسے ہی بیڈروم کا دروازہ کھولا، اندر وہی منظر ان کا منتظر تھا جو وہ پچھلے کئی سالوں سے دیکھتے آرہے تھے۔

”جینٹل مین! خیال آگیا تمہیں اپنی ماں کا۔“

قریشی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے اسے چھیڑا ہادی کی یہ بچپن کی عادت تھی، وہ ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ چمنار بتاتا تھا اور وہ بھی جاب سے آنے کے بعد ایک لمحے کو بھی اسے اگیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔

”اپنی پیاری ماں کا خیال بھولتا ہی کب ہے مجھے۔“ اس نے بھی دو بندو جواب دیا۔ ویسے بھی قریشی والا وہ واحد جگہ تھی جہاں محمد ہادی کو دیکھنے والے کبھی اس بات کا یقین نہ کرتے کہ وہ اس قدر بس مکھ، شرارتی اور نرم دل بھی ہو سکتا ہے۔ باہر کی دنیا میں اس کا امیج بہت سنجیدہ اور کسی حد تک اکھڑ مشہور تھا اور اس نے کبھی اس کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

”عالیہ! مسکھ لگا رہا ہے تمہیں، پتا ہے نا پورے سات دن بعد آیا ہے یہ گھر۔“ قریشی صاحب نے کوٹ اتارتے ہوئے شرارتی انداز سے اپنی بیگم کو بھڑکانے کی کوشش کی۔

”بابا ویسے بڑے ہی کوئی افسوس کی بات ہے۔“ وہ فوراً اٹھ کر تاسف بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ”خود آپ اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ میں جاب کرتے ہیں، اس طرح کسی کے جذبات کو مشتعل کرنا بھی جذباتی کرپشن کے زمرے میں آتا ہے۔“ اس نے برابر دھری میز پر رکھی پھلوں کی ٹوکری سے سیب اٹھایا اور مزے سے کھانے لگا۔

”تو عین نے کون سی غلط بات کی، آخر مری ہے ہی کتنا دور، تمہیں اپنی ماں کی فیملنگز کا خیال ہونا چاہیے، آخر کو اکلوتی اولاد ہو اس کی۔“ وہ بظاہر عالیہ بیگم کی طرف داری کر رہے تھے، لیکن وہ مسکراتے ہوئے ان کی شرارت سمجھ چکی تھیں۔

”ماما، آپ کو شریک عناصر کی باتوں میں آنے کی قطعاً ضرورت نہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ”کچھ“ لوگ ماضی میں بھی ایسی حرکتیں کر کے ہمارے تعلقات کو خراب کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔“ اس نے ماں کا

ہاتھ مضبوطی سے دبا کر شوخی سے کہا۔
 ”میں سب جانتی ہوں بیٹا۔“ انہوں نے محبت سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔
 ”خواتین و حضرات، کھانا لگ چکا ہے ٹیبل پر، آپ لوگ تشریف لاسکتے ہیں۔“ منائل نے ہلکا سا اندر جھانک کر
 بلند آواز میں اعلان کیا۔
 ”دیکھ لو منو، آج اپنا بیٹا آیا ہے تو آپ کو بھی کوئی لقمہ ہی نہیں۔“ قریشی صاحب کا موڈ آج خاصا خوش گووار
 تھا۔

”ماما، آپ کے شوہر نامہ دار گھر کا ماحول خراب کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“ ہادی نے عالیہ بیگم کو بھڑکایا
 اور اس میں کافی کامیاب بھی رہا۔
 ”عبداللہ صاحب! اپنی عمر دیکھیں اور حرکتیں دیکھیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بیڈ سے اٹھیں۔
 ”کیوں، کیا ہوا ہے میری عمر کو، کل تمہارے چیمبر میں تمہارے کلائنٹ کے ساتھ آنے والی بیٹی بھی کتنے غور
 سے دیکھ رہی تھی مجھے۔“
 ”ماموں، آپ کی شکل ملتی ہوگی اس کے فادر سے۔“ منائل نے اپنا نچلا ہونٹ دبا کر شرارت سے کہا تو ہادی اور
 عالیہ بیگم بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”بھانجی، آپ سے مجھے اس طوطا چشتی کی امید نہیں تھی۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے گویا ہوئے۔
 ”سوری ماموں۔“ منائل نے کان کھجاتے ہوئے معذرت کا اظہار کیا۔ وہ قریشی صاحب کی کوبت میں مقیم
 اکلوتی بہن کے تین بچوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی تھی اور بڑھائی کے سلسلے میں گزشتہ بہت سالوں سے
 پاکستان میں مقیم تھی۔ قریشی صاحب اور عالیہ بیگم نے پوری کوشش کی وہ ان ہی کے ساتھ اس گھر میں رہے، لیکن
 وہ دونوں ہی اپنی نوکری اور پیشہ ورانہ مصروفیات کی بنا پر مصروف رہتے تھے۔ اس لیے کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد
 وہ بیزار ہو کر پائل میں مقیم ہو گئی تھی۔ اس کی ہادی کے ساتھ گہری دوستی تھی، حالانکہ وہ اس سے دو تین سال
 چھوٹی تھی، لیکن اسے دھڑلے سے صرف ہادی کہتی تھی۔ اب تو اس کی والدہ نے بھی اس بات پر اسے ٹوکنا چھوڑ
 دیا تھا۔

”ہاں بھئی منو، کیا کیا بنایا ہے؟“ ہادی ڈونگے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔
 ”تمہاری فیورٹ حلیم، قیمہ مٹر اور نہاری۔“ منائل کی بات پر وہ مسکرایا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جب بھی گھر
 پر ہوتی، اس کی پسند کا کھانا بنانا اس پر واجب ہو جاتا تھا۔

”چلو ہم بوڑھے لوگ۔“ قریشی صاحب نے مسکرا کر بیچ میں لقمہ دیا۔
 ”آپ کی آج ویڈنگ اینورسری ہے بابا، لے کر جائیں ناں ماما کو کوئی مووی شووی دکھانے یا لائنگ ڈرائیو پر کم از
 کم آپ کو آج کے دن تو ماما کو امپورٹینس دینی چاہیے، ویسے تو پورا سال ذرا خیال نہیں ہوتا آپ کو ان کا۔“ ہادی
 نے انہیں چھیڑا اور وہ اس کی شرارت سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنسے۔
 ”ہاں ہاں ہنس کر ٹال دیا کریں ایسی باتوں کو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے وہ۔“ عالیہ بیگم حقیقتاً ”برامان گئیں۔“
 ”بہت خبیث روح ہو تم۔ لگا دینا اپنی ماں کو میرے پیچھے۔“

”الحمد للہ۔ اپنی صلاحیتوں پر کبھی غرور نہیں کیا، آخر کو بیٹا کس کا ہوں۔“ ہادی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا،
 جو کھانا بھول کر اب عالیہ بیگم کو منانے میں لگے ہوئے تھے۔ جب کہ منائل بھی مزے سے عبداللہ صاحب کو منتیں
 کرتا دیکھ رہی تھی۔

طوبی اسٹگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

سامنے آتش دان کے قریب رکھی راکنگ چیئر پر انابہ نے اپنی گود میں مظہر الاسلام کی کتاب ”محبت مردہ پھولوں کی سفینی“ رکھی، آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں گم تھی، اسے طوبی کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے چپکے سے کتاب اٹھائی، سامنے چند لائنوں کو انڈر لائن کیا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے انہیں پڑھنا شروع کر دیا۔

”محبت بڑی شفاف چیز ہے کسی آئینے کی طرح، اس پر ہلکا سا ناگواری کا کوئی میلا چھینٹا، بھی فوراً دکھائی پڑ جاتا ہے، ہر جگہ اور خاص چیز کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ تھوڑا سا ناخالص احساس بھی یک دم برا لگنے لگتا ہے۔ اس لیے کسی بھی میلے لفظ، جملے، کج ادائیگی یا دل کی کسی عاقل دھڑکن کی وجہ سے محبت کے سب کو کیزا لگ جاتا ہے۔“ طوبی نے سر اٹھا کر اپنی بہن کے افسردہ چہرے کو غور سے دیکھا، وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے نیاز گہری سوچوں کے سمندر میں غلطاں تھی۔

”بیابا۔۔۔!! اس نے اسٹگی سے اسے پکارا۔

”ہوں۔۔۔“ انابہ نے آنکھیں کھولیں، جو دیکھتے ہوئے انکار سے ہی طرح سرخ تھیں۔

”یہ اتنی مشکل باتیں کیسے سمجھ میں آ جاتی ہیں آپ کے؟“ اس نے مظہر الاسلام کی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں مشکل کیا ہے۔۔۔؟“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”مجھے محبت کے اتنے پیچیدہ فلسفے سمجھ میں نہیں آتے۔“

”محبت جس کی سمجھ میں آجائے اسے کچھ اور سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔“

”ذرا اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گی؟“ طوبی نے منہ بتایا۔

”جب محبت کسی دل پر اترتی ہے تو کائنات کے سارے راز اس پر آشکار ہونے لگتے ہیں۔ ان کئی کہانیوں کے رمز سمجھ میں آنے لگتے ہیں، افسانوی کرداروں کی حقیقتیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں، محبت میں کیا کیوں اور کب نہیں ہوتا، صرف ”ہاں“ اور ”جی“ کی گردان ہوتی ہے۔ محبت ”ہاں“ کے مقبرے پر بیٹھ کر ہر وقت خود کو مٹانے کا نام ہے۔“ وہ خلا میں کسی ناویدہ نقطے پر آنکھیں جمائے کسی اور جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔

”برہان بھائی سے محبت کرتی ہیں ناں آپ؟“ طوبی نے اس دفعہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا اب بھی اس سوال کے جواب کی ضرورت ہے؟“ انابہ نے اسے لاجواب کیا۔

”اور وہ کرتے ہیں آپ سے؟“ طوبی کا عجیب سا لہجہ اسے وہ بات سمجھا گیا، جسے وہ جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے نظریں چرا کر کہا۔

”کس دور میں رہتی ہیں، بیابا، اب ایک طرف محبتوں کا زمانہ گزر گیا، محبت کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر چلتی ہے۔“ طوبی اس سے چھوٹی لیکن زیادہ حقیقت پسند تھی۔

”کیا اب مجھے جا کر ان سے چاہت کی بھیک مانگنی چاہیے۔۔۔؟“ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر

ابھری۔

”بھیک کیوں اپنا حق مانگیں۔ آخر کون نکاح ہوا ہے آپ کا ان کے ساتھ۔“ اسے بہن کی حالت دیکھ کر برہان پر غصہ آیا۔

”نکاح کے چند بولوں سے اگر دلوں میں چاہتوں کی فصل اگ آتی تو آج دنیا کے سارے شادی شدہ جوڑے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہے ہوتے۔“ انابہ پھیکے سے انداز میں زبردستی مسکرائی۔

”تو پھر چھوڑ دیں انہیں اپنی زندگی پر سکون بتائیں، قریب رہ کر سلگنے سے بہتر ہے بندہ کسی مقام پر پھنچ جائے۔“

طولی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی جو اسے خاصی مہنگی پڑی۔
 ”جب خود اس پمپوشن سے گزرو گی تو تب پوچھوں گی۔“ وہ برامان گئی تھی۔
 ”کیا مطلب؟“

”ترک محبت کا مشورہ دینا آسان ہوتا ہے، لیکن اس پر عمل درآمد کرنے سے پہلے ہی بندہ کو نکلنے کے دیکھتے
 فرش پر ننگے پاؤں آن کھڑا ہوتا ہے، محبت سے جتنا دور بھاگو، اتنا ہی آپ کے تعاقب میں آتی ہے، تھک ہار کر
 کہیں بیٹھ جاؤ، تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے، اپنے دل میں اس کی قبر بنا لو، تو ہر روز پہلے خود مرنا پڑتا ہے۔“ انابییہ
 تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔

”بے فکر رہیں، میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتی، کیا فائدہ ایسی ان دیکھی آگ میں سلگنے کا۔“ وہ بے فکری
 سے مسکرائی۔

”تم کہہ سکتی ہو، کیونکہ تم خود ابھی اس اسٹیج سے نہیں گزریں، بہانہ کی طرح تم بھی کسی اور کے تڑپنے کا تماشا
 دیکھ رہی ہو ابھی۔“ انابییہ کی بات پر اسے کرنٹ لگا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑا کا انداز میں بالکل اس کے سامنے آن
 کھڑی ہوئی۔

”کس کے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہی ہوں میں؟“

”شاہ میر کے۔“ انابییہ کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے طولی کو لگا جیسے میراؤس کی چھت اس پر آن
 گری ہو۔ وہ بات جو اس نے اپنی طرف سے نہ بھرے چھپا رکھی تھی، وہ اس کی ماں جانی کونہ صرف معلوم
 تھی، بلکہ اس حوالے سے پہلا طعنہ بھی اسی کی طرف سے مل چکا تھا۔



تھک ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے نے اس کے چہرے کو چھو کر طمانیت کا احساس بخشا۔
 شالیمار کرکٹ گراؤنڈ میں بنے جاگنگ ٹریک پر بھاگتی ہوئی شہر زاد نے ہینڈ فری کانوں سے لگا رکھا تھا۔ اس کا
 سیل فون اس کی جیب میں تھا۔ یہ اس کا چوتھا چکر تھا، جب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کی گہری نظروں کے
 حصار میں ہے۔

وہ چلتے چلتے رکی اور اس نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا، اس وقت کافی لوگ یہاں موجود تھے اور ہر
 کوئی اپنی دھن میں ٹریک پر بھاگ رہا تھا اور کسی کی بھی توجہ اپنی طرف نہ پا کر وہ سنگ مرمر کے بیچ پر بیٹھ گئی۔
 جیب کی جیب سے پانی کی چھوٹی بوتل نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ اسی وقت اس کے سیل فون کی حترنم
 گھنٹی بجی۔

اس نے فون نکال کر دیکھا، نمبر بک میں سنبھلو سے آنے والی ”ہم زاد“ کی کال دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک جان
 دار مسکراہٹ ابھری۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ کال اسی کی ہوگی۔

”آپ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ محتاط ہیں۔“ شہر زاد نے کال اینڈ کرتے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔
 ”سیدھا سا دا بزل بھی کہہ دیتیں تو میں مانتا نہ کرتا۔“ وہ قہقہہ لگا کر اپنی بات پر خود ہی ہنسا تھا۔
 ”ہاں وہ تو اندازہ ہو رہا ہے مجھے، ورنہ اپنے ڈائریکٹ نمبر سے کال کرتے۔“ وہ مسکرائی۔
 ”ڈائریکٹ ڈائریکٹ بھی کر لیں گے جس دن کوئی گرین سگنل ملے گا۔“ وہ معنی خیز لہجے میں گویا ہوا۔
 ”ہاں خوش فہمی اچھی چیز ہوتی ہے، کم از کم اس کی وجہ سے زندگی تو آسان لگنے لگتی ہے۔“
 ”کہہ سکتی ہیں آپ۔“ وہ اس کا طنز سمجھ کر مسکرایا۔

”چھا تو شایمار کرکٹ کلب بھی آتے ہیں جاگنگ کرنے۔“ شہرزاد نے اس دفعہ براہ راست حملہ کیا۔
 ”ایک پاؤں روہاں نہیں آئے گا تو اور کہاں جائے گا۔“ دوسری طرف وہ اس کے اندازے کی درستی پر دل سے
 مسکرایا۔

”تو چھپیں گے نہیں کہ کیسے پتا چلا مجھے۔“ شہرزاد کو حیرانی ہوئی۔
 ”ایک اٹلی جنٹ، میر سٹر سے ایسا سوال کرنے کی حماقت کم از کم میں نہیں کر سکتا۔“ اس دفعہ اس نے شہرزاد کو
 لاجواب کیا۔

”تو کو نے کھدروں میں چھپ کر گھورنے کی بجائے سامنے آکر بات کریں اتنی بھی خوفناک نہیں ہوں میں۔“
 وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔

”میرے فیورٹ قان کٹر میں کوئی لڑکی بھلا کیسے خوفناک لگ سکتی ہے۔“ اس کے شرارتی انداز پر شہرزاد نے
 چونک کر دیکھا، وہ اس وقت نیوی بلیو کٹر کی جینز پر قان کٹر کی جیکٹ پہنے ہوئی تھی۔
 ”بہت خوب اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔“ وہ تھوڑا سنجیدہ ہوئی۔

”جناب، آپ اندازوں کی درستی کو چھوڑیں اور اپنی گاڑی کی ہیڈلائٹس بند کر دیں ورنہ بیڑی ختم ہونے کے
 بعد پراہٹم ہوگی۔“ اس کی بات پر وہ فوراً ”بو کھلا کر کھڑی ہوئی“ صبح جب وہ گھر سے نکلی تھی تو ملکا جیسا اندھیرا تھا اور
 گاڑی کی مائٹس جلانے کے بعد وہ شاید بند کرنا بھول گئی تھی۔

”بائی واوے، یہ میری نہیں میری مام کی گاڑی ہے۔“ وہ بات کرتے کرتے پارکنگ کی طرف چل پڑی۔
 ”جی مجھے پتا ہے، دو گاڑیاں ہیں آپ کے گھر میں، ایک مسزینٹا کے استعمال میں ہوتی ہے اور دوسری آپ کی
 چھوٹی سسٹر روہی کے پاس، اگر کہیں تو روہی مام کی گاڑی کا نمبر بھی بتا دیں۔“ اس کے لہجے میں شرارت کی
 فراوانی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں، آپ صرف اپنی گاڑی کا نمبر بتادیں۔“ شہرزاد کی فرمائش پر وہ بے ساختہ انداز میں ہنسا۔
 ”میں تو غریب سا بندہ ہوں، کہاں انورڈ کر سکتا ہوں گاڑی چھوٹی مولی بائیک ہے میرے پاس۔“ اس نے صاف
 ٹالا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے اپنی گاڑی کے پاس آن رکی، اس کے پونٹ پر ایک سفید رنگ کا کھلتا ہوا گلاب پڑا
 تھا۔ اس نے پھول اٹھاتے ہوئے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، پارکنگ میں کافی گاڑیاں تھیں اور زیادہ تر لوگ
 واپس جا رہے تھے۔

”یہ پھول آپ نے رکھا ہے میری گاڑی پر؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔
 ”معذرت خواہ ہوں، آپ کی آمد کتنی فرم نہیں تھی ورنہ کبے لے کر آتا، یہ بھی یہیں سے توڑا ہے، آئنٹر آئل
 روٹین لائف کی طرف پہلا دن تھا آپ کا۔“ اس سے پہلے کہ وہ اس کی بات کا جواب دیتی ٹینا بیگم کی صبح آنے
 والی کال نے اسے حیران کیا، کیونکہ ان کی صبح باہر بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔
 ”ہکسکو زئی، میری مام کی کال آرہی ہے پائے۔“

شہرزاد نے جلدی سے ٹینا بیگم کی کال اینڈنگ کی، جو اس باختہ انداز میں بول رہی تھیں۔ ”شیری، تم کہاں ہو۔
 فوراً پہنچو گھر۔“

”مام، خیریت تو ہے نا۔“ وہ تھوڑا سا بو کھلائی۔
 ”تمہیں پتا ہے، رومی کو پولیس نے اریسٹ کر لیا ہے، میر سٹر محمود کے بیٹے کے موڈر کے جرم میں۔“ ٹینا بیگم کی
 بات پر اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

منظر جیسے سڑک کنارے کے درخت، جھاڑ، جھنکار،
رواں رواں ٹریفک، چلتے پھرتے لوگ، عمارتیں،
دکانیں، گدھا گاڑیاں یوں سرعت سے تبدیل ہو رہے
تھے جیسے نگین کی روزمرہ کی زندگی۔ اور دور کے مناظر
جیسے دور دور تک پھیلے کشادہ کھیت کھلیان، ان سے
بہت پیچھے کھردرے پختیل پہاڑ۔ اور آسمان پر چھائے
سفید اور سرمئی بادل۔ بالکل اس کے ماضی کی
طرح۔ جو قدرے پیچھے چلا گیا تھا۔
ڈرائیور نے کار کی رفتار کم کی تو نگین نے بے ساختہ
سامنے دیکھا۔ ایک بوڑھا آدمی پیٹھ پر بوری لاوے
سڑک پار کر رہا تھا۔ نگین کی آنکھوں نے بلاوجہ ہی دور
تک اس بوڑھے آدمی کا تعاقب کیا۔ ”کتنے اچھے

فوج بخاری



Downloaded From
Paksociety.com

ہوتے ہیں وہ بوجھ جو مزدور اپنے کندھوں پر لاوے
پھرتے ہیں۔ تھک جانے پر جنہیں وہ دوسروں سے
بانٹ بھی لیتے ہیں۔ اتار بھی پھینکتے ہیں اور بالآخر منزل
پہنچ کر جس سے مکمل نجات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔
لیکن یہ دلوں پہ رکھی سلیں۔ اور پچھتاؤں کے
بوجھ۔ ”نگین نے نظر ہٹائی۔

”کیا آج کم ہو پائے گا یہ درد۔ یا کچھ اور بڑھ جائے
گا۔ گزرے سولہ سال۔ جو کبھی لگتا۔ یوں مٹھی
کھولتے ہی ہاتھ سے پھسل گئے۔ اور کبھی۔ ”شافحہ
کے تصور سے پہلی مرتبہ اس کے لب مسکرا اٹھے۔
”دکتنی دور کھڑی لگتی ہے۔ سولہ برسوں میں جس کا
ایک۔ نقش کبھی آنکھ کے پردے سے اوچھل نہیں

زندگی میں کچھ دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں
روزمرہ کے جھنجٹ میں عارضی طور پر ہم بھول
جاتے ہیں اور وقت کی دھول کچھ ایسے انہیں اپنی لپیٹ
میں لے لیتی ہے کہ ان پر سوچنے کے لیے ہمیں
فرصت ہی نہیں ملتی، لیکن پھر اچانک حالات ہمیں
ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ بھولا ہوا وہ دکھ اور کھوئی
ہوئی یاد عین آنکھوں کے سامنے پوری شدت سے
تازہ ہو جاتی ہے۔ تب حال کا ہر منظر اپنی رعنائی کھودیتا

نگین کی گاڑی شہر سے نکل کر اب گاؤں جانے والی
مضافاتی سڑک پر آگئی تھی۔ اس نے ایک تھکی تھکی آہ
بھر کر کھڑکی کے پار بدلتے مناظر کو دیکھا۔ قریب کے



WWW.PAKSOCIETY.COM



ہوا۔ جانے اب کیسی لگتی ہوگی۔ جانے وہ اب وہاں ہوگی بھی یا نہیں۔ اس سے ملنے کا یہ ایک موقع، اگر — چلا گیا تو۔ ”تکلیف اچانک ہی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگی۔ گزرے سولہ برسوں میں گاؤں واپس آنے کی خواہش جیسے ایک حسرت سی بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن آج وقت اور حالات نے خود یہ موقع اس کی جھولی میں ڈالا تو یہ حسرت، دعا بن کر لبوں پہ چل رہی تھی کہ کاش اس ایک دن کے مختصر سے وقت میں وہ شافحہ سے ملاقات کپائے۔ معافی مانگ پائے، اس ایک غلطی کی جو نادانی میں اس سے سرزد ہوئی تھی۔

گاؤں ابھی بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی دوری پر تھا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ پرانے دنوں کی یاد میں کھو گئی۔ سولہ سال پہلے جب وہ محض سترہ برس کی شوخ اور کھلانڈری سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ اس کی گیارہویں جماعت کی نئی نئی کلاسز شروع ہوئی تھیں، جب فردوس باجی کے بطور سی ٹی ٹیچر آرڈرز آگئے۔ گاؤں کا نام ابو سمیت ان سب کے لیے نیا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ شہر سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک ایسا دیہات بھی ہے جس کے وہ نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ابو نے فوری طور پر محکمہ انجکیشن میں اپنے کچھ جاننے والوں سے علاقے کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ تو خطرناک پچھوؤں، اڑن سانپوں اور مفروز، ڈاکوؤں کا علاقہ ہے۔ ابو کے لیے یہ ابتدائی معلومات اتنی پریشان کن تھیں کہ وہ فردوس کو ایک مرتبہ بھی وہاں بھیجنے پر تیار نہیں تھے لیکن اسکول کی پرنسپل صاحبہ جو کہ خود بھی شہر سے وہاں جاتی رہتی تھیں، فردوس کی ملاقات قدرے تسلی بخش رہی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے علاوہ شہر سے تین ٹیچرز اور بھی وہاں جاتی ہیں۔ البتہ سفر کی طوالت کی وجہ سے دو روز بعد واپس آتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صبح ساڑھے چھ بجے ساری ٹیچرز بس اسٹینڈ پہنچتی ہیں اور اکٹھی اسکول جاتی ہیں۔ لہذا وہ بھی ایسا ہی کرے تو ہر

قسم کی پریشانی سے خود کو بچا سکتی ہے۔ پرنسپل صاحبہ کے اطمینان دلانے پر ابو فردوس کو بھیجنے پر راضی تو ہو گئے، لیکن اکیلے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ شروع کے دنوں میں تکلیف بھی اس کے ساتھ جائے گی۔

گاؤں کی طرف وہ پہلا سفر تکلیف کو آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ حالانکہ ایک سال کے دوران تکلیف کا بے شمار بار گاؤں جانا ہوا تھا۔ لیکن وہ پہلا سفر تکلیف بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ دل میں سانپوں، پچھوؤں اور ڈاکوؤں کا خوف لیے وہ لوگ ڈرہ اسماعیل خان سے روانہ ہوئے۔ ٹانگ شہر پہنچ کر وہ لوگ بس سے ڈائسن میں بیٹھے اور گاؤں کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ ٹانگ سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر عین بھٹنی کی ہاڑیوں سے اوھر وہ سچ سچ ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ شیشم اور دھریک کے درختوں کی بہتات راستے کی ہولناکی میں کچھ اور بھی اضافے کا باعث تھی۔ علاقے کی زمین زیادہ تر بنجر اور پھری تھی۔ کھیت بھی تھے تو سہی، لیکن کہیں کہیں۔ آبادی بھی بہت فاصلہ طے کرنے کے بعد آئی تھی۔

بالآخر ایک بہت بڑے قلعہ نما پولیس اسٹیشن کے آتے ہی ان کی ڈائسن رک گئی اور ساھی ٹیچرز نے انہیں اترنے کا اشارہ کیا۔ ڈائسن دھول اڑائی آگے بڑھ گئی اور وہ لوگ پولیس اسٹیشن کے مخالف سمت والے کھیتوں میں اتر کر پیدل اسکول کی طرف بڑھنے لگے۔ تب ہی ایک الجھے بکھرے بالوں اور لمبے لمبے سے چولے والا پاگل سا لڑکا اچانک ان کے سامنے آگیا۔ فردوس کی توجہ کا قاعدہ چیخ نکل گئی۔ مس آمنہ نے ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ وہ دیوانہ کچھ دیر تو ان کے پیچھے چلتا رہا اور پھر نہ جانے کدھر کو مڑ گیا۔ تکلیف کی دیر سے انکی سانس بھی قدرے بحال ہوئی اور بالآخر اسکول کا گیٹ بھی دکھائی دینے لگا۔

باجی کا اسکول چھٹی سے دسویں جماعت تک تھا۔ لڑکیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اسکول کی عمارت بھی کافی بڑی تھی۔ بڑے سے اسٹاف روم میں کرسیاں بھی

تھیں اور چارپائیاں بھی۔ یعنی اسکول ٹائم کے بعد ہی کمرہ ٹیچرز رہائش کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ مگر اپنے ساتھ کورس کی چند کتابیں بھی لائی تھی۔ سباجی اور دوسری ٹیچرز جب پیریڈ — لینے چلی گئیں تو وہ اپنی کتابیں لے کر لان میں آگئی۔ چوتھے پیریڈ میں البتہ اسے پر سہل راشدہ نے کہلا بھیجا کہ مس عائشہ آج غیر حاضر ہیں۔ چھٹی جماعت ان کی غیر موجودگی میں کافی شور کر رہی ہے۔ لہذا وہ ذرا کلاس روم میں چلی جائے اور انہیں چپ کرادے۔ وہ نگلین کی لائف کی پہلی ٹیچنگ پریزنٹس تھی اور کلاس کنٹرول کرنے کی یہ ذمہ داری آنے والے دنوں میں اسے اکثر ہی انجام دینا پڑی۔ نگلین یہ ذمہ داری نہ صرف خوشی خوشی انجام دیا کرتی بلکہ حسب استطاعت بچیوں کو پڑھا بھی دیا کرتی۔

نویں اور دسویں جماعت کی لڑکیاں البتہ کافی لاڈلیاں تھیں۔ ہمیشہ ہی نہ صرف بڑھنے سے انکار کر دیتیں بلکہ نگلین کے ساتھ خوب گپ شب بھی لگاتیں۔ وہ بھی انہیں آہستہ بولنے کی تشبیہ کر کے بولنے کے موڈ میں آجاتی۔ وہ بات کے لوگ واقعی بہت مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ جب بھی سباجی کے ساتھ گاؤں آتی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، لڑکیاں بہت شدت سے اس کی آمد کی منتظر ہوتیں۔ سباجی اب چونکہ یہاں کے ماحول کے ساتھ کافی ایڈجسٹ ہو گئی تھیں۔ اس لیے نگلین دوبارہ اپنے کالج کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ لیکن ہفتے ڈیڑھ کے بعد ایک آدھ چکر ضرور وہاں کا لگایا کرتی، کیونکہ گاؤں والوں کی محبت اسے بھی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سچ ہے کہ دل کی خوشی کامادی اشیاء سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی خوراک صرف محبت ہے اور وہ اسے جہاں سے ملے یہ اسی طرف ہمکتا ہے۔

سانپوں، بچھوؤں اور مفروز ڈاکوؤں سے بھرے اس گاؤں کے لیے نگلین کے دل میں محبت دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نگلین نہ صرف لڑکیوں بلکہ ٹیچرز میں بھی خاصی مقبول تھی۔ فردوس کی نسبت وہ زیادہ

سوشل، اہلکامی اور باتنی تھی۔ اس لیے جلدی توجہ حاصل کرنے کا باعث بن جاتی تھی۔ گاؤں میں گزرا وہ ایک سال، نگلین کے ماضی کے چند حسین ترین واقعات میں سے ایک تھا۔ مثبت سوچ رکھنے والوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ماضی میں جھانکتے ہیں تو صرف خوب صورت دنوں کی یاد سے دل و دماغ کو سیراب کرتے ہیں۔ پھر ایسی جگہ جہاں وہ چاہے اور سراہے بھی گئے ہوں، انہیں کبھی نہیں بھولتی۔ نگلین بھی فرصت کے لمحات گئے دنوں کی یاد میں بسر کر کے بہت خوشی اور سکون محسوس کرتی تھی اور جہاں اس کی یادوں میں گاؤں پوری آب و تاب سے چمکتا تھا وہاں شافعہ کی یاد بھی پہلے دن کی طرح نئی اور تروتازہ تھی۔

شافعہ جس سے نگلین کی دوستی دوسری لڑکیوں کی نسبت بڑے غیر محسوس انداز میں گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اوپن لمبی سفید اور پیاری سی شافعہ باقی لڑکیوں کی نسبت ذرا کم گو تھی لیکن نگلین نے نوٹ کیا تھا اس کی محفل میں وہ ہمیشہ بڑے شوق سے بیٹھتی تھی۔ کبھی دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتی جیسے دوستی کی خواہاں تو ہو، لیکن نگلین کی مارڈرن پرنسٹنٹی سے مرعوب ہو کر کہہ نہ پاتی ہو۔

دوستی کا نقطہ آغاز دیکھا جائے تو کچھ ایسا خوش گوار بھی نہیں تھا۔ نگلین اس روز مس زاہدہ کی غیر حاضری کی وجہ سے نویں جماعت کا پیریڈ لے رہی تھی جب لڑکیوں نے سانپوں اور ڈاکوؤں کے قصصنا شروع کر دیے۔ مہتاب نے بتایا کہ بہت سال پہلے اسی اسکول کی ایک طالبہ جو صحن کے آخری کونے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کواڑن سانپ نے عین اس کے ماتھے پر آکر ڈسا اور وہ بے چاری موقع پر ہی ہلاک ہو گئی تھی۔ اس کے بعد غمگین نے ایک رات ڈاکوؤں کے اسکول میں آکر چھینے کا قصہ سنایا۔ وہ بتانے لگی کہ اس رات کم از کم چار ٹیچرز اسکول کے اندر موجود تھیں۔ لیکن موسم سرما کی وجہ سے اندر کمرے میں سو رہی تھیں۔ پولیس کے ساتھ ڈاکوؤں کا فائرنگ کا تبادلہ اور اذانوں تک چلنے والی ساری کارروائی انہوں نے چھپ

”میرا بھائی پاگل ضرور ہے۔ لیکن کبھی کسی کو کچھ نہیں آتا۔“ اس نے اپنی سرخ ناک رکھی۔
 ”میں تمہاری مس نہیں ہوں۔“ دن بھر کے دوران یہ صحیح ٹکین کو کئی بار کرنی پڑتی تھی، کیونکہ کافی لڑکیاں اسے یہاں مس کہہ کر بلاتی تھیں۔ چھوٹی بچیوں کو تو وہ کچھ نہیں کہتی تھی کہ بہر حال ان سے وہ کافی بڑی تھی، لیکن اپنی ہم عمر لڑکیوں کو ضرور ٹوک دیا کرتی۔

”تو اور کیا کہوں۔“ وہ تڑخ کر مڑی۔ آنکھوں میں چہرے پر خفگی ہی خفگی تھی۔

”تو اس دسویں کی ساری لڑکیاں میرا نام لے کر بلاتی ہیں۔ کیونکہ کبھی ایک لفظ بھی تم لوگوں نے مجھ سے بڑھا نہیں۔“ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئی۔

”اچھا اندر چلیں۔ لڑکیاں شور کر رہی ہیں اور اندر تم اس موضوع پر کچھ نہیں بولو گی۔“ حکمیہ انداز میں کہتی وہ اس سے پہلے اندر بڑھ گئی۔

”احترام سے بات کرتے کرتے ایک اپنائیت بھری تم“ ڈال دینا پٹھانوں کی بہت پیاری عادت ہے۔“ ٹکین مسکراتے ہوئے خود بھی پیچھے آگئی اور لڑکیوں کے کچھ بھی بولنے سے پہلے اس نے مہارت سے موضوع تبدیل کر دیا۔ بعد میں البتہ دیر تک وہ شافعہ اور اس کی گھریلو زندگی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

اگلی مرتبہ ٹکین کا دو ہفتے بعد واپس گاؤں آنا ہوا۔ فردوس کے ساتھ اسے بھی دیکھ کر لڑکیاں خوشی سے بھاگیں اور گیٹ پر ہی جمع گھٹنا لگا لیا۔ مس راشدہ نے ہنس کر فردوس کی طرف دیکھا۔

”بھئی فردوس اگر تمہاری جگہ ٹکین یہاں ٹیچر ہوتی تو میرے اسکول کا تو اللہ ہی حافظ تھا۔“ فردوس خوش دلی سے مسکرا دی جانتی تھی کہ مس راشدہ مذاق کر رہی ہیں اور وہ بھی ٹکین کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ٹکین کی متلاشی نگاہیں البتہ شافعہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ کہیں ابھی تک وہ اس سے خفا تو نہیں، لیکن جب برآمدے سے اترتی شافعہ نے مسکرا کر

کر کھڑکیوں سے خود دیکھی تھی۔ لیکن اپنے حواس بہر حال اتنے بحال ضرور رکھے کہ ڈاکوؤں کو اپنی وہاں موجودگی کی خبر تک نہیں ہونے دی۔

”آج تو تم سب ٹکین کو ڈرا کر ہی چھوڑو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو آئندہ وہ یہاں آتا ہی چھوڑ دے۔“ نائلہ نے گھور کر سب کو تنبیہ کی تو ٹکین کو ہنسی آگئی۔

”نہ میں سانپوں سے ڈرتی ہوں نہ ڈاکوؤں سے۔ مجھے تو یہاں صرف ایک ہی چیز سے خوف آتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر تجسس پھیلا دیا تو لڑکیوں نے بیک زبان سوال کیا۔

”وہ کیا ہے؟“

وہ ایک پاگل سالڑکا پولیس اسٹیشن والی سائڈ پر گھومتا رہتا ہے نا۔ قسم سے۔ کبھی اگر نظر آجائے۔ میری توجان ہی نکل جاتی ہے۔ ڈائن سے اترتے وقت ہر بار میری پہلی دعا یہی ہوتی ہے کہ کم از کم اس سے بالکل سامنا نہ ہو۔“ ٹکین نے۔ روانی سے تفصیلی جواب دیا، لیکن جملے کے اختتام تک اسے محسوس ہوا کہ کلاس کو جیسے ساتھ سو گئے گیا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ کسی سے کچھ پوچھتی شافعہ اچانک اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ٹکین نے حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ ان سب کی ٹیچر نہیں تھی، لیکن یہاں کوئی بھی لڑکی ہرگز اتنی بد تمیز نہیں تھی کہ بنا اجازت باہر چلی جاتی۔

”یہ کیا کر دیا ٹکین۔“ تیز طراری منتاب نے باقاعدہ ماتھے پہ ہاتھ مار کر تاسف کا اظہار کیا۔ ٹکین ابھی ابھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔

”ارے وہ دیوانہ بھائی کا بھائی ہے۔“
 ”بائیں۔“ ٹکین کے حواسوں پر بجلی گری۔
 ”او میرے خدا۔“ وہ فوراً ”کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”ایک منٹ۔“ اور کلاس روم سے باہر آگئی۔ شافعہ کمرے کی داہنی دیوار کی طرف پیٹھ موڑے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”آئی ایم سوری شافعہ۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔“

جوش سے ہاتھ ہلایا تو نگین نے بھرپور اطمینان کا سانس لیا۔

دونوں کی دوسری ملاقات اشاف روم میں ہوئی۔ دوسریے پیریڈ میں جب نگین اشاف روم میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شافعہ ہاتھ میں کچھ رجسٹر لیے اندر داخل ہوئی۔ نگین نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی اپنی کتابیں اٹھائے لان میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”تم سے ایک بات کرنی ہے نگین۔“ شافعہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اجازت طلب کی تو نگین کا دل انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔ وہ ہرگز اس موضوع پر بات نہیں چاہتی تھی جس پر پچھلے دو ہفتے سے اپنے آپ سے بھی شرمندہ رہی تھی۔

”تم نقاب والا برقع پن کر آیا کرو یہ چادر صحیح نہیں ہے۔“

”میں کیا مطلب۔؟“ نگین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ہاں بھئی۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔
”جس قسم کا تم پر وہ کرتی ہو تو آنکھیں ہی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ کسی دن کوئی ڈاکو اغوا کر لے گیا تو بڑا پچھتاؤ کی تمہیں شاید پتا نہیں پر یہاں خوب صورت سترگے (آنکھیں) کی بڑی ڈیمانڈ ہے۔“ آخر میں وہ بھرپور شوخی کے انداز میں منہ چڑا کر بھاگی تو نگین نے مارنے کے انداز میں اس پر کتاب اٹھائی۔

”خوب صورت سترگے کی بچی۔ جان نکال دی میری۔“ وہ اب بے تحاشا ہنستے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ایک لمحے کو واقعی وہ ڈر گئی تھی کہ اللہ جانے کس نے اس کے پردے پر اعتراض اٹھایا ہے۔

”اچھا بابا۔ ایک منٹ۔“ شافعہ نے ہنستے ہوئے ہاتھ کھڑے کیے۔

”ماتا تمہاری آنکھیں بہت پیاری ہیں پر اتنا نہ اتر آؤ۔“

”ارے۔ میں کب اترائی؟“ نگین کمرہ ہاتھ رکھ

کر ٹھکی۔

”اب اسے اترا تا ہی کہیں گے نا۔ بھئی جو بندہ اپنی آنکھوں کا خیال نہ رکھے اور دھلے منہ کے ساتھ پھینکی سوچی سی آنکھیں لے کر کہیں بھی چل پڑے اس کا مطلب ہے خواہ مخواہ خود کو کوئی چیز سمجھے ہوئے ہے۔“ وہ اپنی دھن میں نہ جانے کیا پٹیڑ کر رہی دوٹے کے کونے پر بندھی گرہ کھولنے لگی۔ نگین نے تنگ آ کر ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

”پتا نہیں کیا مصیبت ہو تم بھی۔“
”یہ لو۔“ اس نے گرہ کھول کر ایک پڑیا اور سلائی برآمد کر کے نگین کی طرف بڑھائی۔

”یہ ہمارے ہاں کا خاص سجا سمرہ ہے گھروں میں تیار کیا جاتا ہے۔ روزانہ لگایا کرو۔ پھر آنکھیں ایسی ٹھکی سوچی سی نہیں لگیں گی۔“

”نہ بابا! نگین فوراً بدکی۔“ میں نہیں لگاتی یہ سرے کا جل۔“ جو اب شافعہ نے نتھنے پھلائے۔

”میں بھی میرے سامنے لگاؤ اچھی بھلی آنکھوں کا ستیا ناس کر رکھا ہے۔“ اس نے جھپٹ کر پڑیا اور سلائی دوبارہ اپنے ہاتھ میں لی اور باقاعدہ سرے میں سلائی پھیر کر اس کی طرف بڑھائی۔

”وہ شیشہ ہے جاؤ اور ابھی لگاؤ۔“ شافعہ اسی رعب سے مصر تھی ناچار برے برے منہ بتاتی نگین نے دونوں آنکھوں میں سرمہ لگالیا۔

”توبہ۔ قسم سے۔“ ٹرک ڈرائیور لگ رہی ہوں۔“ وہ خفا خفا سی مڑی۔

”ڈرائیور نہیں۔“ شافعہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”بلکہ بہت پیاری ٹرک ڈرائیور۔“ اور بنا جواب کا انتظار کیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ نگین نے بے بسی سے پیر پٹنے اب ان ہی آنکھوں کے ساتھ سب کا سامنا کرنا تھا۔ لیکن اسے حیرت ہوئی کہ دن بھر کے دوران تقریباً سب نے پہلے رک کر کچھ دیر حیرت سے اس کے چہرے پر کسی تبدیلی کا نوٹس لینے کی کوشش کی اور پھر بے ساختہ تعریف کی۔ کچھ فوراً بوجھ گئے کہ آج اس نے سرمہ لگایا ہے اور کچھ نے فقط اتنا کہا کہ

کے رنگوں سے سچی بہت خوب صورت بہت حسین ہو گئی تھی۔ سچی بے ریا اور پر خلوص دوستی بھی جینے کے لیے آکسیجن سے کم نہیں ہوتی، شافعہ سے ملنا گاؤں جانے کے لیے وقت نکالنا جیسے نگین کے معمولات میں شام ہو گیا تھا۔ کاش کہ سب کچھ یوں ہی رہتا۔ پرسکون اور رواں۔ لیکن بہر حال جمیل سی رواں زندگی میں بھی آخر ایک پتھر گر ہی گیا۔ فرانس کو اسکول میں کام کرتے ہوئے ایک سال ہونے والا تھا جب اچانک نگین کی زندگی میں ایک طوفان آیا۔ اپنے حساب سے نگین نے جسے بیمار کے جھونکے سے تعبیر کیا۔ وہ اس دن اپنے گھر پر تھی۔ موسم تبدیل تو ہو رہا تھا لیکن ابھی ٹھنڈا قدرے باقی تھی۔ فرانس گاؤں گئی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ جب ایک راتنگ کال نے اس کی زندگی میں تھلکہ مچا دیا۔ غلطی سے اس کا نمبر ملا لینے والے اجنبی سے نگین کی پہلی گفتگو خاصی دلچسپ رہی تھی۔ اجنبی مصر تھا کہ اس نے تنگ کرنے کی غرض سے کال نہیں ملائی اور نگین بھڑک رہی تھی کہ اس پر سکون دوپہر میں بلاشک و شبہ اس کا ارادہ لڑکیوں سے وقت گزاری کرنے کا ہی تھا۔ بحث و تکرار بمشکل پانچ یا سات منٹ جاری رہی اور پھر نگین نے تنگ آ کر فون رکھ دیا۔ پھر دوبارہ اس کا فون نہ آیا اگلے پورے ایک ہفتے تک۔

اور جب نگین دل میں یہ سوچ کر پشیمان ہوئی کہ اس نے بلاوجہ ایک شریف آدمی کو جھاڑ پلا دی تو عین اسی دوپہر کو اس کا دوبارہ فون آ گیا اور جب چھوٹے ہی اس نے اعلانیہ کہا کہ ”آج خالص تنگ کرنے کی نیت سے ہی میں نے فون کیا ہے“ تو نگین کو ہنسی آگئی۔ اجنبی بہت ہی دلچسپ بندہ تھا۔ بلکہ کسی حد تک ڈھیٹ بھی۔ بنا لگی لپٹی کے صاف کہہ دیا کہ۔

”اس وقت وہ روزانہ ہی فارغ ہوتا ہے اور کافی پوریت محسوس کرتا ہے۔ لہذا وقت گزاری کے لیے واقعی اس سے دوستی کا خواہش مند ہے۔“ اب پتا نہیں نگین اس کی سچائی سے متاثر ہوئی تھی یا دلچسپ

تمہارے چہرے میں آج کچھ نیارن ہے، لیکن بہت اچھا ہے۔ مس رفعت نے بتایا کہ یہاں کا سرمہ آنکھوں کی تھکاوٹ، سوجن اور دھوپ کی شدت سے بچاؤ کے لیے بہت سوومند ہے۔ اور نگین نے اس دن تعریف ملنے پر جو اس سرمے کا باقاعدگی سے استعمال شروع کیا تو سولہ برس گزر جانے پر بھی آنکھیں کبھی بنا کا جل یا سرمے کے دکھائی نہیں دیں۔

گاؤں میں نگین کا زیادہ وقت اب شافعہ کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی پچھلے دنوں والی کوتاہی کا کچھ ازالہ وغیرہ کرنا چاہتی تھی، بلکہ شافعہ حقیقتاً ”اسے بہت پسند تھی۔ رعب ڈال کر بات کرنے والی اس صاف دل لڑکی کی محبت بے ساختہ نگین کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔ حالانکہ محبت تو یہاں سب ہی اس سے بہت کرتے تھے۔ لیکن شافعہ صرف محبت نہیں کرتی تھی، وہ اس کا خیال بھی رکھتی تھی۔ جیسے گھر کا کوئی فرد یا کوئی بہت اپنا۔

اپنائیت بھرے ایسے کچھ جذبات نگین نے شافعہ کے لیے اس دن محسوس کیے جب وہ ایک بار فرانس باجی کے ساتھ اسکول آئی تو پتا چلا کہ شافعہ آج غیر حاضر ہے۔ نگین کا وہ پورا دن خالی پن کا احساس لیے گزرا۔ تب پہلی بار نگین کو محسوس ہوا کہ آج کل تو وہ صرف شافعہ سے ملنے کی خاطر ہی گاؤں آنے کا وقت نکالا کرتی تھی۔ شافعہ کو بھی اس روز کی غیر حاضری کا بہت قلق ہوا۔ اسے متاب کی زبانی نگین کی آمد کا پتا چلا تو وہ اگلے روز تک کا بھی انتظار نہیں کر پائی اور اسی شام ڈھیر ساری چیزیں پکا کر اسکول اس سے ملنے کے لیے آگئی۔ آس پاس رہنے والی کافی ساری لڑکیاں تو پہلے ہی سیکنڈ ٹائم پڑھنے کے لیے آیا کرتی تھیں، لیکن شافعہ دور رہنے کی وجہ سے نہیں آتی تھی۔ لیکن اس دن کے بعد سے شافعہ نے عادت بنالی کہ جب بھی نگین گاؤں آتی وہ ضرور اس سے ملنے کے لیے سیکنڈ ٹائم بھی اسکول آتی۔

نگین نے کشیدہ کاری اور پتلی روٹیاں پکانا ان ہی دنوں میں شافعہ سے سیکھے تھے۔ زندگی محبت اور دوستی

ایک عورت تھی اور اس نے ایک بچی بھی اٹھا رکھی تھی۔ احمر کی آواز بہت صاف اور واضح طور پر اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے گائنا کالوجسٹ کا پوچھا اور مسز احمر کے نام کی پرجی بنوائی۔ نگین کے کانوں میں تو بے کسی نے سیدہ انڈیل دیا ہو۔

گھر واپسی تک کا وقت اس نے آندھیوں کی زد میں گزارا۔ اکیلے ہوتے ہی فوراً "احمر کا نمبر ملایا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مجبوراً "احمر کو اقرار کرتے بنی کہ نہ صرف وہ شادی شدہ ہے بلکہ ایک بچی کا باپ بھی ہے۔ نگین نے نہ صرف اسے خوب کھری کھری سنا میں بلکہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر کے فون بند کر دیا۔ دل اتنا بو جھل اتنا ادا اس تھا کہ سوائے وقفے وقفے سے رونے کے اس کا اور کوئی کام نہیں تھا اور مصیبت تو یہ بھی تھی کہ اپنے آنسو اسے گھر والوں سے بھی چھپانے پڑے تھے۔ اس نے جیسے تیسے خود کو گاؤں جانے کے لیے تیار کیا۔ فروس آج ایک دن کے لیے اسکول جا رہی تھی، کیونکہ اگلے روز اسے شہر میں ہی دفتر کی ایک میٹنگ اینڈ کرنی تھی۔ شافعہ نے سوچا کہ سب سے ملنے ملانے اور شافعہ کے گلے دور کرنے کے لیے ایک دن کافی ہے۔ آج البتہ وہ پرانا جوش اور خوشی بالکل مفقود تھی۔ خالی خالی نگاہوں سے راستوں کو کھتی وہ قطعاً "اس بات سے لاعلم تھی کہ آج وہ آخری بار گاؤں جا رہی ہے۔

مارنگ اس سبلی ختم ہونے کے بعد سب ہی طالبات اور ٹیچرز اپنی اپنی کلاسز میں چلی گئیں۔ نگین اسٹاف روم میں آج بھی اکیلی بیٹھی تھی۔ جب شافعہ حاضری کے رجسٹر لینے اندر داخل ہوئی۔ نگین نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بھاگ کر دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئیں۔ شدید دکھ کی کیفیت میں جب کوئی بہت اپنا اور پیارا اگلے سے لگے تو درد آنسو بن کر پھلنے کو بے تاب ہو جاتے ہیں۔ شافعہ کے انداز سے اگر ملنے کی خوشی جھلکتی تھی تو نگین اس لمحے صرف ٹوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ دل کا غبار اسے سب کچھ بتا کر اور رو کر ہلکا کرنا چاہتی تھی، لیکن یہ موقع اور وقت ہرگز

گفتگو سے کہ بتا سوجے سمجھے دوستی کی یہ آخر قبول کرلی۔ دونوں کا رسمی تعلق تعارف کے مراحل سے گزر کر ہنسی مذاق، شوخیوں، شرارتوں، سرگوشیوں اور دیکھتے ہی دیکھتے دھواں دار محبت میں تبدیل ہو گیا۔ اجنبی نے اپنا نام احمر بتایا تھا۔ وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ احمر نے اپنے خاندان، گھر، علاقے سے متعلق ہر بات نگین کو بتادی تھی۔ نگین نے بھی جو اپنا اپنے متعلق کچھ نہیں چھپایا۔ بے کیف شب و روز پر گویا کسی نے دھنک کی پھڑکی گھمادی تھی۔ ہر لمحہ خوب صورت اور ہر بل اپنے اندر روانیت سمیٹے ہوئے تھا۔ تین ہفتوں سے وہ گاؤں بھی نہیں گئی تھی۔ اس شام فروس باجی اسکول میں دو دن گزار کر لوٹیں اسے شافعہ کا خط دیا۔ خط پڑھ کر نگین سخت شرمندہ ہو گئی۔ اسکول میں سب بڑی شدت سے اس کی راہ دیکھتے تھے۔ اس سے پہلے کبھی بھی وہ اسکول سے اتنے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر نہیں رہی تھی۔ نگین نے پیر کو ہی باجی کے ساتھ گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ شافعہ نے خط میں نہ صرف بار بار آنے پر اصرار کیا تھا بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی ہے اور شدت سے اس کی خاطر ہے۔ نگین بھی ذہنی طور پر جانے کے لیے تیار ہو گئی، لیکن اس دوران ایک اور عجیب بات ہو گئی۔

اتوار کے دن امی کے پیٹ میں درد شروع ہوا اور انہیں وہم ہونے لگا کہ درد شاید گروے کا ہے۔ وہ فوراً انہیں لے کر ایک بڑے برائیسٹ اسپتال آگئی۔ وینٹنگ روم میں انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک اسے کاؤنٹر پر احمر دکھائی دیا۔ احمر سے اب وہ صرف نام کی حد تک واقف نہیں تھی، بلکہ صورت سے بھی جان چکی تھی۔ تین ہفتوں کی مختصر ترین مدت میں محبت نے کافی مدارج طے کر لیے تھے۔ نہ صرف دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا، بلکہ احمر کے دوست کے گھر ایک مرتبہ مل بھی چکے تھے۔ نگین اس وقت چونکہ پردے میں تھی تو احمر کے اسے پہچاننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ احمر کے ساتھ بھی پردے میں

”اچھا۔“ نگار نے ساختہ کھلکھلائی۔ ”تو تمہاری عمر میں کس کو جلدی پڑی۔ رشتہ دار ہے کیا؟“

”رشتہ دار نہیں ہے۔“ وہ شرمیلے انداز میں نیچے دیکھے جا رہی تھی۔

”تو پھر کیا جواب دیا تمہارے گھر والوں نے۔“

”گھر والوں کو نہیں بتا۔“ وہ ذرا سا جھجکی۔

”ہیں۔ کیا مطلب۔“ نگین بالکل نہیں سمجھی۔

”وہ چھٹی جماعت کی فاطمہ ہے نا۔ اس کا بھائی ہے۔ جمال نام ہے۔ میرا ان کے ہاں آنا جانا ہے۔ اس نے خود مجھ سے کہا کہ وہ۔“ شافعہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”او۔ یعنی وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔“ نگین مسکرائی۔ ”اور تم؟“ دیکھو جھوٹ مت بولنا۔“

”ہوں۔ میں بھی کرتی ہوں۔ لیکن ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے۔“ وہ کچھ افسردہ نظر آنے لگی۔

”جمال شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔“

نگین کے دل کو دھکا سا لگا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے۔

”شش۔ شادی شدہ اور پھر بھی تم۔“ اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔

”کیا کروں۔“ شافعہ نے تھکی تھکی سی آہ بھری۔

گھر والوں نے زبردستی کم عمری میں اس کی شادی کر دی تھی۔ وہاں اس کی مرضی بھی نہیں تھی۔ وہ کہتا ہے اگر زندگی کے اس عجیب موڑ پر مجھے تم سے محبت ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور۔ وہ بہت اچھا ہے نگین۔ بہت سیدھا اور سچا ہے۔ میرے بغیر جی نہیں سکتا۔ بہت جذباتی ہے میرے معاملے میں۔ بالکل بچوں کی طرح۔“ شافعہ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔ سختی سے لب کاٹتے ہوئے وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نگین کی اپنی حالت غیر تھی۔ کیا کیا نہ یاد آنے لگا تھا۔ اس نے جب احمر سے کہا تھا کہ آج ان کی آخری گفتگو ہے اور وہ پھر کبھی اس کی طرف پلٹ کر نہیں آئے گی تو احمر نے ساختہ رو دیا تھا۔ اس نے نگین کو سو طرح سے یقین دلایا کہ آئندہ وہ کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ بس وہ اسے

موزوں نہ تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار کر شافعہ سے الگ ہوئی۔ زبردستی کی مسکراہٹ بھی لبوں پر سجائی۔ لیکن شافعہ اس کی سہیلی تھی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس نے حیرت سے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ پریشان کیوں ہے۔

”کچھ نہیں۔“ نگین نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ”شاید سفر کی تھکان ہے۔“

”اور آنکھیں۔؟“ شافعہ ہرگز مطمئن نہیں تھی۔ نگین کی سرخ سوچی آنکھیں بہت دیر ان لگ رہی تھیں۔

”بعد میں بتاؤں گی۔“ اس نے جانے کیا سوچ کر حامی بھری۔

”تم بتاؤ کیا کہنے والی تھیں؟“

”ارے ابھی نہیں۔“ مس رفعت انگلیں رنڈھا رہی ہیں۔ کسی فارغ پیریڈ میں آوں گی۔“ مسکرا کر وضاحت دیتی وہ جلدی سے پلٹ گئی اور نگین بھی کتابیں لیے لان میں آئی۔ بریک تک اس نے چھٹی اور ساتویں کے دو پیریڈ بھی لیے کیونکہ مس زاہدہ آج نہیں آئی تھیں۔ بریک میں جب وہ اور شافعہ لان میں آکر بیٹھیں تو نویں کی تقریباً ”آدھی جماعت اس کے گرد آ جمع ہوئی۔ سب ہی اس کی طویل غیر حاضری سے خفا تھیں۔ وہ خاصی خوش دلی سے ان سب سے باتیں کرنے لگی، جبکہ شافعہ شکوہ کنال آنکھوں سے اسے گھورتی رہی۔ نگین کبھی کبھی مسکرا کر اسے دیکھ لیتی تو وہ مزید منہ پھلاتی۔ دونوں کو بات کرنے کا موقع آخری پیریڈ میں ہی مل پایا۔ نویں جماعت کا وہ پیریڈ فری تھا۔ کچھ لڑکیاں کلاس روم میں تھیں، کچھ دھوپ میں آ بیٹھیں۔ شافعہ اسے لیے ایک پرسکون گوشے میں آ بیٹھی۔

”اب بتاؤ۔ کیا کہنے والی تھیں۔ دس پندرہ منٹ تو پہلے ہی ضائع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں چھٹی کا شور بھی اٹھنے لگے گا۔“ نگین نے گھڑی دیکھی۔

”میرا رشتہ آیا ہے۔“ پہلے ہی جملے پر شافعہ کے گل دہکنے لگے۔

اتفاق ہی تو ہے۔ کیا پتا ہماری زندگی سکھی رہے اور یہ بلاوجہ کے وہم خواہ مخواہ ہمیں ہماری محبت سے دور کر دیں۔ شافعہ انجانے میں اسے تصویر کا دو سرا رخ دکھانے لگی اور نگین کی زبان کو جیسے تالے لگ گئے۔ چپ چاپ وہ اس کی ہر منطق سنتی چلی گئی۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی۔

”کیا پتا یہی راستہ ہماری تباہی کی طرف بھی جاتا ہو۔ کیا پتا یہ محبت تنکوں کا ایسا فرش ہو جس پر قدم پڑتے ہی ہم گہرے کنوئیں میں جا گریں۔ کیا پتا ہمارے ہاتھ سوائے پچھتاؤں کے کچھ نہ آئے۔“ لیکن سارے خدشے۔ سارے خیال گھنٹی کی تیز ٹرن ٹرن میں کہیں تحلیل سے ہو گئے۔ دونوں نے بوکھلا کر ایک دوسرے کو دکھایا۔ باتوں میں پتا ہی نہیں چلا اور آخری پیرڈ ختم بھی ہو گیا۔ گیٹ کھل گیا اور بچیاں باہر جانا شروع ہو گئیں۔ فردوس نے اسے چلنے کے لیے آواز لگائی تو ناچار دل کی باتیں دل میں دبائے اس نے شافعہ سے اجازت لی البتہ بہت جلد واپس آنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

طے یہی پایا کہ دونوں اگلی مرتبہ اس معاملے کو تفصیل سے ڈسکس کر کے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات اور آخری گفتگو تھی۔ جانے قدرت نے ایسے موڑ پر کیوں دونوں کو جدا کر دیا تھا جب بہت سی باتیں ان گئی اور ادھوری رہ گئی تھیں۔ آنے والے سالوں میں اسی ایک بات پر نگین سوچ سوچ کر جلتی اور سلگتی رہی کہ کاش وہ اپنے خدشوں کا اظہار زبان سے بھی کر دیتی تو دل پر آپڑنے والے بوجھ میں کسی قدر کمی ضرور محسوس کرتی۔

گھر واپس آنے کے دو دن بعد فردوس کو ٹرانسفر کی خوش خبری ملی۔ جہاں یہ خبر فردوس سمیت سب ہی گھر والوں کے لیے نہایت خوشی کا باعث تھی۔ نگین کے لیے شدید دکھ اور افسردگی لیے ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے ابوجی پر سخت غصہ آیا۔ ان ہی کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے

اتنی بڑی سزا نہ دے، لیکن اس نے احمق کی ایک نہیں سنی تھی۔

”تو تم نے کیا سوچا ہے؟“
”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا نگین؟“ وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ ”میں نے سوچا کہ تم سے مشورہ کروں گی۔ تم اتنی سمجھ دار ہو۔ تم ہی بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”اور اگر میں کہوں اسے چھوڑ دو تو۔“ نگین نے سوالیہ نگاہ اٹھائی۔

”ہاں۔ ضرور مان لوں گی، کیونکہ تمہاری دوستی پر میرا بھروسہ ہر شے پر بھاری ہے۔ تم جانتی ہو میرے دل میں تمہارا کیا مقام اور کتنی محبت ہے۔“ وہ جذباتی سی ہو کر رو پڑی اور نگین بھی اس مرتبہ خود کو روک نہیں پائی۔

”ہم سیلیوں کی قسمت بھی اللہ نے ایک جیسی لکھی ہے۔“ روتے ہوئے بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلا تو شافعہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ایک جیسی قسمت۔ کیا مطلب؟ کیا تمہیں بھی کوئی ایسا شخص پسند ہے جو۔“ تو اتر سے سوال پوچھتے ہوئے وہ ایک دم سے رکی تو نگین نے مجرموں کی طرح سر ہلایا۔ شافعہ کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ بہت دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

”کیا وہ بھی تم سے پیار کرتا ہے۔ وہ کون ہے نگین، بتاؤ نا۔“ شافعہ بے تالی سے استفسار کرنے لگی تو نگین نے خود پر گزرنے والی پچھلے چند ہفتوں کی روداد اس کے گوش گزار دی۔

”ایسا ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوا نگین؟“ شافعہ نے ایک آہ بھری۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ محبت ہماری جھولی میں اسی طرح ہی آئی ہو۔ دنیا میں بے شمار عورتیں ہیں جو اپنے شوہروں کی دوسری بیویاں ہیں۔ کیا پتا ہم بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ پھر وہ ہم سے پیار بھی بہت کرتے ہیں۔ اب زندگی کے ایسے موڑ پر ان کا ہم سے ملنا ایک

محض سال بھر میں ہی فردوس کو قریب کا اسکول مل گیا تھا۔

فردوس نے اگلے روز آخری مرتبہ چارج دینے کے لیے اسکول واپس جانا تھا۔ نگین نے سنا تو دل میں امید کی کرن جاگی۔ چلو آخری مرتبہ سہی، کم از کم شافعہ سے آخری ملاقات کا بہانہ تو پیدا ہوا۔ اس نے فردوس کو اپنے ساتھ جانے کا بتایا اور مطمئن ہو گئی۔ لیکن رات کو سونے سے پہلے ابو نے یہ بتا کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ صبح وہ خود فردوس کے ساتھ گاؤں جائیں گے اور گھنٹے بھر میں ہی کام پٹنا کر وہ اسے ساتھ لیے واپس آجائیں گے۔ نگین نے فردوس کی خوب منت کی کہ وہ اسے بھی ساتھ لے جائے، لیکن وہ ابو کو نہیں مناسکی۔ الٹا نگین کو ابو سے ڈانٹ بھی پڑی کہ آئے روز کالج سے چھٹی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجبوراً اس نے شافعہ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول ثابت ہوئی۔ ایسے خط سے تو وہ ان کو ادھوری گفتگو ہی بہتر تھی۔ لیکن تب یہ بات نگین کی ناقص عقل میں نہیں آسکتی تھی۔ تب ہی اپنی دانست میں ایک بہترین فیصلے کا ارادہ کرتے ہوئے اس نے کانڈ فلم سنبھالا۔ آخری بار شافعہ سے مل کر آنے کے بعد پچھلے دو دنوں میں نگین کے ذہن میں بڑی تبدیلی آئی تھی۔ گاؤں سے واپسی کے راستے میں ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ احمر سے اپنے برے رویے پر وہ جی بھر کے پشیمان ہوئی تھی۔ بھلا محبت بھی کوئی جرم ہے کہ اس کی سزا دی جاتی۔ نگین نے آتے ہی احمر کو فون کر کے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی۔ اور وہ مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہیں پارہا تھا۔ اور جب بولنے کے قابل ہوا تو نگین کا اتنا شکر گزار ہوا کہ وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہو گئی اور اب دوستی کے ناتے اس نے شافعہ کو بھی ایسے مشوروں سے نوازنے کا پختہ عزم کرتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

”بہت پیاری شافعہ۔“

پچھلی بار گاؤں سے آنے اور تم سے ملنے کے بعد

سوچا بھی نہیں تھا کہ اگلی مرتبہ بجائے ملاقات کے مجھے خط کے ذریعے تم سے مخاطب ہونا پڑے گا۔ باجی کی اچانک ٹرانسفر سے میں کتنی اداس ہوں، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اور اس وقت یہ خبر سن کر تمہاری کیا حالت ہے اس کا تصور بھی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ آج باجی کے ساتھ گاؤں آنے کی بہت کوشش کی، لیکن افسوس کہ میری بات نہیں مانی گئی۔ آج میرا تم سے آخری بار ملنا کتنا ضروری تھا۔ میں کسی کو سمجھا نہیں سکی۔ میری دعا ہے کاش ہم دوبارہ مل سکیں۔ وہ بھی بہت جلد اسکول میں گزرائیے ایک سال میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم سب کے ساتھ گزارے دن بہت خوب صورت، بہت یادگار تھے۔ کاش ہماری دوستی کو ابھی اور بھی زیادہ وقت مل پاتا۔ ابھی تو ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جانا اور ایک دوسرے کو بہت کچھ بتانا تھا۔ تمہاری دوستی میرے لیے بہت قیمتی، بہت انمول تحفہ ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔

اور ہاں اس دن تم نے پوچھا تھا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے تو بہت سوچنے پر مجھے احساس ہوا کہ ہاں، محبت ہی دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر اہم ہے۔ اسے کھونا سراسر بے وقوفی ہے۔ تم اور جمل ہرگز اپنے خوب صورت جذیوں کو قربانی کی بھیینٹ مت چڑھانا۔ قدرت نے اگر محبت کا تحفہ دیر سے تمہاری جھولی میں ڈالا ہے تو یقیناً اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ محبت کی راہ میں آنے والی ہر دیوار کو پھاند کر اپنے محبوب کو حاصل کر لیتا ہی سچی محبت ہے۔ میں بھی دنیا کی مجبوری کے آگے ہار نہیں مانوں گی۔ ہم دونوں ہی ان شاء اللہ اپنی اپنی محبت حاصل کر کے رہیں گے۔

دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھنا اور اسکول میں سب کو میرا بہت بہت سلام کہنا۔ خط کا جواب ضرور دینا اور اپنا ایڈریس بھی ضرور لکھنا، تاکہ اگلا خط میں تمہارے بتائے پتے پر پوسٹ کر سکوں۔ بہت ساری نیک خواہشات کے ساتھ دعا گو۔

نگین زہرا۔

اس روز تکمیل بہت خوش اور مطمئن تھی کہ اس نے اپنی عزیز از جان دوست کو بروقت بہت صحیح راہ دکھائی تھی۔ فروس باجی اس کا خط شافحہ کو پہنچا کر واپس آگئی نہیں۔ لیکن ابا کی جلدی کی وجہ سے وہ جوابی خط شافحہ سے نہیں لے پائی تھیں۔ تکمیل نہایت ادا اس دل لیے اپنے کالج میں مصروف ہو گئی۔ یہ جانے بغیر کہ محض چند روزوں بعد یہ ہی صحیح راستہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول بننے والا تھا جو اس نے نادانی میں شافحہ کو دکھایا تھا۔

اور پھر چند روز بعد جو کچھ تکمیل کے ساتھ ہوا اس نے جھنجھوڑ کر ایک گہری نیند سے تکمیل کو جگا دیا۔ خواب نگر کا طلسم کسی چھو منتر کی طرح آنکھ سے اوجھل ہو گیا اور سپنوں سے خالی دامن میں رہ گئے صرف پچھتاوے اور ڈھیر ساری ندامت۔ بے وفا سنے دامن چھڑا کر جاتے جاتے اس کے لبوں پر ایک ”کاش“ ثبت کر گئے۔ کہ کاش اس نے باجی کے ہاتھ شافحہ کو خط لکھ کر گمراہ کن مشورے نہ دیے ہوتے۔ جانے اب اس فریب کی انگلی تھا مے شافحہ کس غلط راہ پر چل پڑی ہوگی جو تکمیل نے اپنی دانستہ میں ایک درست فیصلے کی صورت اس تک پہنچایا تھا۔

”آگ لگے اس خط کو۔ اور ایسی ”سچی دوستی“ کو جس نے میری بھولی بھالی سہیلی کو جانے کس راہ کا مسافر بنا دیا ہوگا۔“ سیر ہاتھوں پر گرائے وہ اندر کے طوفان سے نبرد آزما تھی۔ ہوش آیا تو تکمیل نے اپنا دھیان باقی تمام اطراف سے ہٹا کر صرف شافحہ کی جانب لگایا۔ اب اسے ہر صورت شافحہ سے رابطہ کرنا تھا، لیکن جب فیصلے پر عمل درآمد کا وقت آیا تو اسے دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ شافحہ کا ایڈریس تو اب اس کے پاس تھا نہیں۔ اس نے باجی کی پرانی کو لیگز سے رابطہ کر کے شافحہ کا ایڈریس حاصل کرنے کا ارادہ کیا، لیکن فروس نے اس معاملے میں کسی بھی قسم کا تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک تو نئے اسکول کی مصروفیات میں اس کے پاس وقت کی شدید کمی تھی۔ دوسرے گزرے ایک سال کے دوران اس نے اپنی

کو لیگز سے صرف اسکول کی حد تک ہی ملنا جتنا رکھا تھا۔ نہ ہی اس کے پاس کسی کو لیگ کا ایڈریس تھا، نہ ہی فون نمبر۔

موبائل فون کے تو خیر نام سے بھی سولہ برس پہلے کوئی واقف نہیں تھا۔ اب دوسری کوشش کے طور پر اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سنبھالی۔ مطلوبہ گاؤں کے کالم میں اسے کچھ پچیس، تیس نمبر مل تو گئے، لیکن وہ بار بار تمام نمبرز پر نظریں دوڑائی اور سوچی کہ کون سا نمبر ملائے اور کیا کہے۔ نہ تو اسکول میں فون تھا اور نہ ہی شافحہ کے گھر۔ تکمیل کو بس اتنا یاد تھا کہ کبھی کبھار مس رفعت اور زاہدہ عمرین نامی طالبہ کے ہاں سے اپنے گھر فون کر کے خیریت کی اطلاع دے آتی تھیں۔ اب عمرین کے والد کا کیا نام تھا، یہ تو تکمیل نہیں جانتی تھی، ہاں یہ ضرور معلوم تھا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ تکمیل نے فوراً ڈاکٹر کے حوالے سے ملنے والے تین نمبرز باری باری ڈائل کر کے عمرین کا پوچھا، لیکن کسی نمبر پر عمرین نہیں ملی۔ جانے اس کے والد نے کس نام سے ٹیلی فون لگوا یا تھا۔ پتا نہیں اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ بس پھر ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ایک خط لکھ کر اسکول کے تے بر روانہ کر دیا۔ خط اس نے شافحہ کے نام ہی لکھا تھا، لیکن اس میں صرف حال احوال کے بعد اس کا ایڈریس طلب کیا تھا۔ لیکن اس خط کا جواب تکمیل کو کبھی موصول نہیں ہوا۔ یعنی گاؤں اور شافحہ اب صحیح صحیح اس کی دسترس سے بہت دور جا چکے تھے۔

تھک ہار کر اسے پڑھائی کی طرف متوجہ ہونا پڑا کہ فرسٹ ایئر کے امتحان بالکل سر پر آگئے تھے اور پھر گاؤں تو ایک سہانی یاد بن کر رہ گیا اور شافحہ۔ ایک درو بھری چیخ جسے بالآخر وقت کی دھول نے کٹی دوسری یادوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آج۔ گاڑی رکنے پر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔

”میڈم۔ یہاں سے اسکول کا راستہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔“ ڈرائیور نے مودبانہ اطلاع دی تو تکمیل کے

لب مسکرائے۔

وابستہ تھی اور اپنے ہی اسکول میں پچھلے تین سالوں سے پڑھا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے نہ صرف فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا بلکہ بے حد جوش اور خوشی سے بغل گیر ہوئی تھیں۔ دیگر اسٹاف کو بھی سن کر بہت حیرت ہوئی کہ وزٹ بر آئے والی ایجوکیشن آفیسران کی کولیک کی ہیوسٹ فرینڈ نکلی تھی۔

”اف۔“ کمرہ خالی ہونے پر دونوں اکیلی رہ گئیں تو شافحہ نے بے ساختہ سر ہاتھوں میں گرایا۔

”اس روز اچانک پھڑنے پر سوچا بھی نہیں تھا، نکمین کہ سولہ برس بعد دوبارہ ملنا ہوگا۔“ وہ منہ بہ ہاتھ رکھ کر کبھی حیرت سے اسے دیکھتی، کبھی مسکرائی اور کبھی اچانک سنجیدہ ہو کر گویا بہت پیچھے چلی جاتی۔

”سولہ برس کم نہیں ہوتے نکمین۔ پچھتاوے کی آگ میں جلنے کے لیے۔ کسی سے معافی مانگنے کے لیے اتنا طویل انتظار۔“ شافحہ کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے۔ نکمین نے چونک کر سر اٹھایا۔

”معافی۔ پچھتاوا۔“ شافحہ انجانے میں اسی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ ”لیکن کیوں۔؟“

”اس روز کے بعد کیا ہوا تھا نکمین۔ کیا کچھ بتی تم۔“ شافحہ نے بے ساختہ دونوں ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ سوال جو بڑی دیر سے نکمین کے لبوں پر چل رہا تھا۔ پہلے شافحہ نے بوجھ لیا۔ آخری دن کی ملاقات کے بعد سولہ برس کا طویل وقفہ۔ لیکن ان کی بات جیسے آج بھی وہیں رکی تھی۔ مکمل ہونے کے انتظار میں۔

”معافی تو مجھے مانگنی تھی شانی۔“ نکمین نے بجائے جواب دینے کے حیرت سے اسے دیکھا۔

”پچھتاووں کی آگ میں تو میں جل رہی تھی۔ برسوں سے دل پر بوجھ لیے۔ تم سے ملنے کے بے

تاب۔“

”لیکن کیوں۔“ شافحہ نے تعجب سے پلکیں اٹھائیں۔

”میرا خیال ہے نکمین ہماری بات وہیں سے شروع

سولہ برس بعد بھی اسکول تک سڑک نہیں بنی تھی۔ آج بھی اسے کھیتوں کے راستے اسکول تک جانا تھا۔ گاڑی سے اتر کر نکمین نے اونچے قطعہ نما پولیس اسٹیشن پر ایک نظر ڈالی تو ذہن لمحوں میں سالوں کا سفر طے کرتے کہیں بہت پیچھے چلا گیا۔ سر جھٹک کر اس نے کھیتوں کی پگڈنڈی پر قدم رکھے تو بے ساختہ ہی نگاہوں نے ایک دیوانے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن حیرت انگیز طور پر آج اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ بس ایک پرانی یاد کو مجسم پالنے کی خواہش۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ البتہ اسکول کا گیٹ دکھائی دینے لگا تھا۔ سوائے چند ایک معمولی تبدیلیوں کے سب کچھ جوں کاتوں لگ رہا تھا۔

کاش اس مختصر سے وقت میں، میں شافحہ سے بھی ملاقات کر پاؤں۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے اس نے قدم اسکول کے اندر رکھا۔



دونوں اس وقت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ گزرے سولہ سالوں میں نکمین نے یوں تو کئی طرح کے اندازے اس کے بارے میں لگائے تھے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی، لیکن کبھی ایک بار بھی بھولے سے یہ خیال چھو کر نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے اسی اسکول میں ایک نیچر کی حیثیت سے مل جائے گی۔ حالانکہ وہ ذہین تھی، لائق تھی اور کئی مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر چکی تھی کہ مستقبل میں وہ نیچر بننے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بہر حال خوشی کی بات تھی کہ اس وقت وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اسی کی طرح اس اچانک اور اتفاقیہ ملاقات پر حیران تھی۔ سولہ برسوں نے دونوں میں کئی ظاہری تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، لیکن بہر حال یہ تبدیلیاں ان کی شخصیت پر اس قدر بھی حاوی نہیں ہوئی تھیں کہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ پاتیں۔

شافحہ عرصہ آٹھ سال سے ٹیچنگ کے شعبے سے

خواتین اور شہزادوں کے لیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ۔

خواتین ڈائجسٹ

فروری 2017ء کے شمارے کی ایک جھلک



- "حسن المآب اور۔۔۔" سائرہ رضا کا مکمل ناول۔
- "عشق مجذوب" مصباح نوشین کا مکمل ناول۔
- "دوسری عورت" بی حرملک کا ناول۔
- "دشت جنوں" آمنہ ریاض کا ناول۔
- مریم عزیز اور عطیہ خالد کے ناولٹ۔
- لائل رضا، شازیہ الطاف ہاشمی، ہاجرہ رحمان، ملیاسوں اور آسیہ مظہر چوہدری کے افسانے۔
- خدا اور محبت کی "سعدیہ خان" سے ملاقات۔
- معروف ماڈل اور اداکارہ "ماہم عامر سے باتیں۔
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کارنگ" مصنفین سے سروے۔
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ۔
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا فروری 2017ء کا شمارہ آج ہی خرید لیں

ہونی چاہیے۔ جہاں ختم ہوئی تھی، پہلے تم بتاؤ۔ اس روز کے بعد تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آیا؟" شافحہ نے جیسے برسوں کے طویل وقفے کو ترتیب سے سمیٹنے کی کوشش کی۔

"پیش کہاں آئی۔ افتاد پڑی تھی سر پر۔" نگین نے مسکراتے ہوئے کچھ سوچا۔ اور پھر بولنے لگی۔

"گاؤں سے لوٹتے ہی پہلا حملہ تو باجی کی ٹرانسفر کی صورت میں ہوا۔ اس کا افسوس کم کرنے کے لیے تمہیں خط لکھا، لیکن تمہارا جواب نہ پا کر کافی مایوسی ہوئی۔ جیسے تیسے خود کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ تقریباً بارہ یا تیرہ دن بعد کی بات ہے جب اچانک میری خالہ اپنے بیٹے فرخ کا رشتہ میرے لیے لے کر آگئیں۔ سب ہی گھروالے حیران تھے کہ فردوس سے پہلے میرے رشتے کی جلدی۔ بھلا کس لیے۔ لیکن روینہ خالہ نے معذرت کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کر دی۔ انہوں نے کہا کہ فرخ اپنے دل میں میرے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے اور وہ نہیں چاہتیں کہ اپنوں میں سے کوئی اور۔ ان سے پہلے میرا رشتہ مانگ لے اور وہ صرف پچھتاتی رہ جائیں۔ اس لیے وہ میری اور فرخ کی منگنی کر دینا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی فرخ، فردوس باجی سے چھوٹا تھا اور میرا ہم عمر تھا۔

فرخ انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بہت لائق اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ میرے ابو بھی اسے پسند کرتے تھے۔ انہوں نے باقی گھروالوں سے صلاح مشورہ کر کے ماہمی رضامندی سے خالہ کو رشتے کے لیے ہاں کر دی، لیکن میں تو فرخ کے نام کی انگوٹھی بھی پہننا نہیں چاہتی تھی۔ دل و دماغ پر احمران دونوں اس بری طرح سوار ہو چکا تھا کہ ہر جائز، ناجائز طریقہ مجھے درست لگ رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ ابو کسی صورت ایک شادی شدہ مرد سے میری شادی کے لیے رضامند نہیں ہوں گے۔ اس لیے سوائے گھر سے بھاگنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ذہن میں ساری پلاننگ ترتیب دے لینے کے بعد میں نے اگلے روز ہی احمر کو فون

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریبنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

مجھ رہا تھا کہ محبت کی جو نئی دنیا اس نے مجھے دکھائی ہے اس سے دور رہنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ ویسے تو میں اس کی ساری بکواس میں چپ چاپ سستی رہی تھی، لیکن دماغ میں اس کے ایک ہی جملے کی بازگشت جاری تھی کہ میں اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر کیسے کہیں بھاگ سکتا ہوں۔ سعدیہ مرجائے گی۔ وہ مجھے ایسا نہیں سمجھتی اور بس۔ ”تکین نے ایک سرد آہ کھینچی۔

”بے ساختگی میں بنا سوچے بولے گئے ان۔ چند جملوں کی حقیقت یوں ہر لگی لپٹی پر بھاری آئی کہ مجھے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ احمر کی دھوکا دہی کا پول کیا کھلا۔ دھواں دھار محبت تو سوچ بچ دھواں بن کر اڑ گئی۔ اور میں بے وقوف جو چند ہی روز میں یہ سوچنے لگی تھی کہ احمر میرے بغیر سانس تک نہیں لے سکتا، ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ بیوی کے سامنے دیوتا کا روپ دھار کر رہنے والا میرے ساتھ محض ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں ناوم اور شرمندہ ہونے کے بعد چپ چاپ فرخ سے منگنی کر لی۔“

”اوف“ شافعہ نے بر سکون انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ”تو یعنی تمہاری شادی خالہ زاد سے ہو گئی۔“

”ہاں میں خوش ہوں کہ آج مسز فرخ احمد کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ لیکن تم شافی۔“ تکین نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

”پلیز اپنے بارے میں بتاؤ نا۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا اس روز کے بعد۔“

”میرے ساتھ۔“ شافعہ نے سنجیدگی سے ایک آہ بھری۔

”میرا معاملہ قدرے مختلف رہا۔ احمر اگر دوسری شادی کے نام سے بھاگ رہا تھا تو جمال کے دماغ کا فتور ہی دوسری شادی تھی اور وہ اس معاملے میں مہلت دینے کو بھی ہرگز تیار نہیں تھا۔ حالانکہ میں ان دنوں میں فرانس کی ٹرانسفر اور تم سے دوری کی وجہ سے بہت

کر کے صورت حال سے آگاہ کیا، لیکن احمر کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے نے ہی مجھے شاکڈ کر دیا۔ کہنے لگا۔

”میں اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر کیسے کہیں بھاگ سکتا ہوں۔“ اور میری عقل دیکھو، ”جواباً“ اسے سمجھانے لگی کہ۔

”کوئی بات نہیں، پھر میں ہی تمہارے گھر آجاتی ہوں۔ مجھے تمہاری وائف کے ساتھ رہنے میں کوئی پر ابلم نہیں ہے۔“ احمر کی تو آواز ہی لرزنے لگی۔ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔

”نہیں۔ سعدیہ تو مرجائے گی۔ وہ میرے بارے میں ایسا نہیں سوچتی۔ پھر مجھے ڈانٹنے لگا کہ۔ آخر مجھے ہو کیا گیا۔ محض منگنی ہی تو ہے۔ کیا حرج ہے انگوٹھی پہن لینے میں۔ چند سال گزر جانے دو اسی طرح۔ آرام سے کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا کہ ”کیا وہ میرے بغیر یہ چند سال گزار لے گا۔“

تب اچانک ہی احمر کی زبان کا شہد لوٹ آیا۔ وہ مجھے سمجھانے اور پچکارنے لگا کہ ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔ باتیں بھی کریں گے اور ملاقاتیں بھی۔ بیچ کے چند سال کیسے گزر جائیں گے، پتا ہی نہیں چلے گا۔ میں حیرت سے اس کے بل بل بدلتے رویے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے اعتماد کی وجہ بھی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ جن ملاقاتوں کا ذکر کر رہا تھا ان کی ایک جھلک میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ احمر اپنے ایک دوست سے اس کے خالی گھر کی چابی مانگ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس کی دیوانہ وار محبت کے کئی رنگ مجھ پر آشکار ہوئے تھے۔ لیکن تب اسے میں صرف اور صرف محبت سمجھی تھی۔ چونکہ وہ تہائی کی پہلی ملاقات تھی، تو احمر قدرے محتاط سا تھا، اسی لیے شکر ہے کہ میری عزت بھی محفوظ رہی تھی۔ لیکن بھلا کب تک۔ مستقبل کے حوالے سے بھی اس کے ذہن میں ایسی ہی ملاقاتوں کے خاکے تھے۔ مجھے اپنانے کا کہیں دور دور تک اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شاید وہ

ہی انتظار کر پایا اور پھر دوسرے گاؤں سے ایک لڑکی بیاہ لایا۔ جانتی ہو کیوں۔؟ شافحہ نے مسکرا کر نگین سے سوال کیا تو اس نے محض کندھے اچکا دیے۔

”زندگی کی آخری سالس تک ساتھ نبھانے والے کے دماغ میں صرف دوسری شادی کا کیرا اٹھسا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں کچھ مرد اپنے بیٹوں کی مرضی کے آگے سر جھکا کر مارے باندھے ارنج میں جھونک لیتے ہیں، لیکن محبت کی شادی کا خواب تب تک دیکھتے رہتے ہیں جب تک کہ اسے پورا نہ کر لیں۔ اور محبت کا یہ صفحہ بھی بیک وقت کئی ناموں سے بھرا ہوتا ہے۔ جمال کی شادی کے بعد صحیح معنوں میں میری آنکھوں سے ناوالی کی پٹی اتری۔ تب پہلا خیال تمہیں ڈھونڈنے کا آیا۔ اب میں ہر قیمت پر تمہیں احمر کے قرب سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ میرے شوہر عابد کا اللہ بھلا کرے۔ اس موقع پر میرا بڑا ساتھ دیا اس نے۔ اگرچہ اسے میں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اپنی ایک بہت پیاری سہیلی کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دو مرتبہ ڈی آئی خان گیا۔ مس رفعت کو تمہارے گھر کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ میں اسی آدھے ادھورے پتے پر تمہیں ڈھونڈنے خود وہاں گئی، لیکن بس مقدر میں ملنا نہیں لکھا تھا۔

”لیکن شافحہ۔ تم نے پچھتاوے اور بوجھ وغیرہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس سے تمہاری کیا مراد تھی؟“

”تمہیں انجانے میں ایک غلط مشورہ جو دے بیٹھی تھی۔ یاد نہیں میں نے تم سے کہا تھا کہ کیا پتا محبت ہماری زندگی میں اسی طرح ہی آتی ہو اور دوسری بیوی بن کر شاید ہماری لائف سکھی رہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب جمال کی اصلیت سامنے آئی تو اپنے کئے یہ ہی چند الفاظ میرے لیے زندگی بھر کا روگ بن گئے۔ اگر تم میری باتوں کے زیر اثر ناوانی میں کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا بیٹھتیں تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر پاتی۔ بلکہ معاف تو ایک بھی دن خود کو نہیں کیا تھا۔ تمہارے حالات سے چونکہ لاعلم تھی تو روز ہی یہ سوچ میرے دماغ کو کچھ کے لگاتی کہ کہیں میری وجہ سے تمہاری

پریشان تھی۔ اوپر سے شدید افسوس تمہیں خط کا جواب نہ دے پانے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ حالانکہ تمہارا خط پڑھتے ہی میں نے فوراً ”جواب لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جب مس فردوس کو دینے کے لیے اسٹاف روم میں آئی تو پتا چلا کہ وہ جا چکی ہیں۔ میں نے خط میں اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا۔ سب سے زیادہ دکھ بھی اسی بات کا تھا کہ رابطے کا اب کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف یہ سوچ بھی پریشان کر رہی تھی کہ جمال کے معاملے میں اب کس سے مشورہ کروں گی۔

آخری ملاقات میں ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ اگلی مرتبہ ان معاملات پر تفصیل سے بات کریں گے اور جمال بری طرح میرے سر پر سوار تھا کہ وہ جلد از جلد رشتہ بھیجنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی کو بھی اس نے لڑ بھگڑ کر میکے بٹھادیا تھا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں ہر قیمت پر مجھ سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرا دھیان ان دنوں صرف تمہاری طرف لگا ہوا تھا، اس طرح اچانک تم سے دوری ہوئی کہ اور کسی بات میں میرا دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور پھر جمال نے بنا مجھ سے صلاح مشورہ کیے دو پیار کی ایک بوآ کے ہاتھ میرا رشتہ بھیج دیا اور بس۔ رشتے کا گھر میں آنا تھا کہ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک شادی شدہ بال بچے دار آدمی کا رشتہ آنا اتنا غیر متوقع اور بے جوڑ تھا کہ سب کو پہلا شک ہی ہم دونوں کی باہمی دلچسپی پر گزرا۔ مجھے جمال کی عجلت پر بہت غصہ آیا، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اپانے جھٹ پٹ نہ صرف میرا رشتہ پھوپھو کے بیٹے سے طے کر دیا، بلکہ دو ماہ بعد شادی بھی کر دی۔ تمہیں حیرانی ہوگی سن کر کہ جس روز نویں کلاس کا پورڈ کا آخری پیرزدے کر آئی۔ اسی روز میری رخصتی تھی۔“

”اور جمال۔“ نگین نے بے ساختہ سوال کیا۔

”اس بے چارے کا تو برا حال ہو گا تمہارے بغیر۔“

”ہاں۔“ شافحہ مسخکہ اڑانے والے انداز میں ہنسی۔

”اتنا برا حال کہ میری شادی کے بعد وہ محض ایک ماہ

تھا تو یقیناً "کننگ بھی انہوں نے کی ہوگی۔ حیرت ہے کہ سولہ سالوں سے میری بہن میرے راز کی امین ہے اور آج تک کبھی اس نے نہ تو مجھے اس بات کا طعنہ دیا، نہ کوئی حوالہ۔ بلکہ محض بارہ پندرہ دنوں میں میرا رشتہ فرخ کے ساتھ کرانے میں بھی ضرور ان ہی نے اہم رول ادا کیا ہوگا۔ کیونکہ فرخ بارہا یہ بات دہرا چکا ہے کہ ہماری شادی کے معاملے میں وہ بطور خاص فردوس باجی کا ممنون ہے، لیکن تب میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔"

"کیسے نادان تھے نا ہم۔" شافعہ کھسا کر ہنسی۔
 "ہاں۔ نادانی میں ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو ایسے مشوروں سے نوازنے کی کوشش کی تھی جن کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں تھا اور اپنی دانست میں وہ ہمارے مخلصانہ مشورے تھے۔ کیونکہ اس عمر۔ اس جذباتیت کے حساب سے ہمیں وہی درست لگے تھے۔ یہ تو سراسر قدرت کی مہربانی تھی ہم پر کہ حالات اس کے موافق نہیں ہوئے۔ پھر فردوس باجی نے بھی ذمہ دار بہن ہونے کا پورا حق ادا کیا۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے انہوں نے اپنے فرض سے غفلت نہیں برتی اور میرے لئے سیدھے مشورے بنا مجھے کچھ بھی کہے مہارت سے خود ہی کٹھ پتلی۔"

"یعنی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" بیٹے دنوں کی یاد میں کھوئی شافعہ کا چہرہ ندامت سے سرخ پڑ گیا۔
 "نہیں۔" کننگ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"دوستی تو ہم نے خوب نبھائی، لیکن اپنے حساب سے۔ دراصل دوست تو ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری ہوتے ہیں۔ ساری بے وفائی ان کے ساتھ عمر کرتی ہے۔ نا تجھی کے فیصلے۔ نادانی کے مشورے۔ ساری وفاداری، سارے خلوص کو بہالے جاتے ہیں اور پر خلوص دوست کھڑے سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ایسا ہم نے کیا کر دیا جو حالات یوں تباہی کے سرخ پر چل پڑے۔"

"ہاں۔ لیکن ایسا ہمیشہ ہر کسی کے ساتھ نہیں

زندگی میں کچھ برانہ ہو چکا ہو۔ جس سہیلی سے اتنی محبت کی۔ اسی کے لیے تباہی کا راستہ چن لیا۔"
 "او۔" کننگ مسکرانے لگی۔ عجیب انکشاف کیا تھا شافعہ نے، کمال اتفاق تھا کہ سولہ برس سے وہ بھی اسی غم میں مبتلا تھی کہ اس نے اپنی دوست کو بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں۔ اثر تو ضرور ہوا تھا تمہاری باتوں کا اور اسی وجہ سے بھاگنے کا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا تھا، لیکن بھلا ہوا احمر کا۔ جس کا دور دور تک مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"لیکن کننگ۔ تم بھی تو بوجھ اور پچھتاوے کا ذکر کر رہی تھیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟" شافعہ کو اچانک خیال آیا۔

"کیوں کہا؟" کننگ نے حیرت سے دہرایا۔ "اب تم تو یہ نہ پوچھو شافعہ۔ میرا خط پڑھنے کے بعد بھی ایسا سوال۔"

"تمہارا خط۔ ہاں مجھے آج بھی اس کا ایک ایک لفظ اچھی طرح یاد ہے۔ مہینوں تمہارے خط کی ہر لائن کو بار بار پڑھا تھا، لیکن کننگ۔ اس میں ایسا کیا تھا۔"
 "میرے سب ہی گمراہ کن مشورے، جیسے گھر سے بھاگنے کی صلاح، محبت حاصل کرنے کے لیے ہر جائز ناجائز طریقہ اختیار کرنے کا مشورہ۔ ہر بات۔"
 کننگ اس کی حیرت پر حیران تھی۔

"نہیں کننگ۔ ایسا کچھ نہیں تھا خط میں۔ بلکہ ہاں۔ اسے اچانک کچھ خیال آیا۔ تمہارا خط تو بے شمار کلنگز سے بھرا ہوا تھا۔ بس ایک ہی پیرا گراف تھا جسے میں بار بار پڑھتی تھی۔ جس میں صرف حال احوال اور دور ہو جانے کا افسوس تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا تھا تم پر کہ لائف میں ایک ہی خط تم نے مجھے لکھا اور وہ بھی ایسا آواہ اور اورا۔"

"او۔" کننگ نے تھک کر سر ہاتھوں پہ گرایا۔

"تو یہ بات ہے۔"

"کب تک کننگ۔ میں ابھی بھی نہیں سمجھی۔"
 "ہمارے درمیان رابطے کا نام فردوس باجی نے کیا

www.paksociety.com

حسابہ کیا۔
”عزیز از جان سہیلی کو محض بے خبری اور نا سبھی

کے تحت بربادی کی آگ میں جھونکنے کے پھتارے پالتی۔ ہم نادان سہیلیاں جن کے دکھ بھی ایک ہوتے ہیں اور سکھ بھی۔“

ہوتا۔“ شافحہ نے اس کے تجزیے سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔
”جہاں ہمارے بڑے اپنے بچوں کی دوستیوں میں جوں اور رابٹوں پر اپنی بھرپور نگاہ رکھتے ہیں وہاں ایسی غلطیوں اور بے وقوفیوں کے امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ بس ہر کسی کو اپنی ذمہ داری سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

”اور ہم دونوں نے تو ہر معاملے میں لائبریری کا ثبوت دیا۔ نہ ہم نے غیر مردوں کے ساتھ میل جول بڑھانے میں احتیاط سے کام لیا اور نہ ہی ایک دوسرے کو کوئی اچھا اور مناسب مشورہ دے پائے۔ پھر بھی جانے کس کی نیکی کام آئی کہ خطروں میں کودنے کے باوجود ان سے بچتے چلے گئے۔“

”ورنہ اپنے پلان تو نرے ڈوبنے کے تھے۔“ شافحہ ہنسی تو بے ساختہ نکلیں کو بھی ہنسی آگئی اور وہ دونوں ہی دیر تک ہنستی چلی گئیں۔ ایسی ہنسی جس میں برسوں کا غبار تھا۔ پھر نہ جانے کیسے ہتے ہتے دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ نکلیں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر شافحہ کو دکھا۔

”یہ انسان بھی نا۔ بڑی عجیب مخلوق بنائی رب تعالیٰ نے۔“ مسکرا کر اس نے آنکھوں کے کونے صاف کیے۔

”سانپوں۔ بچھوؤں، ڈاکوؤں، حتیٰ کہ دیوانوں سے گھبرانے، انہیں اپنا دشمن سمجھنے والے ہم کبھی کبھار اپنی ذات کے ساتھ کتنی بڑی دشمنی کر جاتے ہیں۔“
”نہ صرف اپنے بلکہ ان کے ساتھ بھی۔ جنہیں ہم بہت عزیز، بہت قریب، بہت محبوب رکھتے ہیں۔“
شافحہ بھی روتے روتے مسکرائی۔

”تقدیر نے بھلے بربادی سے بچالیا تھا، پھر سولہ برسوں تک جس دکھ کے ناسور کو اکیلے اکیلے اپنے اندر پالتے رہے۔ وہ شاید یاداش تھی اس غلطی کی وجہ جو ہم سے بہر حال سرزد ہوئی۔“ نکلیں نے کھلے بندوں اپنا



مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گروپوش

کتاب کا نام

قیمت

450/-	سزنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سزنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سزنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سزنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سزنامہ	مگری مگری پھر مسافر
225/-	طرح و مزاح	خمار گندم
225/-	طرح و مزاح	اُردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندنگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈگر ایلن پو اینڈ انشاء	اندھا کتاواں
120/-	ادھری ایلن انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طرح و مزاح	ہاتھی انشاء جی کی
400/-	طرح و مزاح	آپ سے کیا پردہ

Downloaded From Paksociety.com



دیکھ کر یہ صدمہ کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

جس اندھیرے میں ستارے نہ جلتے
اک مٹی کا دیا کیا کرتا

ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا لگہ کیا کرتا

جو نہ سمجھا کبھی مفہوم وفا
اپنا وعدہ بھی وفا کیا کرتا

نگہت و رنگ کا پیاسا تھا ندیم
صرف اک لمس ہوا کیا کرتا

احمد ندیم قاسمی

تجھ پر بھی فسون دہر کا جل جلے گا آخر
دنیا کی طرح تو بھی بدل جائے گا آخر

پھیلی ہے ہر اک سمت حوادث کی کڑی دھوپ
پتھر ہی ہے، وہ بھی پگھل جائے گا آخر

وہ صبح کا تارہ ہے تو پھر ماند بھی ہوگا
چڑھتا ہوا سورج ہے تو ڈھل جائے گا آخر

دل تجھ سے پھڑک رہی کہاں جلنے گا ایسے وقت
یادوں کے کھلونوں سے بہل جائے گا آخر

آوارہ و بدنام ہے محسن تو ہمیں کیا؛
خود ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھل جائے گا آخر

محسن نقوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع فروری 2017 266

Downloaded From Paksociety.com

نین کھلتے رہتے، نیندا آتی نہ تھی، رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی
سارے اوراقِ غم منتشر ہو گئے، دیر تک دل میں آندھی سی چلتی رہی

گھاس تھی بگنوں کو چھپائے ہوئے، پیڑ تھے تیرگی میں نہانے ہوئے
ایک کونے میں سر کو تھکائے ہوئے، درد کی شمع افسردہ جلتی رہی

بہسلا دن تھا محبت کی برسات کا، وقت ٹھہرا تھا تجھ سے ملاقات کا
قطرہ قطرہ گزرتی رہیں ساعتیں، سلٹے لیے رہے، دُھوپ چلتی رہی

رنج پھلی مسرت کے بہتے تھے ہم، ایک ہی قریڑ جاں میں بہتے تھے ہم
دن ڈھلے یا کسی صبح کے موڑ پر، اپنے ملنے کی صورت نکلتی رہی

ایک راتوں سے پھڑکی ہوئی رات میں، ہم اکیلے تھے خوابِ ملاقات میں
دووں اک دوسرے کی طرف چل پڑے، خوابِ ڈھلتا رہا، رات ڈھلتی رہی

احمد مشاق

گلشنِ پاکستان

غلطی ہمیشہ معمولی لباس پہننے والے ڈرائیور کی ہے۔ بونی فارمیاسوٹ پہننے والی نہیں۔
غلطی ہمیشہ قومی زبان بولنے والے ڈرائیور کی ہے۔ انگریزی بولنے والے کی نہیں۔

جواب

ایک سیسی نار میں شادی شدہ خواتین سے ایک سوال پوچھا گیا کہ آپ نے آخری دفعہ کب اپنے شوہر کو ”آئی لویو“ بولا تھا۔
کسی نے کہا آج ہی بولا ہے۔ کسی نے کہا دو دن پہلے بولا تھا۔ سب سے کہا گیا کہ آج ہی اپنے شوہر کو مسیج کر کے ”آئی لویو“ کہیں۔ جس خاتون کو سب سے اچھا جواب موصول ہوگا۔ اسے دس تولہ سونا انعام میں دیا جائے گا۔

کچھ دیر بعد ان کے شوہروں کے جواب آنا شروع ہو گئے جو اس طرح تھے۔

- 1- آج تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟
 - 2- گھر کا خرچہ ختم ہو گیا کیا؟
 - 3- کہیں تم میکے تو نہیں جا رہی ہو؟
 - 4- لگتا ہے آج گھر پر کھانا نہیں بنے گا؟
 - 5- کیا مطلب؟
 - 6- تم خواب میں ہو یا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟
 - 7- ہیلو کی شادی میں کسی کی جیولری پسند آگئی کیا؟
 - 8- آفس میں اتنا ٹینشن ہے اور تمہیں عاشقی سوجھ رہی ہے۔
 - 9- کتنی بار کہا ہے انڈین ڈراما سیریل مت دیکھا کرو۔
 - 10- گاڑی پھر ٹھونک دی کیا؟
- فائل جواب جس کو دس تولہ انعام ملا اس کا

لا علمی

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے شادی کے بعد بھی مجھ سے پیار کرتے رہو گے۔“
”مجھے کیا پتا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہی ہو جائے گی۔“ شوہر نے سادگی سے جواب دیا۔

خوبی

”غریبی ڈیلر صاحب! آپ مجھے وہی مکان دلانے کی کوشش کر رہے ہیں نا جس کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔“
”جی ہاں“ آپ بالکل ٹھیک سمجھے، آپ تو اس مکان کی اس اہم خوبی سے پہلے ہی واقف ہیں کہ ٹرانسپورٹ کی سہولت اس کے دروازے پر ہی دستیاب ہے۔“

ذرا سی خراش

بازار سے واپسی پر بیوی نے شوہر کو بتایا۔
”گاڑی کے بونٹ پر ذرا سی خراش آگئی ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو دیکھ لینا۔ بونٹ ڈکی میں رکھا ہوا ہے۔“

ہمارے اصول

جب دو کاروں میں ٹکرا ہو تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ کون سا ڈرائیور غلطی پر تھا۔ ہمارے یہاں کے لوگوں نے اس معاملے میں چند اصول بنائے ہیں۔ ممکن ہے ان پر عمل کرنے سے دوسرے ممالک کے لوگوں کو بھی فائدہ ہو جائے۔

غلطی ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ اور کم قیمت گاڑی والے کی

غلطی ہمیشہ مرد ڈرائیور کی ہے۔ عورت ڈرائیور کی نہیں خواہ وہ بغیر لائسنس گاڑی چلا رہی ہو۔

جواب تھا۔
”آئی لو یو ٹو بٹ ہو آریو؟“

گواہی

ٹریفک سارجنٹ نے طویل اور طوفانی تعاقب کے بعد ایک صاحب کو روکا جو سگنل توڑ کر تیزی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔
”تمہیں شرم نہیں آتی۔ پہلے سگنل توڑا اور پھر اس تیزی سے گاڑی بھگائی جس رفتار سے اس سڑک پر گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہے۔“ سارجنٹ غصے سے بولا۔

”میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ آپ میری بیگم سے پوچھ لیں۔“ وہ صاحب معصومیت سے بولے۔

”کیوں بیگم صاحبہ! آپ گواہی دیں گی کہ آپ کے شوہر نے نہ سگنل توڑا نہ گاڑی تیز چلائی؟“
”میں تو ایک بات جانتی ہوں۔“ خاتون نے سر جھکا کر کہا۔ ”جب میرے میاں نشے میں ہوں اور ڈرائیونگ لائسنس گھر بھول آئیں تو ان سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔“

اگر

ایک صاحب پندرہ سال سے شہر سے باہر نہیں گئے تھے۔ ایک بار چند روز کی چھٹیاں آئیں تو انہوں نے سوچا چلو چھٹیوں کا یہ عرصہ شہر سے باہر چل کر گزاروں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سولہ سالہ لڑکی کو ساتھ لیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی ٹرین نے بیس میل سے زیادہ کا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ٹرین کو جنگل میں روک لیا اور سارے مسافروں کا سامان لوٹ کے لے گئے۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد وہ صاحب روتے ہوئے بولے۔

”ہائے میں تو لٹ گیا۔ تباہ و برباد ہو گیا۔ میری ہر چیز چھین لی گئی۔“

”رویئے مت ابا جان۔“ ان کی بیٹی دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

”میں نے سارے زیورات بچالے ہیں۔ جیسے ہی میں نے ڈاکوؤں کو دیکھا، اپنی انگوٹھیاں، گلے کا ہار، کانوں کے بندے، ہاتھوں کی سونے کی چوڑیاں سب کو اپنے منہ میں رکھ کر چھپالیا۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”مگر ہمارے ساتھ تمہاری امی بھی آئی ہو تیس تو ہم لوگ سوٹ کیس اور بستر بھی بچالیتے۔“

قانونی زبان

پروفیسر وکیل نے شاگرد سے کہا۔
”کسی کو سنگتہ دینا ہو تو کیا کہو گے؟“

طالب علم۔ ”یہ سنگتہ لو۔“

پروفیسر۔ ”نہیں ایک وکیل کس طرح جوئے گا۔“

”میں گل خان ولد شیر زمان ساکن نیا آباد کراچی اپنے ہوش و حواس کے ساتھ اور بغیر کسی سے ڈرے اور بنا دباؤ، اس پھل کو جو اردو میں سنگتہ کہلاتا ہے اور جس کے میں پورے مالکانہ حقوق رکھتا ہوں، کو اس کے چھلکے، رس، گووے، بیج سمیت آپ کو دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ آپ کو پورا حق دیتا ہوں کہ آپ اسے کاٹنے، پھیلنے، فرنیچ میں رکھنے یا کھانے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ یہ بھی حق ہے کہ آپ کسی بھی دوسرے شخص کو یہ پھل اس کے چھلکے، رس، گووے اور بیج کے بغیر یا اس کے ساتھ دے سکتے ہیں۔“

فضول قصے کہانیاں

ایک صاحب کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے عورت کی عادات و فطرت کے بارے میں منقہ باتیں سن رکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ عورت کا دل کس طرح جیتا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ کتابوں کی ایک دکان پر پہنچے اور کہا۔

”آپ کے پاس وہ کتاب ہوگی جس کا عنوان ہے ”عورت پر حکومت کیجئے۔“

”جی نہیں! ہمارے پاس فرضی قصے کہانیوں والی کتابیں نہیں ہوتیں۔“ دکان دار نے منہ بنا کر جواب دیا۔



اولاد و اولاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

• مومن مرد اور مومن عورت پر اس کی جان، اولاد اور مال میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں (جن سے ان کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ کو ملتے ہیں (ان کو موت آتی ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے)

فائدہ:-

اس سے معلوم ہوا کہ مومن بطور خاص آزمائشوں کا برف رستا ہے اور اس میں اس کے لیے بھلائی کا پہلو یہ ہے کہ ان سے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں بشرطیکہ وہ صبر کا دامن تھامے رہے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اللہ پر یقین،

حضرت زینیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرنے کی لوندی تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہونے تھے۔ جوں ہی حضرت زینیرہؓ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو حضرت عمرؓ غصے میں آگ بگولہ ہو گئے۔ انہوں نے خود بھی ان کو خوب مارا اور ان کے گھر کے افراد بھی برابر مارتے رہے۔ سٹکے کے کافروں نے انہیں سر بازا اور اس قدر مارا کہ ان کی بینائی چلی گئی اور وہ نابینا ہو گئیں۔

اس کے بعد کافروں نے طعنہ دینا شروع کیا کہ زینیرہؓ چونکہ تم ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کو برا بھلا کہتی تھیں اس لیے ہمارے ان بتوں نے تمہاری آنکھوں

کی روشنی چھین لی ہے۔

یہ طعنہ سن کر حضرت زینیرہؓ نے جوش میں آ کر کہا۔
”ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم تمہارے لات و عزیٰ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ میری آنکھوں کی روشنی چھین سکیں۔ میرا اللہ جو احدہ لا شریک ہے، وہ جب چاہے گا میری آنکھوں کی روشنی واپس آجائے گی۔“

ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ ان کی آنکھوں کی روشنی واپس آگئی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا،

تم کو دو باتوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک خواہش کی پیروی، دوسرے آرزوؤں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی انسان کو حق سے روکتی ہے اور خواہشات کا زیادہ ہونا آخرت کو بھلاتا ہے۔

دوسروں کو نصیحت،

ایک بستی میں لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے احتراز کرتے۔ اس بستی میں ایک بزرگ عبادت گزار تھے۔ وہ اپنے حجرے میں تنہا بیٹھ کر رات بھر عبادت کرتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ پوری بستی کو تباہ کر دیا جائے۔ جبرائیلؑ وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ مجموعہ عبادت میں۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا کہ کیا انہیں بھی بستی والوں کے ساتھ شامل کیا جائے۔ وہ تو عبادت گزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”ہاں وہ بھی ان میں شامل کیے جائیں گے کیونکہ وہ خود تو عبادت و ریاضت کے پابند ہیں لیکن دوسروں کو تبلیغ و نصیحت نہیں کرتے۔“ چنانچہ جبرائیلؑ نے پوری بستی کو تباہ کر دیا۔

صحابہ کافترہ

اپنی طرف سے منسوب کوئی چیز نہ چھوڑی ہو۔
وفات کے بعد حضرت قادی نے انہیں خواب میں دیکھا
اور پوچھا۔

”حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟“
حضرت جنید نے جواب دیا: ”وہ اٹھائے ختم ہوئے،
وہ عبادت میں فائب ہو گئیں، وہ علوم فنا ہو گئے، وہ نقوش
مٹ گئے اور ہمیں نفع پہنچایا تو چند رکعتوں نے جو ہم
سحری کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے۔“

کامیابی کا راز

کامیابی کا راز صرف دو خصوصیات میں نہیں ہے۔
مستقل مزاجی اور مزاحمت۔ جو کچھ کرنا ہے، اس پر ڈٹے
رہو اور جو کچھ نہیں کرنا ہے، اسے کرنے سے خود کو روکے
رکھو۔

یہ صرف اس وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں
سے زیادہ بہادہ ہوتا ہے۔ وہ اس وجہ سے یہ
ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے دس منٹ زیادہ بہادہ
ہوتا ہے۔

(دائف والد ذرا عیمر سن)

قبولیت کی دعا

قبولیت دعا کے لیے مایوسی، احساس بے چارگی
اور اضطراب غم ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی بیکروں
کی دعا بھی قبول ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو غم زدہ
دل کی بے تاب دھڑکن مائل بیکرم کرتی ہے۔

(ابن جوزی)

ہانیہ عمران - بکرات

ایشارہ کا انعام

بہت سال پہلے کی بات ہے دو نوجوان اسٹینٹن
فورڈ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ مالی حالات کی خرابی کی
وجہ سے انہیں اخراجات پونے کرنا مشکل تھا۔ ایک دن
ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ وہ ایک میوزک
کنسرٹ کا اہتمام کر کے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں۔
”میں نے اصحاب رضوان اللہ اجمعین میں سے خیر ایسے
صحابہ کو دیکھا ہے جن کو پورا لباس بھی میسر نہ تھا کسی
کے پاس صرف اونٹنی کی چاند ہوتی تو کسی کے پاس تہ بند
اور وہ اس کو اپنے گلے سے باندھ لیتے تھے۔ تو کسی کے
تو نصف پنڈلی تک وہ چادر آتی اور کسی کے ٹخنوں تک
اور سامنے سے وہ اسے اپنے ہاتھ سے تھامے رہتے تھے۔“

(بخاری)

آخرت کے عوض

ایک آدمی عامر بن قیس کے پاس سے گزرا۔ وہ

نمک اور بیزی کھا رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔
”اے اللہ کے بندے کیا تو اس قدر دنیا پر خوش
ہو گیا؟“

انہوں نے کہا: ”کیا میں تمہیں اس سے بدتر نہ بتاؤں؟“
کہا: ”ہاں فرمائیے۔“
عامر بن قیس نے کہا: ”اس سے بدتر وہ ہے جو آخرت
کے عوض دنیا پر راضی ہو گیا۔“

دل کا مرنا

ایک بار مالک بن دینار نے جن بھری سے پوچھا۔
”لوگوں کی خرابی کس بات میں ہے؟“
فرمایا: ”دل کے مرنے میں۔“
پوچھا: ”دل کا مرنا کیا ہوتا ہے؟“
فرمایا: ”دنیا کی محبت۔“

تہجد کی اہمیت

وفات سے قبل حضرت جنید بغدادیؒ نے وصیت
فرمائی کہ میری طرف جتنی علم کی باتیں منسوب ہیں اور لوگوں
نے انہیں لکھ لیا ہے، وہ سب دفن کر دی جائیں۔ لوگوں
نے اس کی وجہ پوچھی تو جواب دیا۔

”جب لوگوں کے پاس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)
کا علم (حدیث) موجود ہے تو میری خواہش یہ ہے کہ۔
اللہ تعالیٰ سے میری ملاقات اس حالت میں ہو کہ میں نے

اکٹھی کر سکتے ہیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مشہور یا نو

پھر اس نے واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔
"میں ان دو طالب علموں میں سے ایک ہوں۔ جب
میں مشکل میں تھا تو آپ نے میری مدد کی تھی۔ اب
آپ مشکل میں ہیں تو میں نے آپ کی مدد کی۔"
نادیہ، بیچہ۔ گلستان جوہر

چند باتیں زندگی کی،

6 سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے
کی ہے اور متاثر کرنے کی اور اس کی مزاج ہے
کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔
6 ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ ہیں
اور خود دہین نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم جو کچھ دیکھتے
ہیں وہ سچ نہیں ہوتا۔ ہم ساکن ہیں لیکن متحرک۔
ہماری عمر بڑھ رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ
ہماری عمر کم ہو رہی ہے۔
عاش، تحویم۔ گوجرہ

دوسروں کی مدد کرنا،

عالمی شہرت یافتہ ماہر نفسیات ڈاکٹر کمال میننگز
نے ایک مرتبہ کہا۔
"مگر تمیں علم ہو کہ کسی شخص کا زورس بریک ٹاؤن ہونے
والا ہے تو تم اسے کیا نصیحت کرو گے؟"
سامعین کو توقع تھی کہ ڈاکٹر میننگز کہے گا کہ اسے
ماہر نفسیات کے پاس جانا چاہیے لیکن اس نے ایسا
نہیں کہا۔ اس نے کہا۔
"میں اس شخص کو نصیحت کروں گا کہ وہ شہر کی
دوسری جانب جائے۔ کسی ضرورت مند کو ڈھونڈنے
اور اس کی مدد کرنے۔ ایسا کرنے سے اس کا مسئلہ
حل ہو جائے گا۔"
نمو، اقرا۔ کراچی

ٹواؤ پیڈرووسکی کے کنسرٹ کا اہتمام کر س گے۔
انہوں نے پیڈرووسکی کے میجر سے رابطہ کیا تو اس
نے بتایا کہ پیڈرووسکی ایک پروگرام میں شرکت کا معاوضہ
دو ہزار ڈالر لیتا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت
بڑی رقم تھی۔ لیکن انہوں نے منظور کر لی۔

پیڈرووسکی نے کنسرٹ میں شرکت کی لیکن ان
کے پاس صرف سولہ سو ڈالر جمع ہوئے۔ جب پیڈرووسکی
کنسرٹ میں شرکت کے بعد روانہ ہونے لگا تو انہوں نے
اسے سولہ سو ڈالر نقد اور چار سو ڈالر کا ایک پرومیسری نوٹ
دیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس اتنی ہی نقد
رقم جمع ہوئی ہے، باقی رقم وہ جلد از جلد کما کر اسے ادا
کر دیں گے۔

پیڈرووسکی نے پرومیسری نوٹ بھاڑ کر دو ٹکڑے
کر دیا اور سولہ سو ڈالر انہیں واپس دیتے ہوئے کہا۔
"ان بیسوں سے اپنے اخراجات پورے کرو اور دل
لگا کر پڑھو۔"

اس نے اتنا کہا اور رقم انہیں دے کر چلا گیا۔
وقت گزرتا گیا۔ پہلی عالمی جنگ ہوئی تو پیڈرووسکی

اس زمانے میں پولینڈ کا وزیر اعظم بن چکا تھا۔ جنگ
کے بعد ملک میں شدید غذائی قلت ہو گئی۔ دنیا میں صرف
ایک ہی شخص اس مسئلے کو حل کر سکتا تھا اور وہ تھا
امریکی فوڈ اینڈ ریلیف بیورو کا سربراہ رابرٹ ہوور۔
پیڈرووسکی نے اس سے مدد کی درخواست کی
تو رابرٹ ہوور نے ہزاروں ٹن خوراک پولینڈ بھجوا
دی۔

پیڈرووسکی نے خوراک اپنے عوام میں تقسیم کر
دی۔ جب ایک اجلاس میں اس کی ملاقات ہوور
سے ہوئی تو پیڈرووسکی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہوور نے
اس سے کہا۔

شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ
کے احسان کا بدلہ دیا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہیں،
آج سے کئی سال پہلے آپ نے میری مدد کی تھی۔"



گیلانی سسرز
جو تم نے مجھے ان ہی رنگوں پہ خورد کرو
پھر اس کے بعد میرے حوصلوں پہ خورد کرو
سفر کا سب سے تمہیں موڈ اور میں تنہا
پھرنے والے میری وحشتوں پہ خورد کرو
صدقہ عمران کے ڈی اے

سب کا احسان اٹھانے کی ضرورت کیا ہے
ساتھ ہو تم تو زمانے کی ضرورت کیا ہے
پھول کو کبھی شور مچاتے دیکھا ہے
تم ہو خوشبو تو بتانے کی ضرورت کیا ہے

گیلانی سسرز
کس قدر تکلیف وہ تھا آرزوؤں کا سفر
مسئلہ در مسئلہ، ساتھ در ساتھ

عیدین زینب
کبھی ہماری محفلوں میں بھی آ کر دیکھ عین
کناروتے ہیں زمانے کو ہنسنے والے

کائنات اصغر بوزدار
نے اجنبی سبھی ہم سفر اور نظر کر کے گزر گئے
گرمیوں مانستوں سے تھکے خبر، انہیں منزل کا شور تھا
نہیں اور کوئی رہنمائی، فقط مادوں کا تضاد تھا
انہیں پسند بہت تھیں شوخیاں، مجھے سادگی چرند تھا

نور، اقرا
ہمیشہ ہی نہیں رہتے کبھی چہرے نقابوں میں
سب ہی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

ریحانہ چوہدری
لوگ ہمیشہ ہم نے یوں بھی گزارے تھے
سایج کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جسے

فرزادہ مغل
دیکھتی ہے میرے اندر فصل شعلوں کی
تم بات کرتے ہو بارش کی پھولوں کی
ایک لڑکی ہلستی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر
مگر یہ بات پرانی ہے جاننے کتنے سالوں کی

اسیہ جاوید
بارہ دہی، علی پورچہ

میرا ہے دل لگی کا
نہ مجھے قرار ہوتا، مجھے قرار ہوتا

ندا، قند
فیصل آباد
آندو ہے کہ تو ہمسال آئے
اور پھر عمر بھر نہ جانے کہیں
گردیا شاہ
ان سے ملنے کا کیا سوال عدم
وہ سدا میرے پاس ہوتے ہیں

عمرہ عبید
سورج کی زمیوں پر راستے جہا ہوں تو
دُور جانکنے میں دیر کتنی لگتی ہے
یہ تو وقت کے بس میں ہے کہ کتنی مہلت دے
ورنہ نخت ڈھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

ریحانہ چوہدری
خواب پلکوں کے دیکھوں میں بجار کئے تھے
وقت کی تیز ہوا ان کو اڑانے چلی

ارم کمال
بھڑکی دُھوپ میں جھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماڈوں جیسی باتیں کرتے ہیں
رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

عزرا اسدراز
گھر ڈوب گیا اور انہیں اکواز تک نہ دی
حالانکہ میرے سلسلے اس پار بہت تھے

صائمہ جی
یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

عمرہ جاوید
بسم اللہ پور
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کبھی ہی رہ گئی وہ بات، سب باتوں کے بعد





فرق

انضمام الحق پاکستان کرکٹ ٹیم کے چیف سلیکٹرز ہیں وہ کھلاڑیوں کی موجودہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آفریدی ٹی ٹونٹنٹی میں واپس آنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی فٹنس اور کارکردگی دکھانی ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ”عمر کوئی مسئلہ نہیں“ (جی بالکل...!) مصباح کی عمر چالیس سال ہے اور وہ پاکستان کے لیے کھیل رہے ہیں۔ (مصباح! انضمام سے کچھ مسئلہ ہے۔؟) تو پھر آفریدی کیوں نہیں کھیل سکتے۔ (جی! جی! پر کھیلیں تو سہی۔؟)

سکون

”اذان کی آواز پر اذان کا چوپڑا کو سکون بخشتی ہے۔“ ایک پریس کانفرنس کے دوران پر اذان نے کہا کہ انہیں اذان کے وقت کا انتظار رہتا ہے۔ جب وہ شام کے وقت اپنے گھر کے ٹیرس پر بیٹھتی ہیں تو انہیں ہر جانب سے آنے والی اذان کی آواز سن کر بہت اچھا لگتا ہے۔ (سبحان اللہ) وہ وقت انہیں سب سے اچھا لگتا ہے جب غروب آفتاب کے وقت چاروں طرف سے اذان کی آواز آرہی ہوتی ہے (یعنی اذان مغرب) تو انہیں ایک ناقابل بیان سا سکون محسوس ہوتا ہے۔ (کہیں مودی بھارت میں اذان پر پابندی نہ لگا دے)

تصویر

اٹھارہ سالہ ”ارشاد خان“ (بھئی چائے والا) سوشل میڈیا پر ایک تصویر کے ذریعے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ماڈلنگ، فیشن شو، اشتہار کے بعد اب برطانوی میگزین ”ایسٹرن آئی“ نے ایشیا کے پچاس پرکشش مردوں کی سالانہ فہرست میں ارشد خان کا

نام اکتیسویں نمبر پر شامل کیا ہے جو یقیناً ”ارشاد خان عرف چائے والا کے لیے ایک اعزاز ہے۔

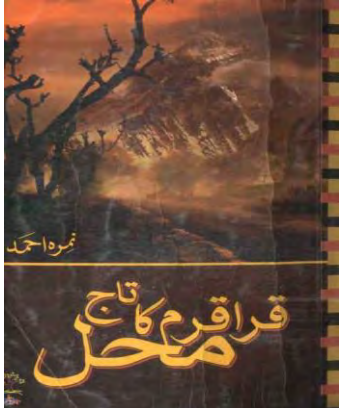
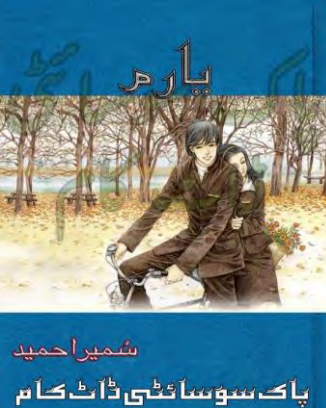
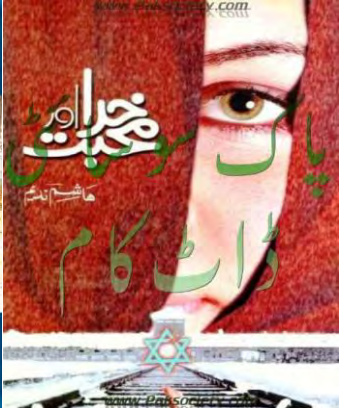
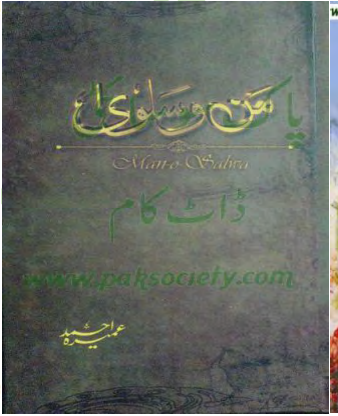
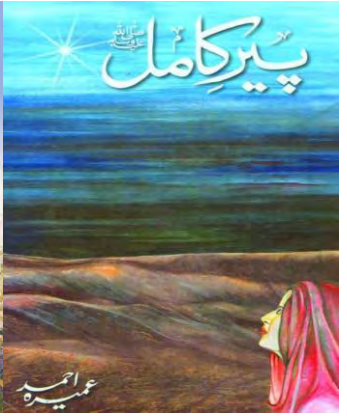
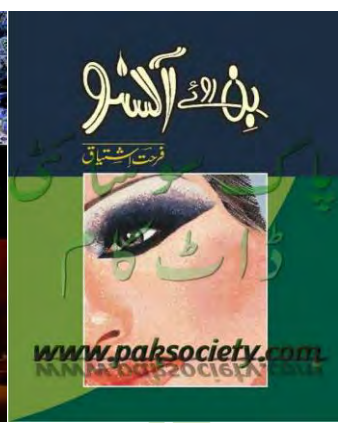
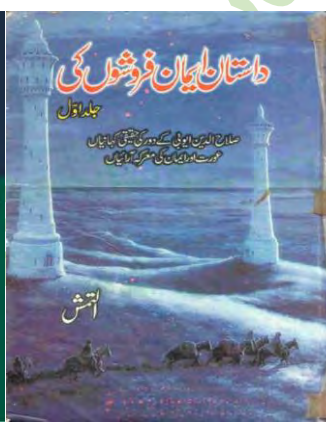
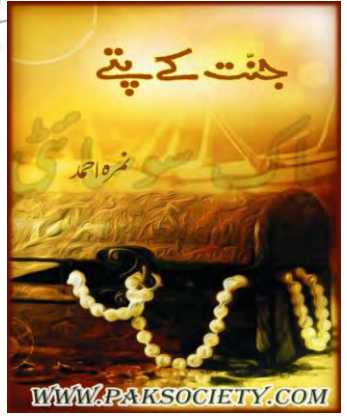
اپنی زندگی اور کیریئر کے حوالے سے ایک بین الاقوامی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے ارشد خان کا کہنا ہے کہ میرا ایک خواب تھا کہ میں ایک ایسا مقام حاصل

کروں کہ میں غریب بچوں کے لیے اسکول بنا سکوں جہاں وہ مفت تعلیم حاصل کر سکیں۔ (تو پھر بنایا اسکول میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے مزدور بھائیوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کر سکوں۔) (پر کتھوں...؟)

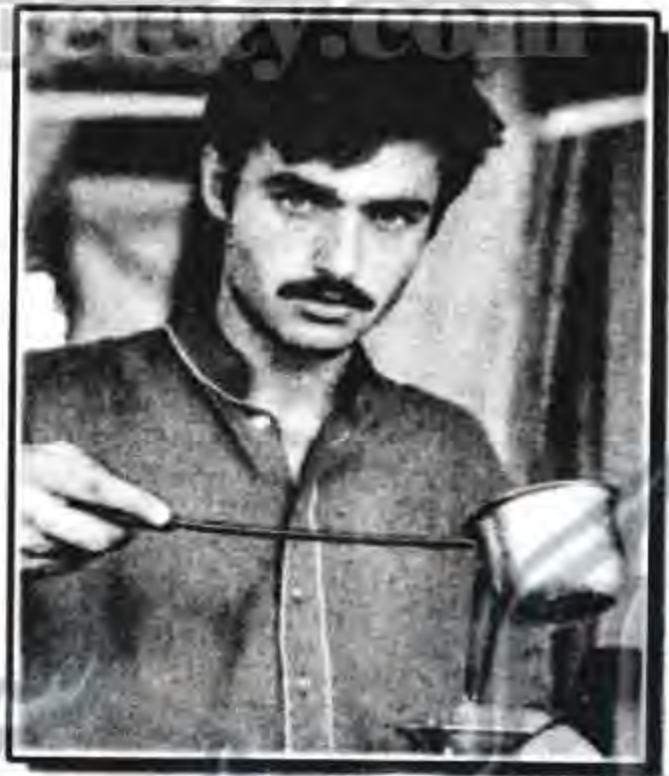
اعزاز

اداکاری موروثی نہیں ہوتی اس کی آپ کو بہت سی مثالیں نظر آئیں گی۔ اب ایمان علی کو ہی دیکھ لیں۔ ماں باپ دونوں اداکار ہیں پھر بھی وہ انتہائی خوب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہے اور بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) اور خون میں
کولیسٹرول کی زیادتی کو بھی کم کرتا ہے۔
ادھر ادھر سے



☆ علمائے کرام کی اکثریت غیرت کے نام پر قتل کو
قتل ہی سمجھتی ہے۔ اسلام کے مطابق کسی کی بیوی
غلط کاری کی مرتکب ہو تو اسے گھر میں بند کر دے۔
مذکورہ عورت کا شوہر اسے طلاق دے سکتا ہے یا معاملہ
ریاست کے سپرد کر سکتا ہے خود سے قتل نہیں کر سکتا
اور ریاست بھی یوں ہی اسے سزا نہیں دے دے گی۔
انصاف کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے الزام
کی تحقیق کرے گی۔ قتل کرنے کا تو کوئی ذرا سا تصور

صورت ہونے کے باوجود اتنے خوب صورت
ایکپیشن نہیں دے پائیں جو کسی فنکار کے لیے بہت
اہم ہوتے ہیں۔ ایمان کہتی ہیں کہ ”قلم اور ڈراما میری
ترجیحات میں شامل نہیں (آپ بھی ڈائریکٹر کی
ترجیحات میں شامل نہیں ہیں) فیشن اور ماڈلنگ نے
مجھے شہرت دی اور یہی میری پہلی ترجیح ہے (تو پھر بول
اور خدا کے لیے کیا تھا ایمان!) ایمان علی نے مزید
کہا کہ قلم ”ماہ میر“ کا آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہو جانا
ہی میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ (یہ تو ہے
ایمان!)



بھی نہیں ہے۔

(عبداللہ طارق سیل۔ وغیرہ وغیرہ)

☆ پاکستان میں اقتدار سونے کی کان ہے جسے موخ
ماتا ہے وہ اربوں گھروں بنا لیتا ہے اور پھر عوامی جلسوں
میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر سینہ تان کر اپنی ایمان داری
کے گن گاتا ہے۔ آخر مشرف بنیادی طور پر 22
گریڈ کا ہی افسر تھا۔ چیف ایگزیکٹو اور صدر بنتے ہی
اسلام آباد کے فارم ہاؤس سے لے کر دینی مئینڈن امریکا
اور شاید کچھ اور ممالک میں بھی اربوں کی جائیدادیں
بنالیں؟ مگر عوام ہے کہ میں مسٹر کلین ہوں۔
(ڈاکٹر صفدر محمود۔ صبح بخیر)

پیاز

پیاز ہمارے باورچی خانے میں روز مو استعمال کی
چیز ہے، لیکن پیاز میں جراثیم کش اور زہریلے اثرات
حتم کرنے والی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اسے
اینٹی بائیوٹک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پیاز
میں فائبر، ریشہ، کیلشیم، فاسفورس، پوٹاشیم، وٹامن سی،
وٹامن بی 6، سلفر اور اینٹی آکسیدنٹ کے حصول کا
اہم ذریعہ ہے۔ پیاز میں ایک طاقت ور اینٹی
آکسیدنٹ جزو (quercetin) بھی شامل ہوتا
ہے جو دل کے امراض اور کینسر سے تحفظ فراہم کرتا

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

276 2017 فروری



PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY

سیدہ فرحین خورشید۔ لاہور

نے مجھے کہا کہ ”آپ تو بالکل بابرہنی لکتی ہو۔“
یہ جملہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اور آل
میں ایک اچھی لڑکی ہوں (یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے
اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے تو ہوتا ہے۔)
5۔ بارش کا موسم اچھا لگتا ہے اور ایسے موسم میں
امی کے ہاتھ کے بنے پکوڑے تو بہت ہی اچھے لگتے
ہیں مگر کوئی دلچسپ واقعہ یا بات نہیں ہے۔

رقیہ سیف۔ ملتان

1۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا؟ اس
حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو لکھیں۔
شعاع سے تعلق تو ویسے بڑا پرانا ہے، لیکن باقاعدہ
انے پیوں سے شعاع کے کر رہنا مئی
2007ء کے شمارے سے شروع کیا۔ پہلے تو
فرنڈز سے لے کر بڑھتی تھی، لیکن ضد کر کے بعد میں
امی سے کہہ کر ماہانہ لگو الیا۔ الحمد للہ کسی بھی ظالم سماج
کا سامنا مابدولت کو نہیں کرنا پڑا، لیکن جب تمام بھائی
اپنی چھٹیوں میں گھر آیا کرتے تو اکثر مجھے چڑایا کرتے
تھے کہ (امی ابھی تک آپ اس کو پڑھنے دیتی ہیں، نہ
لے کر دیا کر اس سے ہر وقت ان رسالوں میں ہی کسی
رہتی ہے) لیکن بھلا ہو میری بیماری امی اور ابو جان کا
کہ انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ امی بھی پڑھتی
ہیں ڈائجسٹ، لیکن امی کی رفتار ذرا کم ہے کیوں کہ میں
تو ددن میں ہی رسالہ چاٹ لیتی ہوں سارا، لیکن امی تو
آہستہ آہستہ اور فرصت کے اوقات میں پڑھتی ہیں۔
اب ان سب باتوں سے آپ مجھے کوئی بڑا حرام لڑکی
مت سمجھ لیجئے۔ ڈیڑھ قارئین! شعاع کے حوالے
سے کوئی دلچسپ واقعہ تو بس یہی ہو سکتا ہے کہ میں
9th کے انٹرمیڈیٹ کے لیے اسکول سے فری ہوئی تو
پھر صبح سے دوپہر تک کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی

1۔ میں جب 8th کلاس میں تھی اس وقت سے
رسالے پڑھ رہی ہوں اور اب اللہ کے فضل سے بی
ایڈ کر رہی ہوں۔ ہمیشہ ابو سے چھپ کر رسالے پڑھنے
پر اب ایسی بات نہیں ہے کیوں کہ اب میں رات کو
رسالہ پڑھتی ہوں تب تک ابو سو چکے ہوتے ہیں۔
2۔ آج کل تو بی ایڈ کی ورکشاپ میں مصروف ہوں۔
ویسے میں صبح نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں پھر امی کے آواز
دینے پر ہی اگھتی ہوں۔ ناشتا امی بناتی ہیں۔ موڈ ہو تو ہم
بھی ناشتا کر لیتے ہیں کبھی کبھار پھر صفائی کرنا دوپہر کی
روٹی بنانا، مسیج کر کے دوستوں سے باتیں کرنا، گیم
کھیلنا، چائے یا کافی بنانا شام کا سارا کام کرنا، نماز پڑھ کر
اور باجی (اپنی بہن) سے فون پر بات کر کے میں رسالہ
لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور جب تک ختم نہ ہو جائے یا
نیند نہ آجائے میں اس کی جان نہیں چھوڑتی۔
3۔ بہت سی تحریریں ہیں جو مجھے نہیں بھولتیں۔
سب کے نام بتانا تو بہت مشکل ہے، آپ کے رسالے
کے صفحات ختم ہو جائیں گے مگر نام نہیں، لیکن
”جنت کے پتے“ ایسی تحریر ہے جو ہمیشہ میرے ذہن و
دل پر نقش رہے گی۔ اگر اسے نموا احمد کا ماسٹر پیس کہا
جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ”جنت کے پتے“ میں حیا اور
جہان میں بیک وقت مجھے اپنی جھلک نظر آئی ہے۔
4۔ غصہ بہت آتا ہے تھوڑی سی ضدی بھی
ہوں۔ میری کولیگ کہتی ہے کہ مجھ میں مروت بہت
ہے۔ اب اللہ جانے یہ خوبی ہے یا خافی حساس ہوں۔
مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔ صبا کو میرا حجاب کرنا بہت
پسند ہے۔ تعریفی جملہ۔
”ایک بار اسکول میں مجھے میری ٹیچر نے آؤگراف
میں فیری فرحین کہا تھا۔“ اور میری ایک کولیگ مہرین

اور پڑھنے کے بہانے کیمسٹری، فزکس اور بائیولوجی کی کتاب میں شعلے رکھ کے پڑھتی تھی۔ ایک دن جب امی کو پتا چلا تو انہیں صدمہ چھبی ہوا اور ہنسی بھی آئی میری چالاکی پہ بہر حال جو بھی دن تھے بہت نایاب تھے اور یادگار بھی۔ اب تو میری شادی ہو چکی ہے اور ایک سال کا پیار سا شہزادہ سا بیٹا بھی ہے تو اس لیے اب میں بھی فرصت کے اوقات میں ہی پڑھتی ہوں رسالے اور وہ بھی امی کے گھر میں آکر۔ شوہر بھی الحمد للہ اچھے

ہیں جو منع نہیں کرتے۔

2۔ سچ سے رات تک کتنے کام نمٹاتی ہیں اور ان مصروفیات میں مطالعے کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

شادی سے پہلے تو معمولات اور تھے جیسے کہ نماز، قرآن کے بعد نائٹے کی تیاری میں بیماری امی جان کی بدو اور نائٹے کے بعد گھر کی صفائی اور معمول کے چھوٹے موٹے کام اور پھر فراغت ہی فراغت عصر تک۔ عصر کے بعد شام کے کھانے کی تیاری میں مصروفیت۔ شام کا کھانا بنا میرے ذمہ تھا۔

شادی کے بعد اب فی الحال تو مزے کے دن ہیں کیوں کہ گھر میں تین چار دیورانیاں اکٹھی ہیں تو کام کے مزے ہیں۔ سسرال اچھا جو ملا ہے۔ بیٹے کے بعد سے ذرا ذمہ داری آئی ہے کیوں کہ چھوٹے چھوٹے ہزار کام ہوتے ہیں بچوں کے تو بس اپنے بیٹے کی نوکری میں زیادہ مصروف رہتی ہوں۔ جب شوہر کام سے آجائیں تو ان کی خدمت کرتی ہوں اور بس ایسے ہی دن کا اختتام ہو جاتا ہے اور ہاں ناشتا کھانا بھی میں خود بناتی ہوں اور بقول سیف جی کے ”بہت مزے کے کھانے پکاتی ہوں اب تمہارے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا بنا اتنا مزے دار نہیں لگتا۔“ بس جی ہم تو معدے کے راستے اپنے شوہر کے دل تک پہنچ چکے ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہیں گے ان کے دل میں۔

3۔ شعلے کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہو گئیں؟ وہ تحریر جسے پڑھ کر دل ابھرا کسی

کردار میں اپنی جھلک نظر آئی؟

ویسے تو شعلے کی تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہیں، لیکن۔ ہاں جی آپ بالکل ٹھیک سمجھے کہ کوئی کوئی دل پہ نقش ہو جاتی ہیں ایسے جیسے شادی کے بعد لڑکی کے دل پر اس کے شوہر کا نام نقش ہو جاتا ہے۔ بہت سی ایسی تحریریں ہیں میں کس کس کا نام لوں۔ ڈیر قارئین۔ ”جنت کے تھے“ ”دیکھ زہرہ محبت“ ”زرد موسم“ اور بہت کچھ گئے تو نام بھی یاد نہیں مجموعی طور پر نمبر احمد، عالیہ بخاری، نمبر بخاری

(اب تو کچھ لکھ ڈالیں) صائمہ اکرم، رخسانہ نگار، نبیلہ عزیز، عمیرہ احمد اور تمام بہترین رائٹرز کی ہر کہانی بہترین ہوتی ہے۔ میرے خیال سے کافی ہے دوستو! دراصل جب ضرورت ہو تو بندے کو آسانی سے کچھ یاد نہیں آتا۔

4۔ اپنی خوبیاں خامیاں لکھیں اور تعریفی جملہ؟
خوبیاں تو ہوتا نہیں ہیں یا نہیں، لیکن خامیاں تو بہت ہوں گی۔ منہ پھٹ بد تمیز اور انتہائی غصہ ور لڑکی ہوں کوشش تو بہت کرتی ہوں اپنے آپ کو سدھارنے کی، لیکن بس ناکام کوشش۔

اب آپ سب مجھے کوئی فساد لڑکی نہ سمجھ لیجیے گا۔ دل کی بہت اچھی ہوں۔ دوستوں کی دوست ہوں اور اپنی فرینڈز کو ہمیشہ خوش رکھتی ہوں۔ امی کی نظر میں بہت اچھی احساس کرنے والی اور سلجھی ہوئی بیٹی ہوں اور سکھ لڑکی ہوں۔ ابو کی نظر میں ”میری بیٹی تو مجاہد ہے مجاہد۔“

بھائیوں کی نظر میں۔؟ اب تمام بھائیوں والی بہنوں کو پتا ہی ہو گا کہ بھائی کس طرح ناک میں دم کیا کرتے ہیں؟ ہا ہا۔۔۔ جی ہاں میرے چار بھائی ہیں اور چاروں چڑانے میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہم دو ہیں، ایک میں یعنی رقیہ سیف اور دوسری بہن چھوٹی ہے طوبی ایمن۔ میں اپنی بہن کو بھی کہتی ہوں کہ رسالے پڑھا کرو فی الحال تو لطائف اور احادیث۔ جب بڑی ہوگی تب باقی سب پڑھا کرے گی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	مصنف	نوم کتاب
500/-	آمنہ پاش	بساط دل
750/-	راحت جبین	ذردموم
500/-	رخسانہ گارہردان	زندگی اک روشنی
200/-	رخسانہ گارہردان	خوشبو کا کوئی گھر نہیں
500/-	شازیہ چودھری	شہر دل کے دروازے
250/-	شازیہ چودھری	حیرے نام کی شہرت
450/-	آسیہ مرزا	دل ایک شہر جنوں
500/-	قائذہ انصار	آنکھوں کا شہر
600/-	قائذہ انصار	بجول بھلیاں تیری نکلیاں
250/-	قائذہ انصار	بھلاں دے رنگ کالے
300/-	قائذہ انصار	یہ بھلیاں یہ چہ پارے
200/-	غزالہ عزیز	سمن سے گورت
350/-	آسیہ ذاتی	دل اُسے ڈھونڈ لایا
200/-	آسیہ ذاتی	نکھرنا جا کیں خواب
250/-	نوزیہ یاسمین	رہم کو خد تھی سہمائی سے
200/-	بشری سعید	اداں کا چاند
500/-	انٹاش آفریدی	رنگ خوشبو ہوا ہا دل
500/-	رضیہ جمیل	درد کے قاسطے
200/-	رضیہ جمیل	آج سمن پر چائے نہیں
200/-	رضیہ جمیل	درد کی منزل
300/-	نیم سحر قریشی	میرے دل میرے مسافر
225/-	میونہ خورد شیدلی	تیری راہ میں نزل گئی
400/-	ایم سلطان خفر	شام آرزو

ناول نگہانے کے لئے نئی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے

نگہانے کا پتہ:
کتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

5۔ بارش پسند ہے؟

جی ہاں بارش تو بہت ہی پسند ہے۔ یقین کریں اب بھی میں تعارف لکھ رہی ہوں اور پھر بارش ہو رہی ہے۔ موسم بہت سارا ہے اس لیے لکھنے کا بھی دل کیا تو کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔

6۔ پسندیدہ شعر پسندیدہ اقتباس پسندیدہ کتاب؟
پسندیدہ کتاب تو قرآن مجید ترجمے کے ساتھ۔ میری دعا ہے سب پڑھا کریں اور اللہ تعالیٰ سب کو توفیق دے پڑھنے کی۔

دوسری کتاب ہے ”زاویہ“ اور ”داستان ایمان

فردشوں کی“ تو بہت بہت پسند ہے۔ جس نے نہیں پڑھی میری تعلقین ہے وہ بھی پڑھے۔ پسندیدہ شعر ویسے تو بہت سارے ہیں لیکن موسٹ فیورٹ پیش خدمت ہے!

مجھ کو خیال ہے کہ تو میرا خیال ہے اے مرکز خیال تیرا کیا خیال ہے آتا ہے تو خیال میں کتنے خیال سے تجھ کو میرے خیال کا کتنا خیال ہے! پسندیدہ اقتباس: ”عورت کوئی موسم کی گڑیا نہیں ہوتی کہ مرد اسے جب چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے۔ اپنی آنکھ کے اشاروں پر چلائے اور اپنے اختیار کے موسم اس پر مسلط کر کے اس کی سانسوں پر بھی پابندی لگا دے۔“

ڈیئر قارئین! امید ہے آپ سب کو میرا تعارف پسند آیا ہوگا۔ آخر میں شعاع کے لیے ڈھیروں دعائیں اور شعاع کی انتظامیہ کے لیے نیک خواہشات۔ اللہ پاک سب کو ہدایت کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔



ماہنامہ شعاع فروری 2017 279

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا۔ پارٹ ون اور ٹو ہمارے بہت مشکل امتحان ہوتے ہیں۔ میرے چھوٹے دونوں بیٹے ان کے دوران پیدا ہوئے میں نے پلاسٹک سرجری میں اسپیشلائزیشن کی۔ بہترین ڈاکٹرز سے کام سیکھا۔ میرے بچے ساس نے پالے، ہمیشہ مجھے آگے پڑھنے پر شاباش دی۔ آج میرے نام کے آگے جو بہت سی ڈگریاں ہیں ان میں میرے شوہر اور ساس سب کی محنت و محبت اور حوصلہ افزائی شامل ہے۔

س۔ رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا ہوا؟

ج۔ میری شادی بہت خوش اسلوبی سے ہوئی۔ میرے خاندان میں لڑکیوں کو خوب جینز دینے کا رواج ہے اور سسرال میں بہو کا بھاری حق مہرباندہنے اور ان کے نام جائیداد لگانے کا۔ اب ہمارے سسرال والے جینز سے منع کر رہے تھے اور میرے والدین اس طرح کی کسی رجسٹری اور انتقال کے خلاف تھے۔ بہر حال دونوں طرف سے باہمی رضامندی سے معاملات طے پائے اور دونوں لحاظ سے میرا ہی فائدہ ہوا۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے نوکریہ کر کیا کہا؟

ج۔ تعریف کی اور جیسی پولیس والے کر سکتے ہیں۔ بس ویسی ہی۔

س۔ کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔ یہ سب سے دلچسپ سوال ہے۔ میں نے اپنے گھر کا کام آج تک نہیں سنبھالا۔ میری ساس کو بالکل جوالی میں بریسٹ کیئر ہوا تھا۔ اس بیماری کا نام تو آج تک بے حد خوف ناک ہے تو آج سے پینتیس سال پہلے تو یہ مرض ہی موت کا پیغام تھا۔ بہر حال بروقت آپریشن اور علاج سے وہ بالکل صحت مند ہو گئیں مگر اس کرائسس نے انہیں تبدیل کر دیا۔

انہوں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر آئندہ ان کے ہاں بیٹی ہوئی تو وہ اسے ڈاکٹر بنا میں گی کیوں کہ ایسے معاملات میں مرد ڈاکٹر کے پاس جانا عورتوں کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اللہ نے انہیں تین بیٹے دیے۔ بڑے میرے شوہر ہیں جو اب پولیس میں

اعلا عہدے پر ہیں۔ دونوں چھوٹے دیور ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے کینسر میں ہی اسپیشلائزیشن کی ہے، میں ان کی بہو ڈاکٹر اور باقی دونوں بہو ویس بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری ساس اکثر کہتی ہیں کہ میں تو جی ہی اس لیے رہی ہوں کہ میری طرح آئندہ کوئی مریضہ کسی عورت سرجن ڈاکٹر اور فزیویشن کی نظر نہ رہے۔ انہوں نے ہر لحاظ سے اپنا مشن پورا کیا۔ شادی کے بعد میرے آرام اور پڑھائی کا ماؤں کی طرح خیال رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے سے ناراض ہو جاتی تھیں کہ بہو کو امتحانوں میں تنگ کرتا ہے۔

میرے کمرے میں روایتی نئے شادی شدہ جوڑوں کے کمرے کی طرح بہت فینسی چیزیں نہیں تھیں۔ بلکہ اس میں رائٹنگ ٹیبل، ایک چھوٹا سا فرنیچ جو ہمہ وقت پہلوں، جو س اور گھر کی بنی ہوئی سلاویا سینڈو پیچر سے بھرا رہتا۔ میری وارڈروپ میں کپڑے استری کروا کر رکھوا دیتے۔ میرے بالوں میں خود تیل ڈالتے۔ میرے کمرے سے ڈرائی فروٹ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ گرمیوں میں اے سی اور سردیوں میں ڈیٹر سب سے پہلے میرے کمرے میں لگایا جاتا۔

میں فائل ایر کے بعد امید سے تھی تب بھی میرا خیال اپنوں سے بڑھ کر رکھا۔ میرے میاں خاصے مصروف رہتے ہیں۔ انہیں اگر کبھی غصہ آجائے تو میرے لیے ڈھال بن جاتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے کہتی ہیں کہ یہ گھر کے کام تو ہر کوئی کر سکتا ہے، مگر مریض کو بیماری میں امید کی کرن ڈاکٹر ہی دکھانا ہے۔ نئی نئی سرجری سیکھنے کے لیے مجھے ”مموٹی ویٹ“ کرتی ہیں۔ ہر امتحان پاس کرنے پر مجھ سے زیادہ میری خوشی کو سہیلہ ویٹ کرتی ہیں۔ میرے بھی تین بیٹے ہیں۔ انہیں سنبھالا، پھر اسکول بھیجا اور اب وہ بھی بڑے ہو گئے ہیں، مگر انہیں بہت ہی زیادہ ٹائم دیتی ہیں۔ اسی لیے میرے دل میں کبھی وہ ندامت نہیں رہی کہ میں نے اپنے بچوں کو نظر انداز کیا یا شوہر مجھ سے خوش نہیں۔

س۔ شادی کے بعد کوئی خاص تبدیلی؟

ج۔ جی۔ پہلے میں صرف اپنے شوق کے لیے اس شعبے میں آئی تھی، مگر میری ساس نے اس شوق کو میرا عشق بنا دیا۔

س۔ میکیے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟

ج۔ میکیے اور سسرال کے تو نہیں ہاں ہاسٹل اور سسرال کے ذائقے میں بہت فرق ہے۔ سسرال میں کھانا مزیدار، خوشنما اور اشتہا انگیز ہوتا ہے۔ خصوصاً جب میاں خاص توجہ سے ساتھ بٹھا کر کھلائے اور آپ کی فکر بھی کرے تو اس کا ذائقہ دوچند ہو جاتا ہے۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید؟

ج۔ میرے اچھے رزلٹ پر ہمیشہ بہت تعریف ہوئی، میں نے پلاسٹک سرجری میں گینسر کی مریضوں کی چھاتی کو دوبارہ نارمل کی طرح بنانے کے لیے ٹریننگ لی اور پھر جب یہ آپریشن شروع کئے تو میری ساس کی خوشی دیدنی تھی۔ ایک مریض کا چہرہ مکمل طور پر جل گیا تھا، بہت سے آپریشن کر کے اسے بہتر کیا جس پر میرے میاں بہت بہت خوش ہوئے۔

بہر حال اچھی ڈاکٹر بننے کے لیے اہل خانہ کا رویہ بہت اہمیت کا حامل ہے میں سرجری سیکھنے مختلف ممالک میں جاتی ہوں۔ نئی ٹیکنیکس سیکھ کر آتی ہوں۔ میرے بچے اور شوہر سب میری تعریف کرتے ہیں۔ آج تک میری ساس نے مجھے کچن میں کام نہیں کرنے دیا۔ کپڑے دھونے یا استری نہیں کرنے دیے۔ ذہنی سکون دیا۔ شوہر نے تحفظ کے احساس کے ساتھ ساتھ مجھے خود اعتمادی دی۔

آج میں ایک اسپتال میں سینئر سرجن ہوں اور شام میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں سرجری کرتی ہوں۔ میں کتنا کمائی ہوں، کبھی کسی نے نہیں پوچھا، مگر کتنے مریضوں کو ٹھیک کیا، یہ سب پوچھتے ہیں۔ میری ساس کئی مریضوں کو بھیجتی ہیں۔ خصوصاً "یہ گھروں میں کام

کرنے والی تشدد کا شکار عورتیں، میں انہیں دیکھتی ہوں۔ ٹیسٹ کرتی ہوں اور پھر توجہ سے ان کی بات سن کر دوادیتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اس طرح میں اپنی ساس کی محبتوں کا قرض اتار رہی ہوں۔

س۔ سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج۔ میری امی کا کہنا ہے کہ ان سسرال والوں نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میری توقعات سے کہیں زیادہ اچھے لوگ ثابت ہوئے ہیں۔

س۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج۔ فاسٹل ایئر میں ہمیں گائنتی وارڈ کا خاصا مشاہدہ ہو چکا ہوتا ہے۔ سو نارمل ڈلیوری بے حد آسان

پروسیجر لگتا تھا، مگر ان نو ماہ اور پھر ڈلیوری نے ہمیں دن میں تارے دکھا دیے۔ خوب شور بھی مچایا اور ڈانٹ بھی کھائی۔ بلکہ میری ایک پرو فیسر نے تو پھنڈ بھی لگا دیا۔ پھر اتنا تنہا منا بے پی۔ اسے سنبھالنا ہی خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ ساری ڈاکٹری ایک طرف اور تنہا بچہ پالنا اور سنبھالنا ایک طرف۔ میری دادی اور دادا کو تنہا کھلونا مل گیا۔ میاں صاحب کو تو وہ آج تک تنہا بلوگڑا ہی لگتا ہے، میں نے بچے سنبھالے کم، مگر ان کی شاپنگ خوب خوب کی۔ جب کبھی بیرون ملک جاتی واپسی پر بس چھوٹے بچے کی شاپنگ ہوتی۔ بہت انجوائے کیا تینوں بیٹوں کا بچپن اور اب لڑکھن بھی۔

س۔ سسرال میں مقام؟

ج۔ پورے سسرال میں کوئی بیمار ہو۔ کسی رشتے دار کا کوئی نوکر بیمار ہو۔ سب ہی میرے مریض ہیں۔ ان کو دیکھنا۔ ٹیسٹ کروانے اور پھر متعلقہ ڈاکٹر تک راہنمائی اور دوامیں۔ یہ سب کچھ میرے ذمے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو کوئی دور دراز کا مریض ہمارے ہاں آکر رہ بھی جاتا ہے۔ جیسے میرے میاں کا ایک سپاہی جو بہت زیادہ جھلس گیا تھا۔ تقریباً "ایک سال ہمارے ہاں رہا۔ اس کا چہرہ بہت خراب تھا۔ ناک پھل گئی تھی۔ ساری سرجریز میں نے کیں، تو معالج کو ہمارے ہاں مقام بہت

چاہے۔ گویا اب وہ بھی بہت سینئر آفیسر ہو گئے ہیں۔ وقت کی قلت ان کو بھی ہے، مگر وہ پھر بھی بھاگتے دوڑتے بچوں اور میرے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ کتنے بھی مصروف ہوں، میرے فون کو پہلی تیل پر راجو کرتے ہیں۔ میری ہر پریشانی کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند سال پہلے میں سرکاری اسپتال میں آپریشن کر رہی تھی۔ مریضہ کے لواحقین اس کی غلط بلڈ رپورٹ ہمارے پاس جمع کرا چکے تھے کہ اس میں خون کی کمی نہیں ہے اور وہ مریضہ آپریشن کے دوران ہی اہکسہاڑ ہو گئی۔ اس کے لواحقین نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے شوہر نے اس صورت حال کو بہت تحمل سے سنبھالا۔

اب ہم دونوں اپنے اپنے پروفیشن کے تقریباً بیس بیس برس گزار چکے ہیں۔ اب تو ہم دونوں رٹائرمنٹ لائف میں ایک دوسرے کو وقت دینے کی بات کرتے ہیں جس پر میرے بچے خوب ہنستے ہیں۔ اللہ میرے اس کنبے، میرے بچوں اور ہم سب کو اسی طرح شادو آباد رکھے۔ آمین۔

بلند ملتا ہے۔ عزت اور محبت اور ہر محفل، تہوار اور ملاقات میں مریض بے شمار۔ چند دو آئیں تو میرے ساتھ ہر وقت ہی ہوتی ہیں، لیکن میں کبھی مریضوں کے ہجوم سے گھبراتی نہیں۔ میرے کام کرنے کے اوقات تقریباً اٹھارہ گھنٹے ہیں۔ میرے شوہر اور بیٹے بھی بہت تعاون کرتے ہیں۔ جب میرے علاج سے ایک اٹھارہ برس کی کینسر کا شکار انتہائی خوب صورت لڑکی ٹھیک ہو گئی تو میں نے اپنے رب کا بے حد شکر ادا کیا جس نے مجھے کسی کو دوبارہ زندگی دینے کا وسیلہ بنا دیا۔ اب وہ لڑکی شادی شدہ ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے۔ نارمل زندگی گزار رہی ہے اور میری ساس کی طرح اپنی اولاد کو میچا بنانے کی خواہش مند بھی ہے۔

س۔ جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟
ج۔ جی۔ مجھے تو جوائنٹ ہی پسند ہے۔ کم از کم ہم ورکنگ ویمن کی تو جوائنٹ ہی ہونی چاہیے۔
س۔ شوہر سے تعلقات؟
ج۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک ہی کمی لگتی ہے کہ شوہر کو میں وہ وقت نہیں دے پائی جو ایک عام عورت کو دینا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



تنزیلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



قاخرہ جمیں
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلچسپ حقائق

ستارہ

یہ اس وقت کی دہلی ہے، جب نادر شاہ درانی کی یلغار نے مغل سلطنت کو ہلا کر رکھا ہوا تھا۔

محمد شاہ، فرماں روائے ہند کا برا حال ہو چکا تھا۔ اسے تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کہا گیا ہے۔ وہ ایک احمق اور عیاش بادشاہ تھا۔

اس روز نادر شاہ خاصا خوش تھا۔ اس کا لشکر دہلی سے ذرا فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ اور وہ فرماں روائے ہند کی جانب سے ان تحائف کا منتظر تھا، جس کا وعدہ اس شکست خورہ حکمران نے کر رکھا تھا۔ ذرا ہی دیر کے بعد اس کے خیمے کا پرہ ہٹا اور اس کے خلم خاص نے بتایا کہ تحائف آگئے ہیں۔

”تفصیل؟“ نادر شاہ نے دریافت کیا۔

”ایک ہاتھی، ایک درجن گھوڑے، پچاس غلام اور درجن بھر حسین و جمیل ہندی دوشیزائیں۔“

یہ تحفے کافی دیر میں پہنچے تھے اور نادر شاہ اس تاخیر پر اندر ہی اندر برہم تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نادر شاہ نے ان کا معائنہ دوسری صبح تک ملتوی کر دیا، لیکن عورتیں۔

نادر شاہ نے ہندی عورتوں کے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور اس طرف چلا جہاں یہ عورتیں رکھی گئی تھیں۔

جس خیمے میں وہ پہنچا وہاں داخل ہوتے ہی نادر شاہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا یہاں معاملہ اس سے بھی سوا تھا۔ لگتا تھا ایک ہی جگہ پر بہت سے چاند نکل آئے ہوں۔ ہر حسینہ دوسرے سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔

نادر شاہ انہیں دیکھتا اور توتا رہا پھر اس کی نگاہیں

سب کا جائزہ لینے کے بعد ایک چہرے پر آکر رک گئیں۔ لڑکی نے نادر شاہ کو اپنی جانب گھورتے پایا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ کون ہے؟“ نادر شاہ نے خواجہ سرا سے دریافت کیا جو اس کے عقب میں تلوار سونچے کھڑا تھا۔

”عالی جاہ، یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے۔“ خواجہ سرا نے بتایا۔

”دوشیزہ؟“ اچانک اس لڑکی کے گلاب جیسے لب کھلے اور اس کی طنزیہ آواز بلند ہوئی جس میں زبردست بے باکی تھی۔

”غلط!“ اس نے کہا۔ ”میں دوشیزہ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہوں۔“

نادر شاہ کو لڑکی کی دلیری اچھی لگی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ستارہ۔“ لڑکی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ لڑکی، جس کا نام ستارہ تھا، ابھی تک اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اسے خواجہ سرا چھوڑ کر گیا تھا۔

”ادھر آؤ۔ میرے قریب۔“ نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی جھجکی، اس کے چہرے پر وحشت اور اداسی نے عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً وہ خوف زدہ تھی۔

اس نے اس ایرانی حملہ آور کی سفاکی کی داستانیں سن رکھی تھیں، مگر اب رہا ہی کیا تھا، وہ تن بہ تقدیر ہو کر آگے بڑھی۔

”مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“ نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ نسلِ ”راجپوت“ ہے۔ وہ چھوٹی ہی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اس کی شادی

پھر اس نے وہ ہیرا نکال کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس ہیرے کی ضرورت ستارہ کو جلد ہی پیش آئی۔ اسے خبر ملی تھی کہ نادر شاہ نے دہلی کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نادر شاہ کا غصہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

ستارہ کو دہلی سے پیار تھا۔ اس جگہ اس نے اچھے دن گزارے تھے اور اس کی بہت سی محبوب شخصیتیں یہاں تھیں۔ وہ اس قتل عام کو رونا چاہتی تھی۔ جس کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے آقا باشی کو طلب کیا اور ہیرا نادر شاہ کے پاس بھجوانے کے لیے قاصد دوڑایا۔

یہ ستارہ ہی تھی جس کی التجا پر نادر شاہ کی تلوار نیام میں گئی تھی۔ پھر بھی اس عرصے میں دہلی کے گلی کوچوں میں خون ہی خون پھیل چکا تھا۔ یہ اتنا بڑا قتل عام تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔

نادر شاہ نے دہلی کی سلطنت کو اچھی طرح پامال کرنے کے بعد بے شمار مال غنیمت کے ساتھ اپنے ملک واپسی کا سفر شروع کیا تو ستارہ اس کے ساتھ تھی۔ نادر شاہ ہرات پہنچا تو معلوم ہوا نادر شاہ کا بیٹا اور دلی عہد شہزادہ رضا خان استقبال کے لیے آ رہا ہے۔

نادر شاہ کو بیٹے سے جدا ہونے دو سال سے زائد ہو چکے تھے۔ فطری بات تھی کہ وہ بیٹے کو دیکھنے کا متمنی تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس عرصے میں شہزادے نے اپنی لیاقت سے ملک کا انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔

اس جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ شہزادے کی تعریفیں سن سن کر نادر شاہ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں بیٹا غرور میں بہہ کر کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ کچھ لوگوں کی سازش اس کے پس پر وہ تھی اور انہوں نے شہزادے کے اندر بھی یہ خیال ڈال دیا تھا کہ نادر شاہ آتے ہی اسے پھر ایک اپنی عمدے دار میں بدل دے گا۔

پھر ایک روز خلوت میں نادر شاہ نے جب اپنے شبہات کا تذکرہ ستارہ سے کیا تو اس نے شہزادے کی

ایک مغل سپاہی سے کر دی گئی جس کے گھر سے وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلی۔ اسے ایک تاجر گھرانے نے پناہ دی۔ یہ گھرانہ اسے دلی لایا۔ یہاں بادشاہ کی ایک ملکہ نے اسے پسند کر لیا اور وہ شاہی محل میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ اب تک ایک کینز کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ نادر شاہ اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ اب ایک بچی عمر کا آدمی تھا، فولادی ذہن کا، مگر یہ لڑکی کسی جاوگی طرح اس کے سر چڑھ گئی تھی۔

اچانک اس نے نرمی سے کہا۔
”کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرو گی؟“
ستارہ کا جسم آہستہ سے لرز اٹھا۔ وہ کسی بوجھ کو

محسوس کرتے ہوئے ڈگمگائی اور وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

یہ تقدیر کا ایک کھیل تھا۔
وہ جو لونڈی بنا کر دشمن کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ایک دم سے ایک انتہائی باجروت بادشاہ کی ملکہ بن گئی تھی۔

مگر اس جگہ ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کا نام شیرازی تھا۔

شیرازی وہ عورت تھی جو اب تک نادر شاہ کی سب سے زیادہ منظور نظر ہونے کا شرف رکھتی تھی۔ ستارہ کی آمد نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے بل کھا رہی تھی۔

پھر ستارہ کو خبر ملی کہ نادر شاہ کا لشکر اب دہلی کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو پیچھے ہی رکے رہنا تھا اور اس میں نادر شاہ کا حرم بھی شامل تھا۔ پھر نادر شاہ نے اسے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک شاید اس سے دور رہے گا۔ اس نے کہا ”تم پریشان نہ ہونا۔ میں ایک ہیرا تمہیں دے رہا ہوں، یہ ایک خاص نشان ہے۔ اگر تمہیں کبھی میری سخت ضرورت محسوس ہو تو اسے کسی قاصد کے ذریعے میرے پاس بھیج دینا۔ میں فوراً تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔“

میں آکر نہ صرف اپنے جیتے بیٹے کو اندھا کرادیا تھا بلکہ ایک باوقافیہ بیوی پر الزام لگا کر اسے قید تھمائی میں ڈال دیا تھا۔

ستارہ نے نادر شاہ کی لاش کو دیکھا۔ پھر اس نے نہایت سکون سے اپنی پیٹی سے خنجر نکالا اور وہیں اپنے سینے میں گھونپ لیا۔



تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ ستارہ کیا واقعی نادر شاہ کی ایک باوقافیہ بیوی تھی یا یہ حقیقت ہے کہ وہ دلی عہد رضا خان کے سامنے دل ہار گئی تھی اور اس کے اندھا ہو جانے کے بعد دل بروا شتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسی نیت سے نکلی

تھی کہ وہ نادر شاہ کو ختم کر کے خود اپنا خاتمہ کر لے گی، مگر یہ تمام باتیں غیر تصدیق شدہ ہیں۔ محقق نے ستارہ اور رضا خان کے رومان کا ذکر ضرور کیا ہے اور لکھا ہے کہ نادر شاہ کی اس محبوبہ ہی کی وجہ سے رضا خان نے اپنی آنکھیں گنوائی تھیں اور بوڑھے نادر شاہ کی موت میں ستارہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

مہابھارت

400 قبل مسیح انکارٹا کے مطابق ہندوؤں کی دیومالائی نظم اور دنیائے ادب کا نادر شاہ پارہ ”مہابھارت“ مرتب ہوئی۔ مہابھارت کی ترتیب و تشکیل 400ء تک جاری رہی، ہومر کی ایلاڈ اور اوڈیسی (دونوں کو ملا کر) سے سات گنا بڑی یہ داستان ہندو خاندانوں کے مابین اختلافات اور جنگ کے بارے میں تھی۔ اس نظم کا یہ حصہ ”بھگوت گیتا“ کہلاتا ہے جو اخلاقی و مذہبی اقدار سے متعلق ہے، لیکن ”بھگوت گیتا“ بعد میں تصنیف کر کے اس میں شامل کی گئی۔

مسلم اقوام کا قومی نشان ہلال و ستارہ

”کیوں ہے؟“ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا بیان ہے کہ ہلال کا نشان مسلمانوں نے بازنطینی حکومت سے لیا

طرف داری میں اسے سمجھانا شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سمجھایہ عورت شہزادے سے مل گئی ہے۔ بد قسمی سے ان ہی دنوں نادر شاہ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا جو ناکام رہا۔ شیرازی نے نادر شاہ کو پٹی پڑھائی کہ یہ حرکت شہزادے کی ہے جو اب خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔

ادھر ستارہ نے اس خیال سے کہ باپ بیٹے کی دشمنی طویل نہ پکڑے، نادر شاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ بلا تحقیق شہزادے کو مورد الزام قرار نہ دے۔ بات شاید خراب نہ ہوتی اگر شیرازی نے نادر شاہ کے دل میں ایک خیال اور نہ ڈال دیا ہو مگر ستارہ، شہزادے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ ستارہ کی اس سفارش نے

نادر شاہ کے اندر اور زہر پھیلا دیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں رضا خان کو اندھا کرانے جا رہا ہوں مگر یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔“ ستارہ یہ سن کر وہل گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”شاہ! رحم کریں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اسے اندھا کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔“

نادر شاہ نے غصے سے ستارہ کو دیکھا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر جاگری۔ آغا باشی نے نادر شاہ کے حکم پر اسے محل سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

نادر شاہ بے حد چڑچڑاہو چکا تھا اور ملکی مسائل میں اس طرح دھنس گیا تھا کہ اس نے ستارہ کے بارے میں پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ تب وہ ایک روز خود ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نادر شاہ سے ملنے چلی تو آغا باشی سخت پریشان تھا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ نادر شاہ اسے مروا بھی سکتا ہے، مگر وہ نہ مانی۔

اسی رات۔!

نادر شاہ کے خیمے میں دشمن کا آدمی گھسا اور اس کے خنجر نے ہمیشہ کے لیے اس شخص کو دنیا سے رخصت کر دیا جس نے شک و شبہ اور حکومت و اقتدار کی لپیٹ

نام گولیتھ ہے۔ ایک اور کتاب میں آتا ہے کہ یہ بہت قوی الجیٹہ یعنی قوی بیگل تھا۔ (عرب مورخ مسعودی اور طبرانی)

طویل ترین عشقیہ خط

عشقیہ خطوط میں سب سے طویل خط وہ ہے جو اس وقت بھی برطانوی عجائب خانے میں محفوظ ہے یہ خط ملکہ الزبتھ کے ایک درباری کا ہے جو اس نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط 400 باریک لکھے ہوئے صفحات پر محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ نالوں کے برابر ہے۔ اس کی شادی غالباً اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی ورنہ شاید اس کی بیک بیک کی سب سے زیادہ قبل از وقت مر جائی۔ (ازہفت روزہ چٹان)

مہرین اناقریشی تائبندہ گوہر قریشی ملتان



ہے حالانکہ بازنطینی حکومت پر فتح پانے سے قبل ہی ترکوں کے پرچم پر یہ نشان پایا جاتا تھا تاہم یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ ہلال کے بطن میں ستارہ کہاں سے آیا۔ جب کہ بازنطینی پرچم اس سے خالی تھا۔ اس کے متعلق ایک روایت اور ہے جس سے ہلال میں ستارہ کے اضافے کے حوالے سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک بار الطفول اعظم جو ترک سلطنت کا مورث اعلا ہے کسی درویش سے ملنے گیا اور اس نے پیش گوئی کی کہ تیری قائم کردہ حکومت صدیوں قائم رہے گی۔ یہ خوش خبری سن کر جب الطفول درویش کے حجرہ سے واپس آیا تو شام ہو چکی تھی اور ہلال و زہرہ دونوں کا اجتماع بالکل اسی طرح تھا جس طرح قوی پرچم میں نظر آتا ہے اور طفول نے اسے نیک فال سمجھ کر اپنے پرچم کا نشان قرار دے دیا۔

جالوت کون تھا؟

قرآن کریم میں جالوت کا ذکر آیا ہے۔ ”اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔“ (البقرہ 251) جالوت کون تھا اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔ جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ایک بادشاہ تھا۔ عرب مورخ مسعودی کا بیان ہے کہ فلسطین میں بربر قوم آباد تھی اور یہ ان کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام مولود تھا۔ اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور اردن کے علاقے میں لڑائی ہوئی۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت نے اعلان کیا کہ جو کوئی جالوت کو مارے گا۔ اسے آدمی سلطنت انعام میں دی جائے گی اور شہزادی سے نکاح کرا دیا جائے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے گوچھن سے پتھر مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔ مورخ طبری کے نزدیک وہ عاد و ثمود کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اسرائیلیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ تیرکات اور تابوت سلیمانہ بھی بنی اسرائیل سے چھین کر لے گیا۔ اسلامی روایات بائبل کے مطابق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں اس کا

خدا تین ڈائجسٹ

کلام اللہ کے لیے لکھا گیا

جلد سوم کا کلام

سائزہ رخصتا

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون: 32735021

37، نئی بازار، لاہور

چکن چائینز سوپ

ضروری اجزا :

چکن (بغیر ہڈی کا)

انڈوں کی سفیدی

کارن فلور

پیاز

اورک

سیاہ مرچ پاؤڈر

سویا سوس

سوئیٹ کارن

پانی یا بخنی

انڈے (ابلے ہوئے)

نمک

ترکیب :

برتن میں چکن کٹی پیاز، اورک کٹی ہوئی، بخنی، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔

گوشت گل جائے تو سوپ چھان کر الگ برتن میں ڈالیں، گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر لیں، آدھا کپ ٹھنڈے پانی میں کارن فلور گھول کر سوپ میں ڈالیں، اس میں سوئیٹ کارن (بھنے کے دانے) اور گوشت شامل کر کے پکائیں، ابل آجائے تو انڈے کی سفیدی پھینٹ کر ڈالیں اور 3 سے 2 سیکنڈز بعد چمچے کی مدد سے مکس کریں۔

گہرے پیالے میں نکال کر ابلے ہوئے انڈوں سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

لوکی کے سیخ کباب

ضروری اجزا :

لبی ہری لوکی

لال مرچ ثابت

لونگ

سیاہ زیرہ

نمک

انڈا

ہری مرچ

لسن کے جوئے

تیل رکھی

چنے کی دال

کالی مرچ ثابت

سفید زیرہ

دھنیا ثابت

ڈبل روٹی کے سلائس

ہرا دھنیا

پیاز

اورک

ترکیب :

سب سے پہلے لوکی کو چھیل کر باریک کدو کش کر لیں پھر اسے نمک کے ہی پانی میں بھاپ دے کر خشک کر لیں۔ چنے کی دال میں سوائے ہرے مسالے اور پیاز کے باقی سارے مسالے ڈال کر ہلکی آنچ میں پکنے رکھ دیں۔ پانی اتنا ڈالیں کہ دال زیادہ نہ گل جائے۔ بھری بکھری رہے۔ جب دال کا پانی خشک ہو جائے تو پھینٹ لیں۔ بھاپ دی ہوئی لوکی کو چھلتی میں رکھ کر دیا کر پانی خشک کر لیں پھر پسی ہوئی دال میں ملائیں۔ انڈا اور سلائس کے چاروں کنارے کاٹ کر درمیان کا حصہ باریک چورا کر کے ملائیں۔ ہر مسالا

دوسرے برتن میں گھی گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری تل لیں اور نہاری پہ بگھار لگادیں۔ ہر ادھیا اور ک کتری ہوئی بڑی ہری مرچیں اور لیموں کے ساتھ پیش کریں۔

نچیری

ضروری اجزا :

سوتلی گھی
چینی پانی
گٹے ہوئے پستہ بادام
ایک کلو
ایک کپ
آدھا کلو
ایک کپ
حسب خواہش

ترکیب :

آدھا کلو چینی میں ایک کپ پانی ڈال کر جو لے کر پکنے کے لیے رکھ دیں جب ایک مار کا شیرہ ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔

سوتلی میں گھی ڈال کر ہلکی آج پر بھون لیں پھر جب سوتلی کارنگ سنہری ہو جائے تو اس میں شیرہ ڈال دیں۔ اور اچھی طرح مکس کریں اتنا بھون لیں کہ پھر ایک

تھال میں ڈال کر تھچے سے ہموار کریں۔ اوپر سے پستہ بادام اور پسانا رمل چھڑک دیں اور چھری سے ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیں۔



اور پیاز ملا کر گوندھ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد ان کے کباب بنا کر سینوں پر لگا کر جو لے پر سینک لیں۔ برش کے ذریعے ہلکا سا تیل لگا کر سرخ سے نکال کر گرم گرم پیش کریں۔
گرم گرم پراٹھے اور اہلی کی کھٹی چٹنی ساتھ میں رکھیں۔

نہاری

ضروری اجزا :

بونگ کا گوشت
نلی نمک
سیاز گھی
پسا ہوا اورک ہلسن
آٹا
پسی سوٹھ
پسا گرم مسالا
اورک ہر ادھیا
جا نقل جاوتری
سونف
ایک کلو
ایک عدد
حسب ذائقہ
ایک عدد
دو کپ
دو کھانے کے چمچے
ایک چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چمچ
سجاوٹ کے لیے
ایک چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچے

ترکیب :

پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں پسا ہوا ہلسن اورک ڈال کر بھونیں پھر اس میں لال مرچ نمک پسی ہوئی سوٹھ پسی ہوئی سونف جا نقل جاوتری گوشت اور نلی ڈال کر بھونیں۔ گوشت کا پانی بھن جائے تو اس میں تقریباً ایک لیٹر پانی ڈال کر ہلکی آج پر گوشت گلا لیں۔ اگر پانی ختم ہو جائے تو گلنے کے لیے مزید پانی ڈال سکتے ہیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں تین کپ پانی ڈالیں اور آٹا بھون کر پانی کے ساتھ آمیزہ تیار کر کے گوشت میں شامل کریں اور چمچے مسلسل چلاتی رہیں۔ اور ساتھ ہی پسا ہوا گرم مسالا بھی ڈال دیں۔ پندرہ منٹ ہلکی آج پر ڈھکنا ڈھانپ کر پکا میں۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو اور سماجی کامیابی

کانیا ایڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا گھانا

قیمت - 225/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا منی آڈر ارسال فرمائیں۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



منٹ تک لگا رہنے دیں پھر نیم گرم پانی سے سرد ہو کر خشک کریں۔ اس عمل کو ہفتے میں ایک دفعہ ضرور آنا میں۔
آپ کے بال حیرت انگیز طور پر نہایت خوب صورت لے گئے اور چمک دار ہو جائیں گے۔

بالوں کے لیے ہمیشہ ہلکے شیمپو کا استعمال کریں اور شیمپو کی مقدار ہمیشہ کم لیں۔ سخت قسم کے شیمپو بالوں سے قدرتی تیل کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ سرد ہونے کے دوران بہت زیادہ گرم پانی کا استعمال بھی ہرگز نہ کریں۔

شیمپو کرنے کے بعد ہمیشہ کنڈیشنر کا استعمال کریں یا ایسے شیمپو کا انتخاب کریں جس میں پہلے سے کنڈیشنر شامل ہو۔ ہفتے میں دو مرتبہ تیل سے سر کی جلد اور بالوں کا مساج کریں اور رات بھر کے لیے چھوڑ دیں۔

ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ اپنے بالوں کو کنڈیشنر کریں، دہی یا انڈے کی زردی خشک بالوں کی کنڈیشننگ کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے اس کو بالوں میں لگا کر ادھا گھنٹے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اچھی طرح دھو لیں۔

مندی بھی بالوں کے لیے ایک بہترین کنڈیشنر ثابت ہوتی ہے۔ مندی میں ایک چائے کا چمچ تیل اچھی طرح مکس کر کے بالوں میں لگائیں۔

سورج کی روشنی کا سامنا اگر زیادہ دیر تک کرنا ہو تو اپنے سر کو اچھی طرح ڈھک لیں۔

ادنی مصنوعات جیسے ادنی ٹوپیوں، اسکارف اور گردن کے گرد لپیٹے جانے والے مظلروں کا استعمال آپ کی ہیئر لائن کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتا ہے یا بالوں کے ٹوٹنے کی وجہ بھی بن سکتے ہیں، موسم سرما کی ایسی مصنوعات کے استعمال سے قبل اپنے بالوں کو لان کے اسکارف سے ڈھک لیں۔

اپنے بالوں کو آزاد بالکل نہ چھوڑیں۔ چھاپا پونی ٹیل یا کسی بھی انداز سے باندھ کر رکھیں۔ کھلے ہوئے بالوں پر ٹھنڈی اور گرم ہوا بہت تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔

بالوں کو جلدی جلدی رنگنے، اسٹریکنگ یا الیکٹرک آئرن جیسے عوامل بالوں کی نمی چھین لیتے ہیں، بالوں کو حرارت دے کر ان کو نیا انداز دینے سے ممکنہ حد تک گریز کریں۔

بالوں کی حفاظت

تیز کیمیکل کے حامل شیمپو اور بالوں کی آرائش کے لیے استعمال ہونے والے ہیشر اسپرے، ویکس یا ڈائی وغیرہ کا زیادہ یا بے احتیاطی سے استعمال بالوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بالوں کی بہترین نشوونما کے لیے انڈہ دہی اور سرسوں کے تیل یا ناریل کے تیل کو ملا کر بالوں کی جڑوں سے سرے تک اچھی طرح لگا کر ایک گھنٹہ چھوڑ دیں۔

یہ عمل ہفتے میں تقریباً دو دفعہ دہرا میں۔ آپ کے بال نہایت حسین چمکدار اور مضبوط ہو جائیں گے۔

بالوں کو کنگھا کرنے کے لیے معیاری ہیشر برش خریدیں اور کیلے بالوں میں کنگھا ہرگز نہ کریں کیونکہ کیلے بال کمزور ہوتے ہیں اور آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بالوں کی نشوونما میں اضافہ کرنے کے لیے سر جھکا کر آٹھی سمت میں کنگھا کریں۔ اس سے دوران خون بھی بہتر ہوتا ہے اور بالوں کی صفائی بھی ہوتی ہے اور وہ گھنے اور صحت مند بھی ہونے لگتے ہیں۔

امرو کے پتے بالوں کی خوب صورتی کیلئے اکسیر

امرو کے پتے بالوں کو گرنے سے روکتے ہیں۔ سر کی جلد اور بالوں سے خشکی و سرخی جووں کا خاتمہ کرتے ہیں۔ آپ امرو کے پتوں کا استعمال مندرجہ ذیل طریقہ کار کے مطابق کر سکتی ہیں۔

مٹھی بھر امرو کے تازہ پتے لے کر چھی طرح دھولیں

تاکہ ان پر لگی ہوئی مٹی صاف ہو جائے جب پتوں پر سے تمام گرد و غبار صاف ہو جائے تو ایک بڑے برتن میں تقریباً 1 لیٹر پانی گرم کریں اور اس میں ان پتوں کو ڈال کر دھیمی آنچ پر 30-20 منٹ تک پکائیں۔

جب پانی آدھا رہ جائے تو اس پانی کو چھان کر علیحدہ برتن میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ پانی ٹھنڈا ہونے کے بعد اس محلول کو بالوں کی جڑوں اور بالوں میں انگلیوں کی مدد سے اچھی طرح لگائیں یا اس پانی سے سرد دھولیں اور 30

